سفرنامہ
بلوچستان و سندھ
مصنف: لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر
ترجمہ: پروفیسر ایم انور رومان

سفرنامہ

بلوچستان و سندھ

حصّہ اوّل

سفرنامہ

بلوچستان و سندھ

اور
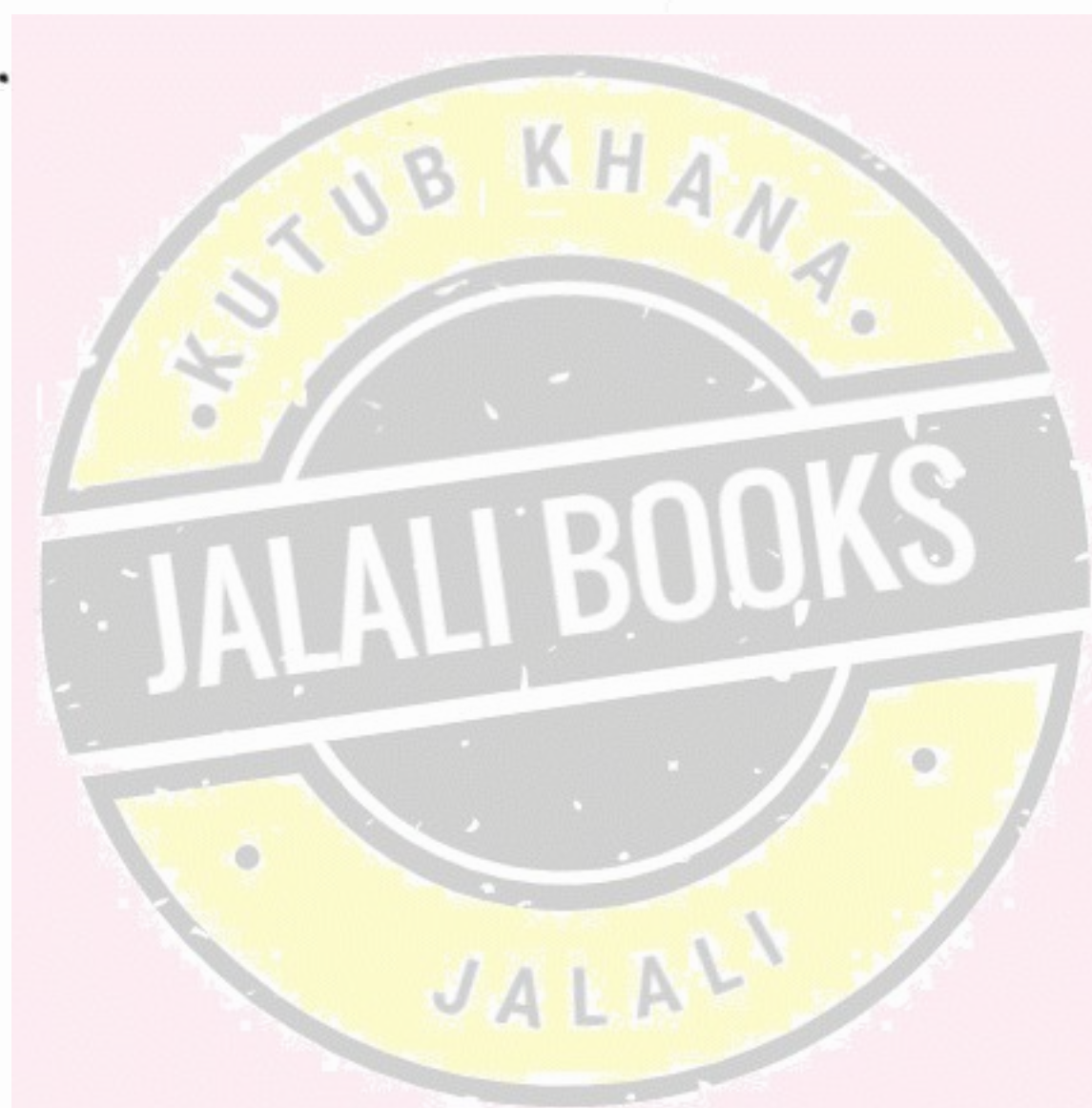
ان ممالک کا ایک تاریخی و جغرافیائی مطالعہ

حصّہ اوّل

مصنّف: لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر منسلک بصیغہ ملازمت آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی،
معاون ریذیڈنٹ در دربار اعلیٰ حضرت پیشوا و سابقہ معاون و پیمائش کار
وفود سندھ و ایران

ترجمہ: پروفیسر ایم انور رومان
ڈائریکٹر بیورو آف کریکولم
بلوچستان۔ کوئٹہ

نساء ٹریڈرز
۷۔ جناح کلاتھ مارکیٹ۔ کوئٹہ
فون: ۷۴۶۸۱

طابع ——— عابد بخاری

مطبع ——— علی پرنٹرز، پیسہ اخبار، لاہور

طبع اوّل ——— مئی ۱۹۸۰ء

تعداد ——— ۲۵۰ جلدیں

قیمت ——— ایک سو روپے

کتابت ——— اے ایس ممتاز

اصل کتاب:

"Travels in Baluchistan and Sind."

کے نام سے ہنری پوٹنگر نے تحریر کی جس کی اوّل اشاعت ۱۸۱۶ میں ہوئی اور ترجمہ پروفیسر ایم انور رومان نے کیا۔

اشاعتی ادارہ: نساء ٹریڈرز - ۲، جناح کلاتھ مارکیٹ کوئٹہ (پاکستان)

فون: ۷۴۶۸۱

تقسیم کار: میسرز گوشہ ادب، سرکلر روڈ، کوئٹہ (پاکستان)

فون: ۷۵۰۰۲

انتساب

ہنری پوٹنگر نے اپنی کتاب کا انتساب لارڈ موئرا (مارکوئیس آف ہیسٹنگز) کے نام کیا تھا جو ۱۸۱۳ سے ۱۸۲۳ تک گورنر جنرل ہند رہے اور برطانوی سامراج کے ایک بہت بڑے قیم تھے. انہوں نے برمی اور گورکھا جنگیں لڑیں اور پنڈاروں کو قابو کیا. پوٹنگر ان کے ہم قوم بھی تھے اور ہم خیال بھی اور ظاہراً نہ سہی باطناً اسی سامراج کے لئے نئی فتوحات کے دروازے کھول رہے تھے لہٰذا یہ انتساب انہی کو زیب دے سکتا تھا!

میں یہ ترجمہ اپنے محترم و محتشم استاد ڈاکٹر پروفیسر انوشیر بادی لال سری دستورا کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں جو عربی، فارسی اور ترکی کے عالم تھے۔ وہ انتہائی سادہ اور درویش صفت انسان تھے۔ صاحبِ علم و فضل، علم دوست اور علم پرور تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ روایتی مشرقی اوصاف و اقدار کے مجسمے تھے اور میں آج بھی اپنے ذوقِ تحقیق میں ان کو اپنا رہنما سمجھتا ہوں۔ خدا کرے کہ وہ حیات ہوں!

سلام ما برسانید ہر کجا کہ ہستند

انور رومان

کوئٹہ

۲۱, دسمبر ۱۹۷۹ء

مندرجات

حصّہ اوّل

انتساب	۱
دیباچہ	۶
پیش لفظ	۹
تعارف	۱۲
باب اوّل	۲۰
باب دوم	۳۸
باب سوم	۵۴
باب چہارم	۶۶
باب پنجم	۹۸
باب ششم	۱۱۴
باب ہفتم	۱۲۷
باب ہشتم	۱۳۷
باب نہم	۱۴۷
باب دہم	۱۶۰
باب یازدہم	۱۷۴
باب دوازدہم	۱۸۵
باب سیزدہم	۱۹۹
باب چہاردہم	۲۰۸

دیباچہ

آئندہ صفحات کا عام خاکہ ابتدائی طور پر ۱۸۱۰ء کے ایک سفر کی سرکاری روئیداد کے طور پر تیار کیا گیا تھا جسے جناب عزت مآب گورنر جنرل اِن کونسل کے توسط سے (ہندوستان کی) برطانوی حکومتِ عالیہ کے حضور پیش کیا گیا جس کے زیر سرپرستی یہ سفر اختیار کیا گیا تھا۔ اُس وقت سے میں نے اس میں بہت سے اعداد و شمار اور جغرافیائی کوائف کا اضافہ کیا ہے لیکن چونکہ اس روئداد کا ابتدائی مقصد اُن واقعات و تعلقات کی تفصیلات کا متحمل نہ ہو سکتا تھا جو اس میں در آئی ہیں۔ لہٰذا نظرِ ثانی پر میں نے بہتر یہی سمجھا کہ روابط کو ایک ڈائری کی صورت میں واقعات سے الگ کروں اور اب حصۂ اوّل میں وہ واقعات شامل ہیں جو مجھے انوکھے یا دلچسپ معلوم ہوئے اور جن کو قلمبند کرنے میں مَیں نے طول کلام سے احتراز کیا۔ حصّہ دوم میں بلوچستان و سندھ کے اعداد و شمار اور جغرافیہ کے سلسلہ میں میری تحقیقات کے نتائج شامل ہیں۔ ان دونوں کے درمیان خطِ فاصل کھینچنا دشوار تھا۔ لہٰذا ممکن ہے میرے بعض قارئین سَرسَری مطالعہ کے بعد چند جزئیات کو حقیر اور بے مایہ سمجھ لیں لیکن میرے خیال میں وہ جزئیات یقیناً دلچسپ تصور کی جائیں گی کیونکہ وہ اُن ممالک سے متعلق ہیں جو اہل یورپ کے لئے رازِ سربستہ ہیں اور جن کے لوگوں، رواجوں اور حکومتوں کے متعلق سکندرِ اعظم کے وقت سے کوئی تحریری دستاویزات موجود و محفوظ نہیں ہیں۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اور بعض معزز دوستوں کے اصرار پر مَیں نے زمرۂ مصنفین

میں شامل ہونے کی جسارت کر لی لیکن چونکہ مجھے نہ تو عالمانہ تحقیق نہ ہی کلاسیکی صحتِ واقعات میسّر ہے لہٰذا میں مواد و اسلوب کی خامیوں کے لئے اپنے قارئین کی چشم پوشی اور درگذر کا امیدوار ہوں۔ مجھے بھیس بدل کر سفر کرنا پڑا اور اس کی وجہ سے موضوعات کی عمومیت پر مجھے ظاہری بے اعتنائی سے کام لینا پڑا۔ شرح و بسط سے نوٹ لکھنا بھی قطعاً ناممکن تھا۔ اسی لئے حصّہ دوم میں بعض فروگذاشتیں نظر آئیں گی جنہیں میں ہندوستان سے واپسی کے بعد بھی دُور نہیں کر سکا۔ یہ بھی کہہ دینا مناسب ہو گا کہ بلوچستان کے سلسلہ میں میرے بعض جغرافیائی و شماریاتی حقائق پہلے ہی لیفٹیننٹ میکڈانلڈ کنیئر کی گرانقدر کتاب "ایرانی سلطنت کا جغرافیائی تذکرہ" میں خلاصے کی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ یہ تذکرہ پچھلے سال منظرِ عام پر آیا تھا اور لیفٹیننٹ موصوف کو اُن تمام سرکاری دستاویزات تک رسائی حاصل تھی جو بنگال سے ایسٹ انڈیا ہاؤس کو روانہ کیے گئے تھے۔ لیکن چونکہ مجھے ذاتی مشاہدات اور تازہ ترین تحقیقات کی بدولت نہ صرف اُن کی صحت و صداقت کی تصدیق و توثیق کا موقعہ ملا بلکہ میں انہیں کافی وسیع پیمانے پر دیکھ سکا لہٰذا میں نے اُن کا کوئی حصّہ نظر انداز نہیں کیا اور مطابقت کی صورت میں محض اس کتاب کا حوالہ دینا ہی کافی سمجھا جو زبان اور معلومات دونوں سے عیاں ہے۔

مجھے احساس ہے کہ زیرِ تحریر موضوع کلاسیکی تحقیق اور قیاس آرائی کا طلب گار ہے اور متعلقہ ممالک کی قدیم تاریخ کے گہرے مطالعہ کا متقاضی ہے جو مجھے نصیب نہیں اور سفرنامہ عین ان کی ضد ہوتا ہے لہٰذا میں نے حتی الوسع موضوع سے انحراف نہیں کیا اور نہ ہی تماثل و تقابل کی کوشش کی ہے سوائے اس کے کہ جب ایسا تقابل و توازن مجھے اظہر من الشمس معلوم ہوا۔

اب مجھے خوشگوار (لیکن افسوس ناک) فرض بھی ادا کرنا ہے اور وہ ہے استفادے کا اعتراف جو میں نے اپنے مرحوم رفیقِ سفر اور دوست کیپٹن چارلس کرسٹی (بمبئی نیٹو انفنٹری سے متعلق) کی اصلی یادداشتوں سے کیا۔ وہ ایک ایسا انسان تھا جسے فطرت نے ایسے

جذبات سے متصف کیا تھا جو ایک معزز شخص، ایک مجلد، ایک عالم، ایک عزیز یا ایک دوست کو محبوب بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح میں کیپٹن ولیم میکیس فیلڈ (بمبئی میرین سے منسلک) کا شکرگذار ہوں کہ اُنہوں نے مجھے صوبۂ سندھ کے سلسلہ میں اپنی سرکاری خط و کتابت سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔ ایک اور صاحب (جن کا نام میں نے کہیں متن میں درج کیا ہے) کا میں اتنا ممنون ہوں کہ بیان نہیں کرسکتا اس لئے کہ انہوں نے کتاب کی تکمیل کے دوران مجھے اپنے مختلف النوع افکار و آراء سے سرفراز فرمایا۔ پونہ کے ریذیڈنٹ کے پہلے معاون، کیپٹن رابرٹ کلوز کا بھی مجھے شکریہ ادا کرنا ہے کہ انہوں نے مجھے بعض موضوعات پر ایسی تجاویز دیں جو اب جزو کتاب بن گئی ہیں۔ آخر میں میں جناب ہنری ایلس ایم۔ پی (۱۸۰۹ میں دربارِ سندھ کے سفیر کے پہلے معاون) کا احسان مند ہوں کہ میں نے انہی کی رپورٹ سے سندھ کے مالیہ اور آبادی کی معلومات اخذ کیں۔

(ہنری پوٹنگر)

پیش لفظ

ہنری پوٹنگر کی کتاب کے دو حصّے ہیں جو اُس کی شخصیت کے دو پہلوؤں کے عین مطابق ہیں۔ پہلے حصّے میں اُس کی ڈائری ہے جو ۲ جنوری ۱۸۱۰ سے ۶ فروری ۱۸۱۱ء تک محیط ہے جب وہ واپس بمبئی پہنچ گیا جہاں سے وہ اوّل الذکر تاریخ کو روانہ ہوا تھا۔ یہ کم و بیش ڈھائی ہزار میل کے سفر کی روداد ہے۔ سولہ جنوری ۱۸۱۰ء کو وہ سونمیانی اترا اور پھر اُوتھل، بیلہ، سوراب، خضدار، قلات، نوشکی، کھوگن، دزک، سب، عثمان آباد، ہفتر، پوہرہ، بمپور اور نسبان وغیرہ ہوتا ہوا ۲۱ اپریل تک کوئی سوا تین مہینے بلوچستان میں ۹۲۸ میل طے کر کے ایران میں داخل ہوا۔ وہاں مزید ۷۲۳ میل طے کر وہ ۵ جون کو شیراز پہنچ گیا۔ اِس حصّہ میں وہ سر تا پا سیاح ہے۔ کتاب کے دوسرے حصّہ میں (ماسوائے ضمیمہ کے جس میں اُس نے اپنے ہمسفر کیپٹن کرسٹی کی بیاض کا خلاصہ پیش کیا) وہ ایک مورّخ کے رُوپ میں ہمارے سامنے پیش ہوتا ہے۔ پہلا حصّہ بہت دلچسپ ہے۔ اُس کے مشاہدات دوار دات ذاتی ہیں اور اُس کا انداز بیان اکثر و بیشتر نہایت دلکش اور معلُومات افزا ہے۔ لیکن دُوسرے حصّہ میں اُس کی معلومات بہت دقیانوسی، ناقص اور بعض مقامات پر غلط بھی ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اُس وقت لکھ رہا تھا جب ابھی تاریخ ہند موجُودہ تحقیقات کی روشنی میں نہیں آئی تھی۔ یورو پی بالخصوص انگریزی علماء ابھی مسلمانوں کے بیش بہا مسوّدات و تواریخ کے مطالعہ کے آغاز میں ہی تھے اور ہنوز ان مطالعات کو نہ ترتیب دے سکے تھے اور نہ ہی ان کا تقابلی مطالعہ کر کے انہیں تاریخ کے جدید نظریات سے

ہم آہنگ کر سکے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ امّ العلوم اور کلید انسان ہے اور افراد و اقوام دونوں کے لئے اس کا مطالعہ یکساں طور پر مفید، سبق آموز اور اشد ضروری ہے لیکن تاریخ بعدِ زمانی و مکانی میں کام کرنے پر مجبور رہی ہے۔ چونکہ اس کی نظر ہونے والے واقعات پر مرکوز ہونے کے علاوہ ان کے تجزیہ، ان کے اسباب و علل اور ان کے نتائج و عواقب پر بھی ہوتی ہے اور اسے ہر قسم کی معلومات حاصل کرکے اکثر ان پر کوئی نہ کوئی فیصلہ بھی صادر کرنا ہوتا ہے (جو حق میں بھی ہو سکتا ہے، خلاف بھی اور معلّق بھی!) لہٰذا واقعات اور ان میں ملوّث یا ان کے ذمّہ دار انسانوں سے فاصلہ ضروری ہے تاکہ تاریخی فیصلہ ہنگامی یا سطحی نہ ہو، جذبات سے مغلوب نہ ہو اور ادھورے یا یک رُخ واقعات اور ماحول پر مبنی نہ ہو، گویا تاریخ کا بنیادی کام ہمہ جہتی واقعات اور ہر واقعہ کی ہمہ پہلو معلومات کو اکٹھا کرنا ہے جس کے لئے لازماً وقت درکار ہے، دوری ضروری ہے۔ غیر جانبداری ناگزیر ہے۔ واقعات اندوزی کے بعد ہی تاریخ اپنا ظاہری و باطنی کام انجام دے سکتی ہے۔ اس کے برعکس سیاحت ایک محدود پیمانے پر ہوتی ہے لیکن وہ زمین کے چپے چپے، فضا کے رنگ و روپ اور انسانوں سے بہت گہرا ربط رکھتی ہے۔ یہ جو کچھ کہتی ہے وہ نرا مشاہدہ نہیں بلکہ بسا اوقات ذاتی تجربہ ہوتا ہے، روزمرہ کے واقعات ہوتے ہیں جن میں سیاح بلا واسطہ شریک ہوتا ہے اس لئے انسانوں اور واقعات کا جو تجزیہ ہمیں سیاحت میں ملتا ہے وہ تاریخ میں ممکن نہیں گویا ان دونوں میں قریب قریب وہی فرق ہے جو آپ بیتی اور جگ بیتی میں ہے لیکن یہ ایک دوسرے سے مربوط یوں ہیں کہ تاریخ کے لئے سفر نامہ ایک عملی، حقیقت پسندانہ اور یقینی ماخذ ہے اور سفر نامہ کے لئے تاریخ ایک ناگزیر پس منظر کا کام کرتی ہے اور ان انسانوں اور اس ماحول کو سمجھنے میں معاون ہوتی ہے جن سے سیاح کو واسطہ پڑتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ تاریخ کا تجزیہ عموماً ہمہ گیر اور نظریہ جامع ہوتا ہے اور سیاح کا تجزیہ محدود اور نظریہ عموماً سطحی ہوتا ہے۔

مسٹر پوٹنگر بھی ایک سیاح تھے۔ گو اُن کا مقصد سیاسی تھا کیونکہ انہوں نے زیرِ سیاحت علاقوں میں برطانوی استیلا و استعمار کی آئندہ توسیع کے امکانات کا جائزہ لینا تھا تاہم وہ ظاہری اور مبینہ طور پر سیاح تھے۔

یہ ماننا پڑے گا کہ آج سے ۱۷۰ سال پہلے جب یہاں ذرائع مواصلات بالکل کہنہ و پامال تھے۔ سیاحت کرنا بہت دل گردے کا کام تھا۔ قدم قدم پر پوٹنگر اور اس کے ساتھی کیپٹن کرسٹی کو لٹنے اور مرنے کا اندیشہ تھا لیکن جس دلیری، جرأت، حاضر دماغی، موقعہ شناسی، خطر پسندی اور قوت برداشت کا ثبوت ان دو نے پیش کیا وہ مرورِ زمان کے ساتھ تحیّر زائی میں بڑھتا جا رہا ہے اور گو اس کا محرک اور ان مثبت صفات کو بروئے کار لانے والا جذبہ انسانی ہمدردی اور تحصیل علم کا تو نہ تھا تاہم انگریز قوم جب موج توسیع و ترفّع پر سوار تھی تو اس کے افراد کی فرض شناسی کا ایک روشن نمونہ ضرور تھا اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ اس توسیع میں ممد و معاون ہونا ضروری سمجھتا تھا۔

اس رُوداد سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے برِصغیر کے ہر حصّہ میں سامراج کی مدد کی۔ سیٹھ امی چند ہو، پورنیا ہو یا سُندر جی، ان سب نے یہاں مسلمانوں کی سلطنت کو بیخ و بن سے اکھاڑنے اور انگریز استعمار کے لئے راستہ صاف کرنے میں بہت اہم حصّہ لیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں میں غدار نہ تھے یا اُن کے حکمران جہانبانی و جہانداری کی صفات سے متصف تھے۔ میر جعفر اور میر صادق کی شبیہیں یہاں بھی موجود تھیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ حکمران اپنے دائرۂ اقتدار سے اتنے لاعلم اور امورِ سلطنت سے ایسے غافل تھے کہ ایک غیر ملک و قوم کا ایک عیّار اور بہروپ کا باشندہ طول و عرض میں گھومتا پھرتا رہا لیکن نہ خان، نہ کوئی سردار نہ خان کا کوئی عزیز دار اور نہ ہی عمّال میں سے کوئی اتنا قیافہ شناس یا مردم فہم ثابت ہوا کہ وہ اسے پالیتا۔ کیا یہ ان کی غفلت و نااہلی اور خستگی و شکستگی کا ثبوت نہیں ہے؟ قوانین فطرت جہاں غیر مبدّل ہیں وہاں سب کے لئے یکساں بھی ہیں اور قدرت افراد و اقوام کے محاسن و معائب

کو اپنی میزان میں لازماً تولتی ہے اور اگر معائب کا پلڑا بھاری ہو تو وہ انہیں کبھی معاف نہیں کرتی اور دوسروں کو ان پر مسلط کر دیتی ہے۔ فطرت اقرباپروری اور عزیز داری کی قائل نہیں۔ اس کے عزیز و اقارب صرف وہی لوگ ہیں جو اپنے عائد شدہ ہمہ جہتی فرائض کو بدل و جان ادا کرتے ہیں۔

کتاب سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ زیر مطالعہ علاقوں میں جبتک جدید مواصلات و آلات فاصلوں کو فتح نہ کرلیں پہاڑوں کو کھنگال نہ لیں قدرتی آبی ذرائع کو محفوظ نہ کرلیں اور موجودہ ذرائع سے بدرجہ اتم فائدہ نہ اٹھائیں اور تعلیمی و تہذیبی کایا پلٹ نہ لاسکیں اُس وقت تک قبائلی نظام کے افعیٔ جانگداز کو شاید زخمی تو کیا جاسکے لیکن اس کا سر نہیں کچلا جاسکتا کیونکہ یہ جبتک بلد الخوف ہے ہر لمحہ اور ہر قدم پر موت اپنا منہ کھولے کھڑی ہے اور یورش و یلغار، تاخت و تاراج، حرب و ضرب اور دھاوا اور چپاؤ کا دور دورہ ہے اُس وقت تک عامی مجبور ہے کہ وہ آس پاس کے طاقتور انسان کو اپنا آقا مان لے اور اُس کے سایۂ عاطفت میں امن سے رہے ورنہ اس علاقے میں فرد ایک لفظ مہمل ہے افراد مولی گاجر کا ایک کھیت ہیں اور قبیلہ بھی ایک وجود موہوم ہے اور چپاؤ اور شب خون کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

پوٹنگر نے بلوچستان و ایران کے متعلق جو تبصرے کئے ہیں وہ بعض اوقات بہت حقیقت پسندانہ، حقائق آشکار اور خیال افروز ہیں اور آج بھی مشعل راہ ہوسکتے ہیں لیکن بعض اوقات وہ ادھورے اور جانبدارانہ ہیں اور کہیں کہیں تو وہ بالکل غلط ہیں۔ مثلاً قبلہ کو آنحضورؐ کا مزار بتانا مسلمانوں کے متعلق یہ کہنا کہ وہ گوشت کے ہر لقمہ کے بعد منہ دھوتے ہیں۔ آنحضورؐ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ جب بیرون ملک نکلتے تھے تو کئی ممالک کا چکر کاٹتے تھے، ہندوستان کے شہنشاہوں کو سلیوکسی، ارشکانی اور ساسانی حکمرانوں کا باجگزار بتانا، خوارزم شاہوں کے متعلق یہ سمجھنا کہ انہوں نے منگولوں کو ایران سے نکلنے اور سندھ میں آباد ہونے پر مجبور کر دیا وغیرہ وغیرہ۔ اسیطرح چند مثالوں کی بنا پر بلوچوں کے متعلق ایک پست نظریہ اور براہوئیوں کے متعلق ایک بلند نظریہ قائم کرلینا درست نہیں۔ بلوچوں (اور براہوئیوں) کو سلاجقہ کہنا اور

سلاجقہ کو تاتار سمجھنا بھی محلِ نظر ہے ۔ اصل میں پوٹنگر (اور بہت سے دُوسرے بھی) ہٹ کی ایک چوتھی قسم کے شکار ہیں جسے ہم گیانی ہٹ (راج ہٹ، تریا ہٹ اور بالک ہٹ تو مشہور ہیں) کہہ سکتے ہیں ۔ جس کی رُو سے ہر موجودہ قوم یا قبیلہ یا جمعیت کو کسی نہ کسی مخصوص نسل سے منسوب کرنا ضروری ہے حالانکہ انسان و اقوام اور شعوب و قبائل ایک دوسرے سے اتنا گڈمڈ ہو چکے ہیں کہ اب وہ اکثر و بیشتر واحد العنصر نہیں رہے بلکہ کثیر العناصر بن چکے ہیں لہٰذا ان کو کسی ایک نسل یا نسل پارے سے منسوب کرنا مجذوب کی ایک بڑ معلوم ہوتا ہے ۔ صحیح طریقۂ فکر و کار یہ ہے کہ ہر جمعیت کے اجزائے ترکیبی کا تجزیہ کیا جائے مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ اور پھر اگر کوئی عنصر غالب نظر آئے تو اس کی نشاندہی کی جائے نہ یہ کہ الل ٹپ کسی ایک عنصر سے ہی اسے مخصوص کر دیا جائے !

بہر حال مورّخ کی حیثیت سے کبھی پوٹنگر کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھنا چاہیے اور اُس کا مطالعہ صرف ایک سیاح کی حیثیت سے ہی کرنا چاہیے ۔

پوٹنگر کی قوتِ مشاہدہ کتنی صحیح، تیز اور مستقبل گیر تھی، اس کے متعدد ثبوت کتاب میں جابجا ملتے ہیں ۔ مثلاً حصّہ دوم کے باب ہفتم میں اُس نے لکھا ہے کہ "میں نے نوشکی کے مغرب کی طرف پہاڑوں میں سفید اور بھورے رنگ کے سنگِ مرمر کی کافی مقدار دیکھی لیکن بلوچ اس کی قدر و قیمت سے بالکل ناآشنا معلوم ہوتے ہیں"۔ اس مشاہدہ کے کوئی ڈیڑھ سو سال بعد واقعی ان پہاڑوں سے سنگِ مرمر نکالا جانے لگا اور اب یہ نہ صرف پاکستان میں چھوٹی چھوٹی اور بڑی بڑی چیزوں میں استعمال ہوتا ہے بلکہ یوروپ کو بھی بھیجا جاتا ہے اور لاکھوں رُوپیہ زرِ مبادلہ میں کماتا ہے ۔ ایک اور مثال ہے: "قلات سے کوئی ڈیڑھ سو میل جنوب اور جنوب مغرب میں واقع قصبہ نال کے قریب لوہے اور سیسے کی کانوں میں کام کرتے ہوئے قیمتی دھاتیں بھی دریافت ہوئی ہیں ...... (لیکن) بلوچ خام سیم و زر کو صاف کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اسے اس کی اصلی حالت میں ہی ہندوؤں کے ہاتھ بیچ ڈالتے ہیں

جو محصولات سے بچنے کے لئے اسے خفیہ طور پر پنجاب کے شہروں کو بھیج دیتے ہیں"۔ اس میں بھی ایک معنی خیز اور امکان پرور اشارہ موجود ہے جس پر ہنوز توجہ نہیں دی گئی!

میں نے حسبِ معمول یہ ترجمہ بھی قلم برداشتہ کیا ہے۔ میرے پاس اتنی فرصت بھی نہیں تھی کہ میں اسے دوبارہ دیکھ سکتا۔ بس صبح اور شام کے لمحات فراغت میں اس کی نذر کرتا تھا۔

میں نے لفظی ترجمہ سے بھی حتی الوسع گریز کیا اور صرف مطالب و مفاہیم کو صحیح طور پر بیان کر دینا اپنا مقصدِ اوّلین سمجھا۔ اگر یہ مصنف کے الفاظ و تراکیب کے قریب رہ کر ادا ہو سکتے تھے تو فبہا ورنہ اس کے مطلب کو بہتر سے بہتر اردو پیرائے میں ادا کر دیتا تھا۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے قلبی مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ اُردو زبان اتنی مالا مال ہے کہ وہ ہر قسم کے اظہار پر قادر ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ اتنی توسیع پذیر ہے کہ مسلّمہ اصولوں کے مطابق نئے مرکبات بھی نہایت آسانی سے تراشے جا سکتے ہیں اور پھر اس میں اتنی سمائی ہے کہ پاکستان کی علاقائی زبانوں کے الفاظ بھی اس میں نہایت خوبصورتی سے سموئے جا سکتے ہیں اور وہ اسی کے ہو رہتے ہیں!

انور رومان

کوئٹہ

یکم جنوری ۱۹۸۰ء

حصّہ اوّل

بلوچستان اور ایک حصّہ ایران کے سفر کا بیان
(جزوی طور پر ایک مُسلمان حاجی کے بھیس میں)
مشتمل بر

حکایات و بیانات

جو
لوگوں کے اطوار و عادات اور اُن کی قبیلہ وار تقسیم وغیرہ کے آئینہ دار ہیں۔

تعارف

ہندوستان کے متعلق فرانسیسی نظریات ـــــ سفارت ایران ـــــ سفر اور سفارت کار ـــــ بریگیڈیئر جنرل میلکم اور سر ہار فورڈ جونز کی نامزدگی برائے طہران ـــــ موخر الذکر کی روانگی کی وجہ ـــــ جنرل میلکم کی ہدایات ـــــ سفارت کی بازطلبی ـــــ دوبارہ تقرری ـــــ نصب العین ـــــ کیپٹن کرسٹی اور راقم کی رضا کارانہ خدمات ـــــ منظوری ـــــ ہدایات و انتظامات ـــــ مشکلات معلومہ و ممکنہ ـــــ گھوڑوں کے مقامی سوداگر کے گماشتوں کا بھیس ـــــ انتظام کیسے ہُوا۔ !

۱۸۰۷ اور ۱۸۰۸ء کے دوران بونا پارٹ کے دیرینہ مخالفانہ منصوبے برطانوی ہندوستان کے ضمن میں اتنے کھل کر سامنے آگئے کہ انگلستانی اور مقبوضاتی حکومتوں نے ان کے اثرات کا سدِّباب کرنا اشد ضروری سمجھا۔ ۱۸۰۷ء کے اواخر میں دربار ایران نے ایک فرانسیسی سفیر کا نہایت دوستانہ اور پُرتپاک استقبال کیا تھا اور اُس قوم کے فرستادگان ایسی مقامی معلومات حاصل کرنے میں منہمک تھے جو ان کے مقصد کو عملی جامہ پہنانے میں ممد و معاون ہو سکتی تھیں۔

ان حالات میں عزّت مآب گورنر جنرل آف انڈیا[1] نے فروری ۱۸۰۸ میں بریگیڈیئر جنرل میلکم کو شاہ ایران کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ قریباً اسی وقت شاہِ انگلستان نے سر ہار فورڈ جونز کو

---

[1] ارل آف منٹو (لارڈ منٹو)

اغذات تعارفی دیگر انگلستان سے روانہ کیا تاکہ وہ شاہِ ایران کے ساتھ مذاکرات کی مناسبت سے صاحب وقار و اختیار ہو جو ایک ثانوی حکومت کے نمائندہ کو نصیب نہ ہو سکتا تھا خواہ وہ کتنا ہی ممتاز اور عظیم المرتبت کیوں نہ ہو!

حکومت بنگال کی طرف سے جنرل میلکم کو جو ہدایات دی گئیں وہ عام لفظوں میں یہ تھیں کہ وہ ان ممالک کی ماہیت اور ان کے وسائل کی پوری طرح چھان بین کرے جن کے راستے ایک حملہ آور یورپی فوج ہندوستان کی طرف پیش قدمی کر سکتی تھی اور اس مقصد کے حصول کے لئے اسے یہ بھی اختیار دیا گیا کہ وہ ضرورت کے مطابق سیاسی معاونین اور پیمائش کار ملازم رکھ سکتا تھا۔

بعد کے واقعات (جو اس کتاب کے ضمن میں بالکل غیر متعلق ہیں) نے حکومت انگلستان کو مجبور کر دیا کہ وہ سر جان میلکم کو واپس بلائے۔ لیکن تھوڑے عرصہ بعد اُسے دوبارہ اسی مشن پر مامور کیا اور وہ ۱۸۰۹ کے اواخر میں ایرانی پایۂ تخت کو جاتے ہوئے بمبئی پہنچا۔ کیپٹن چارلس کرسٹی (بمبئی نیٹو انفنٹری کی پانچویں رجمنٹ سے منسلک) اور میں سندھ سے حال ہی میں واپس آئے تھے جہاں ہم گورنر جنرل کے سفیر کی معیت میں گئے تھے۔ جونہی ہمیں ہندوستان اور ایران کے درمیانی خطوں کی پردہ کشائی کے منصوبے کا علم ہوا ہم نے فوراً اپنی خدمات پیش کر دیں جن کی تفصیلات آئندہ صفحات میں آئیں گی۔

ہماری پیشکش قبول کر لی گئی اور مجاز حکومت بمبئی کا اختیار نامہ بھی حاصل کر لیا گیا۔ مجھے جنرل میلکم نے کیپٹن کرسٹی کے احکامات کا پابند کیا اور کیپٹن موصوف کو براہِ راست ہدایات دیں جو ہمیں درپیش سفر نامعلوم کی نوعیت سے غیر معین اور غیر واضح ہی ہو سکتی تھیں۔ وہ ہماری توجہ صرف اُن اہم نکات پہ مرکوز کرتی تھیں جنہیں حکومت مستحسن سمجھے اور جو اس جرأت مندانہ حکمت عملی کی غرض و غایت کو پورا کر سکیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ہمیں اندازِ سفر، منزلِ مقصود، روش بموجب حالات اور دیگر چھوٹی چھوٹی باتوں میں مکمل طور پہ با اختیار کرتی تھیں اور صرف ایک بات پر مصر اور واجب التعمیل

تھیں کہ ہم اپنی جانوں کی حفاظت کو مقدم سمجھیں۔

عام خیال یہ تھا کہ ایسے کاموں کی تکمیل کے لیئے بڑی رکاوٹ شروع میں ہی پیش آتی تھی کیونکہ اندرونِ ملک کی نسبت ساحلِ سمندر پر ایشیائی باشندے یورپی مسافروں کو مشتبہ سمجھتے تھے اور ان سے غیر شائستہ برتاؤ کرتے تھے لہٰذا ساحل سے آگے بڑھنا کافی مشکل نظر آتا تھا۔ ان حالات میں ہمارے اُترنے کی بندرگاہ پر خاطر خواہ انتظام بے حد ضروری تھا۔ ہماری خوش قسمتی سے یہ انتظام اتنا عمدہ ہُوا کہ اس پر کسی اعتراض کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

ایک معزز اور امیر سُندرجی شوجی نامی ہندو سوداگر تھا جو بہت مدّت سے حکومت ہائے مدراس و بمبئی کو ان کے رسالہ کے لیے گھوڑے مہیا کرنے کا ٹھیکہ دار تھا۔ اُس نے طریقۂ سفر کے استفسار پر یہ پیش کش کی کہ وہ ہمیں بلوچستان کے صدر مقام قلات جانے کے لیئے گماشتوں کی حیثیت سے خطوط اور ہنڈیاں دے دیگا۔ اس جگہ سے ہم مقامی معلومات حاصل کر کے کوئی اور راستہ اختیار کر سکتے تھے اور اگر خدانخواستہ ہم راہِ فرار اختیار کرنے پر ہی مجبور ہوں تو آمد کے راستے کی بجائے کسی اور راستے سے ساحلِ سمندر تک جائیں تاکہ ملک کا زیادہ سے زیادہ حصّہ دیکھ سکیں۔

چنانچہ ہمارے لئے خطوط اور ہنڈیاں تیار کی گئیں اور سُندرجی کا ایک پتیمبر داس نامی ہندو گماشتہ بھی ہمارے ساتھ کر دیا گیا تاکہ بہروپ سراپا رُوپ معلوم ہو۔ کیپٹن کرسٹی اور میں نے دو ہندوستانی بھی چُن لیئے اور انہیں بیش بہا انعام و اکرام کے وعدوں پر راز دار بنالیا۔ اور اُن کی وفاداری اور ایمانداری آخر تک مثالی ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ ہم دونو کو کافی رقم وینس سونے کی صورت میں دے دی گئی تاکہ ہنگامی ضرورت کے وقت خفیہ سہارا بن سکے۔ اسے ہم نے اپنے ملبوسات کے نیچے کمر کے گرد بندھی ہوئی پیٹیوں میں چھپالیا۔ مزید براں کیپٹن کرسٹی کو اختیار دیا گیا کہ وہ سُندرجی شوجی کے نام پر حکومت بمبئی سے بھی مطلوبہ رقومات وصول کر سکتا تھا۔ یوں ہمیں خطرات و مشکلات سے بچنے اور نکلنے اور ہر قسم

کی مخالفت کو زیر کرنے کے لئے کا حصّہ مسلح کر دیا گیا۔ دسمبر ۱۸۱۰ء انہی تیاریوں اور پیش بندیوں میں گذرا اور میں اپنا بیانِ سفر اُس دن سے شروع کروں گا جب ہم نے صوبہ بمبئی کو خیر باد کہا۔
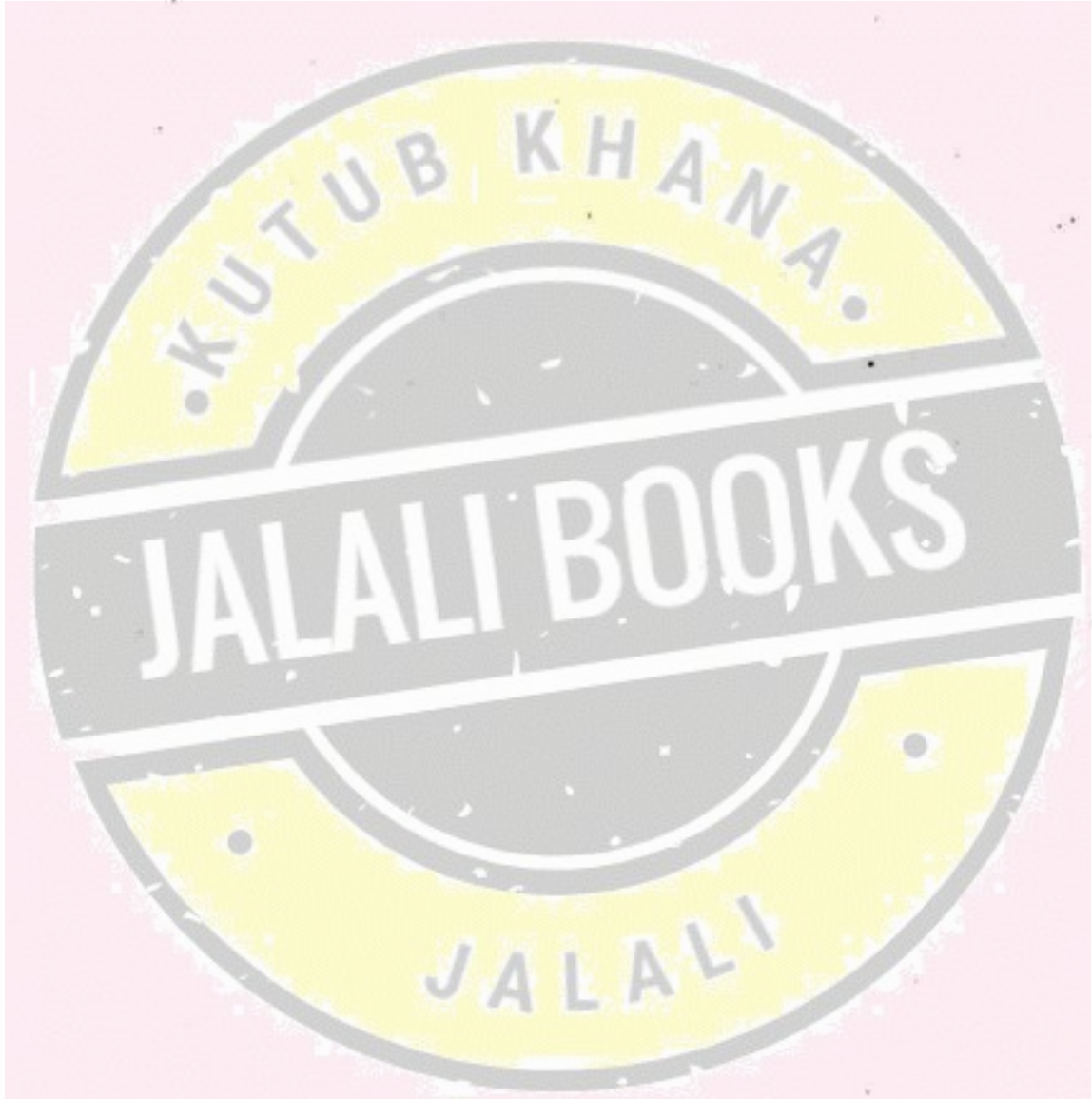
باب اوّل

بمبئی سے روانگی — جماعت — بھیس — پوربندر میں ٹھہراؤ — مقصد — قصبہ اور تجارت — گجرات — پوربندر سے روانگی — سندھ کا شبنم بار ساحل — دریائے سندھ — پانی کا نظّارہ — بندرگاہ اسکندر — سونمیانی میں آمد — استقبال — واقعات — تجارت — ہنود — بیان — دریا — ساحل ریگ — پانی — اس کا حصول — مکانات — سونمیانی سے روانگی — بزنجہ بلوچ — شیخ کاراج کا گاؤں — درمیانی علاقہ — اُتھل گاؤں — علاقہ — نالے — مصنّف اور اس کے ساتھی کی دریافت — نتائج سے بچاؤ — دُریارا — کنوئیں — بیلہ — علاقہ — قبرستان — مقابر — چھٹی — گھوڑ دوڑ — اُونٹ — تیز رفتاری — جام سے تبادلہ پیام و سلام — سندھ سے خط — مقصد — اس کے نتائج سے بچاؤ — جام سے ملاقات — استقبال — گفتگو — جام کے خیالات — بیلہ میں قیام کی دعوت — انکار — قلات کی طرف جانے کے احکامات — سردار کی آمد — زبان — لباس — دربار — مسقط سے خط — چونگی — قصبہ بیلہ — محلّ وقوع اور وسعت — آبادی — سوداگروں کی آمد — کرسٹی کی چال — اس کے نتائج — تحائف — جام دریا خان — گفتگو — پہاڑی بکریاں — براہوئی — جام کے خدم و حشم — ہمیں پا لینے کی کوشش — خطوط — رانا سیٹھ۔

شام گئے کیپٹن کرسٹی اور میں ۲ جنوری ۱۸۱۰ء کو ایک چھوٹی سی مقامی کشتی میں بمبئی کی

بندرگاہ سے سوار ہوئے جو ہمیں سونمیانی بندر تک پہنچانے کے لئے کرائے پر لی گئی تھی۔ یہ فوراً ہی روانہ ہو گئی۔ اگلی صبح طلوعِ آفتاب پر ہم نے دیکھا کہ ہماری جماعت مانجھیوں کو چھوڑ کر دو ہندوستانی ملازموں، سُندرجی کے گماشتہ اور اُس کے نوکر اور گھوڑوں کے متعدد افغان سوداگروں پر مشتمل تھی جو اپنے وطن کو واپس جا رہے تھے اور جنہیں ہم نے یہ سوچ کر بٹھا لیا تھا کہ اُن کی آشنائی اُترنے پر کارآمد ہو گی۔

جب ہم ساحل سے روانہ ہوئے تو کافی اندھیرا ہو چکا تھا اور چونکہ ایک تازہ بتازہ نسیم بحری چلنے لگی اور ہم رات گئے سوار ہوئے تھے لہٰذا ہمیں ہمسفروں کے پا لینے کا خطرہ کم تھا۔ پھر بھی ہم نے ایسا کامیابی سے بھیس بدلا اور یوروپی لباس کو مقامی لباس سے تبدیل کیا کہ افغان ہمیں رنگ کے اعتبار سے یوروپی سمجھنے کے باوجود ہمارے اصل کرداروں پر ذرّہ بھر بھی شک نہ کر سکے۔ اُن میں سے دو تین ہمیں خوب ذہین اور شائستہ معلوم ہوئے اور اُنہوں نے ایسی معلومات ہم پہنچائی جو فوری طور پر دلچسپ تھی اور بعد میں ہمیں منصوبے بنانے کے لئے بہت ممد و معاون ثابت ہوئی۔

۷ رجنوری :-

۷ رجنوری کو ہم نے ساحل گجرات پر واقع جوناگڑھ کا رُخ کیا اور اگلے دن پوربندر لنگر انداز ہوئے۔ یہاں ٹھہرنے کا اصل مقصد سُندرجی سے ذاتی ملاقات تھا جو حکومت بمبئی کی طرف سے راجہ کے ساتھ بعض سیاسی روابط کے سلسلہ میں یہاں متعین تھا۔ ہم نے مشہور کر دیا کہ ہم قلّت آب کی وجہ سے ٹھہرنے پر مجبور تھے اور لنگر اندازی کے ساتھ ہی ہم دونو ساحل پر گئے اور اگلے دو دن آنریبل کمپنی کے بحری بیڑے کے کپتان میکس فیلڈ کی رہائش گاہ پر گذارے جو ان دنوں قائم مقام مہتمم چونگی تھا۔ یہاں بھی ہم افغانوں کی متجسّانہ نگرانی سے بچ نکلے کیونکہ وہ سمجھتے رہے کہ ہم سُندرجی کے گھر ٹھہرے تھے۔

پوربندر، گجرات کے جنوب مغربی ساحل سمندر کی ایک کھاڑی پر بنا ہوا ہے۔ یہ ایک

بڑا اور گنجان آباد قصبہ ہے اور اس کے لوگ بمبئی، سندھ اور مالابار کے ساتھ تجارت کرتے ہیں۔ بارہ چودہ میل دُور ایک سلسلۂ کوہ کے سوا قصبے کا گردوپیش پورے صوبے کی مانند ہموار سطح کا مالک ہے۔

۱۰ر جنوری:

ہم ۱۰ر جنوری کو پور بندر کے شمال مغرب کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک تازہ مشرقی ہوا چل رہی تھی اور رات سخت ٹھنڈی اور اتنی شبنم آلود تھی کہ سب کچھ ایسے بھیگ جاتا جیسے بارش سے۔ ۱۵ کی دوپہر کو ہمیں سندھ کا ساحل دیکھ کر اطمینان ہوا اور ہم اس کے قریب ہی آگئے۔ زمین پست اور مسطح ہے لیکن ہمیں اسے دیکھے بغیر ہی اس کی قربت کا یقین ہوگیا تھا کیونکہ دریائے سندھ کا بے پناہ پانی سمندر میں گرنے کی وجہ سے سمندر ایک غیر معمولی بلکہ ایک وجہ ناشناس ناظر کے لئے تو ایک خوفناک منظر پیش کرتا ہے اور غلطاں و پیچاں لہریں بے رنگ سمندر کے ساتھ مل کر ایک ساحل کا تصور دیتی ہیں جس پر صرف چند انچ پانی ہو حالانکہ پیمائش پر ہمیں اس میں کئی تھیں ملیں۔ اسی دن شام کو ۸ بجے ہم راس مواری (مونز) اور جزیرہ چرنا (چلنی) کے درمیان سے گذرے۔ ہمارا سفر وسطی رود بار پر تھا جو پون میل سے زیادہ لمبی نہیں ہے لیکن گہری اور خطرے سے محفوظ ہے۔ چاندنی میں جزیرہ اور مقابل کنارہ ویران معلوم ہوتا تھا اور اول الذکر میں نہ تازہ پانی ہے اور نہ ہی کسی قسم کی روئیدگی۔

اب ہم خلیج سونمیانی میں داخل ہوئے جو ایک طرف راس مواری اور جزیرہ چرنا اور دوسری طرف راس عرّبو (عربہ) سے تشکیل پاتی ہے۔ یہ ایک نفیس چادر آب ہے جس میں چٹانیں اور خفیہ رکاوٹیں نہیں ہیں۔ اور بڑے سے بڑا بیڑہ بھی یہاں لنگر انداز ہو سکتا ہے۔ مشہور ہے کہ نیارکس کا مستقر رہا اور وہ یہاں کچھ عرصہ قیام پذیر رہا۔ ڈاکٹر ونسنٹ نے ایرین کی سند پر بندر اسکندر کی[1]

---

[1] اسے یہ نام نیارکس نے ہی دیا

جو تصویر کھینچی ہے وہ اصل سے اتنی مشابہ ہے کہ یونانی مورخ کی ثقاہت و صداقت کا واضح ثبوت ہے۔

۱۶ر جنوری:

۱۶ر جنوری کو ایک بجے دوپہر ہم دریائے پورالی کے ساحل ریگ پر لنگر انداز ہوتے۔ سونمیانی کا گاؤں کوئی دو میل دُور شمال مشرقی سمت میں ہے۔ یہاں ہم تین بجے تک ٹھہرے اور نموتج کیساتھ ہی دوبارہ روانہ ہوئے اور پانچ بجے گاؤں کے پاس آکر ٹھہرے۔ ہم نے اپنے ہندو گماشتہ کو ساحل پر بھیجا جو تھوڑے ہی عرصہ بعد سندرجی کے ایک اور گماشتہ کے ہمراہ ایک ڈونگا ہمارے سامان کے لئے لے آیا۔ نو وارد سے یہاں مل کر ہمیں بہت خوشی ہوئی کیونکہ وہ پچھلے ہی موسم میں بلوچستان گھوڑوں کی خرید کے لئے آیا تھا اور ہمیں ضروری معلومات دے سکتا تھا۔ اُس کے مشورے پر ہم شام گئے خشکی پر اُترے اور رانا سیٹھ کے گھر میں آگئے جو اجارہ دار یعنی چونگی کا ٹھیکے دار تھا۔ اُس کے ساتھ چار پانچ ہندو سوداگر الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمیں اُس سے سُندرجی کے یوروپی کارندوں کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا۔ وہ ہمیں شفقت سے ملا اور رسمی سلام و پیام کے بعد کہنے لگا کہ وہ ہمارے آقا کے مفادات کو آگے بڑھانے کے لئے بہت بیتاب تھا اور سمجھتا تھا کہ ہمیں دوست بنا کر ہی وہ ایسا کر سکتا تھا لہٰذا ہم اُس سے ہر قسم کی تگ و دو کی توقع رکھ سکتے تھے۔ ہم نے اس پر اس کا شکریہ ادا کیا اور چند ثانیے بیٹھنے کے بعد وہ ہمیں ایک چھوٹی سی لیکن گاؤں کی بہترین جھونپڑی میں لے گئے جو ہماری رہائش گاہ کے لئے مخصوص کی گئی تھی۔ یہاں ہم نے گندم کی روٹی دودھ کے ساتھ خوب سیر ہو کر کھائی جو اجارہ دار نے بھیجی تھی اور خدا کا شکر ادا کرتے ہوتے لیٹ گئے کہ بالآخر ہمیں ایک چھت (سادہ ہی سہی) نصیب ہو گئی تھی جو کشتی کے مقابلہ پر ایک عیاشی تھی جس میں ہمیں دھوپ اور شبنم سے بچانے کے لئے نہ کوئی کمرہ تھا نہ کوئی شامیانہ۔

۱۷ر جنوری:

صبح حُلیہ بدلتے گذری۔ ہم نے اپنے بال کٹوا دیئے اور لباس بھی کاملاً مقامی زیب تن کر لیا۔ اس کے بعد رانا سیٹھ جھونپڑی میں آیا تو ہم نے اُس سے بیلہ (علاقے کا صدر مقام اور جام کی اقامتگاہ)

چلنے کی درخواست کی جو اُس نے مان لی۔ اُس نے ہمیں بیلہ سے قلات بھیجنے کی بھی پیشکش کی جو پورے بلوچستان کا دارالحکومت تھا۔ وہ خاص طور پر مشفق تھا۔ اُس کے جانے سے پہلے ہم نے اُسے بمبئی سے آوردہ مختلف سوغاتیں دکھائیں اور رلتے پوچھی۔ اُس نے کہا کہ چھینٹیں ہاتھوں ہاتھ لی جائیں گی اور چھری چاقو اور شیشے کے برتن بھی سُندرجی کے مقصد کو پورا کر سکیں گے گو بہتر صنائی ان کو تحائف قبول کرنے والوں کے لئے زیادہ پرکشش بنا دیتی! تھوڑا سا اسکاچستانی چارخانہ بھی ہم نے رکھ لیا تھا لیکن یہ اُس نے اس لئے پسند نہ کیا کہ یہ اُن کی اپنی دیہاتی کملیوں سے ملتا جلتا تھا۔ لیکن بعد کے واقعات نے اُس کے خیال کو غلط ثابت کیا اور ہمارے سارے سامان میں سے سب سے زیادہ تعریف اسی کی ہوئی۔ جب ہم جانے کے لئے اُٹھے تو اُس نے بتایا کہ کل شام اُس نے ایک آدمی جنگل میں بھیجا تھا تاکہ ہمارے اور ہمارے سامان کے لئے اُونٹ لے آئے اور وہ رات کے کسی پہر میں واپس آئے گا لہٰذا ہمیں اگلی صبح بیلہ کو روانہ ہونا ہوگا۔

آج عیدالاضحیٰ کا دن تھا لہٰذا ہم نے اپنے افغان ہمسفروں کی ضیافت کی جو انہوں نے جی بھر کر اُڑائی۔ مجھے مقامی مسلمان باشندوں میں کوئی خوشی یا راگ رنگ نظر نہ آیا جو میرے خیال میں اتنے غریب تھے کہ مقدور نہ رکھتے تھے۔ ایک افغان نے (جس کا نام نیک نام تھا) شام کو ہماری ملازمت اختیار کرنے کی التجا کی جو مفید سمجھ کر قبول کر لی گئی۔ ویسے بھی وہ ایک ذہین اور سمجھدار آدمی تھا اور گھوڑوں کی تجارت کے سلسلہ میں بلوچستان کے طول و عرض میں گھوما ہوا تھا۔

۱۸ ؍ جنوری:

اُونٹ نہ پہنچنے کی وجہ سے ہمیں ۱۸ کو سونمیانی ہی ٹھہرنا پڑا اور ہم ادھر ادھر گشت کرتے رہے۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اتنے حقیر سے گاؤں اور اس کی فرومایہ آبادی کے مقابلہ پر تجارت کا بازار خوب گرم تھا۔

تجارت سراسر ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے اور اُن کی انتھک محنت ہر جگہ اُجاگر ہے۔

جب میں نے ایک ہندو سے چونگی خانہ اور بندر کے آس پاس چہل پہل اور گہما گہمی پر اپنی حیرت کا اظہار کیا تو اُس نے مجھے یقین دلایا کہ ۱۸۰۸ کے اواخر تک تجارت چار گنا زیادہ تھی لیکن اس سال جوازمی عرب ڈاکوؤں نے سونمیانی کو لوٹا اور جلا دیا اور یہ ابھی تک بحال نہیں ہو سکا۔

سونمیانی کا گاؤں دریائے پورالی کے جنوبی کنارے پر آباد و شاد ہے اور اس میں کوئی ڈھائی سو جھونپڑیاں ہیں۔ یہ شہر بے فصیل ہے اور بیلہ کی طرف ریتلی پہاڑیاں سرافراختہ ہیں۔ دہانۂ دریا کے ساحل ریگ پر اُتار کے وقت یہاں صرف بارہ فٹ پانی اونچا ہوتا ہے لیکن چھ سات کشتیاں گاؤں کے پاس ہی پڑی رہتی ہیں۔ لوگ ماہی گیری پر گذارہ کرتے ہیں اور بہ استثنائے ہنود بے حد غریب ہیں۔ وہ تازہ پانی ریت کو ایک دو فٹ گہرا کھود کر حاصل کرتے ہیں اور اسے جمع ہوتے ہی کھینچنا پڑتا ہے ورنہ یہ فوراً کھاری ہو جاتا ہے اور نہ ہی ایک دفعہ کی کھدائی دوسری بار کام دیتی ہے سوائے اس کے کہ اُسے بند کر دیا جائے اور از سرِ نو کھودا جائے۔ سونمیانی کے اچھے مکان چوبی ڈھانچوں اور کچی اینٹوں سے بنتے ہیں لیکن معمولی جھونپڑیاں ترس کی شاخوں سے بنائی جاتی ہیں جنہیں ایک دوسرے سے جوڑ کر مٹی سے لیپ دیا جاتا ہے۔ چھتیں گھاس پھوس کی ہوتی ہیں اور مخروطی شکل کی بنائی جاتی ہیں۔ میں حصہ دوم میں صوبہ لاس کی تجارت، مالیہ اور مصنوعات کا ذکر کروں گا جس کی واحد بندرگاہ سونمیانی ہے لہٰذا میں یہاں ان کی تفصیل میں جانے کی بجائے اپنا بیان جاری رکھتا ہوں۔

۱۹ جنوری:

صبح کو ناشتہ کے بعد افغان ایک قندھاری سوداگر کو لائے جس نے ہمیں بیلہ سے براہ راست قلات جانے کے خطرات پر متنبہ کیا اور دوستانہ مشورہ دیا کہ ہم براستہ سندھ جائیں جہاں سے وہ خود آیا تھا۔ لیکن وہ ہمیں اس پر آمادہ نہ کر سکے گو سوداگر نے دلائل کا طومار باندھ دیا اور اعلان کیا کہ بیلہ سے آگے بڑھنے پر ہمیں بلوچوں کا سب سے پہلے ملنے والا قبیلہ

بزنجوؤں کا تھا جو اس کے مصداق "بادشاہ، خان، خدا یا رسول کو خاطر میں نہیں لاتے بلکہ ہر شخص کو لوٹتے اور قتل کر دیتے ہیں اور جو کچھ ملے اُڑا لیتے ہیں"۔ ہم اپنے مشیر کو ٹکا سا جواب دینے سے گریز کرتے رہے اور وہ اتنا ہی چیم چپڑ ہوتا گیا۔ بالآخر ہمیں اُسے بتانا پڑا کہ یہ ہمارے اختیار سے باہر تھا کیونکہ سندر جی نے ہمیں پہلے بیلہ جانے کا حکم دیا تھا جس پر اُس نے اس جاں جوکھوں کے کام پر ہمیں دُعا دی اور رخصت ہوگیا۔ سامان روز روشن میں ہی یہاں کے دُوسرے قصبہ لیاری کو بھیج دیا گیا تھا اور دو بجے ہم بھی روانہ ہوگئے۔ ساڑھے چار بجے تک ہم ایک نمکین دلدل پر آٹھ میل چلے جس پر تمرس وغیرہ کا جنگل تھا اور کہیں کہیں شور کلر کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ یہاں ہمیں یہ دیکھ کر کوفت ہوئی کہ ہمارا سامان پڑا ہوا تھا اور اُونٹ چرنے گئے ہوئے تھے لہٰذا ہمیں بھی اُترنا اور دوسرے مسافروں میں گھلنا ملنا پڑا جو چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کے سائے میں جمع تھے۔ انہی میں وہ افغان بھی تھے۔

جب ہمارے نوکر روٹی پکا رہے تھے تو افغان پھر اکٹھے ہوکر آئے اور قلات جانے کے لئے سندھ کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرنے لگے۔ لیکن ہم نے انہیں یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ ہمیں بیلہ ضرور جانا تھا خواہ ہمیں وہاں سے ہی لوٹنا پڑے۔ اس پر ہمارے نئے ملازم نیک نام نے کہا کہ چونکہ وہ تو نہی دست تھا اور ہم اپنی بربادی پر تلے ہوئے تھے لہٰذا وہ ہم سے جدا ہوگیا اور لکھ کے راستے یا پہاڑوں کو پار کرکے سندھ جائے گا جو اس کے پڑاؤ کے پاس ہی تھے۔ لیکن اس نے کہا کہ "ہم ان شاء اللہ قلات میں ملیں گے بشرطیکہ آپ لوگ ان بزنجو قزاقوں سے بچ گئے اور اب میں بشرط قبولیت اپنے ایک دو ساتھی آپ کے پاس چھوڑ دوں گا جو قابل اعتبار ہیں اور آپ کی خدمت کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دیں گے"۔ ہم نے بدقسمتی سے (جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا) یہ تجویز منظور کرلی اور اُن میں سے دو رضاکار ہمارے ساتھ ہو لئے۔ ہم نے انہیں الوداع کہا اور سات آٹھ میل دُور شیخ کا راج گاؤں میں چلے گئے۔ یہاں ہمیں ایک خالی اصطبل نظر آیا جس پر ہم نے بے تکلفانہ قبضہ جما لیا۔ لوگ سب سوئے پڑے تھے۔

سونمیانی کے بعد ہمیں یہاں پہلی دفعہ آبادی کے آثار دکھائی دیئے۔ سارا درمیانی علاقہ کلر کی ایک دلدل تھا۔ آج ہمارے راستے کی سمت شمالی تھی اور میرے اندازے کے مطابق ہم نے ساڑھے پندرہ میل فاصلہ طے کیا۔

۲۰ر جنوری :

آج صبح ایک ہندو بنیا بیلہ سے سونمیانی واپس آتے ہوئے تعظیم کے لئے حاضر ہوا اور اُس سے ہمیں یہ خوشخبری ملی کہ بیلہ اور قلات کی سڑک قابل گذر تھی۔ گو افغان اصرار در اصرار کر رہے تھے کہ زنجو بلوچوں کی وجہ سے یہ دشوار تھی اور ہم بھی شک میں پڑے ہوئے تھے۔ ہم کوئی ایک بجے اپنے اُونٹوں پر سوار ہوئے اور پانچ بجے ایک صاف ستھرے، خوش ساختہ گاؤں اُوتل پہنچ گئے جو چار سو مکانات پر مشتمل ہے۔ سڑک زیادہ تر قابل برداشت تھی، علاقہ غیر مزروعہ اور مکمل طور پر مسطح تھا اور کہیں کہیں دشوار گذار جنگل تھے جن میں غیر معمولی جسامت کے ببول کے درخت تھے۔ ہم دو نالوں یعنی وُلٹہ اور سنگنی سے گذرے۔ وُلٹہ پرالی کا ہی ایک معاون ہے جو ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر اس میں گرتا ہے۔ سنگنی ہمارے مقام عبور پر تقریباً خشک تھا اور اس کا پاٹ از یں سُو تا آں سُو تقریباً بارہ گز چوڑا تھا۔ سڑک کا رُخ شمال کو تھا اور فاصلہ نو میل تھا۔ اوتھل میں پانی بہت گہرے کنوؤں سے نکالا جاتا ہے اور مفرح ہوتا ہے۔ گاؤں کے لوگ ہشاش بشاش معلوم ہوتے تھے۔ وہ کالے مویشیوں اور اونٹوں کے گلّوں کے علاوہ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ بھی پالتے ہیں۔

ہمارے اُترنے سے پہلے گاؤں کا جمعدار یعنی معتبر ایک بکری کا تحفہ لیکر حاضر ہوا لیکن ہم نے اُس کے مساوی تحفہ دینے پر اصرار کرکے انکار کر دیا۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ ایک شخص نے مجھے اور کیپٹن کرسٹی کو پہچان لیا تھا کیونکہ وہ پچھلے سال سندھ کے مشن (جس سے ہم دونو منسلک رہے تھے) کا بہشتی رہا تھا اور اسی لئے جمعدار حاضر خدمت ہوا تھا۔ اُس نے یہ بات اِدھر اُدھر مشہور کر دی لیکن ہم نے ممکنہ ناخوشگوار اثرات سے بچنے کے لئے فوراً ہی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا

اور بزور کہہ دیا کہ ہم نے اسوقت سے سندرجی کی ملازمت کر لی تھی جسے لوگوں نے بلا تامل تسلیم کر لیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

۲۱ جنوری :

ہم دوپہر کے قریب اُتھل سے چلے اور چھ بجے کے فوراً بعد شام کو ایک دریا نامی پنڈورے میں پہنچے جس میں مشکل ایک درجن گھر تھے۔ گھر کیا بس چھپر تھے۔ ہم نے ایک رنگریز کے چھپر میں رات بسر کی۔ فاصلہ اٹھارہ میل تھا اور سمت شمال کے مشرق کی طرف تھی۔ علاقہ ویران مسطح اور ریتلا تھا۔ ہم نے دو کنوئیں دیکھے جن کا پانی چکھا تو کھارا اور بہت قلیل المقدار نکلا۔

۲۲ جنوری :

آج چار بجے ہم بیلہ پہنچے جو ہمارے سابقہ پڑاؤ سے ساڑھے دس میل دور تھا۔ علاقہ مختلف النوع تھا۔ کہیں گھنا جنگل، کہیں عریاں اور بنجر اور تین چار نظر میں آنیوالے دیہات کے پاس خوب سر سبز اور زیرِ کاشت۔ قریباً وسط میں ہم قبرستان سے گذرے جہاں جام کے اعزہ مدفون ہیں۔ دو قبہ دار مقابر قریبی پہاڑوں کے صاف پتھر سے بنے ہوئے ہیں اور وہ بھی دیگر بہت سی قبروں کی طرح سیاہ و سفید خزفریزوں سے آراستہ ہیں جو مختلف چھوٹی چھوٹی آیاتِ قرآنی کی صورت میں ترتیب دیئے گئے ہیں جن کے اردگرد انہی کے ہار بنے ہوئے ہیں اور جو اپنی سادگی کے باوجود ایک خوشگوار اور اچھوتا تاثر دیتے ہیں۔

جب ہم بیلہ پہنچے تو چھٹی کا دن تھا اور جام گھوڑ دوڑ پر گیا ہوا تھا جو یہاں کی پسندیدہ تفریح ہے۔ ایسے مواقع پر جو لوگ بھی اُونٹ یا گھوڑا رکھتے ہیں یا حاصل کر سکتے ہیں علاقے میں دندناتے پھرتے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ اُونٹ مہار میں رہ کر اتنا سرپٹ دوڑ سکتا ہے اور میں اسے پہلی مرتبہ دیکھ کر ششدر رہ گیا گو میں نے اُونٹ دوڑ کی بہت سی حیرت انگیز کہانیاں سُن رکھی تھیں اور انہیں مذاق ہی سمجھتا رہا تھا۔

جام شام کو واپس آیا اور ہم نے تُلسیہ (سُندرجی کا گماشتہ جو سونمیانی میں ملا تھا)

سے کہا کہ وہ اُسے ہماری آمد سے مطلع کرکے چند روزہ توقف کی اجازت لے۔ جام نے ہمارے ایلچی کا سواگت کیا اور نہ صرف بیلہ میں ٹھہرنے کی اجازت دی بلکہ مزید اندرونِ ملک جانے میں بھی ہر مدد کا وعدہ فرمایا۔ یہ بہت اہم مقصد تھا جو ہمیں آن کی آن میں حاصل ہو گیا اور ہم بے حد محظوظ ہوئے کیونکہ ہمیں خدشہ تھا کہ وہ کہیں آگے جانے کی ممانعت نہ کر دے۔

ہمارا دوست سونمیانی کا اجارہ دار ایک دوسرے راستے سے ہم سے بھی پہلے بیلہ پہنچ گیا تھا اور ہمارے استقبال کے لیے اپنا ہی ایک گھر بنا چکا تھا جہاں خلوت اور آرام میسر تھے۔ اس کے اردگرد ایک دیوار اور سامنے ایک دروازہ تھا۔ اگرچہ یہ ایک بڑے کمرے، ایک برآمدہ اور دو بغلی کوٹھڑیوں پر ہی مشتمل تھا تاہم سُندرجی کے عام ملازمین کی حیثیت سے یہ ہماری توقعات سے بہت زیادہ تھا۔

۲۳، جنوری:

آج شام تُلسیہ نے ہمیں بتایا کہ راناسیٹھ نے اُسے کراچی (سندھ) سے موصولہ ایک طویل خط سُنایا تھا جس میں اسے تنبیہہ کی گئی تھی کہ اُس نے اپنے آقا' جام کے علاقے میں برطانوی حکومت کے کارندوں کو کیوں گھسنے میں مدد دی اور اُسے حکم دیا گیا تھا کہ وہ بزورِ قوت ہمیں اور ہمارے لواحقین کو' خواہ وہ کسی ذات کے ہوں، کشتی میں بٹھا کر واپس بمبئی بھیج دے۔ مکتوب نگار[1] نے مزید لکھا تھا کہ ہمارے مشہور کردہ تجارتی عزائم کے باوجود ہمارا مقصد اصلی علاقے کی چھان بین کرنا تھا حالانکہ آنریبل کمپنی اس کے خلاف تھی کیونکہ پچھلے سال ایک ایسا ہی سفیر کثیر اخراجات کے بعد سندھ بھیجا گیا تھا جس پر امیرانِ سندھ نے انگریزوں کی ہر ایسی کوشش کو ناکام بنانے کے لیے اقدامات کیے تھے۔ اس پر تُلسیہ نے راناسیٹھ کو وہ خطوطِ تعارف اور ہنڈیاں دکھائیں

---

[1] دریا دھن سیٹھ، ایک ہندو سوداگر جس نے اپنے اثر و رسوخ کی بدولت آنریبل کمپنی کی حکومتوں اور ان کے گماشتوں سے خوب فائدے اٹھائے تھے۔

جو ہمیں سُندرجی کے گماشتوں کی حیثیت سے مہیا کیے گئے تھے جس سے وہ بالکل مطمئن ہو گیا لیکن ہم نے مزید احتیاط اور حفظ ما تقدم کے طور پر تاپیہ کو ہدایت کی کہ وہ مناسب موقع پر اجارہ دار کو سمجھا دے کہ مذکورہ خط اس خوف کی بنا پر لکھا گیا کہ کہیں برطانوی حکومت کی زیر سرپرستی (جس کا ملازم ہمارا آقا سُندرجی بھی تھا) بندر سونمیانی سندھ کی بندرگاہ کراچی سے ہونیوالی ساری یا معتد بہ تجارت غصب نہ کر لے۔

کوئی ڈیڑھ بجے ہمیں جام صاحب کی تسلیمات بجا لانے کے لیے بُلایا گیا۔ وہ اُس وقت دربار میں نشستہ تھا اور اُس کے گرد کوئی ڈیڑھ سو اشخاص کا حلقہ بندھا ہوا تھا جن میں سے اکثر از راہِ تجسس آئے تھے اور اُس کے اپنے خدمت گار بہت کم تھے۔ اُس نے گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں خوش آمدید اور الوداع کہتے ہوئے دونو مواقع پر کھڑا ہوا۔ گفتگو کے دوران اُس نے ہم سے کئی انوکھے اور چبھتے ہوئے سوال پوچھے جو انگریزوں کے مذہب، رسم و رواج اور ذات پات سے متعلق تھے۔ اُس نے یہ بھی استفسار کیا کہ آیا فرانسیسی عادات و اطوار میں ہمی جیسے تھے کیونکہ اُس نے اپنے ہندوستان جانیوالے باشندوں سے اکثر سُنا تھا کہ ہماری اُس قوم سے غیر مختتم جنگ بھی اور یہ کہ ہمیں سمندر کی سیادت حاصل تھی اور آیا وہ اب بھی قائم تھی؟ اُس نے شاہِ انگلستان کا نام بھی پوچھا اور اُس کی فوج اور بحریہ کی وسعت اور طرزِ تنظیم بھی، اُس کا دارالحکومت قسطنطنیہ سے کتنا دُور تھا؟ حکومت کی ہیئت کیا تھی؟ وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے حتی المقدور سوالوں کے مفصل جواب دیئے لیکن سوال جتنے سادہ تھے ہمارے جواب اور ان کے مختلف نکات اس کے لیے اتنے ہی مشکل تھے اور بعض پر تو وہ بالکل سراسیمہ رہ گیا اور دو ہندوؤں سے ان کی تصدیق چاہی جو ہمارے ساتھ دربار میں آئے تھے۔ اُنہوں نے اُسے یقین دلایا کہ ہم نے شمہ بھر مبالغہ نہ کیا تھا اور جو کچھ بتایا تھا اُنہوں نے من و عن وہی دیکھا تھا لیکن اُس نے بے یقینی سے سر ہلایا اور کہا "تم مجھے بتا رہے ہو کہ ایک جہاز ایک سو نبا دیق اور ایک ہزار آدمی لے جا سکتا ہے۔ یہ اخلاقی لحاظ سے ناممکن ہے! مؤخر الذکر کے خورد و نوش کا کیا بنے گا؟

بادشاہ کے پاس اس کے توپخانہ میں مشکل اتنی بنادیتی ہوں گی اور ایسے دو جہازوں سے تو وہ میرا پورا ملک فتح کرے گا۔" ہم نے اسے یقین دلایا کہ بحریۂ انگلستان کے متعلق جو کچھ اُسے بتایا گیا وہ سو فیصدی درست تھا اور جنگ ٹرافالگر میں اس کے فیصلہ کن کردار کا مختصر ذکر کیا۔ اس پر اُس نے کہا۔ "چونکہ تم کہتے ہو اس لئے میں اسے مان لیتا ہوں لیکن اگر پیغمبر پاک نے بھی اس کی پیشنگوئی کی ہوتی تو مَیں (اس کے لوگ) اُن سے بھی ثبوت مانگتے۔"

بالآخر اُس نے ہمارے نظریات و عزائم پر استفسار کیا اور ہم نے اُسے ذرا تفصیل سے بتایا کہ ہم بمبئی کے ایک ہندو سوداگر سُندرجی کے ملازم تھے جس نے ہمیں ہندوستانی منڈی کے لئے گھوڑے خریدنے کے لئے بھیجا تھا۔ آخر میں ہم نے استدعا کی کہ وہ ہمیں قلات بھیجنے کے انتظامات فرمادے۔ چنانچہ اُس نے اُسی وقت اپنے دیوان کو حکم دیا کہ وہ ہمارے لئے مطلوبہ رہنماؤں اور نوکروں کا بندوبست کرکے ہماری روانگی کا جلد از جلد انتظام کرے۔ پھر اُس نے ہماری طرف رجوع ہو کر کہا۔ "بہتر ہوتا اگر تم لوگ میرے پاس چار چھ ہفتے ٹھہر جاتے تاکہ قلات کی شدید سردی سے بچ جاتے جو ممکن ہے تمہارے لئے جان لیوا ثابت ہو۔" ہم نے جواباً عرض کیا کہ ہمارا وطن شدید سرد تھا اس لئے ہم سردی کے عادی تھے اور بلندی کے سفر کی صعوبتوں کے لئے تیار تھے۔ اُس نے کہا۔ "بجا لیکن تمہیں اپنے رفیقانِ سفر کا تو کچھ خیال کرنا چاہیے لیکن چونکہ تمہارا کاروبار تاخیر کا متحمل نہیں لہٰذا تم تیاری کرو اور میں تمہیں اُن سرداروں کے نام خطوط بھی دے دوں گا جن کے علاقوں سے تم گزرو گے۔ آج ہی ایک ایلچی بھی روانہ ہو جائے گا جو نوبجہ بلوچ سردار رحمت خان کو لے آئیگا تاکہ وہ خود تمہیں اپنے علاقے سے گذار دے جہاں ڈاکوؤں کا بہت خطرہ ہے۔" پھر ہم نے اپنے اس دوستانہ اور کارآمد استقبال پر خوش ہو کر اُس سے اجازتِ رخصت طلب کی۔

اس ملاقات میں جام نے اپنے آپ کو بہت زیرک ثابت کیا جو معلومات حاصل کرنے کا شائق تھا۔ اُس کا چہرہ بُشرا بہت عمدہ تھا اور وہ فارسی میں خوب روانی سے گفتگو کر سکتا تھا۔

جب وہ ہماری بات کو پوری طرح نہ سمجھتا تھا تو ہمارے ساتھی کسی ہندو سے سندھی زبان میں اُس کا معنی پوچھتا تھا۔ وہ ایک سفید کپڑے کی گدی پر بیٹھا ہوا تھا جس پر کوئی آرائش یا ہیرے جواہرات نہ لگے تھے۔ وہ سرخ کمخواب کی اُلخلق[1] میں ملبوس تھا اور کافی بڑی پگڑی پہنے ہوئے تھا گو وہ محیط میں اتنی بڑی نہ تھی۔ اُس کا بیٹا اور دو بھائی اُس کے پاس بیٹھے تھے اور پورا مجمع تنگ دستی کا تاثر پیش کر رہا تھا جس پر وہ کوئی خفت محسوس نہ کرتے تھے یا اسے چھپانے کے لئے کوشاں نہ تھے۔ دربار ایک بڑا کھلا کمرہ تھا جو زمین سے چند فٹ بلند تھا۔ اس کی مسطح خاکی چھت کو چند عام ٹیڑھے میڑھے بانس سہارا دے رہے تھے جو جیسے جنگل سے آئے تھے ویسے ہی کھردرے اور بے روغن لگا دیئے گئے تھے۔ کسی چیز سے معمولی سی شوکت یا ترتیب بھی نہ ٹپکتی تھی۔ نہ چوبدار تھے نہ سپاہی جو جام کے گرد جمع تھے وہ بلا پس وپیش اپنی رائے دیتے یا جملے کستے تھے گو اُن میں سے ہر ایک خود سردار کی اتنی عزت و تکریم کرتا تھا جو اسکی مقبولیت کا ثبوت تھا۔

ابھی ہم دربار میں ہی تھے کہ ایک عرب نے ایک خط دیا جو ان ممالک کے رواج کیمطابق پڑھ کر سنایا گیا۔ یہ امام مسقط کے ایک جہاز سے متعلق تھا جو کچھ عرصہ پہلے سونمیانی کے قریب ساحل پر تباہ ہو گیا تھا اور اُس سے کچھ چیزیں برآمد ہوئی تھیں۔ امام نے درخواست کی تھی کہ وہ اسکے لوگوں کو واپس کر دی جائیں چنانچہ بھرے دربار میں ہی دیوان نے احکامات بلند آواز میں جاری کر دیئے۔ میں نے دیکھا کہ خط فارسی میں نہایت خوبصورت انداز میں لکھا ہوا تھا اور اُس میں امام کی طرف سے تحکم کا شائبہ تک نہ تھا جس کے بارے میں جام بہت حساس تھا اور اسی لئے اُس نے اُسے نہایت احتیاط سے اپنے منشی سے جدگالی میں منتقل کروایا تھا جو یہاں بول چال کی زبان ہے۔

---

[1] اُلخلق ایک دوھرے پیشں کا لباس ہے جس کی آستینیں کہنیوں تک لمبی ہوتی ہیں اور کنارے پنڈلیوں تک آتے ہیں۔ یہ کمر کے گرد بائیں طرف باندھ دیا جاتا ہے۔ کمخواب ریشم کی ایک قسم ہے جس پر سونے یا چاندی کے بیل بوٹے ہوتے ہیں یا پھول کاڑھے جاتے ہیں۔

دربار سے واپسی پر ہم بازار سے گذرے جو بہت صاف ستھرا تھا۔ گلیاں تنگ ہیں لیکن قصبے کی بلندی اور اس کے چٹانی محل وقوع کی وجہ سے یہ انتہائی برسات میں بھی خشک رہتی ہوں گی کیونکہ بارش کا پانی یہاں ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ بیلہ پورالی کے شمالی کنارے پر بنا ہوا ہے۔ اس کا ایک تہائی جنوب مغربی حصہ میں ہے اور اس کے گرد درمیانے درجہ کی اچھی گارے کی دیوار ہے۔ باقی رسالہ یا پیادہ کے حملے کے سامنے بالکل غیر محفوظ ہے۔ اس میں دو ہزار سے زیادہ مکانات ہیں جن میں سے ڈھائی تین سو ہندوؤں کے ہیں جو جام کی نرم اور منصفانہ حکومت کے تحت اپنے کاروبار میں بالکل مامون و مصئون ہیں۔

جب ہم اپنی اقامت گاہ میں واپس آئے تو ملتان اور شکارپور[1] کے بہت سے سوداگر ملنے کے لیے آ گئے۔ ان سے تجارتی امور پر خوب گپ شپ رہی اور ہم نے ان کی پان اور لونگ سے تواضع کی جو یہاں کا رواج ہے اور وہ ہماری تجارتی مہارت و قابلیت سے متاثر ہو گئے۔ میں بمشکل اپنی ہنسی ضبط کر سکا جب کیپٹن کرسٹی (میرے ہمسفر) نے مبئی یا ہندوستانی منڈی کے لیے موزوں ترین اشیاء پر ایک خاص اور طویل لیکچر دیا اور جسے ہمارے ملاقاتی نہایت غور اور یقین سے سنتے رہے۔ ہمارے اپنے ہندو ساتھیوں نے بھی ان کے ہوش و حواس پر شک کیا اور ان کے چلے جانے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ کیپٹن کرسٹی ایک ایسے موضوع پر بولتے رہے تھے جس سے وہ قطعاً نابلد تھے۔ یہ معمولی سا داؤں ہمارے لیے بعد میں بہت مفید ثابت ہوا اور کام کر گیا جس کے بعد بیلہ کے سوداگر یہ ہرگز نہ مانتے کہ ہم نے اپنے اصل رُوپ کو بہروپ میں بدلا ہوا تھا۔

---

[1] ملتان ایک بڑا تجارتی شہر ہے جو پنجاب میں اپنے ہمنام صوبہ کا صدر مقام ہے۔
شکارپور قلات کے مشرق میں ہے۔ دریائے سندھ کے مغرب کی طرف اور یکساں طور پر تجارت کے لیے مشہور ہے۔

۲۴ / جنوری :

صبح صبح جام کا دیوان اپنے آقا کا سلام لیکر آیا اور خیریت پوچھتا رہا ۔ ہمیں اس قسم کی تعظیم پر کچھ کوفت ہوئی کیونکہ یہ اس بات کی غماز تھی کہ انہوں نے ہماری کل کی باتوں اور منندرجی کے ملازم ہونے کو مشکوک سمجھا تھا لہٰذا ان خیالات کو زائل کرنے کے لئے ہم مؤدبانہ جواب ہی دیتے رہے ۔ دیوان کے جانے کے کوئی دو گھنٹہ بعد ہم نے جام کو ایک تحفہ[1] بھیجا جس پر وہ بے حد مسرور ہوا ۔

شام کو جام دریا خاں کی آمد سے ہماری پہچان کے خطرے کی تصدیق مزید ہوگئی ۔ وہ جام کے دونو بھائیوں میں بڑا ہے ۔ اُس نے گپ شپ کے لئے ہمیں دو گھنٹے بٹھائے رکھا ۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا خوش وضع آدمی ہے ۔ اپنے اہل ملک کے مقابلہ پر نرم اور شائستہ اطوار ہے لیکن بدلباس ہے کیونکہ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ اس کو صرف پندرہ سو روپے سالانہ کا حقیر وظیفہ ملتا ہے اور اسی لئے یہ لوگ اتنی سادگی اور کفایت شعاری سے رہتے ہیں ۔ یہ سردار اپنے ملک میں مرتبہ کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر آتا ہے اور فوج کے اجتماع پر یہی سالار بھی ہوتا ہے ۔ اس حیثیت میں اسے مزید الاؤنس بھی ملتا ہے اور جام کے اپنے اصطبل سے دو گھوڑے بھی دیئے جاتے ہیں ۔ اُس نے بلا استفسار ہمیں اپنے بھائی کی طرز حکومت اور ذرائع آمدنی کی تفصیل بتائی اور پھر ہماری قومی طرز حکومت وغیرہ سے اس کا موازنہ کرتا رہا جو اُس نے کل دربار میں ہماری گفتگو سے سمجھی تھی ۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ وہ صاحب فہم و

---

[1] تحفہ مندرجہ ذیل اشیا پر مشتمل تھا ۔ چینی سلک کا ایک تھان، یوروپی چھینٹ کا ایک تھان، کافی کی آٹھ پرچ پیالیاں، آٹھ چینی پیالے، آٹھ تراشیدہ شیشے کے گلاس، ہندوستانی سلک کا ایک تھان، چھ عام چاقو ۔ دو عام قینچیاں ۔ آدھ سیر بارود، ایک چھوٹی سی دوربین اور بڑے پستولوں کا ایک جوڑا ۔

امتیاز تھا۔ اُس کی گفتگو سے ہمیں معلوم ہوا کہ وہ ایک پُرجوش کھلاڑی تھا اور اپنے زیادہ تر اوقات فرصت بیرونی مشاغل میں گذارتا تھا۔ وہ ہر ماہ کئی بار سخت جاڑے میں بھی پہاڑوں کے چکر لگاتا تھا اور کئی دفعہ اُس نے دو روزہ چکر میں خود اپنی بندوق سے بیس یا تیس پہاڑی بکریاں (بُز کوہی) شکار کی تھیں۔ ان جانوروں تک پہنچنا مشکل ہے کیونکہ یہ خطرناک ترین اور ناقابلِ رسائی ڈھلانوں پر رہتے ہیں۔ ان کا گوشت بیحد لذیذ اور نفیس ہوتا ہے اور جو محنت ان کو قابو کرنے میں لگتی ہے اس کے پیش نظر اس نے ہمیں تعداد بتائی تاکہ مشاقی و مہارت کا اندازہ ہو سکے۔ جام اور اُس کا خاندان ایک ہی قسم کی تفریح کے رسیا اور دلدادہ ہیں اور سرداروں کے استعمال کے لئے ہر قسم کے شکار کے قواعد وضوابط اتنے سخت ہیں کہ بعض پہاڑی اضلاع انہی کے لئے مخصوص ہیں اور اگر کوئی شیر یا کوئی بڑا جانور کہیں بھی ملک میں ان کے لائق شکار ہو تو فوراً اس کی اطلاع دی جاتی ہے اور جام بیلہ سے اسے تباہ کرنے کے لئے روانہ ہو جاتا ہے۔ رخصت ہوتے وقت اُس نے کہا کہ خدا کرے ہمارے دوران قیام ایسا واقعہ ہو تو وہ ہمیں اپنی سواری کے دو اُونٹوں پر بٹھائیگا اور شکار دیکھنے کے لئے لے چلے گا۔ ہم اس کی ملاقات سے بہت محظوظ ہوئے کیونکہ اس سے اہل لس کے عادات و اطوار کا ہمیں ایسا گہرا علم حاصل ہوا جو کسی دُوسرے ذریعہ سے محال ہوتا۔

براہوئیوں یا پہاڑی بلوچوں کا ایک گروہ آج شام بُن کر سے آیا جو قلات کی سڑک پر چھ سات میل کے فاصلہ پر ایک پنڈور ہے۔ اُن کے پاس ساٹھ ستر اونٹوں کی ایک قطار تھی۔ ہم نے ان میں سے ایک دو کو سرائے سے بلایا اور پوچھ گچھ کی تو انہوں نے بتایا کہ ایک امیرانہ قافلہ کے سوا بزنجوؤں سے کسی کو ڈرنے کی ضرورت نہ تھی گو وہ علاقے بھر کا ہوا تھے تاہم وہ ایک تھوڑا سا محصول لیکر ہمیں بلا ضرر گذرنے دیں گے لیکن اگر ہمارے پاس مال اسباب تھا تو انہوں نے ہمیں براستہ سندھ جانے کا مشورہ دیا لیکن چونکہ ایسی بات نہیں تھی لہٰذا ہمارا براہِ راست جانے کا عزم اور بھی مصمم ہو گیا۔

۲۵ ، جنوری :

آج ہم نے مناسب قیمت پر تین چار اُونٹ خریدے اور تیاریاں کرتے رہے کیونکہ ہمیں دیوان کا پیغام ملا تھا کہ بزنجو سردار کسی لمحہ بھی آسکتا تھا جس کے فوراً بعد ہمیں روانہ ہونا ہوگا۔ ہم اس پر بہت خوش تھے اور اسی لئے رختِ سفر باندھ رہے تھے۔ چار بجے کے قریب جام ہماری رہائش گاہ کے پاس سے گذرا تو باہر بلا کر خیریت دریافت کی۔ وہ ایک خوبصورت شمالی گھوڑے پر سوار تھا جس کا ساز رنگین سلک سے آراستہ تھا۔ اُس کے ساتھ بیس تیس مسلح آدمی تھے جن میں سے کچھ گھوڑ سوار اور کچھ شتر سوار تھے۔ اُس کا بیٹا ایک اُونٹ پر سوار تھا جو بہت عمدہ تھا اور وہ نہایت اطمینان اور ہوشیاری سے اسے ریشمی نکیل سے قابو کر رہا تھا۔ شتر سوار دو دو کی قطاروں میں تھے اور گھوڑ سوار بازدوں پر تھے۔ اُن کا اسلحہ تلوار، ڈھال اور تفنگ پر مشتمل تھا۔

۲۶ ، جنوری :

آج قبل از دوپہر جام نے ہمارے تلمیہ کو بلایا اور کچھ بے ربط گفتگو کے بعد اُس سے کہا "اب میں تم سے ایسے موضوع پر گفتگو کروں گا جس کی طرف میں نے ابھی تک کوئی اشارہ نہیں کیا اور نہ ہی میں آئندہ کسی سے اس کا ذکر کروں گا خواہ وہ میرا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ دونوں انگریز سوداگر ہیں میری خواہش و کوشش ان کے منصوبوں کا پتہ لگانے کی نہیں لیکن اگر وہ افسر ہیں تو مجھے ملاقات پر اُن سے برابری کا سلوک کرنا چاہیئے تھا۔ لہٰذا اب میری التجا ہے کہ مجھے بتادو کہ وہ کون ہیں۔ یہ بات سخت پردۂ اخفا میں رکھی جائے گی۔ اور اگر وہ حکومت برطانیہ سے منسلک ہیں تو مجھے اُن کی خدمت کرکے مزید مسرت ہوگی"۔ بنیہ جام کے ذہن کو تاڑ گیا لیکن وہ پکارا رہا اور ہمیں سُندرجی کے ملازم ہی بتاتا رہا۔ پھر جام نے ہماری اُجرت کا پوچھا اور یہ بھی کہ آیا ہمارے توسط سے وہ بمبئی سے دو چھوٹی بندوقیں حاصل کر سکتا تھا؟ تلمیہ نے جواب دیا کہ وہ اُس کی اس خواہش کا اظہار ہم سے کردے گا اور پھر چلا آیا۔

ہم نے اس سے کہلوا دیا کہ ہم وعدہ تو نہ کر سکتے تھے لیکن ہندوستان واپسی پر بھجوانے کی کوشش ضرور کریں گے۔

شام کے وقت دیوان مختلف سرداروں کے نام چار پانچ تعارفی خطوط لے آیا جو قلات کے جنوبی سرداروں کے نام تھے۔ جام کے حکم پر لکھے گئے تھے اور ہمیں پڑھ کر سنائے گئے۔

آج رات رانا سیٹھ سومنیانی واپس گیا تو رخصت ہونے پر ہم نے اُسے ایک تھان چھینٹ کا ایک چھوٹی دُوربین اور کچھ چھوٹی موٹی چیزیں دیں۔ یہ شخص بہت مہربان رہا تھا اور اگر حالات اجازت دیتے تو ہم اُس کی خدمات کا بہتر صلہ دیکر خوش ہوتے۔ اُس کے جانے سے پہلے ہمیں معلوم ہوا کہ اُسے ہمارے اعلانیہ عزائم پر مکمل یقین تھا۔ جب تلبیہ نے دیدہ و دانستہ اُس پر الزام لگایا کہ اُس نے اپنا ایک گماشتہ بنکر گاؤں میں گھوڑوں کی خرید کے لئے بھیجا تھا تو اُس نے اعتراف کر لیا اور ہماری خفگی سے بچنے کے لئے کہا کہ وہ صرف گھٹیا گھوڑوں کا خریدار تھا اور پھر اُس نے اپنے گماشتہ کو بنکر سے آگے شمال کی طرف جانے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ بعد میں ہمیں یہ جان کر کوفت ہوئی کہ اُس نے ہمارے کام میں مداخلت سے اجتناب کی خاطر اپنے گماشتہ کو واپس بلا لیا تھا۔

باب دوم

بیلہ سے روانگی ـــ علاقہ ـــ گڑ یا خام چینی ـــ کارخانے ـــ بزنجو ـــ بیلہ کو واپسی ـــ جام سے ملاقات ـــ اس کے مہمان ـــ آگے کا سفر ـــ منظرِ شب ـــ عزروفکر ـــ تفریحات ـــ لوٹ مار کا طریقہ ـــ بلوچوں اور ان کے ہمسایوں کا مقابلہ ـــ صوبہ لس ـــ آبادی ـــ رسم و رواج ـــ نام ـــ خصائص ـــ قد و قامت ـــ شکل و صورت ـــ مردانہ و زنانہ لباس ـــ خوراک ـــ حیوانات ـــ زبان ـــ ہنود سے مشابہت ـــ آدم بو بسر مطلب ـــ مطالبہ اور تکرار ـــ راستہ ـــ بزنجوؤں سے علیحدہ ـــ قیام ـــ شتربان کا دھوکہ ـــ قلات کو فوری کوچ کا تہیہ ـــ مقصد ـــ مایوس کن بزنجو ـــ ان کے بغیر کوچ ـــ ہدایات ـــ دریائے پورالی ـــ اس کی گذرگاہ ـــ پہاڑی سڑک ـــ صوبہ جھلاوان ـــ تنگ گھاٹی ـــ قیام ـــ سخت سردی ـــ باران لک ـــ اس کا خاکہ ـــ تصویر خیز علاقہ ـــ افکار و خیالات ـــ دریائے اورناچ ـــ ریوڑ ـــ ایک بھیڑ کی خرید ـــ ٹُکوبُر ـــ شام کا کھانا ـــ جگہ کا نام ـــ پھر دہی راستہ ـــ میدان ـــ قصبہ وڈھ ـــ نظر انداز کیا ـــ کیوں ـــ عام عقیدہ ـــ ایک براہوئی خیل یا معاشرہ ـــ ان کے اطوار و مشاغل ـــ مستورات بے پردہ ـــ متعادن مزاج ـــ غدان یا خیمے ـــ تشکیل ـــ آرام ـــ تمباکو نوشی ـــ سردی کے فوائد ـــ براہوئیوں سے رخصت ـــ تحائف ـــ راستہ ـــ علاقہ ـــ خراب سڑک ـــ قصبہ خضدار ـــ باشندوں کی حیرانی ـــ

یک روزہ قیام — وجہ — ملاقاتی — قندھاری سوداگر — گھوڑے کے بیوپاری — ملمان — فقیر — حفاظتی اقدامات اور ان کے نتائج — قصبہ کا بیان — وادی — باغات — اثمار — سردار کا نام اور قبیلہ — اس کا نائب — اس کا پیغام — جواب — باشندے — ہندو — برہمن — بگوڑا — عادات بد — نتائج — بازار — کارخانے — ٹنکر گاؤں — راستہ — سردار — طول و عرض — برف — تکلیف دہ سفر — علاقہ ویران — سڑک خراب — گاؤں سوہراب — سخت سردی — ایک براہوئی کی مہمان نوازی — وادی برنت — اونچی چوٹی — رودبنجو کا راستہ — سرائے — شرمہ — گاؤں رودبنجو — ویران علاقہ — افکار و خیالات — اس کے نام کی عجیب و غریب روایت۔

۲۰ جنوری :

ہم نے تین بجے شام تک انتظار کیا لیکن بزنجو سردار رحمت خان کی آمد کے کوئی آثار نہ تھے لہٰذا ہم بیلہ سے روانہ ہوئے اور ساڑھے چار میل دُور جام کے ایک باغ میں چلے گئے جہاں ہم نے رات کے لئے تمرہندی (املی) کے ایک شجر کے تحت توقف کیا۔ ہم اور ہمارے چھ شتر سوار تھے لیکن مبتدی ہونے کی وجہ سے کیپٹن کرسٹی اور میں نے ایک ایک آدمی اپنے آگے بٹھا لیا تھا۔ یہ علاقہ زیر کاشت ہے جس میں کئی ندیاں رواں دواں ہیں۔ بیلہ اور باغ کے وسط میں گڑ کا ایک کارخانہ ہے۔ گنوں سے رس نکالنے کا بیلنہ قریبی پہاڑوں کی ایک ندی سے چلتا ہے اور کسی حد تک اس کی تعمیر و ترکیب سادہ ہے۔ پن پہیہ دو اُفقی دندانے دار بیلنوں کو حرکت میں لاتا ہے اور چھیلے ہوئے گنوں کے سرے ان کے بیچ میں دے دیئے جاتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ گنوں کا رس نکالتے ہوئے انہیں اندر کھینچتے جاتے ہیں اور بے رس ڈنٹھل دُوسری طرف نکلتے جاتے ہیں۔ رس نیچے آبریز میں گرتا ہے اور حوض میں جمع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ تانبے کے برتنوں میں اُبالا جاتا ہے اور پھر گڑ تھیلوں میں بھر دیا جاتا ہے جو پنکھیا

کھجور کے پتوں سے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ بورے برآمد کے لئے ساحل سمندر پر
بھیج دیئے جاتے ہیں۔ یہ اونٹوں کو بھی دیا جاتا ہے اور مقامی لوگ اسے کھانے پکانے
میں بھی بہت استعمال کرتے ہیں۔ اس عمل کے لئے دو آدمی اور ایک لڑکا کافی ہوتے
ہیں اور اُبال کے برتنوں کی گاد بہترین اور قوی ترین کھاد بنتی ہے۔

۲۹ ، جنوری :

آج صبح جب ہم اپنے اونٹوں پر سامان لاد رہے تھے تو رحمت خان بعد از انتظار
بسیار پندرہ بیس رفقا کے ساتھ باغ میں آ پہنچا اور آتے ہی کہنے لگا کہ وہ ہمیں اپنے
علاقے سے صرف اپنی ہی حفاظت میں گذرنے دے گا کیونکہ ہماری حفاظت اُس کی نیک
نامی سے تعلق رکھتی تھی) اور مزید یہ کہ وہ ہمارے ساتھ اُسی وقت جائے گا جب وہ جام
سے گفت گو کرے گا۔ لہٰذا ہمیں بادلِ ناخواستہ اونٹوں سے سامان اتارنا پڑا اور بزنجو
کے ساتھ بیلہ واپس آنا پڑا جہاں ہم گیارہ بجے پہنچے۔ دوران سفر ہم اپنے نئے آشنا
سے بات چیت کرتے رہے جس سے ہمیں معلوم ہوا کہ وہ بے تکلفانہ مہمان نوازی اور
قزاقانہ وحشت کا مجموعہ تھا جو بلوچ کردار میں عجیب و غریب طریقے سے آمیختہ ہیں۔
وہ بار بار اپنی داڑھی کی قسم کھا کر کہتا کہ اگر ہم اس کی اجازت کے بغیر اس کے علاقے سے
گذرتے تو وہ ہم سب کو بھسم کر ڈالتا اور پھر ایسے ہی نہایت خلوص سے دعوت دیتا کہ ہم
ایک ہفتہ اس کے گاؤں میں گذاریں جو ہم بخوشی منظور کر لیتے بشرطیکہ حالات اجازت
دیتے۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہمارا ارادہ بلا ضرر بلکہ نادیدہ آگے بڑھ جانے کا تھا۔ وہ ہماری
سادہ لوحی پر مصنوعی طور پر ہنستا رہا مگر بعد میں ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم اپنے ارادے کے مطابق
آگے بڑھ سکتے تھے لیکن جام نے اس وحشی کو بلا کر نہایت احمقانہ غلطی کر دی تھی گو اس
کی نیت نیک تھی۔ اُس نے کہا "تم کیسے اس لائحہ عمل کا ایک لمحے کے لئے بھی تصور کر
سکتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارا واسطہ ہمیشہ لس کے نمریوں سے ہی ہوتا؟ نہیں، تمہیں

بلوچ بننا ہوگا اور میری نگہبانی میں آنا ہوگا۔ تم تو ایک طرف، ایک خرگوش بھی رحمت خان کی مرضی کے خلاف اس علاقے سے نہیں گذر سکتا۔ البتہ تمہاری حفاظت کا قول دے کر تمہیں خوفناک سے خوفناک چیز سے بھی نہیں ڈرنا چاہیئے۔ باقی اللہ اور اس کے رسول کے سپرد ہے"۔ ہم نے اُسے یقین دلایا کہ ہم اس کے قول پر پورا یقین رکھتے تھے اور اس کی صلاحیتوں اور ذرائع حفاظت کے متعلق شمہ بھر شک و شبہ نہ رکھتے تھے۔

ہم دن کے وقت جام سے ملے اور اُس نے رحمت خان کو ہمارے سفر کا مقصد سمجھایا اور یہ بھی کہا کہ اُس نے ہمارے بحفاظت سفر کی خاطر اُس کے لیے ساٹھ روپے بھی ہم سے وصول کیے تھے۔ بزنجو نے بے تکلفی سے جواب دیا کہ چونکہ ہم سندرجی جیسے نامور سوداگر کے گماشتے تھے لہٰذا اُسے ہمارے سفر کے لیے زیادہ رقم دینی چاہیئے۔ جام نے جواباً کہا کہ اُس نے طرفین کے لیے بہت منصفانہ فیصلہ کیا تھا اور ہمیں مخاطب ہو کر کہا کہ ہمارے دربار سے چلے جانے کے بعد وہ معاملہ سلجھا لے گا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے ہمیں رات کو اُس کے مہمانوں کی حیثیت سے بیلہ میں ٹھہرنے کی دعوت دی جسے ہم نے طوعاً وکرہاً قبول کر لیا۔ اس کے بعد ہم واپس آ گئے کیونکہ جام کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بزنجو کے ساتھ مزید گفتگو ہماری موجودگی میں پسند نہ کرتا تھا غالباً اس لیے کہ سردار تو سردار اُس کا ادنیٰ ترین خادم بھی جملہ بازی اور زرطلبی بھونڈے اور منہ پھٹ انداز میں کرتا تھا۔ ہم اپنی پرانی رہائش گاہ پر پہنچے ہی تھے کہ جام کے خدام ہمارے لئے ایک بھیڑ، چار پرندے، کچھ چاول، گھی اور سبزیاں لے آئے جو تیس آدمیوں کے کھانے کے لئے کافی تھے۔ شام کے وقت ہمیں رحمت خان کا پیغام ملا کہ وہ صبح روانہ ہونے کے لئے تیار تھا اور خضدار تک ہمارے ساتھ جائے گا۔ جو قلات کے راستے پہ ایک گاؤں تھا۔

۳۰ جنوری:

کیپٹن کرسٹی اور میں صبح صبح جام کے باغ میں اپنے سامان کے پاس پہنچ گئے لیکن رحمت خان اور اُس کے ساتھیوں کو شہر (وہ بیلہ کو شہر کہتے تھے) میں اتنے کام تھے کہ وہ بعد از دوپہر ہمارے پاس آئے۔ پھر ہم اُونٹوں پر سوار ہوئے اور مشرق کی طرف سے چار میل شمال کو چلے۔ یہ سفر زیادہ تر دریائے پورالی کے خشک پاٹ میں ہوا جو پہاڑوں کے درمیانی علاقہ پر محیط ہے اور برسات میں میلوں کے عرض میں بہتا ہے۔

باغ جام کے قیام کے دوران ہمیں معلوم ہوا تھا کہ رحمت خان کے ساتھ اسی قبیلہ کا ایک چھوٹا سردار بہادر خان نامی بھی تھا اور سابقہ سردار کا ایک بھائی بھی تھا جسے وہ لوگ ملّا کہتے تھے۔ ملّا محض معنی مذہبی رہنما ہی نہیں بلکہ بلوچوں اور بہت سے ایشیائیوں کے ہاں معنی وہ شخص جو قرآن حکیم پڑھ سکتا ہو۔ وہ سب کے سب اپنے سرداروں کی طرح ملبوس تھے ــــ گھٹنوں تک لمبی سفید ڈھیلی ڈھالی سُوتی قمیص، نیلی یا دھاری دار سُوتی شلوار اور ایک چھوٹی سی گول ٹوپی جو عین سر پر آجاتی تھی۔ امتیاز صرف گھوڑوں اور ساز و سامان میں ہی مجھے نظر آیا۔ رحمت خان نے جام کے پاس جاتے وقت اپنی کمر میں ایک لُنگی[1] بھی باندھ لی جو اس کے خدمت گاروں کو میسر نہ تھی۔ ہم پاٹ میں ایک اُونچی جگہ پر ٹھہرے۔ بلوچوں نے فوراً ہی لکڑیوں کا ایک ڈھیر اکٹھا کر لیا اور آگ جلا دی اور ہم رات کا زیادہ حصہ الاؤ کے گرد بیٹھے رہے۔ تین چار لنگری (گھومتے پھرتے مُطرب) بھی بزرگوں کے ساتھ آئے تھے اور وہ ہمیں اپنے مختلف سرداروں کے بہادرانہ کارنامے گا گا کر سُناتے رہے اور گیتوں کے ساتھ ساتھ دیوانہ وار اور بے معنی اشارے بھی کرتے رہے۔ بعض گیت

---

[1] لُنگی ریشم یا ریشم اور سُوت کا لمبا پٹکا یا کمر بند ہوتا ہے۔ بعض سندھی پٹکے (عربی شناش) بے حد خوبصورت اور نظر فریب ہوتے ہیں۔

اور کچھ موسیقی یقیناً لطیف اور شیریں تھی لیکن افسوس کہ سامعین کثرت سے سر ہلا کر کم از کم میرے لئے اس کے لطف کو زائل کر دیتے تھے۔

یہ منظر زنجوؤں اور بہت سے دیگر بلوچ قبائل کی وحشیانہ زندگی کا کماحقہٗ مظہر ہے۔ اُس لمحے سرداروں کا ظاہری وقار و امتیاز ایک طرف رکھ دیا گیا اور وقفوں وقفوں سے سردار اور اُن کے لوگ دفورِ اشتیاق سے مُنکریوں کے ہاتھ سے ستار[1] پکڑتے اور مجنونانہ انداز میں اپنے پسندیدہ راگ الاپتے اور مضحکہ خیز اور پُرجوش حرکات و سکنات کے ذریعے اپنے آپ کو وجد میں لے آتے۔ شور و غل اتنا بڑھ جاتا کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگتے لیکن سامعین تحسین و آفرین کے دو نگڑے برساتے اور گانے والوں کے ساتھ کورس میں شریک ہو جاتے اور سر دھنتے حتیٰ کہ وہ تھک کر رہ جاتے۔ پھر دوسرے ستار تھام لیتے اور یوں پورے حلقے میں ستار کا دور چلتا رہتا!

۳۱ جنوری:

آج طلوعِ آفتاب کے بعد رحمت خان اور اس کا ٹولہ ہمارے پڑاؤ سے کوئی دو میل دُور گنّوں کے ایک کھیت میں گئے اور وہاں سے اتنے گنّے اٹھا لائے جتنا ان کا مقدور تھا اور خوفزدہ مالک انہیں دیکھا کیا اور لوٹ مار پر اُف تک نہ کر سکا۔ اس منظر نے لس اور بلوچستان کے لوگوں کے کردار کا تفاوت مجھ پر بالکل واشگاف کر دیا۔ جو باہمی قربت اور روزمرہ کے تعلقات کی وجہ سے اور بھی غیر معمولی ہو جاتا ہے۔

چونکہ ہماری اگلی منزل سابقہ صوبے میں آخری تھی لہٰذا میں چند الفاظ میں اس کے باشندوں کے متعلق اپنی رائے مختصراً پیش کروں گا۔ متعدد بیانات کے مطابق لس کی آبادی پچیس ہزار ہو گی جس کی قریباً ایک تہائی خانہ بدوش خاندانوں پر مشتمل ہے

---

[1] ستار = سہ تارا = تین تاروں کا ساز

جو سہولت اور میلان کے مطابق اپنی خیمہ گاہیں بدلتے رہتے ہیں۔ وہ سب ایک ہی قبیلہ کے ہیں لیکن چار مختلف ناموں یعنی نمری، جدگال، جوکھیا اور جٹ سے پکارے جاتے ہیں۔ موخر الذکر اصطلاح سب سے زیادہ مستعمل ہے اور عملاً و لفظاً کاشتکار کا معنی دیتی ہے۔ یہ لوگ پرلے درجے کے کاہل الوجود ہیں اور بھنگ اور دیگر منشیات کے عادی ہیں اور اپنا وقت بیکار تفریحات میں گذارتے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ پردیسیوں سے شائستہ ہونے کا میلان رکھتے ہیں تاہم یہ میلان واضح نہیں ہوتا کیونکہ ان میں تجسس کا مادہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ آپ کے خفیہ ترین کمروں میں آنے سے بھی گریز نہیں کرتے اور آپ کی لپنٹ کے کپڑوں کو بھی چھوتے اور جانچتے ہیں۔ اُن کے اطوار کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ کبھی سوال نہیں پوچھتے یا شاذ و نادر ہی پوچھتے ہیں۔ مجھے ایک نمری یاد ہے جو بن بلائے بیلہ میں ہمارے گھر آیا اور ایک بھرے ہوئے کمرے میں دو گھنٹے بیٹھا رہا اور پھر ایک لفظ بولے بغیر چلا گیا۔ مردوں کے خدو خال اچھے ہیں — قدو قامت درمیانے ہیں اور وہ مضبوط اور کسرتی ہیں۔ عورتیں عامیانہ ہیں، اور پاکیزگی جسم و لباس سے بالکل غافل ہیں۔ اوّل الذکر کا لباس ایک ڈھیلا ڈھالا پیرہن یا قمیض، شلوار اور ایک چھوٹی سی ٹوپی پر مشتمل ہے جو اکثر ایک علاقے کے لوگوں کو دوسرے علاقے سے ممیز کرتی ہے۔ عورتیں بھی ایسا ہی لباس زیب تن کرتی ہیں سوائے اس کے کہ ان کی قمیص ٹخنوں تک لمبی ہوتی ہے اور ان میں سے بعض اس کے نیچے ریشمی یا سوتی شمیز پہنتی ہیں۔ اہل لس کی اہم خوراک چاول اور دیگر اناج ہیں جو وہ خود بافراط اگاتے ہیں۔ چاول کے ساتھ خشک مچھلی یا گھی بھی استعمال کرتے ہیں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اعلیٰ طبقے کبھی کبھار گوشت کا بھی اضافہ کر لیتے ہیں جو بیشتر آبادی کو میسر نہیں ہوتا۔ اُن کے پاس عمدہ اونٹوں اور کالے مویشیوں کے علاوہ بھیڑوں، بکریوں کے بڑے بڑے اور بے شمار ریوڑ ہیں لیکن گھوڑے بہت کمیاب اور

منحنی قد اور کینہ پرور ہیں۔ لس کی زبان قریباً سندھی سے ملتی جلتی ہے اور جدگالی یا جدگی کہلاتی ہے جو قبیلے کے نام سے ہی منسوب ہے۔ میں نمریوں کا مختصر سا خاکہ یہ کہہ کر ختم کرتا ہوں کہ ان کی شکل و شباہت اور عادات و اطوار مجھے اور کیپٹن کرسٹی کو بہت حد تک ہند و آنہ معلوم ہوئے۔ ان کے چہرے مہرے سے ایسی مردہ دلی اور بے بسی ٹپکتی ہے جو مجھے کسی مسلمان ملک میں نظر نہیں آئی اور یہی انہیں اُن کے سندھی، مکرانی اور بلوچستانی ہمسایوں سے ممیز کرتی ہے۔

آمدم برسر مطلب۔ جونہی بلوچوں نے ناشتہ ختم کیا ہم نے روانہ ہونے کی تجویز کی لیکن ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب بہادر خان اور رحمت خان کے بھائی ملا نے اپنی زحمت سفر اور اجازت سفر کا معاوضہ مانگا۔ ہم نے انہیں مختصراً بتایا کہ جام نے رحمت خان کے ساتھ فیصلہ کر لیا تھا جو بزنجووں کا سردار تھا اور جس کے علاقے سے راستہ گذرتا تھا لیکن اگر وہ مزید معاوضہ پر مُصر رہے تو ہم بیلہ واپس چلے جائیں گے اور ملحقہ صوبہ مکران کے صدر مقام کیچ کے راستے قلات کا سفر کر لیں گے۔ اس دھمکی نے ان کے مطالبات پر اوس ڈال دی اور وہ آپس میں رحمت خان کے وصول کردہ ساٹھ روپیوں پر خوب حیث بیث کرتے رہے جس کے بعد ہم روانہ ہوئے اور دریائے پورالی کی گذرگاہ یا اس کی ساحلی پہاڑیوں پر قریباً عین شمال کی جانب سولہ میل کا سفر طے کیا۔ علاقہ وحشیانہ، ویران اور سنگ آلود تھا اور دریائی گذرگاہ میں گز یا تمرس اور ببول وغیرہ کے اشجار کا ایک بے محابا جنگل تھا۔ سفر کے دوران ہم رحمت اور اس کے ٹولے سے جدا ہو گئے اور تین بجے شام اُس کے انتظار کے لئے ٹھہرے۔ عین اسی وقت اُونٹوں کے مالکوں نے (جو ہم نے بیلہ میں کرائے پر لئے تھے) پہاڑوں میں اپنے گاؤں جانے کی اجازت مانگی جو تین میل دور تھا اور شام تک واپس آنے کا قسمیہ وعدہ کیا۔ بعد میں ثابت ہوا کہ اُس کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ یہ سوچ کر

کہ ہمارے لدے ہوئے دو نو اُونٹ اُس دن کتنے آہستہ چلے تھے اور یہ بھی کہ رحمت خان کے ساتھ خدا معلوم کتنے آدمی ہوں گے جو ہمیں راستے کے کوائف اور سمتیں قلمبند کرنے سے روک دیں ہم نے فیصلہ کیا کہ اُس کے آتے ہی ہم اپنی سواری کے اُونٹوں پر پوری تیز رفتاری سے قلات روانہ ہو جائیں اور سامان اپنے ایک ہندوستانی خادم اور چند بلوچوں کے سپرد کر جائیں۔

یکم فروری:

ہم نے دس بجے تک بزنجوؤں کا انتظار کیا اور پھر پڑاؤ سے اپنے اُونٹوں پر سوار ہو گئے۔ یہ ہدایت دے گئے کہ رحمت خان خود تو ہمارے ساتھ آملے اور اپنے آدمیوں کو سامان کی حفاظت پر مامور کر آئے۔ ہمارا راستہ سیدھا دریائے پورالی کی گذرگاہ سے نکلا جو یہاں مشرق کے رُخ پر ایک تنگ آبی گذرگاہ بن جاتا ہے۔ ہم پندرہ میل شمال کی طرف چلے اور پھر ناشتہ کیا۔ اس راستے پر عمدہ پانی کی افراط ہے جو چٹانوں سے نالوں کی صورت میں بہتا ہے۔

اسے کوہن وٹ یا پہاڑی سڑک کہتے ہیں اور اس کا آغاز یہاں اس بلوچستان کے جنوبی ترین صوبہ جھلاوان کا آغاز ہے۔ اس پر عموماً دو اُونٹ پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے لیکن ایک جگہ پر یہ راستہ اتنا تنگ ہو گیا کہ ہمیں اُونٹوں سے اُتر کر انہیں پیدل اُتارنا پڑا۔ سینکڑوں فٹ اُونچے پہاڑ دو رویہ ایستادہ تھے اور راستے کو اپنے سائے میں لپیٹے ہوئے تھے۔ بعد از دوپہر ہم چودہ میل مزید چلے اور رات ایک بڑے الاؤ کے گرد سوئے جو سیلاب آوردہ لکڑیوں سے جلایا گیا تھا۔ رات انتہائی سرد تھی اور سونمیانی پہ اُترنے کے بعد سے ہمیں پہلی دفعہ بستروں اور گرم پارچات کی کمی کا احساس ہوا۔

۲ فروری:

ہم نے کنجی کا پڑاؤ صبح آٹھ بجے چھوڑا اور چودہ میل چلنے کے بعد باران لک یعنی برساتی

درہ کے آغاز پر پہنچے اور اس کے اوپر چلتے رہے۔ ہم کوئی ڈیڑھ گھنٹہ میں اس کی چوٹی پر چڑھے جہاں ایک سو گز یا بیشتر راستہ بہت تنگ ہے اور ٹھوس چٹانوں سے کھودا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس اونچے مقام سے ہم نے چہارطرفہ علاقے کا انتہائی خوبصورت منظر دیکھا جو بنجر اور چٹانی پہاڑوں کے ایک بے قاعدہ مجموعہ پر محیط تھا جن میں چند براہوئی چرواہے اپنے چھوٹے چھوٹے اخیال (خیل کی جمع یعنی معاشرہ) میں رہتے ہیں۔ شاید ہی کوئی اور منظر اتنا رفیع الشان اور پرشکوہ ہو!

جگہ کا اتھاہ سکوت اور سنگلاخ اور مہیب پہاڑوں کی زنگار رنگ نظر گیر شکلیں جو ایک دوسرے پر ایک بحرِ متلاطم کی لہروں کی طرح جمی ہوئی تھیں اس پورے منظر کو ایک ناقابلِ بیان تاثر دے رہی تھیں اور ذہن پر حرمت وہیبت کے احساسات طاری کرتی تھیں درے کی چوٹی سے اترنے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور ہم چند میل تک ایک پتھریلے میدان پر چلتے رہے اور پھر کچھ عرصہ کے لئے ٹھہر گئے تاکہ ہمارے اونٹ پہاڑی دریا اور ناچ کی گذرگاہ میں ایک گھنٹہ کے لئے چر لیں جس میں پانی کا ایک چھوٹا سا فرحت بخش دھارا بہہ رہا تھا۔ ایک براہوی گڈریا جو بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ چرا رہا تھا۔ اتفاقیہ یہاں ہمیں مل گیا جس سے ہم نے کچھ دودھ لیا اور ایک روپے پر ایک بھیڑ خریدی۔ ہم شام کو پانچ میل مزید چل کر ایک جگہ طرقبور پہنچے جہاں ہم نے رات ویسے ہی گذاری جیسے پچھلی رات۔ گو اس میں بھنے ہوئے گوشت کے عشائیہ کا خوشگوار اضافہ ہوا۔ جس چابکدستی سے ہمارے شتربانوں نے بھیڑ کو ذبح کیا میں اس کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ انہوں نے گوشت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹا، انہیں اپنی توڑے دار بندوقوں کے آہنی گزوں سے چھیدا اور پھر بہترین کباب بنا دیئے۔ اس جگہ کا نام ایک مشہور دیو طور کے نام پر ہے جس کی قبر ایک قریبی بلندی سے ممیز ہوتی ہے اور اس کی بہادری کے افسانوی قصے بیان کئے جاتے ہیں۔

۳ فروری :

ہم صبح سات بجے طور قبر سے روانہ ہوئے اور دن میں چوبیس میل فاصلہ طے کیا۔ ہمارا راستہ زیادہ تر دو میدانوں بلکہ وادیوں سے گذرا جو طول یا عرض میں بارہ یا چودہ میل سے زیادہ نہ تھیں۔ ان میں بعض خانہ بدوش کوہستانیوں نے خوب کاشت کی تھی لیکن اب یہ مردہ گھاس اور ٹھنٹھوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ان میں سے بڑا میدان وَڈھ کا ہے جو سڑک سے چھ میل مشرق میں واقع پہاڑی گاؤں وَڈھ کے نام پر پکارا جاتا ہے۔ ہمارے پاس جام کا تعارفی خط بنام ولی محمد خان تھا جو وَڈھ کا سردار اور براہوئی قبیلہ مینگل کا سربراہ ہے۔ یہ قبیلہ تعداد کے لحاظ سے بلوچستان میں سرفہرست ہے لیکن ہمیں بیلہ میں ہی معلوم ہوگیا تھا کہ وہ موجود نہ تھا۔ ہم نے گاؤں جانا مناسب نہ سمجھا اور اپنے ایک راہ نما کو خط دیکر اُس کے دیوان کے پاس بھجوا دیا تاکہ وہ اسے اپنے آقا کے پاس پہنچا دے۔ میرے خیال میں وَڈھ کا قصبہ بہت چھوٹا اور بد ساختہ ہے اور سردار نے وادی میں کوئی اور قصبہ بسانے کی بھی جدوجہد کی ہے لیکن لوگوں کا خیال ہے کہ یہ آسیب زدہ جگہ ہے اور ہمارے رفقا نے یقین دلایا کہ کئی ہندوؤں اور دوسرے لوگوں نے کئی دفعہ یہاں آباد ہونے کی کوشش کی لیکن وہ سب کے سب بلا استثنا مر گئے یا سال کے اندر اندر وہاں سے بھگا دیئے گئے۔

غروبِ آفتاب سے تھوڑا عرصہ پہلے ہم نے شب بسری کے لئے تین چار براہوئی چرواہوں کے گدانوں کے پاس ڈیرہ ڈالا۔ ان میں سے ایک نے ہمیں بافراط دودھ، ایندھن اور پانی مہیا کیا۔ اس خیل یا معاشرہ نے ایک عظیم سلسلہ کوہ کے سائے میں ایک نہایت رومانوی اور پرسکون مقام کو اپنی رہائش کے لئے منتخب کیا ہوا تھا۔ ان کے عادات و اطوار معتدل، سادہ اور دلآویز تھے اور اس پناہ گاہ میں اُن کا واحد تردد اپنے ریوڑوں کو بھیڑیوں اور چرخوں کے سفاکانہ حملوں سے بچانا۔ دن کے وقت بحفاظت چرانا اور صبح و شام ان کا دودھ دوہنا تھا اور ان تمام مواقع پر مرد عورت یکساں طور پر مستعد اور ماہر تھے۔ ہمارے

اُترنے سے ذرا ہی قبل ریوڑ گھر لائے گئے تھے اور حیران کن طور پر اُن سب کو نہایت عجلت اور باقاعدگی سے دوہا گیا اور باڑوں میں بند کر دیا گیا۔ اس وقت ہر متنفس نے ہاتھ بٹایا خواہ سربراہ خاندان تھا یا کمسن۔ بھیڑوں کو بکریوں سے علیحدہ بالٹیوں میں دوہا گیا کیونکہ ان کے مکھن سے بننے والا گھی پائیدار نہیں سمجھا جاتا۔ گو براہوئیوں کے نزدیک یہ تازہ بتازہ تقویت بخش ہوتا ہے۔ جب گھریلو کام پورے ہو گئے تو مستورات اور بچے ہمارے الاؤ کے گرد آ گئے۔ اور نہایت بے تکلفانہ گپ شپ لڑاتے رہے۔ اُن کے اور اُن کے مردوں کے طور طریق سے دوسروں کے کام آنے کی مخلصانہ کوشش و خواہش کا اظہار ہوتا تھا جس میں انعام و اکرام کی کوئی غرض نہ تھی۔ ہمیں ان وحشی اور غیر مہذب چرواہوں سے جو حسن سلوک نصیب ہوا اُس کی مسرت صرف وہی معدودے چند لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو ہمارے جیسی صورتحال سے گذرے ہوں۔ اپنے میزبان کی بیٹی کو روٹی پکانے کے لئے کچھ آٹا دینے کے بعد مجھے روٹی کی تیاری یا عدم تیاری کے بہانے گدان کو اندر سے دیکھنے کا موقعہ مل گیا۔ میں اس غیر معمولی رہائش گاہ کی صفائی اور سکون سے بہت متاثر ہوا۔ یہ چند بیلی خمیدہ چھڑیوں کی ایک محرابی چھت تھی جسے کھردرے اور کالے کمبلوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ جس گدان میں میں داخل ہوا، اُس میں میں بمشکل سیدھا کھڑا ہو سکتا تھا۔ مجھے اس کی لمبائی دس بارہ گز معلوم ہوئی اور چوڑائی اتنے ہی فٹ اور اُس کے فرش پر کھردری دریاں بچھائی ہوئی تھیں، جو خود براہوی خواتین کی بافتہ و ساختہ تھیں۔ آگ ایک کونے میں تھی اور صرف یہی کچھ تکلیف کا باعث تھی کیونکہ دھواں نکلنے کی کوئی چمنی نہ تھی اور وہ دروازے سے ہی باہر نکلتا تھا لیکن اس کا فائدہ یہ تھا کہ گدان خوب گرم تھا جو اِن غریب، معمولی کپڑے پہنے ہوئے لوگوں کے لئے (جو میرے علم و مشاہدہ کے مطابق یورپ یا ایشیا میں موسمی تغیرات کے بہت زیادہ شکار ہیں) واقعی ایک بہت بڑا مصرف ہے۔

۴ فروری :

آج صبح ہم اپنے مہمان نواز براہوئیوں سے رخصت ہوئے۔ اس سے پہلے ہم انہیں ان کی مہربانی کے لئے کھردرے سفید کپڑے اور تمباکو کا تحفہ دے چکے تھے جنہیں وہ نقدی سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔ ایک بنجر، پہاڑی علاقے سے پینتیس میل سے بھی زیادہ کا سفر کرکے جہاں راستہ بے حد خراب تھا اور بیشمار گہری اور مشکل گھاٹیوں سے کٹا پھٹا تھا ہم تین بجے بعد دوپہر خضدار کے قصبہ میں پہنچے۔ اس موسم میں مسافروں کی آمد سے قیاس آرائی کے دروازے کھل گئے اور اہل قصبہ نے ہمیں حیرت و استعجاب اور شک و شبہ سے دیکھا۔ ہم بازار سے گذر کر ایک ہندو کے مکان پر گئے جس کے لئے ہمارے پاس تعارفی خطوط تھے۔ ہمیں شرف مہمانی بخشنے یا نہ بخشنے کی بحث کی وجہ سے کافی تاخیر ہوئی اور بالآخر ہمیں ایک خالی کٹیا مل گئی جہاں ہمیں رات گذارنا تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد ہمیں کچھ خوراک اور جانوروں کے لئے کچھ چارہ مل گیا۔

۵ فروری :

آج ہم خضدار ہی ٹھہرے تاکہ رسد اکٹھی کرلیں اور اونٹوں کو سستانے کا موقعہ دیں۔ ہمارے ملاقاتیوں میں ایک قندھاری سوداگر بھی تھا جو پانچسو میل دور سے بھیڑیں خریدنے آیا تھا گو انہیں وہاں تک لے جانا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اس نے معذرت کے ساتھ اپنے ایک چچا کے متعلق استفسار کیا جو چند سال پہلے ہندوستان گیا تھا اور اس وقت سے مفقود الخبر تھا اور چونکہ بقول اس کے وہ بھی ہمارے ہی پیشہ کا تھا یعنی گھوڑوں کا سوداگر لہٰذا اس نے سمجھا کہ شاید ہم اس کے متعلق کچھ جانتے ہوں۔ وہ کوئی دو گھنٹے ہمارے ساتھ رہا اور ہمیں واقعی مسلمان سمجھتے ہوئے رخصت ہوا۔ ہم نے بھی اس کی اس رائے کی تردید مناسب نہ سمجھی۔ بعد از دوپہر ہمارے پاس ایک ہندو فقیر آیا جس نے بتایا کہ اس نے ایران، خراسان، سیستان، کشمیر، بخارا وغیرہ کی پیدل سیاحت کی تھی اور وہ ان میں سے کسی بھی علاقے پر ہماری مطلوبہ معلومات دے سکتا تھا۔ ہم نے اس سے بہت ہی کم سوال پوچھے مبادا ہماری اصلیت کا اسے پتہ چل جائے

لیکن اس کے جوابات سے یہ واضح ہو گیا کہ اس کا علم نہایت محدود تھا اور گو اس نے دیکھا بہت کچھ ہو گا تاہم اس نے سمجھا بہت ہی کم تھا۔

آج کے قیام نے ہمیں شہر دیکھنے کا موقعہ بخشا۔ یہ چھوٹا سا شہر ہے جس میں پانچ سو سے زیادہ مکانات نہیں ہیں۔ یہ پہاڑوں میں محصور ایک وادی میں بنا ہوا ہے اور اس کے اردگرد ایک چھوٹی سی مٹی کی دیوار ہے جس کے اندر دو تین باغات بھی ہیں جن میں مناسب موسم میں انگور، انجیر، خرمانی، بادام، سیب وغیرہ ہوتے ہیں لیکن ہمارے قیام کے دوران درخت لنڈ منڈ تھے اور ہر چیز نذر یخ تھی۔ خضدار خان قلات محمود خان کے ایک سالے اور قمبرانی سردار میر مراد علی کا گرمائی صدر مقام ہے۔ وہ اس وقت کچھ گندا دا[1] گیا ہوا تھا لیکن اس کا شکستہ حال معمر نائب ہمیں ملنے آیا اور سابقہ شام نہ آنے کی بربنائے علالت معذرت کی۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہمارے پاس اُس کے آقا کے نام جام سبیلہ کا ایک خط تھا لیکن چونکہ ہمیں بالآخر اس سے ملنے کی امید تھی لہٰذا ہم وہ خط اپنے ہی پاس رکھیں گے۔ خضدار کے لوگ زیادہ تر ملتان اور شکارپور[2] کے ہندو ہیں اور یہاں ان کا اثر و رسوخ اتنا ہے کہ دروازۂ شہر کی چابیاں ہر رات مہابرہمن کی تحویل میں دے دی جاتی ہیں۔ یہاں برہمن کافی تعداد میں ہیں اور وہ ایک مندر کا انتظام کرتے ہیں جو ہندو جاتی نے قسمت کی دیوی کالی کے نام پر بنایا ہے۔ وہ نہایت بگڑے تگڑے لوگ معلوم ہوتے ہیں اور اس موسم میں الاؤ کے گرد بیٹھ کر تمباکو اور بھنگ پیتے ہیں اور انہی عادات و امراض کی وجہ سے وہ قبل از وقت بڑھاپے کے آئینہ دار ہیں۔ بازار ان کے وسائل کی بدولت بھرا ہوا ہے اور ان کی دو پن چکیاں ہیں جو وادی سے گذرتی ہوئی ندی سے چلتی ہیں۔

---

[1] مشرق کی طرف پہاڑوں کے سلسلے میں ایک علاقہ۔

[2] قلات کے مشرق اور شمال مشرق کے دو تجارتی شہر۔ دیکھئے ۲۳ جنوری کا نوٹ۔

۶ فروری :

خضدار سے سُبنکر تک فاصلہ دس گیارہ میل ہے ۔ سڑک اچھی ہے لیکن چڑھائی بہت ہے اور خضدار د باغوان کی وادیوں میں سے گذرتی ہے ۔ خضدار کی مانند باغوان بھی میر مراد علی قمبرانی کی ملکیت ہے لیکن اتنا بڑا یا گنجان آباد نہیں ہے ۔ اس کے سب باشندے بہ استثنائے دو براہوی خاندان کچھ گنداوا گوگئے ہوئے تھے ۔

۷ فروری :

ہماری آبی مشکیں آج صبح جم گئیں اور ہمارے لوگ آٹھ بجے سے پہلے باہر نہ نکل سکے ۔ بہر حال ہم آٹھ بجے سوار ہوئے اور تقریباً پچاس میل کے تھکا دینے والے سفر کے بعد ہم رات کو نو بجے گاؤں سوہر آب یا سُوراب پہنچے جو اسی نام کے میدان میں واقع ہے ۔ پورا سفر ایک ویران وسنسان علاقے میں گذرا ۔ سڑک خراب تھی جو کبھی پہاڑوں کے اُوپر سے اور کبھی ان کے بیچ سے گذرتی تھی ۔ غروبِ آفتاب کے بعد سردی اتنی شدید ہوگئی کہ ہمیں اُتر کر اُونٹوں کے پیچھے پیچھے چلنا پڑا جو بھوک اور مشقت سے بے حال ہو رہے تھے ۔ گاؤں میں پہنچے تو ایک مینگل براہوئی نے الاؤ روشن کیا اور ہمیں اپنا مکان سپرد کر کے خود بمعہ اہل و عیال ہمسایہ کے مکان میں منتقل ہوگیا ۔ وادئ سُوراب بہت وسیع ہے اور تیس تا چالیس میل لمبی اور دس تا بیس میل چوڑی ہے ۔ ایک ندی اسے سیراب کرتی ہے جس کا پانی مختلف پہاڑی چشموں سے آتا ہے ۔ اس میں تین چار گاؤں ہیں جو سُبنکر کے میر مُراد علی کے بھائیوں کی ملکیت ہیں ۔ ان میں سے ہر ایک کا یہاں مکان ہے جہاں وہ گرمی کے چند دن شکار کے لئے ٹھہرتے ہیں ۔ اس میدان کے مشرقی پہاڑ بے حد اُونچے ہیں اور ان کی چوٹیاں برف سے سفید ہو چکی تھیں ۔ سفر کے دوران بھی ایک برف پوش چوٹی نظر آئی جو بعد کی معلومات کے مطابق قلات سے ایک سیدھی شمالی لکیر میں پچھتر میل سے بھی زیادہ ہوگی اور نہایت معتدل اندازے کے

مُطابق ہمیں پہلی دفعہ دکھائی دینے پر ہم سے کم از کم ڈیڑھ سو میل ہوگی۔

۸۔ رسنہ وری:

سوراب سے رود بنجو تک چھبّیس میل کا فاصلہ ہے جو زیادہ تر میدان سوراب پر محیط ہے۔ رود بنجو سے تین میل ورے ہم اس میدان سے نکلے۔ قریباً وسط میں ایک سرائے ہے جس کا نام سرمنگ ہے جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کے قرب و جوار میں سنگ سُرمہ کی افراط ہے۔ یہ سرائے لدے ہوئے اُونٹوں کے لئے ایک منزل ہے اور اس کے قریب بہت عمدہ پانی ملتا ہے۔ رود بنجو کا گاؤں چند خستہ حال جھونپڑیوں پر مشتمل ہے۔ پانی کے لئے یہاں صرف کنوئیں ہیں لیکن ان کا پانی نہ اچھا ہے نہ بافراط۔ ملحقہ مُلک بالکل بنجر اور ویران ہے اور میرے خیال میں قلات اور سوراب کے درمیان پہلی اور واحد ستانے کی جگہ ہونے اور اناج وغیرہ کی کافی کھیت کی وجہ سے ہی صحیح الدماغ انسان ایسی بے کیف جگہ پر رہائش اختیار کر سکتے ہیں ورنہ وہ کسی آباد و شاداب علاقے میں بھی رہ سکتے تھے۔

رود بنجو کی وجہ تسمیہ ایک عجیب و غریب روایت ہے جس کو مقامی لوگ سختی سے ملتے ہیں۔ دو سوداگر یہاں انتہائی سردرات میں اتفاقیہ مل گئے۔ ایک کے اُونٹ مجیٹھ اور دوسرے کے نیل سے لدے ہوئے تھے اور ان دونوں رنگوں کو بلوچی میں رودین اور جو کہتے ہیں۔ نیل والے نے خسارے سے کچھ مجیٹھ سے تبادلہ کر لیا اور اس کی آگ جلا کر اپنی جان بچالی لیکن کنجوس ہمسفر نے اپنے سامان کا ایک ذرّہ بھی اس مقصد کے لئے استعمال نہ کیا اور سردی کی نذر ہو گیا۔

باب سوم

قلات میں آمد — دریائی علاقہ — پانی — محافظین شہر — ہندو گماشتہ — کرائے کا مکان — ہندوؤں کی ملاقات — ان کے خیالات — مصنف اور اس کے ساتھی کے شکوک و شبہات — سندھی دشمنی — کپڑے — ضروریات کی اشیا — ملاقاتی — تجسس — سردی — ہندوستانی اسے کیسے برداشت کرتے ہیں — لس کے لوگ — لاسیوں اور قلاتیوں کا مقابلہ — ایندھن — برف — مصنف کے تاثرات — پیغام — داروغہ — بابی سوداگر — تجارت — مصنف اور اس کے ساتھی کو ڈھونڈنے کی کوشش — دعوے — انکار — کلمۂ برمحل اور قیاس — بابی دوسروں کی نسبت زیادہ باخبر — دنیاوی علم کی کمی — دو واقعات — مصنف کے تاثرات — بابیوں کی وضع قطع، لباس اور اطوار — پھل کا تحفہ — کیسے خشک کیا جاتا ہے — غیر معمولی طور پر سرد دن — سخت پالا — غلزئی سوداگر — قافلہ — اس کی تشریح — بمبئی کے لئے خطوط — پیشکش — انکار — مصنف اور ساتھی ازبک تاتار بن جاتے ہیں — شہر کی سیر — فیشن — مصنف کا مکمل بہروپ — اس کے ثبوت کا ایک واقعہ — شہر قلات — وجہ تسمیہ — محل وقوع — نقشہ — قلعہ بندیاں — مصنف کی رائے — خان کا محل — منظر — بیرونی منظر — قلعہ — قابل دفاع — تفنگچی — محافظ — ابواب شہر — تعداد — نشان امتیاز — مکانات — قرب و جوار — تعمیر — گلیاں — راستہ — بدررو — ناگواریات — مصنف کا تبصرہ — جواب — بہت

غیر متعلق ــــ معموری بازار ــ پانی ــ غیر معمولی چشمہ ــ اس کی صفات ــ پن چکیاں ــ تعمیر ــ
بیان ــ حفظ ماتقدم ــ ضرورت ــ باغات ــ ہوائی ــ پیداوار ــ قلات کی آبادی
ــــ طبقے ــ پیچیدہ موضوع ــ اگلے باب میں تشریح۔

۹۔ ضروری :

ہم رود بنجو سے پچیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد آج بعد از دوپہر قلات پہنچے ۔ علاقہ پہاڑی تھا جس میں کہیں کہیں جنگل کے پیوند لگے ہوئے تھے ۔ راستہ قریباً شمال اور شمال مغرب کا تھا اور بہت سی جگہوں پر تازہ پانی دستیاب تھا ۔ جب ہم وسیع مضافات سے گذر کر شہر کے باب جنوبی پر آئے تو پہرے کے تفنگچیوں نے پوچھا کہ ہم کہاں سے آئے تھے اور کس کام سے آئے تھے ۔ ہم نے انہیں مختصراً مطلع کر دیا اور خواہش ظاہر کی کہ ہمیں سندرجی کے قلاتی گماشتہ ہندو شکول کا مکان بتا دیا جائے جس کے نام ہمارے پاس ہنڈیاں اور تجارتی خطوط تھے ۔ ان میں سے ایک ہمیں بازار میں اس کی دکان پر لے گیا جہاں ہمارے ہندو نے خطوط دیئے اور قیام گاہ کے بندوبست کے لئے کہا ۔ شکول اور اس کے بیٹے نے مشورہ دیا کہ ہم فصیل شہر کے باہر کوئی مکان کرائے پر لے لیں کیونکہ وہاں کی آب و ہوا شہر کی تنگ و تاریک گلیوں کی نسبت زیادہ فرحت بخش تھی ۔ ہم نے یہ تجویز فوراً مان لی کیونکہ اس میں دیگر فوائد کے علاوہ ہمیں خلوت بھی میسر ہوگی جس کی ہمیں اس وقت اشد ضرورت تھی ۔ اس کا بیٹا ہمارے ساتھ ہو لیا اور قلعہ و مضافات گذرنے اور وادی کا ایک نالہ عبور کرنے کے بعد ہم باغ میں واقع ایک مکان پر پہنچے جس کے متعلق اس کا باپ پہلے ہی طے کر چکا تھا اور "جو خاص طور پر گھوڑے کے سوداگروں کے لئے موزوں ہے کیونکہ اس کے ساتھ ایک دیوار بند صحن منسلک ہے جس میں ساٹھ ستر گھوڑے باندھے جا سکتے ہیں"۔

مکان معقول تھا اور بیلہ کی طرح لکڑی کے ڈھانچے پر مٹی لیپ کر بنایا ہوا تھا ۔ اس میں ہمارے مقیم ہونے کے بعد ہندوؤں کا اعلیٰ طبقہ ہمیں ملنے آیا جس کا تعارف شکول

نے کرایا۔ اُن میں سے بہت سوں کے نام ہمارے پاس تعارفی خطوط تھے جواب ہم نے اُنہیں دیئے اور موصول کنندگان نے ہمیں پوری توجہ دینے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے ہمیں مطلع کیا کہ ہم بہت غلط وقت پر آئے تھے کیونکہ خان بمعہ خاندان اور معتبرین قلات شدت سرما سے بچنے کے لئے کچھ گنداوا چلا گیا تھا لیکن انہوں نے کہا کہ "اگر تم دوبارہ یہاں ٹھہرو تو بہار کے آغاز پر ہی وہ سب لوٹ آئیں گے۔ اُسی وقت قندھار سے سوداگر آجائیں گے اور پھر آپ جتنے گھوڑے چاہیں خرید سکتے ہیں"۔ ہم نے اُنہیں اپنا منصوبہ بتایا اور یہ بھی کہ ہم اس لئے جلدی آگئے تھے کہ منڈی میں اولیت ہمیں حاصل ہو۔ ہندوؤں میں ایک بوڑھا آدمی (سیٹھ دریادھن کا گماشتہ، ہمارا کراچی کا بدخواہ) بے انتہا تکلیف دہ ثابت ہوا اور ہماری نقل و حرکت اور عزائم کے مقصد کی ٹوہ میں لگا رہا۔ اُس نے کھلم کھلا ہمارے دعاوی پر اپنے شکوک اور اُس کے نام خط نہ لانے پر حیرت کا اظہار کیا اور مجھے اور کیپٹن کرسٹی کو اس کے انداز گفتگو سے یہ اندازہ ہو گیا کہ اسے ہماری مجوزہ پیش قدمی کا پہلے سے علم تھا اور ہماری نقل و حرکت پر کڑی نگرانی کی ہدایات تھیں[1]۔ بہر حال ہم نے کھانے کا بہانہ کر کے اس مفروضہ جاسوس اور پوری ٹولی سے جتنی جلدی ممکن ہو سکا چھٹکارا

---

[1] امیران سندھ کا تردد پہلے دریادھن اور پھر اعلانیہ گماشتوں کے ذریعے (جن کا بیان کسی اور جگہ آئے گا) ظاہر ہوا۔ اس کا مقصد ہمارے منصوبوں کو خاک میں ملانا اور ملک سے عجلت سے نکل کر اپنے مقصد کو ترک کرنے پر مجبور کرنا تھا۔ یہ ان کے شک وشبہ اور عداوت و دہشت سے بھی ظاہر ہے جو حکومت ہند کے سلسلہ میں ان کے تمام افعال کا سرچشمہ ہے لیکن خوش قسمتی سے میں اور کیپٹن کرسٹی دونوں اس سے بخوبی واقف تھے کیونکہ ہم پچھلے سال حکومتی وفد کی آمد پر ان کے ردعمل کے عینی گواہ تھے۔

حاصل کر لیا۔ رات کے وقت شنُوبل پھر آیا اور ہر قسم کی خدمت کے لئے اصرار کرنے لگا۔ چونکہ ہمارے پاس وہی کپڑے تھے جو ہماری پشت پر تھے لہٰذا ہم نے اسے کچھ کپڑے مروجہ نمونے کے مطابق بنوانے کے لئے کہا اور دیگر ضروریات کا بھی بتایا جو یہاں قیام کے دوران مطلوب تھیں۔ اُس کے جانے کے بعد ہم نے اپنی کملیاں فرش پر بچھائیں اور خواب خرگوش کے مزے لینے لگے۔

۱۰ فروری :

آج صبح بے شمار لوگ از راہ تجسس ہمیں ملنے آئے۔ ہوا جان لیوا تھی لہٰذا ہمیں سارا دن کمرے کے وسط میں الاؤ روشن رکھنا پڑا اور خود بھی اسی کے قریب رہے۔ کپڑوں کی قلت کی وجہ سے ہمیں سردی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ ہمارے لاسی ساتھی تو اتنے شل اور بے مصرف ہو گئے کہ ہم نے انہیں واپس بھیج کر نئے ملازم رکھنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے تعجب ہوا کہ بمبئی کے رفقا نے سردی کو بہتر طور پر برداشت کر لیا حالانکہ بیلہ کا موسم ہندوستان کے اُس حصّہ کی نسبت زیادہ سرد ہوتا ہے۔

ہم اور ہماری کپکپاتی ہوئی جماعت ہمارے مضبوط مالک مکان اور اس کے بھائی کا ایک حیرت انگیز تضاد تھی جو طلوع آفتاب کے تھوڑا عرصہ بعد ایندھن لانے کے لئے قریبی پہاڑوں کو چلے گئے اور شام کو واپس لوٹے اور ہمارے لئے برف کا ایک تھیلا بھی بطور تحفہ لائے کیونکہ وہ ہمارے لئے اسے ایک سوغات سمجھتے تھے۔ میں نے آتے ہوئے دُور سے اس کا نظارہ کیا تھا لیکن تقریباً سات سال کے بعد اسے اب پہلی دفعہ دیکھا اور چھُوا اور میرا اپنا سرسبز جزیرہ اپنے لطیف بندھنوں اور عزیز ترین امیدوں کے ساتھ میرے آئینہ یاد میں اُبھر آیا۔ احساسات کسی بھی چیز سے وطن کا اٹوٹ رشتہ جوڑ دیتے ہیں جسے ہم لڑکپن میں دیکھتے رہے ہوں خواہ وہ غیر اہم ہو۔ اُس وقت چونکہ میں مہذب دُنیا سے سماجی رابطہ کی مسرتوں سے کٹا ہوا تھا لہٰذا یہ احساس بیگانگت کچھ زیادہ ہی پُرزور

تھا اور میں نے اس برف کو طمانیت و تاسّف کے ملے جُلے جذبات سے دیکھا۔ ہم نے سوغات کے لئے مالک مکان کا شکریہ ادا کیا تو وہ خوب ہنسا اور نہایت سادگی سے کہنے لگا "آپ اس تھوڑی سی برف کو اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں؟ اگر آپ کسی دن میرے ساتھ پہاڑوں کو چلیں تو آپ کو پورا علاقہ اسی میں ملفوف ملے گا"۔ لیکن میں خاموش رہا کیونکہ اپنے مخاطب کو اپنے احساسات واضح کرنا بیکار بھی تھا اور ناممکن بھی۔

۱۱ فروری:

ہمیں خان قلات کے بھائی میر مصطفےٰ خان کے داروغہ کا سلام و پیام ملا کہ وہ اپنی علالت کے باعث ہماری خاطر تواضع کا شرف حاصل نہ کر سکا اور ساتھ ہی امید ظاہر کی کہ وہ ہماری کسی بھی خدمت کے لئے تیار تھا۔ ہم نے اس کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ شہر جانے کے اوّلین موقعہ پر ہم ضرور باریاب ہوں گے۔ آج بھی کل کی طرح بہت سے لوگ ہمیں ملنے کے لئے آئے اور ہم اس رنگارنگ گفتگو سے خوب مسرور و محظوظ ہوئے۔ وہ زیادہ تر افغان تھے جو قبیلہ بابی کے لوگ تھے جو رسل و رسائل کے مقاصد کے لئے قلات میں آباد ہیں۔ وہ بمبئی کی تجارت کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے مشتاق تھے اور خوش قسمتی سے ہمارا ہندو ساتھی اس منڈی کے نرخوں سے واقف تھا لہٰذا وہ انہیں مطمئن کر سکا۔

ان میں ایک نہایت خوش لباس انسان فیض محمد بھی تھا جس نے بتایا کہ اس کی ایک انگریز معزز سے گاڑھی چھنتی تھی جو کراچی (سندھ) میں ریذیڈنٹ تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نے یہ شوشہ محض یہ جاننے کے لئے چھوڑا تھا کہ ہم انگریز تھے یا نہیں اور اگر تھے تو ہماری نیت کیا تھی۔ لہٰذا ہم اس موضوع سے کنی کترا گئے اور میں نے صرف یہ کہا کہ ہم نے سندرجی کی زبانی یہ سُنا تھا کہ کسی وقت انگریزوں کی سندھ میں ایک کوٹھی یا فیکٹری تھی۔ آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ایک نے دوسرے رفقا سے پشتو میں کہا کہ اُس نے پچھلے ہی سال ہم دونو کو سندھ کے سفیر کی معیت میں دیکھا تھا۔ ہمیں پشتو پر اتنا عبور تھا کہ ہم اس کی بات سمجھ گئے اور جس حیرت و استعجاب سے

ان میں سے بعض ہمیں دیکھ رہے تھے (جو ہمیں پالینے کی سازش سے بے خبر تھے) وہی ان کے عزائم کا واضح ثبوت تھا لہٰذا ہم نے اس الزام کی پُرزور تردید کی اور حاکم کے آدمیوں نے بھی ہمارا ساتھ دیا جو اس وقت اتفاقیہ طور پر موجود تھے بلکہ انہوں نے تو اس خیال کو ہی ہنسی میں اڑا دیا۔ لیکن پٹھان اپنی بات پر اڑا رہا اور وہ اُس جگہ اور وقت کو بھی بیان کرنے لگا جب اُس نے ہمیں دیکھا تھا اور کیپٹن کرسٹی کو بھی یاد آگیا کہ وہ سچ کہہ رہا تھا لیکن فیض محمد نے لُقمہ دیا کہ زندگی میں بہت سی گردشیں آتی ہیں اور ہم تمام انسان نیرنگیٔ تقدیر کے شکنجہ میں کسے ہوئے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُس نے یہ بات اس لئے کہی کہ وہ ہماری تردید کو کسی دوسری وجہ کی بجائے گردشِ ایام کا نتیجہ سمجھتا تھا جس کے ہم شکار ہوئے تھے اور جسے ہم چھپا رہے تھے۔ کچھ بھی ہو ہم اُس کے شکر گذار تھے کیونکہ اس کے اس جملہ نے ان سب کو خاموش کر دیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

یہ بابی لوگ مجھے قلات بلکہ بلوچستان بھر میں سب سے زیادہ باخبر معلوم ہوئے تاہم وہ بھی اپنے مخصوص دائرہ فکر سے باہر عالی ترین زندگی یا معاشرت کا ہلکا سا تصور بھی نہ رکھتے تھے۔ اگر ہم قندھار، کچھ گنداوا یا کسی اور جگہ کا ذکر کرتے جہاں وہ کئی بار گئے تھے تو وہ ذہین ثابت ہوتے اور اظہار خیال کرتے لیکن جب کوئی اَن دیکھی چیز یا جگہ زیر بحث آتی تو وہ یکسالہ بچے کی مانند بے خبر ثابت ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایشیا کے ان تمام حصوں کے لوگوں کا خاصہ ہے جہاں میں گیا ہوں اور مجھے روزمرہ کے تجربات کی بنا پر یقین ہے کہ وہ بلا مقصد مشاہدات و تحقیقات کا ذوق نہیں رکھتے۔ میں اس میں مستثنیات سے منکر نہیں ہوں لیکن وہ بہت کم ہوں گی۔ یہ صحیح ہے کہ ہندو فوراً اپنے سامان تجارت کے لئے آپ کو موزوں ترین منڈی کا بتا سکتا ہے اور گھوڑوں کا مسلمان سوداگر جانتا ہے کہ اسے بہترین اور ارزاں ترین گھوڑے کہاں سے ملیں گے۔ لیکن ان باتوں میں ان کی اپنی غرض پنہاں تھی لہٰذا وہ باخبر رہتے تھے۔ میں نے یہ باتیں برسبیل تذکرہ اس لئے کہیں کہ مجھے اُسی شخص کے دو سوال یاد آگئے جو سندھ کے ریذیڈنٹ سے دوستی کا دعویدار تھا اور محض اس بنا پر دوسروں سے بہتر طور پر باخبر ہو سکتا تھا اُس نے نہایت سنجیدگی

سے مجھ سے پوچھا کہ آیا ممبئی کا فنانسنگی یا یورپی گورنر ہندو تھا یا مسلمان اور چند لمحات کے بعد اُس نے لفظ "کمپنی" استعمال کیا اور پوچھا کہ وہ کس عمر کی تھی بشروع میں تو میں اس کا مطلب ہی نہ سمجھا جس پر اُس نے توضیح کی کہ وہ "کمپنی" کو ہمیشہ ایک بوڑھی لیکن مالدار عورت سمجھتا رہا تھا۔ اس طفلانہ مفروضے سے مجبور ہو کر میں نے حتی المقدور اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ سرکار یا حکومت کی کیا ماہیت تھی جسے کمپنی کہتے تھے۔ پتہ نہیں اس کے کچھ پلّے پڑا یا نہیں کیونکہ اس نے صرف یہ کہا کہ میں یقیناً ٹھیک ہوں گا کیونکہ وہ خود بھی کچھ دنوں سے سوچ رہا تھا کہ اس بوڑھی عورت کی تو بہت ہی عمر ہو گی کیونکہ سندھ کی فیکٹری نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے سے کمپنی کی کوٹھی کہلاتی تھی۔

بابی سوداگروں کی شکل و صورت دلخوش کن ہے۔ وہ سب کے سب مضبوط اور قوی الجثہ لوگ تھے۔ خط و خال دلکش تھے اور ان کے عادات و اطوار دوسروں کی نسبت شستہ و شائستہ تھے۔ سردی میں ان کا لباس سفید کپڑے یا رنگین ریشم کا پیرہن، چھینٹ کی اُلخلق یا فتوحی اور نیلی ریشمی یا سوتی شلوار ہے جو بہت لمبی چوڑی تھی۔ اعلیٰ طبقوں کے لوگ بوقلموں اونی جرابیں پہنتے ہیں۔ ان کی پگڑیاں کچھ بڑی اور عام ساخت کی لنگی یا ریشم کی ساختہ ہوتی ہیں جس کے نیچے کاسۂ سر پر وہ ٹوپی پہنتے ہیں اور باہر جاتے وقت اوپر سے پوستین پہنتے ہیں جس کا اونی حصہ اندر کی طرف ہوتا ہے اور جو اُنہیں بے حد گرم رکھتا ہے۔ عموماً ان کے ہاتھ یا کندھے سے بندھی ہوئی ایک فالتو لنگی بھی ہوتی ہے۔ گرمی میں وہ گرم کپڑے اتار دیتے ہیں اور پتلی کیلی کے پیرہن، ہلکی چھینٹ کی واسکٹ اور اکثر پگڑی کی بجائے تہ دار ٹوپی پہنتے ہیں۔ بشام کو ان افغان آشناؤں میں سے ایک نے ہمیں خشک خرمانیوں کا تحفہ دیا جو تین چار گھنٹے پانی میں رہنے کے بعد بہت عمدہ ہو گئیں۔ اُنہیں گٹھلیاں نکال کر دھوپ میں رکھ کر سکھا لیتے ہیں اور محفوظ کر لیتے ہیں۔

۱۲، ۱۳، اور ۱۴ فروری:

بارہ فروری اس موسم میں قلات کا سرد ترین دن تھا اور اسی وجہ سے ہماری صبح

پُرسکون رہی کیونکہ شہر کے فارغ اور گپ باز لوگ ہم تک نہ پہنچ سکے لہٰذا ہم نے بمبئی کو کچھ خطوط لکھے۔ سردی اتنی شدید تھی کہ دن کے بارہ بجے جب میں نے دھوپ میں اپنے ہاتھ دھوئے تو پانی زمین پر گرتے ہی جم گیا۔ شام تک برف باری کا سماں ہو گیا۔ ہوا کثیف اور کہر آلود ہو گئی لیکن رات کے نو بجے تک مطلع صاف ہو گیا اور بے پناہ انجماد ہوا۔

۱۳ر فروری :

تیرہ فروری کو ہرات کا ایک غلزئی سوداگر ہمیں ملنے آیا۔ وہ مال سے لدے ہوئے بیالیس اونٹوں کے قافلے[1] کے ساتھ آیا تھا اور بمبئی میں مقیم شندرجی کے نام کچھ خطوط چاہتا تھا تاکہ اس کے ذریعے سے اس کا سامان بک سکے۔ ہم نے فوراً اس کی درخواست مان لی اور وہ اتنا شکر گذار ہوا کہ وہ اپنا سامان ہمارے ایک آدمی کے سپرد کر کے خود قندھار واپس جاکر ہمارے لئے گھوڑوں کی مطلوبہ تعداد لانے کی پیش کش کرنے لگا لیکن بہت سی وجوہات کے باعث ہم اس کے ممنون احسان نہ ہونا چاہتے تھے لہٰذا ہم نے شائستگی سے انکار کر دیا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے کہا کہ وہ قلات میں اپنے مختصر قیام کے دوران پھر بھی ہمیں ملے گا۔

۱۴ر فروری :

چنانچہ وہ اگلے دن یعنی ۱۴ر فروری کو بھی آیا اور دو گھنٹے بات چیت کرتا رہا۔ اس آدمی کے ساتھ پورے سلسلۂ کلام میں ہمیں احساس ہوتا رہا کہ وہ ہمیں مسلمان سمجھتا تھا اور ہم سے رخصت ہونے سے قبل آج اس نے ہماری ذات اور وطن کے متعلق بھی استفسار کیا۔ ہم چونکہ پہلے ہی اس کا جواب سوچ چکے تھے لہٰذا کیپٹن کرسٹی نے بلا تامل جواب دیا کہ ہم ایک اوزبک

---

[1] قافلہ اور کاروان عموماً مترادف ہیں۔ میرے خیال میں ان میں تمیز ہو سکتی ہے۔ کم از کم بلوچ اور ان کے ہمسائے بہت سے مسافروں کو معہ مال و متاع کاروان سمجھتے ہیں اور اس کے برعکس اگر سب سامان ایک ہی سوداگر کا ہو تو وہ اسے قافلہ کہتے ہیں۔

خاندان کے افراد تھے جو چند قرون پہلے ہندوستان میں آباد ہو گیا تھا۔ وہ اس جواب پر مطمئن ہو گیا اور کہنے لگا کہ ہمارے رنگ سے یہی ظاہر ہوتا تھا[1]۔

۱۵ر فروری:

درزی ہمارے نئے کپڑے لے آیا تو آج ہم بازار گئے اور اس میں گھومنے پھرنے کے بعد دو گھنٹے شلوبل کی دکان میں بیٹھے رہے۔ ہم اپنے قلاتی لباس میں اتنا بدل چکے تھے (جو بابی سوداگروں کے انداز میں بنائے گئے تھے) اور میں نے ڈھیلی ڈھالی لُنگی (جو اکثر ہاتھ میں رکھی جاتی ہے) کو اِدھر اُدھر پھینکنے اور اچھالنے کا انداز اس خوبی سے اپنایا تھا کہ ایک افغان گلی سے دوڑتا ہوا میرے پاس آیا اور پشتو میں مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں قندھار کب واپس جاؤں گا؟ ہمارے رہنما نے جواب دیا کہ میں نے ہنوز فیصلہ نہ کیا تھا اور استفسار کنندہ اپنی غلطی کا احساس کئے بغیر واپس چلا گیا۔ یہ شہر پورے بلوچستان کا دارالحکومت ہے اور اسی لئے یہ قلات یا شہر کہلاتا ہے جو بلوچی میں اس کا مفہوم ہے۔ یہ ایک سیراب و شاداب میدان یا وادی کی مغربی طرف ایک اونچی جگہ پر واقع ہے جو قریباً آٹھ میل لمبا اور دو تین میل چوڑا ہے اور جس کا بیشتر حصہ باغات اور دیگر احاطوں پر مشتمل ہے۔ شہر ایک مستطیلی مربع صورت میں بنا ہوا ہے اور اس کی تین اطراف کے گرد ایک خاکی دیوار ہے جو اٹھارہ یا بیس فٹ اونچی ہے اور جس پر ڈھائی سو قدموں کے وقفے پر برج بنے ہوئے ہیں۔ برجوں اور دیوار میں تفنگچیوں کے لئے بے شمار سوراخ ہیں لیکن ان پر توپیں کہیں نصب نہیں ہیں اور نہ ہی شاید میرے اندازے کے مطابق یہ شکستہ مستعمرات ان کی متحمل ہو سکتی ہیں۔ شہر کی چوتھی طرف پہاڑی کے مغربی حصے سے محفوظ ہے جس پر یہ جزوی طور پر ایستادہ ہے اور جسے عمودًا کاٹا گیا ہے۔ اس پہاڑی کی چوٹی پر خان قلات سیگلر بیگی بلوچستان، محمود خان کا محل بنا ہوا ہے جہاں سے شہر اور مضافات کا

---

[1] بہت سے تاتاری اہل یوروپ کی طرح سُرخ و سفید ہوتے ہیں۔

منظر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ مجھے اندرونی محل دیکھنے کا تو موقع نہ مل سکا لیکن باہر سے یہ عام مٹی کی عمارتوں کا ایک بے ہنگم ڈھیر معلوم ہوتا ہے۔ ان کی چھتیں مسطح اور ڈھلوان ہیں جن کی حفاظت کے لئے چھوٹی چھوٹی دیواریں ہیں جو قلعہ کی دیواروں کی طرح سوراخ دار ہیں۔

پہاڑی کے اُس حصّے کے گرد ایک بُرجدار خاکی دیوار بنی ہوئی ہے جس پر خان کا محل واقع ہے۔ اس کی حالت دیگر قلعہ بندیوں کی نسبت بہتر ہے اور میرے خیال میں مجموعی طور پر یہ قلعہ تھوڑی سی مزید توجہ سے بلوچستان بھر میں دفاعی طور پر محفوظ ترین بنایا جا سکتا ہے۔ اس کا باب داخلہ جنوب مغربی طرف ہے اور یہاں مستقلاً تفنگچیوں کا ایک حفاظتی دستہ ہوتا ہے۔ شہر کے تین دروازے ہیں جو خانی، قندھاری اور بیلائی کہلاتے ہیں۔ آخری دونو قندھار اور بیلہ جانیوالی سڑکوں پر موسوم ہیں اور پہلا خان سے منسوب ہے۔ ان دروازوں پر بھی حفاظتی دستے متعین ہیں۔ فصیل کے اندر ڈھائی ہزار سے زیادہ مکانات ہیں اور مضافات میں ان کے نصف سے زیادہ ہوں گے۔ وہ نیم سوختہ اینٹوں کے بنے ہوئے ہیں جو چوبی ڈھانچوں پر لگی ہوئی ہیں اور ان پر گارے (چونم) کا پلستر ہوا ہے۔ گلیاں عموماً دیگر مقامی قصبوں کی نسبت زیادہ چوڑی ہیں اور ان کے دو رویہ پیادہ لوگوں کے لئے اُونچی پگڈنڈیاں بنی ہوئی ہیں لیکن ان کے وسط میں ننگی بدرو ہے جس میں کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے اور بارش کا بدبودار پانی بھی اس میں رکا رہتا ہے لہٰذا یہ وبال جان بنی ہوئی ہے کیونکہ اس کی صفائی کے کوئی سخت انتظامات و احکامات نہیں ہیں۔ ایک اور مشکل (جو شہر کی صفائی اور آرام کو متاثر کرتی ہے) یہ ہے کہ مکانات کی بالائی منزلیں گلیوں کے اوپر تک پھیلی ہوئی ہیں اور ان کے نچلے حصّے تاریک اور مرطوب رہتے ہیں۔ یہ اصل میں ایران اور کابل کے بازاروں کی بے حد بھونڈی تقلید ہے کیونکہ جب ہم نے اپنے رہنما سے ان کی دقت آفرینی کے متعلق پوچھا تو اُس نے کہا "آپ ہمارے بازاروں پر فیصلہ تب صادر کریں جب آپ قندھار اور ہرات کے بازار دیکھ لیں۔ وہاں تو ساری گلیاں چھتی ہوئی ہیں اور پھر بھی کوئی مین میکھ نہیں نکالتا" میں اُس وقت مذکورہ بازاروں کے رنگ ڈھنگ سے بخوبی

واقف نہ تھا لہٰذا اس موازنہ کا خاکہ نہ اڑا سکا اور بلوچ نے یہ سمجھ لیا کہ اس نے یہ بات کہکر میرے اعتراضات کو ختم کر دیا۔

قلات کا بازار وسیع ہے اور ہر قسم کے سامان سے معمور ہے۔ گوشت، سبزیاں اور دیگر ضروریاتِ زندگی ہر وقت مناسب قیمت پر دستیاب ہیں۔ میدان کے مقابل پہاڑی کا ایک چشمہ شہر کو لذیذ پانی مہیا کرتا ہے اور شہر مع مضافات اور باغات کے بیچوں بیچ بل کھاتا ہوا گذرتا ہے۔ پانی کا دھارا اتنا تیز اور بھرپور ہے کہ چوتھائی میل طے کرنے سے پہلے پہلے اس سے بہت سی پن چکیاں چلتی ہیں۔ اس کا منبع چٹان کی ایک قدرتی غار میں واقع ہے۔ جس کے اندر میں دس بارہ گز تک گیا۔ یہاں دو تین فٹ گہرا دھارا آئینہ کی طرح شفاف ہے اور بہت تیز۔ یہ یہاں سے ہی چار پانچ شاخوں میں بٹ جاتا ہے جن کے بہاؤ کے راستے اتنے نشیبی اور تنگ ہیں کہ میں آگے نہ جا سکا۔ اس سے زیادہ مملو چشمہ میری دید و شنید میں نہیں آیا۔

ایک خاص قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ چشمے کا پانی چھوٹی نالیوں سے نکلنے کے بعد طلوعِ آفتاب کے بعد تک اچھا خاصا نیم گرم ہوتا ہے اور پھر یکلخت ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور سارا دن ٹھنڈا ہی رہتا ہے۔

پن چکیاں اسی اصول پر بنی ہوتی ہیں جو بلوچستان میں مروّج ہے اور عموماً کسی کنالے کے عین نیچے واقع ہیں یا وہاں جہاں قدرتی آبشار نہ ہو تو مصنوعی آبشار کے پاس۔ پہیہ اُفقی ہوتا ہے اور اُس کی حرکت پانی کے زور کے مطابق بڑھتی گھٹتی رہتی ہے۔ بارش یا برف کے پگھلنے کی وجہ سے دھارے پھیل جاتے ہیں تو چکّی والے پہیے کو پانی کی سطح تک اٹھانے پر مجبور ہوتے ہیں ورنہ دھارا تو اسے بہت ہی تیز چلا دے۔ بعض چکیوں میں فالتو پانی نکالنے کے لئے ایک متبادل راستہ بھی بنا ہوا ہے لیکن اس مشکل کو حل کرنے کے لئے عموماً مذکورہ طریقہ ہی استعمال ہوتا ہے۔ وادیٔ قلات کے باغات کا زائد از نصف حصہ موجودہ خان کے

والد نے لگایا تھا اور یہ اشجار ہنوز تکمیل پذیر ہیں۔ وہ مشرقی آب و ہوا کے عام پھل بکثرت پیدا کرتے ہیں لیکن چونکہ یہ موضوع میرے نقشہ کے مطابق کسی اور جگہ کے لئے موزوں ہے لہٰذا میں اس پہ غور و فکر فی الحال ملتوی کرتا ہوں۔

قلات کے باشندے چار طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں یعنی بلوچ یا براہوئی، ہندو، افغان اور دہوار، اور چونکہ بالخصوص اوّل الذکر کی تقسیم در قبائل تفصیل طلب ہے۔ لہٰذا میں اگلا باب انہی کے لئے وقف کروں گا۔
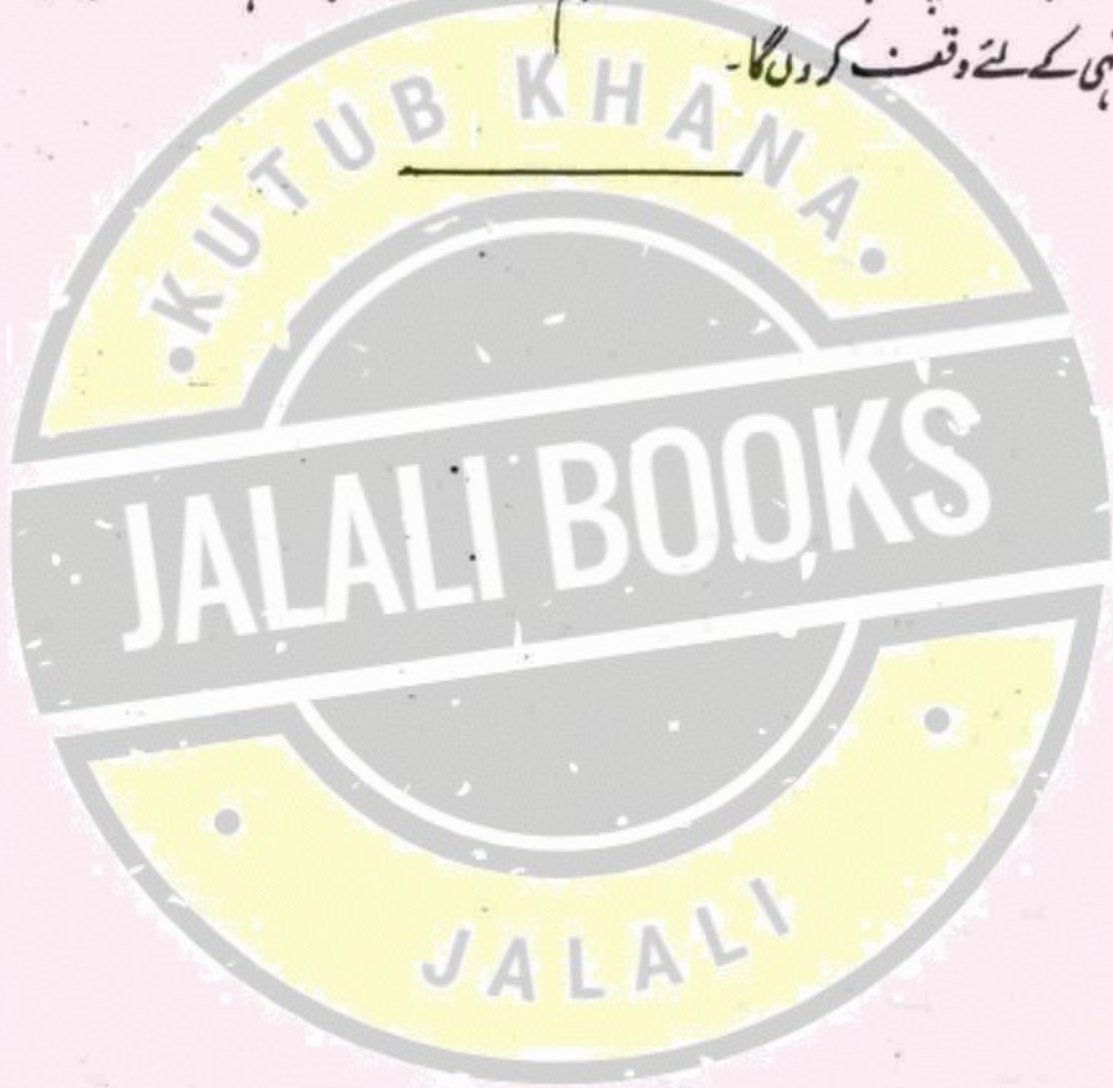
باب چہارم

بلوچ — پوری آبادی کا نام — مبہم ماخذ اور تاریخ — مفروضات — اعلیٰ طبقے — بلوچ اور براہوی — قبائل — تقسیم در تقسیم — نام — کہاں سے — تمیز باہمی — بلوچوں کی زبان — ایرانی (فارسی) سے مشابہت — تلفظ — مصنف کی رائے کی وجوہات — براہوئیگی یا براہوئیوں کی زبان — فارسی سے عدم مشابہت — ہندوی — پنجابی — لوگوں کا ناک نقشہ بہت مختلف — مستثنیات — کہاں — اشتباہ — بڑے بلوچ قبائل — نام — ناہردئی — خطۂ سکونت — رند اور مگسی — فروارد — تینوں کے ذیلی حصے — سردار — پہاڑی قبائل — ناہردئی — اُن کا بیان مخصوص — سخت جان — بہادر — وحشی — انفرادی چوری سے نفرت — لوٹ مار کے عادی — اس پر ان کے جذبات — چپاؤ — نوعیت — سرداروں کے حکم کے تحت — اس کا طریقہ — خوراک — پانی — عام طریقۂ کار — حملہ — حیران کن رفتار — حلقہ بندی — مقصد — چپاؤ کا خطرۂ عظیم — نتیجہ ممکنہ — غیر صحیح — ثبوت — رند اور بلوچ مگسی طبقے — لوٹ مار کے کم عادی — وجہ غیر یقینی — مصنف کی قیاس آرائی — اس کی وجہ — ناہردئیوں کی تائید — تینوں طبقوں کا مقابلہ — رند اور مگسی سخت جانی میں ناہردئیوں سے کم — آب وہوا کی اثر آفرینی — قیاس — رنگ — رند مگسی مشابہت — ناہردئی سے ممیز — تینوں طبقوں کا خاکہ جاریہ — مذہب — شیعہ دشمنی — مصنف کی رائے — قابلِ ذکر مہمان نوازی — چوری پر نظریہ — وفاداری — اطاعت گزاری — اس کی وجہ — گھریلو

عادات ــ چرواہوں کے گدان یا خیمے ــ تمن یا گاؤں ــ خیل یا معاشرے ــ مؤخر الذکر کا امتیاز بذریعہ سوابق ــ تبدیلی سے گمراہ کن ــ ایک کہانی سے آشکار ــ گدان نشینی سے اشتنا ــ جھونپڑیاں ــ مہمانوں کا استقبال ــ تقریب کی تفصیل ــ بلوچوں کی کاہلی ــ تمباکو نوشی ــ قمار بازی ــ نفرت انگیز عادات ــ شراب سے اجتناب ــ خوراک ــ گوشت ــ شکار ــ سبزیات ــ رال ــ کھانے کا طریقہ ــ تعداد ازواج ــ اکثر زیادہ ــ مثالیں ــ عورتوں کا احترام ــ باہر آنے کی اجازت ــ محدود ــ غلام ــ ان کا حصول ــ ان پر مہربانی ــ پہلی دفعہ کا سلوک ــ اس میں تبدیلی ــ ثبوت بذریعہ کہانی ــ لباس ــ قمیص ــ شلوار ــ ٹوپی ــ سرداروں کا لباس ــ غربا ــ عورتوں کی پوشاک ــ جسم کی فحش عریانی ــ دوشیزاؤں کے بال ــ باندھنے کا طریقہ ــ بوڑھی عورتیں ــ باہر نکلتے وقت ملفوف ــ گھر میں ایسا نہیں ــ ثبوت ــ سپاہی کے آلات ــ تکلیف دہ ــ انداز جنگ ــ آلات ــ کہاں سے لئے جاتے ہیں ــ دیسی ساخت ــ تفریحات ــ نشانہ بازی ــ شکار ــ کتوں سے شکار ــ پٹائی ــ کشتی ــ تلواریں ــ نیزے ــ مہارت ــ نیزہ بازی ــ طریقہ ــ خطرناک ــ ضرورت تگ و دو ــ ماتمی رسومات ــ مسلمانوں جیسی ــ فاتحہ خوانی ــ شب بیداری سے مقابلہ ــ شادی کی رسومات ــ آغاز ــ سانگ یا منگنی ــ ماہیت ــ نذرانے ــ جوڑا ــ باہمی سلوک ــ تقریب ــ دولہا کا رویہ مابعد ــ پختگی ــ جہیز ــ مصنف کی رائے ــ تبصرہ ــ کردار ــ نسوانی عزت ــ یہودی مذہب ــ قوانین ــ مثالیں ــ خطرناک اثرات شاذ ــ براہوئی ــ قبائل ــ خیل ــ خانہ بدوش لوگ ــ سخت جان ــ خط و خال میں بلوچوں سے مقابلہ ــ پیشے ــ دستکاریاں ــ خوراک ــ بسیار خوری ــ گوشت ــ گوشت خوری کی وجہ ــ گوشت محفوظ کرنے کا طریقہ ــ بے حد لذیذ ــ حفاظتی اقدامات ــ براہوئی وفادار ــ مہمان نواز ــ محنتی ــ مصنف کا ان کے کردار کا مقابلہ ــ عظیم بہادری ــ سرداروں کے

اختیارات ـ اکھڑپن ـ ناگوار نہیں ـ شکر گذار ـ تفریحات ـ نشانہ باز ـ تلواریں ـ نیزے ندارد ـ مردانہ لباس ـ گھریلو کام ـ عورتیں آزاد ـ زنانہ لباس ـ مذہب ـ شادی ـ تجہیز وتکفین ـ سادگی ـ براہوئی قبائل کی فہرست ـ سردار ـ تعداد ـ پیچیدہ موضوع ـ مختلف ناموں کا تجزیہ ـ اکثر تبدیلی پذیر باہمی شادیاں ـ ایک قبیلہ کی مخصوص تقسیم ـ رند بلوچوں اور براہوئیوں کے تکلفات ـ ہندو ـ جینے کا حق ـ حکومت سے ان کے خدشات ـ تعداد ـ روایت غمگین ـ وجہ ـ مصنف کا تبصرہ ـ ہندو ـ دھرم پیسہ ـ کیا ہے ـ برہمن ـ گوشت خور ـ سختی نہیں ـ مثالیں ـ ہندو لباس ـ شکل وشباہت ـ حساب کتاب ـ زبان ـ بابی ـ غیر اہم قبیلہ ـ ملک ـ پیشے ـ سوداگر ـ گجرات ـ دہوار یا دہقان ـ کون ہیں ـ ماخذ غیر یقینی ـ زبان ـ قیاس ـ غلط ـ پیشے ـ بیگار کی مختلف قسمیں ـ حقوق ومراعات ـ عادات واطوار ـ دوسرے قبائل میں شادی کی ممانعت ـ مذہب ـ گھریلو زندگی ـ عورتوں سے سلوک ـ تاجیک ـ کون ہیں ـ نتیجہ ـ مزید طبقے ـ بحث کا التوا ـ

بلوچ آبادی کا جزو اعظم ہیں بلکہ شاید صاف گوئی سے کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ پورے بلوچستان کی آبادی ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جن کا ماخذ مبہم ہے اور جن کی تاریخ دیگر وحشیانہ قبائل کی مانند رومانوی داستانوں اور حیرت انگیز قصوں سے اتنی مملو ہے کہ مجھے ایک یا دوسرے کو قابل یقین شکل دینا بے حد مشکل ثابت ہوا ۔ یہ دو بڑے طبقوں یا حصوں پر مشتمل ہیں جو علیحدہ علیحدہ بلوچ اور براہوئی کہلاتے ہیں اور یہ دونوں بے حساب قبائل میں تقسیم در تقسیم ہیں جن کے نام معمولی ترین واقعات سے ماخوذ ہیں اور ان کی وجہ تسمیہ معلوم کرنا سراسر ناممکن ہے ۔ عام طور پر اُن کے نام اُن کے مخدوم سرداروں یا آبائی علاقوں یا روایات نسلی پر مبنی ہیں ۔ ان دونوں متقدر طبقوں کے درمیان طغرائے امتیاز اُن کی زبانیں اور شکل وشباہت ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم رنگ وہم

قوم لوگوں میں زبان اور خط وخال کا ایسا اور اتنا فرق شاید ہی کہیں اور ملے گا۔ بلوچی یا بلوچکی میں موجودہ فارسی کے روزمرہ کا رنگ پایا جاتا ہے اور کم وبیش اس کی آدھی لغت اسی زبان سے ماخوذ ہے جو ایک مسخ شدہ اور ناقابل وضاحت تلفظ کا بہروپ لئے ہوئے ہے لیکن صوتی مماثلت اتنی ہے کہ ان لوگوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے میں نے محض اپنی فارسی دانی کی وجہ سے بلوچی میں بولا جانیوالا قریباً ہر فقرہ سمجھ لیا۔ اس کے برعکس براہوئیکی صوتی و تشکیلی اعتبار سے اتنی مختلف ہے کہ مجھے اس میں فارسی روزمرہ کا شائبہ تک نہ ملا۔ اس میں قدیم ہندوی الفاظ کا کافی حصّہ ہے جو ان لوگوں کے تاریخی بیان میں مذکور ہوگا اور جو سماعت کو پنجابی کا تأثر دیتا ہے یعنی وہ زبان جو ہندوستان کے حصّہ موسومہ بہ پنجاب میں بولی جاتی ہے۔[1]

ان دونوں طبقوں کے لوگوں کا ناک نقشہ اکثر و بیشتر ان کی زبانوں کی مانند غیر مشابہ ہے بشرطیکہ وہ اپنی اپنی جگہ علیحدہ آباؤ اجداد کے وارث ہوں لیکن بکثرت باہمی شادیوں کی وجہ سے ان دونوں کے مخصوص خصائص کچھ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ بہت سے خاندانوں بلکہ پورے کے پورے قبائل میں یہ امتیازات یکسر مٹ گئے ہیں لہٰذا ان کی اولاد ایک تیسرا طبقہ بن گئی ہے جو شاید ناک نقشہ میں اپنے آباؤ اجداد سے معمولی تفاوت ہی رکھتی ہو اور ایک یا دوسرے طبقے میں شامل ہو۔ میں ایک دفعہ پھر اُلجھن دُور کرنے کے لئے یہ دُہرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجموعی آبادی بلوچ ہی کہلاتی ہے خواہ وہ ایک طبقہ سے ہو یا دوسرے سے لیکن چونکہ ان پر الگ الگ غور کیا جائے گا لہٰذا میں آئندہ بلوچ یا براہوئی کی تخصیص کرتا رہوں گا۔

اس پیچیدہ موضوع پر مجھے جتنی زیادہ سے زیادہ مصدقہ و موثقہ معلومات حاصل ہوئیں ان کے مطابق بلوچ پہلے پہل تین عظیم قبائل موسومہ بہ ناہروئی، رند اور مگسی سے برآمد ہوئے۔

---

[1] میں یہاں صرف صوتی لحاظ سے ذکر کر رہا ہوں ورنہ میں ان دونوں زیر موازنہ زبانوں سے یکساں طور پر نابلد ہوں۔

اوّل الذکر یا ناہروئی زیادہ تر بلوچستان کے اس حصّہ میں آباد ہیں جو صحرا کے مغرب کی طرف ہے۔ ان کے خیل یا معاشرے قلات کے شمال مغرب میں ایک گاؤں نوشکی اور ملک سیستان میں بھی ہیں۔ دیگر دونو قبائل رند اور مگسی مشرق کی طرف کے نشیبی علاقہ کچھ گنداوا میں آباد ہیں جو پہاڑوں کے دامن میں ہے اور زرخیز میدان ہے اور جہاں وہ مختلف ادوار میں صوبہ مکران سے آکر آباد ہوئے ہیں اور خان قلات کی رعایا کی حیثیت سے جٹوں یا کاشتکاروں سے گھل مل گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ کچھ گنداوا کی شمال مشرقی پہاڑیوں میں بھی رہتے ہیں اور قلات کے شمالی صحرا کی سرحدوں پر بھی[1]۔

ناہروئی قبیلہ کے ذیلی حصّے آٹھ یا دس ہیں اور رندوں اور مگسیوں کے ان سے دوگنا سے بھی بہت بہت زیادہ۔ میں ان تینوں میں سے صرف اُن قبائل کی ایک فہرست نیچے دے رہا ہوں جن کی اور جن کے سرداروں کی میں تصدیق کر سکا۔ میں ان میں سے چند ایک کے جنگ آزماؤں کی اعلانیہ تعداد کا بھی اضافہ کر رہا ہوں گو میرے خیال میں یہ کافی حد تک مبالغہ آمیز ہے۔

---

[1] مجھے آگے بڑھتے ہوئے مفصّل تشریح کے فوائد کا احساس ہے لیکن اس قسم کے بیان میں ہر زیرِ تذکرہ جگہ پر نوٹ لکھنا طول امل ہوگا۔

ناہروئی بلوچ قبائل[1]

	نام	تعداد	سردار
۱	رخشانی	۷۰۰	محراب خان
۲	ساجدی	۴۵۰	میر شاہ سوار
۳	خاسگی	۱۵۰	-
۴	کُرد یا شہیدی	۴,۵۰۰	اُلفت خان
۵	مِنگ یا مِند	۳۰۰	شاہسوار خان
۶	اُربابی	۶,۰۰۰	شاہ محراب خان
۷	مُلکیہ	۲۵۰	عیسیٰ خان

۱ اس طبقہ یا حصّہ کا سربراہ نمبر اوّل سے تعلق رکھتا ہے اور نتیجتہً سب کے سب عام بول چال میں اسی نام سے ناہروئی سے ممیّز کئے جاتے ہیں لیکن محراب خان کا اختیار اقتدار برائے نام ہے۔

رِند بلوچ قبائل

	نام	تعداد	سردار
۱	رِندانی	۸,۰۰۰	سردار خان
۲	غلام بولک	۷۰۰	-
۳	پُنغ	۳۰۰	میر صاحب
۴	گُلنبانی	۸۰۰	
۵	دنیاری	۷۰۰	فیض اللہ خان
۶	پُشر	۶۰۰	-

	نام	تعداد	سردار
۷	گلوئی	۷۰۰	فیض اللہ خان
۸	جتوئی	۷۵	-
۹	ڈومبکی	-	-
۱۰	بُلیدی	۹۰۰	میر سیف الدین
۱۱	دوانکی	۸۰	-
۱۲	خارانی	۱,۰۰۰	میر عباس
۱۳	عمرانی	۴,۰۰۰	ثابت خان
۱۴	کھوسہ	۱۵۰	شمشیر خان
۱۵	چھانگیہ	۱۰۰	میر بہادر
۱۶	نوشیروانی	۷۰۰	سکندر خان
۱۷	بگٹی	-	-
۱۸	مری	-	-
۱۹	گورچانی	۳,۰۰۰	فتو (فتح؟) خان
۲۰	مزاری	۲,۵۰۰	-
۲۱	دریشک	۵۰۰	-
۲۲	لغاری	۵,۰۰۰	جمال خان
۲۳	لُرد	۱,۰۰۰	محمد خان
۲۴	چاچڑی	۱,۵۰۰	
۲۵	مندستری	۱,۵۰۰	لشکر خان

مگسی بلوچ قبائل

	نام	تعداد	سردار
۱	مگسی	۸،۰۰۰	جعفر خان
۲	ابڑو	۳،۰۰۰	قائم خان
۳	لاشاری	۲۰،۰۰۰	غلام محمد خان
۴	ماتھی	۱،۰۰۰	علی محمد
۵	بُردی	۲۰۰	جلال خان
۶	اُونڑہ	-	دریا خان
۷	ناری	۵۰۰	-
۸	جتکی	۴،۰۰۰	-
۹	قلندرانی	۷۰۰	نور خان
۱۰	مُوسائی	۶،۰۰۰	کریم خان
۱۱	ٹُکرانی	-	-
۱۲	جھکرانی	-	-
۱۳	عیسوبانی	-	-
۱۴	ٹُکرا	-	-
۱۵	جلالی	-	-
۱۶	تُربند زئی	-	-

رند بلوچوں کے آخری نو مذکورہ بالا قبائل کچھ گنداوا کے شمال مشرق میں واقع پہاڑی علاقوں میں آباد ہیں۔ ممکن ہے اس طبقہ میں کچھ اور قبائل بھی ہوں۔ یہی حال مگسیوں کا ہے جن کا ذکر

صوبہ سندھ کے بیان میں آئے گا۔

ناہروئی عموماً طویل القامت، خوبرو اور مستعد لوگ ہیں۔ ان میں زور تو زیادہ نہیں ہوتا لیکن وہ آب و ہوا اور موسموں کے تغیرات کے خوگر اور ہمہ نوعی جفاکشی کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ موت سے نہیں ڈرتے اور جنگ میں بہت پامردی سے لڑتے ہیں بشرطیکہ ایسا سالار میسر ہو جو انہیں دادِ شجاعت دینے کے لئے مناسب مقام پر لے جا سکے۔ وہ قوانین اور انسانی احساسات سے بے نیاز ہیں اور بلوچوں کا بے حد وحشیانہ اور قزاقانہ حصہ ہیں۔ وہ انفرادی چوریوں کو انتہائی معیوب اور شرمناک سمجھتے ہیں لیکن کسی علاقے کو تاخت و تاراج کرنا مستحسن گردانتے ہیں اور اسے بہادری کا کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ اسی احساس کے زیر اثر وہ ایسے مواقع پر انفرادی طور پر باقاعدہ شمار کرتے ہیں کہ ہر ایک نے کتنے مرد، عورتیں اور بچے قید کئے، اٹھا کر لے آئے یا قتل کئے، کتنے گاؤں جلائے اور لوٹے اور کتنے ریوڑ ہنکا کر نہ لا سکنے کی وجہ سے موت کے گھاٹ اتار دیئے۔

یہ غیر قانونی حملے جن میں یہ ظلم و ستم روا رکھا جاتا ہے۔ یہاں چپاؤ کہلاتے ہیں۔ چونکہ یہ سرداروں کی زیر نگرانی و سرکردگی کئے جاتے ہیں لہٰذا یہ ان کے لئے ذریعۂ آمدنی ہیں۔ قزاق عموماً شتر سوار ہوتے ہیں اور فاصلہ کے مطابق خوراک (یعنی کھجور، ترش پنیر اور روٹی) کا ذخیرہ بھی ساتھ لیتے ہیں۔ وہ صحراؤں کی وجہ سے ایک چرمی تھیلے میں پانی بھی حسب ضرورت ساتھ رکھتے ہیں۔ پوری تیاری کے بعد وہ روانہ ہوتے ہیں اور چپاؤ کے مقام سے چند میل ورے تک مسلسل چلتے ہیں۔ یہاں وہ کسی جنگل یا غیر مانوس جگہ پر ٹھہرتے ہیں تاکہ ان کے اونٹ آرام کر سکیں۔ رات کے وقت وہ پھر سوار ہوتے ہیں اور جونہی باشندے آرام پذیر ہوتے ہیں وہ آتش زنی، تباہ کاری اور جو کچھ ملے اسے قبضانے سے اپنا حملہ شروع کرتے ہیں۔ وہ چپاؤ میں ایک لمحہ بھی نہیں رکتے بلکہ زیر حملہ علاقے میں اسی نوے میل یومیہ رفتار سے بھاگتے پھرتے ہیں حتیٰ کہ وہ جتنا مال سمیٹ سکتے ہیں اپنے اونٹوں پر لاد لیتے ہیں اور چونکہ ان جانوروں کو

سنبھالنے میں ماہر ہیں لہٰذا ہر آدمی دس بارہ اونٹوں کو سنبھالتا ہے۔ اگر ممکن ہو تو وہ اپنی آمد کے راستے کی بجائے کسی دوسرے راستے سے واپس جاتے ہیں۔ دوسرے راستے سے جانے میں لوٹ مار کا دوہرا امکان ہوتا ہے اور تعاقب کنندگان کو بھی گمراہ کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے مگر مؤخرالذکر کی زیادہ تعداد ان کے اس حربے کو ناکام بنا دیتی ہے۔

چپاؤ کا یہ حال مختلف بلوچ چپاؤ کاروں نے مجھے بتایا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ بہت سے لٹیرے جو رات کے وقت اپنے ساتھیوں سے بچھڑ اور بچھڑ جاتے ہیں پکڑے جاتے ہیں، ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جاتے ہیں اور مشتعل باشندے بہت بیدردی سے انہیں مار ڈالتے ہیں۔ کچھ دوبدو لڑائی میں مارے جاتے ہیں اور بعض تھکاوٹ اور بے آرامی کی وجہ سے ختم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا صرف یقینی مال غنیمت ہی بلوچوں کو یوں سربکف ہونے پر آمادہ کر سکتا ہے لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کو پہلے سے خبر ہو جاتی ہے اور وہ انہیں پسپا کرنے کے اقدامات کر لیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ جو جزوی طور پر کامیاب ہوتے ہیں وہ بھی بمشکل ان اونٹوں کا خسارہ پورا کرتے ہیں جو چپاؤ کے دوران یا اس کے بعد زیادتی کار کی نذر ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ڈاکو اپنی دلیری سے خوب ہاتھ رنگتے ہیں اور محراب خان رخشانی نے خود مجھے بتایا کہ اس نے ایرانی صوبہ لارستان کے ایک چپاؤ میں چھ ہزار روپے کے مساوی غلام اور دیگر مال غنیمت بطور حصہ وصول کیے جو ایک وحشی کے نکتہ نظر سے خاصی بڑی رقم ہے۔

رند اور مگسی عادات و اطوار اور طرز زندگی میں ناہرویوں کی نسبت لوٹ مار کے کم عادی ہیں لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آیا یہ خان قلات کے خوف کا نتیجہ ہے یا انہیں قتل و غارت سے پیدائشی نفرت ہے۔ میرے خیال میں خان کا خوف زیادہ مؤثر رہا ہے۔ کیونکہ مزاری، درلیشک اور دیگر رند قبائل جو پہاڑیوں میں رہتے ہیں اور خان کے شکنجۂ اقتدار سے باہر ہیں، مسافروں کے قتل و غارت کے زیادہ مرتکب ہوتے ہیں۔ ان کا یہ کشت و خون ناہرویوں سے بھی زیادہ قابل مذمت ہے کیونکہ ناہروئی ہمیشہ اپنے آپ کو ہمسایہ اقوام سے برسر پیکار سمجھتے ہیں اور مذکورہ بالا

چیاؤ گویا اسی کا عملی اظہار ہے۔ رند اور مگسی قد و قامت میں ناہرو ئیوں کے مشابہ ہیں اور انہی کی طرح اچھے ناک نقشہ اور چہرے مہرے کے مالک ہیں لیکن وہ ان جیسی جفاکشی اور سخت جانی کے اہل نہیں ہیں۔ ان کے موجودہ علاقہ کی آب و ہوا نے انہیں مضمحل کر دیا ہے اور وہ اس قوت جسم و ذہن سے محروم ہو گئے ہیں جو صوبہ مکران کے قیام کے دوران انہیں نصیب تھی اور جو اب بھی پہاڑی قبائل مذکورہ میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ ناہرو ئیوں کی نسبت سانولے رنگ کے ہیں جس کی وجہ بھی کچھ گندا وا کی آب و ہوا ہے۔ ان دونو حصوں یا ان سے برآمد ہونے والے قبائل کے جو آدمی بھی مجھے دوران سفر یا ہندوستان میں واپسی کے بعد ملے ان کے عادات و اطوار اور شکل و شباہت میں مجھے کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوا۔ ایک اجنبی تو ان سب کو ایک ہی طبقہ کے لوگ سمجھ سکتا ہے لیکن یہ بات ناہروئی اور اس کے مختلف ذیلی قبائل پر صادق نہیں آتی۔ چونکہ مجھے کتاب کے دوران ان کا باہمی تفاوت بیان کرنے کا موقعہ ملے گا۔ لہذا میں فی الحال بلوچ کردار کا خاکہ ہی جاری رکھوں گا اور ان نکات پر زور دوں گا جن میں وہ مشترک معلوم ہوتے ہیں۔

مغرب کی طرف کی چند مستثنیات کو چھوڑ کر وہ مذہب کے لحاظ سے سُنّی مسلمان ہیں[1] اور اہلِ تشیع سے سخت متنفر اور ان کے کٹر دشمن ہیں۔ اور بلوچستان میں شیعہ بن کر رہنا عیسائی بن کر رہنے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

ایک بلوچ کی مہمان نوازی ضرب المثل ہے اور مجھے اس کی روایت ملک کے ہر حصہ میں نظر آئی۔ ان کے ہاں چوری بدترین فعل سمجھا جاتا ہے اور اگر ایک دفعہ وہ کسی کی درخواست یا ضرورت

---

[1] سنّی وہ مسلمان ہیں جو آنحضورؐ کے قانونی جانشین ائمۂ اربعہ یعنی حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو سمجھتے ہیں جب کہ شیعہ صرف حضرت علیؓ کو ان کے بھتیجے داماد ہونے کی حیثیت سے حقدار گردانتے ہیں۔

پر اسے پناہ دے دیں تو وہ اسے نبھانے کے لئے اپنی جان پر بھی کھیل جاتے ہیں ۔ وہ برضا و رغبت اور پھرتی سے اپنے سرداروں کا حکم مانتے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ اطاعت گذاری اس لئے ہے کہ وہ حکم کی معقولیت پر اعتماد رکھتے ہیں اور اپنے قبائلی وقار کو قائم رکھنا چاہتے ہیں جو بہت حد تک سرداروں پر منحصر ہوتا ہے نہ کہ بوجہ حرمت و عقیدت کیونکہ میں نے کئی بار دیکھا کہ وہ سرداروں کی موجودگی میں بھی ان کے اختیار کو خاطر میں نہ لائے ۔ عادات و اطوار کے لحاظ سے بلوچ مجموعی طور پر شانی ہیں ۔ وہ عموماً گدانوں میں رہتے ہیں جو کالی اون یا کھردرے کمبلوں کا بنا ہوا ہوتا ہے اور گز یا ٹمرس کی ٹہنیوں کے ڈھانچے پر ڈال کر بنایا جاتا ہے ۔ ان گدانوں کا مجموعہ تمن یا گاؤں کہلاتا ہے اور اس کے باشندے خیل یا معاشرہ بنتے ہیں جس کی ہیئت ترکیبی سے ظاہر ہے کہ وہ ایک ہی قبیلہ میں بے شمار ہو سکتے ہیں ۔ مجھے پتہ ہے کہ نصف درجن مثالوں میں وہ بیس یا تیس سے بھی زیادہ تھے ۔ ان میں باہمی امتیاز لفظ خیل کے ساتھ کوئی اعزازی سابقہ جیسے امیری، داؤدی، سرداری وغیرہ لگانے سے کیا جاتا ہے جیسے امیری خیل (شریفانہ معاشرہ) داؤدی خیل (داؤد کا معاشرہ) وغیرہ وغیرہ ۔ قبائل کی خیلوں میں یوں تقسیم ایک سطح بین مبصر کو پریشان کر سکتی ہے ۔ بالخصوص اس لئے کہ ان کے یہ امتیازی القاب نقل مکانی کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں مثلاً جب میں صحرا کے کنارے یعنی نوشکی میں تھا تو مجھے قریباً دو میل دور ایک مینگل براہوی (جن کا وطن مالوف قلات کے جنوب میں ہے) خیل نظر آیا ۔ ایک قبائلی سے اس کا قبیلہ پوچھا تو اس نے مینگل بتایا اور خیل پوچھا تو نوشکی جواب دیا یعنی نوشکی خیل یا نوشکی کا معاشرہ ۔ یہ درست ہے کہ بعض بلوچ خصوصاً ناہردنی خیموں کی بجائے کچے مکانوں بلکہ قلعوں میں رہنا پسند کرتے ہیں اور مغربی بلوچستان میں تو ایسے مناظر بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ آدھا خیل گدان نشین ہے اور آدھا جھونپڑیوں میں مقیم میرے خیال میں سردی کی وجہ سے مکانوں کو ترجیح دی جاتی ہے ۔

ان کے ہاں مہمانوں کا استقبال سادہ لیکن مؤثر ہوتا ہے ۔ جب ایک نووارد تمن میں پہنچتا ہے

تو مہمان خانہ (جو بلوچستان کے ہر گاؤں میں یا قصبہ میں موجود ہے) کے دروازے کے سامنے ایک دری بچھائی جاتی ہے۔ اس کے فوراً ہی بعد سردار یا سربراہ خیل آتا ہے اور مہمان سے بغلگیری اور دست بوسی کے بعد وہ اپنے آدمیوں کو اس سے ملاتا ہے اور مہمان کا ہاتھ انہیں تھماتا ہے جسے وہ اپنی پیشانی سے ملتے اور ہونٹوں کا بوسہ دیتے ہیں۔ یہاں تک استقبال کامل خاموشی میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد طرفین بیٹھ جاتے ہیں اور سردار اس سے مخاطب ہوکر اس کا حال پوچھتا ہے۔ نووارد معمول کے مطابق اس کا جواب دیتا ہے۔ پھر وہ اس کے خاندان، احباب اور اس کے موجود آدمیوں کی صحت کا پوچھتا ہے جس پر مہمان اُن کی طرف دیکھتا ہے اور وہ خیریت کے اثبات میں سر ہلاتے ہیں، اسیطرح مہمان سردار، اُس کے خاندان، خیل، پیروکاروں اور دوستوں کی خیرت پوچھتا ہے اور یوں یہ تقریب ختم ہوتی ہے۔ فطرتاً بلوچ انتہائی سُست لوگ ہیں اور اگر وہ کسی مرغوب مشغلہ میں مصروف نہ ہوں تو سارا دن گداموں میں گھومتے پھرتے، تمباکو پیتے اور جُوا کھیلتے گذار دیتے ہیں۔ بہت سوں پر تو افیم خوری اور بھنگ خوری کی بھی لعنت سوار ہے لیکن میری دید و شنید میں کوئی شراب نوش نہیں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بادہ نوشی کی لعنت سے مامون و مصئون ہیں۔ گندم اور جوار کی روٹی، چاول، کھجور، پنیر، دودھ میٹھا اور ترُشس جو اُنہیں بے حد مرغوب ہے، مٹر شوربا جس میں سُرخ مرچ اور دیگر مصالحہ جات ہوتے ہیں، گوشت جب بھی انہیں میسر ہو مشمولہ بہ شتر بچوں اور شکار کا گوشت، سبزیاں بالخصوص لہسن، پیاز اور رال کے پودے کے پتے اور تنا جو وہ مکھن یا گھی میں بھُون لیتے ہیں، اُن کی پسندیدہ اشیائے خوردنی ہیں۔ وہ عموماً ایک یا دو بیویوں کے مالک ہوتے ہیں اور اُن کے سردار چار کے لیکن یہ سراسر ان کی مرضی پر منحصر ہے۔ میں نے کمتر ین لوگوں کو دیکھا جن کی سات یا آٹھ بیویاں زندہ تھیں اور رخشانی سردار، محراب خان نے میرے اس کے صدر مقام کے دوران سولہویں شادی رچائی۔ وہ اپنی مستورات کا احترام کرتے ہیں لیکن وہ مسلمانوں کے سواد اعظم کی مانند غیر محرموں سے اُن کی روپوشی پر اتنے مُصر نہیں ہوتے گو وہ ہر وقت اُن کا باہر پھرنا پسند

ہیں کرتے ۔

بلوچوں کے ہاں دو نو اصناف کے بہت سے غلام ہوتے ہیں جو چپاؤ کا ثمرہ ہیں لیکن اُن کا اُن سے مشفقانہ اور فراخدلانہ سلوک طمانیت بخش ہے ۔ شروع شروع میں تو وہ اپنے آپکو بدنصیب ترین خلائق سمجھتے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ اُس وقت اُن کے ساتھ سلوک بھی سخت ناروا اور رُوح فرسا ہوتا ہے ۔ اُن کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اُنہیں اُونٹوں کے اوپر باندھ دیا جاتا ہے تاکہ ان کی واپسی کا امکان ہی نہ رہے ۔ عورتوں کے بال اور مردوں کی داڑھیاں بھی مونڈ دیئے جاتے ہیں اور ان کی جڑیں بھی ایک سفوف سے ختم کر دی جاتی ہیں تاکہ وہ اپنی آبائی سرزمین میں جانے کا سوچیں بھی نہیں لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ راضی برضا ہو جاتے ہیں ۔ اور بہت وفادار خادم بن جاتے ہیں ۔ میں ایک کہانی کے ذریعے آقا اور غلام کے تعلقات کی نوعیت کو واضح کروں گا ۔ کیپٹن کرسٹی نے سردار نوشکی عبدل خان رخشانی سے گفتگو کرتے ہوئے اظہار حیرت کیا کہ اتنے سارے غلام بلا نگرانی کیونکر اتنی محنت سے کام کرتے تھے ۔ اُس نے کہا "وہ کیوں نہ کریں ؟ اُنہیں میرے دیگر افراد خاندان کی طرح کپڑے ، خوراک اور سلوک ملتا ہے اور اگر وہ محنت نہ کریں تو وہ جانتے ہیں کہ روٹی کمیاب ہو گی اور اُنہیں اور ہم سب کو تکلیف ہو گی ۔ بہبات میں ان کا اپنا مفاد ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مجھے جو کچھ ملے گا اُسی کا حصہ وہ بھی پائیں گے " ۔ کیپٹن کرسٹی نے ان باتوں کی معقولیت سے اتفاق کیا لیکن کہا کہ وہ شاید بھاگ جانا پسند کریں ۔ بوڑھے سردار نے جواب دیا " ہرگز نہیں ! وہ اتنے عقلمند ہیں کہ ہرگز ایسی کوشش نہیں کرتے ۔ اوّلاً وہ اپنے علاقے کا راستہ ہی نہیں جانتے لیکن اگر وہ جانتے بھی ہوں تو وہ کیوں واپس جانا چاہیں گے ؟ وہ یہاں بہت خوش ہیں اور بیشتر دنیاوی تفکرات سے آزاد ہیں ۔ اگر وہ اپنے گھر پر ہوتے تو اس سے دوگنی محنت کرنے اور پھر روٹی ، کپڑا اور مکان کے بکھیڑے بھی ہوتے ۔ موجودہ حالات میں وہ ان ضروریات کا کفیل مجھے سمجھتے ہیں ۔ مختصراً ان کے احساسات کا اندازہ لگانے کے لئے میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اُن میں

سے کسی کو بدترین سزا جو ہم دے سکتے ہیں یہ ہے کہ ہم اُسکے کام سے محروم کر دیں"۔

بلوچوں کا عام لباس ایک کھردری سفید یا نیلی کیلیکو کی قمیص ہوتی ہے جو سینے پر چودہ انچ کے قریب کھلی ہوتی ہے، گلے پر بٹن ہوتے ہیں اور گھٹنے سے بھی نیچے تک لمبی ہوتی ہے۔ ان کی شلوار بھی اسی کپڑے یا دھاری دار سُوسی کی بنتی ہے اور ٹخنوں کے گرد اس پر چنٹیں ڈالی جاتی ہیں۔ وہ اپنے سروں پر ہمیشہ اور صرف ایک چھوٹی سی ریشمی یا سوتی سلی ہوئی ٹوپی پہنتے ہیں جو ان کے کاسۂ سر کے عین مطابق ہوتی ہے۔ پورے لباس میں وہ اس کے اُوپر نیلی یا چارخانہ دار پگڑی باندھتے ہیں اور اسی رنگ کا کمربند اپنی کمر کے گرد باندھ لیتے ہیں۔ سردار اور ان کے رشتہ دار سردی کے موسم میں چھینٹ کی اَنگَرکھی پہن لیتے ہیں جو روئی سے بھری ہوئی ہوتی ہے اور غریب لوگ باہر جاتے وقت بکری کے بالوں اور بھیڑ کی اُون سے بنے ہوئے کپڑے کا اوورکوٹ پہن لیتے ہیں۔ عورتوں کا لباس بھی مردوں کے لباس سے ملتا جلتا ہے لیکن اُن کی قمیصیں عموماً سُوتی ہوتی ہیں، سُرخ یا بھُورے رنگ میں رنگی جاتی ہیں۔ ایڑیوں تک لمبی ہوتی ہیں اور سینے کے نیچے سامنے سے کھلی ہوئی ہوتی ہیں اور چونکہ وہ ان کے نیچے سے کچھ نہیں پہنتیں لہٰذا ان کے جسم کافی حد تک نظر آتے ہیں۔ ان کی شلواریں غیر ضروری حد تک چوڑی ہوتی ہیں اور ریشم یا ریشم اور سُوت کے ملاپ سے بنائی جاتی ہیں۔ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ لڑکیاں اپنے بالوں کو نہایت خوبی سے باندھتی ہیں۔ وہ انہیں مختلف زُلفوں میں تقسیم کرتی ہیں اور انہیں سر کے گرد بل دیتے ہوئے ان کے سروں کو ایک گرہ کی صورت میں چوٹی پر باندھ لیتی ہیں۔ یہ گرہ بہت صاف ستھری ہوتی ہے اور میں نے کئی دفعہ تھوڑے فاصلے سے اسے ٹوپی سمجھا۔ بوڑھی عورتیں اپنے سروں کے گرد رومال باندھتی ہیں جن پر ریشم یا اُون کے پھُول کاڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب نوجوان اور بوڑھی عورتیں باہر نکلتی ہیں تو وہ اپنے چہروں کو ایسے ڈھانپ لیتی ہیں کہ نظر نہ آئیں لیکن اپنے گھروں میں وہ اس پابندی بلکہ رُو بندی کی عادی نہیں اور جب میں نوشکی میں تھا تو میں اکثر سردار کے گدان میں

جاتا تھا جب اُس کا پُورا خاندان موجود ہوتا تھا۔

بلوچ سپاہی سرتاپا مسلح ہو تو وہ بہت بارعب اور ہیبت انگیز ہوتا ہے۔ اُس کے پاس توڑے دار بندوق، تلوار، نیزہ، خنجر اور ڈھال ہوتے ہیں اور ان کے علاوہ بہت سی بارُود کی ڈبیاں، نرسنگھے اور تھیلیاں ہوتی ہیں۔ تھیلیوں میں گولے، گولیاں، چقماق، آتشگیر ڈبے اور دیگر جنگی آلات ہوتے ہیں جو لامحالہ اُسے اچھا خاصا زیر بار رکھتے ہیں لیکن وہ اس کی پرواہ نہیں کرتا بلکہ جنگ آزما کی قوت کا اندازہ اُس کے جنگی ساز وسامان کے وزن سے لگایا جاتا ہے۔ وہ سب کے سب پکے نشانہ باز ہوتے ہیں لہٰذا جنگ میں جہاں تک ممکن ہو دُوبدو لڑائی سے گریز کرتے ہیں لیکن جب کوئی چارہ کار نہ رہے تو وہ اپنا اسلحہ پھینک دیتے ہیں یا اپنی سواری کے اُونٹ یا گھوڑے کی ایک طرف لٹکا دیتے ہیں۔ ان کے بہترین اور مرغوب ترین آلات جنگ بیرونی ساخت کے ہیں۔ وہ توڑے دار بنا دیتے ہیں۔ تلواریں اور خنجر ایرانی یا خراسانی یا ہندوستانی لیتے ہیں، ڈھالیں ہندوستانی ہوتی ہیں اور نیزے سندھی، قلات میں توڑے دار بندوقوں، تلواروں اور نیزوں کا اسلحہ خانہ ہے لیکن وہ خان کے لئے مخصوص ہے لیکن مجھے ان کی صناعی ناقص اور بدنما معلوم ہوئی۔

بلوچوں کی تفریحات ایسی ہیں جیسی ایک وحشی اور غیر متمدن قوم سے متوقع ہو سکتی ہیں۔ وہ ہر قسم کے میدانی کھیلوں کے بے حد شوقین ہیں اور ان کا کافی وقت نشانہ بازی، بندوق سے شکار اور (کتّے سے شکار) میں گذرتا ہے۔ سگ دوڑ کے لئے وہ اپنے مھورے شکاری کتوں پر بہت توجہ دیتے ہیں۔ ایک اچھا شکاری کتّا دو تین اُونٹوں بلکہ ان سے بھی زیادہ قیمتی سمجھا جاتا ہے اور مجھے بتایا گیا کہ خان قلات نے تو ایک کتّے کے لئے چار سو روپیہ[1] بھی خرچ کیا ہے۔ چاند ماری، ڈنڈے بازی، کشتی، تلوار بازی اور نیزہ افگنی بھی ان کے پسندیدہ مشاغل میں اور

---

[1] پچاس پاؤنڈ (پاؤنڈ = آٹھ روپے)

ہمسایہ خیل ایک دوسرے سے مقابلے رکھتے ہیں۔ چاروں آخری مشاغل میں تو وہ سائنسی مہارت رکھتے ہیں اور چاند ماری میں تو وہ اتنے مشاق ہیں کہ میرے خیال میں وہ سرپٹ گھوڑے سے بھی چھ انچ مربع ہدف پر کامیاب نشانہ لگا سکتے ہیں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ دوران سفر ہمارے مختلف رہنما پچاس ساٹھ گز کے فاصلے سے ہر چھوٹے پرندے از قسم چنڈول، کنجشک وغیرہ کو صرف ایک گولی سے مار گراتے تھے اور پھر بھی وہ اسے اپنی نشانہ بازی کا کوئی کمال نہ گردانتے تھے۔ تفریحات کے بیان کو ختم کرنے سے پہلے اُن کی ایک مقبول لیکن خطرناک تفریح کا ذکر ضروری ہے اور وہ ہے نیزہ بازی۔ درمیانی جسامت کا ایک چوبی کھونٹا زمین میں گاڑ دیا جاتا ہے اور ایک گھوڑ سوار پوری رفتار پر اپنے نیزے سے اسے ایسے پھاڑتا ہے کہ اسے زمین سے اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کارنامے کا خطرہ اور وقت کھونٹے کی زمین میں گہرائی کے مطابق بڑھتا یا گھٹتا ہے لیکن آسان ترین شکل میں بھی اس میں بیک وقت گھوڑے اور نیزے کا چابکدستانہ استعمال اور اپنے بازو اور کلائی کا پُر زور اور اُستادانہ عمل درکار ہوتا ہے۔

بلوچوں کی شادی غمی کی رسومات سوائے چند معمولی جزئیات تمام مسلمانوں کی رسومات سے ملتی جلتی ہیں اور قرآن حکیم کی مقرر کردہ ہیں لہٰذا میرے تبصرے سے بے نیاز ہیں۔ جب ایک مریض فوری خطرے سے دوچار ہو تو ایک مُلّا کو بلایا جاتا ہے جو اُس کے سامنے قرآن حکیم پڑھتا ہے اور اس کی تفسیر کرتا ہے۔ یہ عمل وقفوں سے جاری رہتا ہے۔ موت کی صورت میں لوگوں کو فوراً ماتم کے لئے بلایا جاتا ہے اور مرحوم کے گھر میں تین دنوں اور راتوں تک مسلسل کھانا تیار کیا جاتا ہے تاکہ فاتحہ خوانوں کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ فاتحہ خوانی مُلّا پر بھی فرض ہے اور مرحوم خواہ امیر ہو یا غریب اُس کے رشتہ دار اس موقعہ پر زیادہ مہمانوں کے لئے ضرور بیقرار ہوتے ہیں اور اُن کی خاطر تواضع میں استطاعت سے بڑھ کر خرچ کرتے ہیں۔ اس رسم کے زبانی بیان سے ظاہر ہوا کہ یہ اس رسم سے ملتی جلتی ہے جو برطانیہ عظمیٰ میں شب بیداری

کہلاتی ہے۔ رات اسی عیش وطرب میں گذاری جاتی ہے گو یا وہ خواری نہیں ہوتی تاہم کھانے اور گپ بازی کے درمیان بلوچ لازماً خوشی مناتے ہیں اور فاتحہ خوانی ایک اجنبی کے لئے سوگ کے سوا سب کچھ معلوم ہوتی ہے۔ شادیوں کے سلسلہ میں بھی کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں اور وہ بھی مذکورہ بالا موضوع کی طرح غیر دلچسپ ہیں۔ جب ایک نوجوان کسی خاص بلوچ کی بیٹی سے شادی کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے تو وہ اپنے بھائی یا کسی قریبی رشتہ دار کو اُس کے پاس بھیجتا ہے تاکہ عندیہ لے اور شادی کی تجویز پیش کر سکے۔ اگر لڑکی کے باپ کو رشتہ پسند ہو تو وہ رضامند ہو جاتا ہے اور فوراً ہی طرفین کے درمیان تبادلہ تحائف کا ابتدائی فیصلہ ہو جاتا ہے۔ یہ باہمی معاہدہ ساںگ یعنی منگنی کہلاتا ہے اور گو یہ کبھی کبھار معتبرین کی موجودگی میں کیا جاتا ہے جب لڑکے اور لڑکی نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں ہوتا تاہم یہ اتنا مقدس سمجھا جاتا ہے کہ اسے کسی قسم کے حالات میں بھی فسخ نہیں کیا جاتا۔ اگر خدانخواستہ منگیتر فوت ہو جائے تو آداب عزت و شرافت کے تحت اُس کے بھائی کو لڑکی سے شادی کرنا ہو گی۔ لڑکے کی طرف سے تحائف اونٹوں، بھیڑوں، بکریوں اور دیگر مویشیوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور ساںگ بندی کے چند دن بعد سُسر کے گھر بھجوائے جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی تیار شدہ سامان ضیافت بھی ہوتا ہے جو پورے خیل کے لئے کافی ہوتا ہے بشرطیکہ نوجوان اتنے اخراجات کا متحمل ہو سکے۔ اگر ساںگ بندی لڑکی کی سنِ بلوغت سے پہلے طے کر دی جاتی ہے اور ایسی صورت میں دونو لڑکی کے گھر میں ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ لڑکا کبھی فرد خاندان کے ہمراہ جاتا ہے لیکن لڑکی لڑکے کے گھر میں ہرگز نہیں جا سکتی اور نہ ہی وہ دُوسروں کی موجودگی کے سوا ایک دُوسرے سے مل سکتے ہیں یا بات چیت کر سکتے ہیں۔ جونہی لڑکی گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لائق ہوئی، تو

---

[1] کہا جاتا ہے کہ افاغنہ میں بعض اوقات لڑکی کی ماں شادی سے پہلے دونو کے باہمی اظہار جذبات پر چشم پوشی سے کام لیتی ہے۔ اس رسم کو نامزد بازی کہتے ہیں یعنی نام دینا کیونکہ ماں اس وقت لڑکی کو

ایک ملّا دولھا اور دلہن کے احباب واقارب کی موجودگی میں نکاح پڑھاتا ہے۔ دولہا ایک دفعہ پھر حسبِ حیثیت خیل کو دعوت دیتا ہے اور چند دن تک تکمیل زفاف کے لئے اپنے سُسر کا مہمان رہتا ہے۔ اس کے بعد ساس اسے اپنی بیوی[1] کے ساتھ جانے کی اجازت دیتی ہے اور رخصتی کے وقت دولہا کو دلہن کا جہیز دکھایا جاتا ہے جو سانگ میں مقرر ہوا تھا اور جو کم و بیش اُسی قسم کا ہوتا ہے جو نوجوان نے شروع میں پیش کیا تھا یعنی کچھ کپڑا، دریاں اور دیگر گھریلو سامان جس کی دلہن والوں کو استطاعت ہو۔

مذکورہ نکتے اور اس کے متعلقات کی تحقیق کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ بلوچوں کی بہت سی رسمیں مُوسوی قانون کے مطابق ہیں حتیٰ کہ شادی کے اخلاقی قواعد وضوابط بھی لازماً اسی مقنن سے ماخوذ ہیں اور وہ اتنی سختی سے ان پر عمل پیرا ہیں اور ان کی صداقت کے قائل ہیں کہ ان میں شاذ و نادر ہی شادی شدہ جوڑوں میں زنا کی مثال ملتی ہے۔ آیا یہ باہمی وفاکیشی اتفاقیہ ہے اور موسوی قواعد وضوابط کی پابندی کا نتیجہ ہے یا یہ کسی دُور افتادہ وجہ کا نتیجہ ہے ــــــ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا میں جواب نہیں دے سکتا کیونکہ مجھے ان لوگوں کے ماخذ کا بہت ہی محدود علم ہے۔ زبانی اور تحریری روایت[2] انھیں افغانوں کی ایک شاخ کی حیثیت سے اسرائیلی بتاتی ہے لیکن وہ ان دونو باتوں کو بے بنیاد تہمت سمجھتے ہیں۔ صداقت خواہ کچھ بھی ہو، موجودہ بلوچوں میں نہ یہودیوں کی شکل وشباہت ہے نہ عادات واطوار۔ لیکن اس سے بھی ان کے یہودی النسل ہونے

عملی طور پر بیاہی ہوئی سمجھتی ہے۔ بلوچ ایسی رسم سے سخت متنفر ہیں اور مجھے یقین ہے کہ لڑکی کا باپ بھی اسے پسند نہیں کرتا خواہ وہ افغان ہی ہو۔

[1] دلہن کی ماں لازماً زفاف کے ثبوت دیکھتی ہے۔ اسی قسم کی رسم ارمنی لوگوں میں بھی ہے گو ناشائستہ حد تک ہے۔ یہ واضح طور پر یہودی رسم ہے۔

[2] دیکھئے ص ۹۷، پانچواں ایڈیشن، جلد دوم " ایشیاٹک ریسرچز"۔

کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ان کا یہودی الاصل ہونا مصدقہ حقیقت ہے تو بھی ان ممالک کے عرب اور دیگر فاتحین سے ان کے متواتر روابط ان کے ناک نقشہ کو بدل سکتے تھے گو انہوں نے بعض قدیم قوانین برقرار رکھے ہوں جو میرے علم کے مطابق قرآن حکیم کے مقرر کردہ نہیں ہیں۔ ایک نوجوان لڑکی کا شوہر مر جائے تو مرحوم کا بھائی لازماً اُس سے شادی کرتا ہے اور ان کی اولاد مرحوم کی جائیداد کی وارث ہوتی ہے۔ اگر مرحوم کا بھائی نہ ہو تو بیوہ کو دوسرا شوہر پسند کرنے کا اختیار ہے کیونکہ وہ لمحۂ عروسی سے ہی اپنے والد یا کسی دوسرے رشتہ دار کے دائرۂ اختیار سے آزاد ہے۔ شادی شدہ عورت کا اپنے شوہر کے گھر یا منگیتر دوشیزہ کا اپنے باپ کے گھر سے اُدھالا (فرار) بلوچ غیرت اور فرض کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ کوئی بھی صورت ہو عورت اور اُس کے آشنا کی موت ہی ان کے یہاں واحد مسلّمہ کفارہ ہے۔ لیکن بلوچستان میں یہ جرائم معدوم ہیں۔ ایک آدمی اپنی بیوی کو لات مار سکتا ہے[1] جسے اُس نے دوشیزہ سمجھ کر شادی کی ہو بشرطیکہ وہ اُس کی عصمت باختگی ثابت کر سکے۔ لیکن اس قانون کے اطلاق کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی۔ الزام کو ثابت کرنے کی مشکلات اور خاندانوں کے درمیان جانی دشمنی کے خطرات بے بنیاد بہتان کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔

اب ہم اہالیانِ بلوچستان کے دوسرے بڑے طبقے یا حصے یعنی براہوئیوں کی طرف آتے ہیں لیکن میں نے چونکہ اپنا مطالعہ اکثر و بیشتر بلوچوں اور ان لوگوں کے مقابلہ و موازنہ پر مرکوز کیا ہے لہٰذا میں یہاں صرف کچھ مختصر کوائف ہی درج کروں گا۔ وہ بھی بلوچوں کی مانند قبائل اور خیلوں کی غیر متعین تعداد میں تقسیم ہیں اور ابھی تک زیادہ تر خانہ بدوش قوم ہیں جو گرمی ملک کے ایک حصہ اور سردی کسی دوسرے حصہ میں گذارتی ہے۔ وہ اپنے ریوڑوں کے لئے چراگاہوں کی تلاش میں ہر سال کئی دفعہ سکونت بدلتے ہیں گو بلوچوں میں یہ دستور کمیاب ہے۔

---

[1] ڈیوٹرونومی، باب بائیسواں، جملہ ۱۳، ۱۴، ۱۵ وغیرہ۔

چُستی، طاقت اور سخت جانی میں شاید ہی اور لوگ ان کا لگا کھا سکیں۔ وہ کچھ گنداوا کے نشیبی میدانوں کی گرمی اور بلوچستان کے پہاڑی علاقوں کی سردی کے یکساں طور پر عادی ہیں۔ وہ ظواہر میں بلوچوں سے اتنے مختلف ہیں کہ ایک کو دوسرا سمجھ لینا ناممکن ہے۔ براہوئی اپنے ہموطنوں کی طرح طویل قد، لمبوترے چہروں اور ابھراں خط وخال کے مالک نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی موٹی ہڈیوں، کتابی چہروں اور مسطح خد وخال کے لوگ ہیں بلکہ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان سے مشابہ کوئی اور ایشیائی نہیں دیکھے کیونکہ ان میں سے کافی تعداد کے بال اور داڑھیاں بھورے ہیں۔ کاشتکاری اور دیگر گھریلو کاموں میں وہ سخت محنتی ہیں اور ان میں سے جو لوگ قلات کے جنوبی میدانوں کے قرب وجوار میں رہتے ہیں وہ بڑے بڑے قطعات زمین پر کاشت کرتے ہیں اور اپنی پیداوار برآمد کے لئے قلات، بیلہ اور خضدار کے ہندوؤں کے ہاتھوں فروخت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ پنیر، گھی، مندے، دریاں اور اُون براہوئیوں کی دیگر اشیائے تجارت ہیں۔ اُن کی خوراک بلوچوں جیسی ہے سوائے اس کے کہ وہ گوشت کو سب پر مقدم سمجھتے ہیں اور اسے ادھ کچی حالت میں روٹی، نمک یا سبزیوں کے بغیر ہڑپ کر جاتے ہیں۔ وہ بسیار خوری کے لئے مشہور ہیں اور ان کے لاتعداد اور روزافزوں بھیڑوں بکریوں کے ریوڑ ان کی گوشت خوری کا سامان مہیا کر دیتے ہیں۔ اُن کا کہنا صحیح ہے کہ حیوانی خوراک کے بغیر ان پہاڑوں میں رہنا ناممکن ہے جو نہ صرف پُر غذائیت ہے بلکہ انہی حرارت بخش خصوصیات کی مالک ہے جو یورپ میں شراب سے منسوب کی جاتی ہیں چنانچہ وہ اواخر خزاں میں گوشت دھوپ میں سُکھا لیتے ہیں اور پھر اسے تازہ لکڑی کی آگ کے اوپر دھوئیں میں پکاتے ہیں۔ ایسے گوشت کا ذائقہ ناخوشگوار نہیں ہوتا بلکہ روس سے درآمد کردہ رینڈیئر کی زبانوں کے ذائقہ سے ملتا جلتا ہے۔ یہ کئی ماہ تک خراب نہیں ہوتا اور جب وہ سردی کے لئے اُس کا ذخیرہ کرتے ہیں تو وہ اُس کے بچاؤ کی صرف ایک ترکیب کرتے ہیں کہ اس کا ایک ٹکڑا دوسرے کو نہ چھوئے۔

براہوئی بلوچوں کی طرح قول کے پکے اور مہمان نواز ہیں اور مجموعی طور پر مجھے ان کا عام برتاؤ بہت پسند ہے۔ میں نے جو کچھ پہلے لکھا ہے اس کے لحاظ سے وہ زیادہ امن پسند اور محنتی لوگ ہیں اور ان کے عادات و اطوار بلوچوں کے تشدد اور تاخت و تاراج کے نظام سے یقیناً مختلف ہیں اور ان کا محرک صرف ایک نیک جذبہ ہے کیونکہ ذاتی شجاعت اور قوت برداشت میں براہوئی اپنے تمام ہمسایہ ممالک میں ممتاز ہیں۔ ان کے سردار بلوچوں کی نسبت اپنے قبائل اور خیلوں پر زیادہ مطلق العنان اور آمرانہ و جابرانہ اختیار رکھتے ہیں۔ لوگ بھی ان کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں لیکن ان کی اطاعت کا محرک اور ہے۔ ان کا رویہ غیر شائستہ اور اکھڑ ہونے کے باوجود نرم اور بے آزار ہے لیکن چونکہ ان کا اکھڑ پن دنیاوی مکر و فریب کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا ان کی نرم خوئی کی اکھڑ کوششیں دل خوش کن ہیں کیونکہ مشاہدہ بتاتا ہے کہ اُن کی یہ کوششیں بے لوث ہوتی ہیں اور صرف خدمت دیگراں کے قدرتی میلان سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ بلوچوں کے بدترین خصائص از قسم حرص انتقام اور ظلم سے مبرا ہیں اور وہ اپنی مہربانی یا خدمت کے لئے شاذ و نادر ہی کسی معاوضہ کے امیدوار ہوتے ہیں۔ اُن کی شکر گذاری دیرپا ہے اور وفاداری توانی فراواں فراواں ہے کہ بلوچ سردار بھی اُنہیں ہی اپنے نہایت قابل اعتبار اور رازدار خدمت گار گردانتے ہیں۔

ان کی تفریحات بالکل بلوچوں جیسی ہیں لہٰذا مزید خاص تبصرہ کی محتاج نہیں۔ عام طور پر براہوئی بلوچوں کی نسبت بہتر نشانہ باز ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں اور بلوچ بھی یہ کہہ کر اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ زیادہ مشق کا نتیجہ ہے کیونکہ کوئی براہوئی اپنی بندوق کے بغیر اپنے گداں سے چند سو گز تک بھی نہیں جاتا۔ وہ اچھے شمشیر باز بھی ہیں لیکن نیزے کو بیکار اور بھاری بھرکم اوزار سمجھتے ہیں اور اسے کبھی استعمال نہیں کرتے۔ ایک براہوئی ہمیشہ ایک ہی انداز میں لباس پہنتا ہے اور سردی ہو یا گرمی، برفباری ہو یا حدت سوزاں اس کا لباس ایک ڈھیلی ڈھالی سفید قمیص، اسی بناوٹ کی شلوار اور ایک اونی ٹوپی پر مشتمل ہوتا ہے۔ چرواہے کبھی کبھار اپنے جسم کو

ڈھانپنے کے لئے سفید اُون کا اوور کوٹ اوڑھ لیتے ہیں جو سر کی چوٹی تک آتا ہے۔ اس سے وہ برف و باراں سے محفوظ رہتے ہیں اور یہی اُس کا مقصد بھی ہوتا ہے براہوئیوں کی گھریلو زندگی انتہائی سادہ ہے۔ مرد لوگ ریوڑ چراتے ہیں۔ زمین پر کاشت کرتے ہیں اور دیگر بیرونِ خانہ کام کرتے ہیں جن میں بوقت ضرورت عورتیں بھی ان کی مدد کرتی ہیں لیکن عورتوں کا بیشتر کام خانہ داری ہے جیسے دودھ دوہنا، مکھن، پنیر اور گھی نکالنا اور دریاں، اُونی کپڑے اور سفید گاڑھے کپڑے بُننا۔ جیساکہ میں ۳ فروری کے تحت بیان کر چکا ہوں وہ مردوں سے الگ تھلگ نہیں ہوتیں بلکہ سب اکٹھے کھاتے پیتے اور رہتے سہتے ہیں اُن کا لباس ایک لمبی قمیص اور شلوار پر مشتمل ہوتا ہے جو دونو سوتی ہوتی ہیں لیکن بالغ ہونے کے بعد وہ قمیص کے اوپر سے ایک چوڑی پیٹی پہن لیتی ہیں جن کے تسمے پیچھے باندھ دیئے جاتے ہیں اور جس کے سامنے کے حصّہ پر رنگین اون سے پرندوں اور جانوروں کی مضحکہ خیز شکلیں بنائی جاتی ہیں۔ مذہب کے لحاظ سے براہوئی سنّی مسلمان ہیں اور مذہبی ظواہر، شادی اور تجہیز و تکفین اسی عقیدے کے مطابق سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ لہٰذا میرے کچھ کہنے کی گنجائش کم ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کی روزمرّہ کی زندگی کی سادگی ان تقریبات میں بھی پائی جاتی ہے۔

پیشتر اس کے کہ میں قلات کے دیگر باشندوں یعنی ہندوؤں، بابیوں اور دسواروں کا ذکر کروں میں اس حصّہ میں کچھ براہوی قبائل کے نام دے رہا ہوں تاکہ ان کی تشکیل کا تنوع اور (اگر عدم امکان نہیں تو) منتجہ جنجال سمجھا جا سکے جو تسلی بخش تحقیقات کے راستے میں حائل ہے۔

براہوئی قبائل

	نام	جنگ آزماؤں کی تعداد	سردار
۱	قمبرانی	۱,۰۰۰	محمود خان
۲	زہری	۸,۰۰۰	قادر بخش
۳	مینگل	۱۰,۵۰۰	ولی محمد خان

۴	سمالاڑی	۴,۰۰۰	
۵	گرگناڑی (گرگنانی)	۳۰۰	-
۶	امام حسینی	۲,۰۰۰	شیخ لوہار
۷	کلچے بھگوا	۵۰۰	-
۸	محمودانی	۵۰۰	-
۹	مرُوہہ	۱,۰۰۰	-
۱۰	کوری	۱۵۰	-
۱۱	بُرجانی	۱,۰۰۰	-
۱۲	ریکی	۷۰۰	-
۱۳	پندرانی	۳,۰۰۰	-
۱۴	رائی سنگو (ارتیسنگو)	۱۰۰	-
۱۵	شیروانڑی	۸,۰۰۰	-
۱۶	رئیسانی	۱,۵۰۰	ملا محمد
۱۷	نیچاری	۲,۰۰۰	-
۱۸	بزنجہ	۱,۰۰۰	رحمت خان
۱۹	شجاع الدینی	۱,۰۰۰	-
۲۰	ماماسینی	۱,۵۰۰	-
۲۱	ہارونی	۲۰۰	-
۲۲	رودینی	۶۰۰	-
۲۳	ساسولی	۲۰۰	-
۲۴	گروچکو	۵۰۰	-

۲۵	بجائی	۷۰۰	
۲۶	گُردا	۲۰۰	-
۲۷	ناگری	۲,۰۰۰	-
۲۸	کچین بلبیدی	۷,۰۰۰	-
۲۹	نصیر رودینی	۳,۰۰۰	-
۳۰	چوتوا	۷۰۰	-
۳۱	خدرانی	۵,۰۰۰	-
۳۲	میرواڑی	۷,۰۰۰	-
۳۳	کلدانی	۳۰۰	-
۳۴	گلوسروئی	۷۰۰	-
۳۵	کُلاچی	۲۵۰	-
۳۶	لوگی	۳,۰۰۰	-
۳۷	کُری	۱,۵۰۰	-
۳۸	محمد شاہی	۳,۵۰۰	-
۳۹	ڈیگی	۴,۰۰۰	-
۴۰	رئیسانی	۸۰۰	-
۴۱	قیصری	۱,۰۰۰	میر قیصر
۴۲	مُوری	۳۰۰	-
۴۳	گُداجے	۲۰۰	-
۴۴	جیانی	۶۰	-
۴۵	مُوسوانی	۱,۰۰۰	-

۴۶	سراوانی	۱۰,۰۰۰	
۴۷	سُرفرانی	۲,۵۰۰	-
۴۸	پرُجھانی	۲۰۰	-
۴۹	گمچکا	۳۰۰	-
۵۰	بھولدرا	۳۰۰	-
۵۱	بھوکا	۳۰۰	-
۵۲	ریدی	۱,۷۰۰	-
۵۳	عیسرانی	-	-
۵۴	مہرانی	-	-
۵۵	جمالزئی	-	-
۵۶	گورانی	-	-
۵۷	سموزئی	-	-
۵۸	پوتئی	-	-
۵۹	چنگوزئی	-	-
۶۰	دودائی	-	-
۶۱	جیکھو	-	-
۶۲	رودین زئی	-	-
۶۳	حسنی	-	-
۶۴	چمروزئی	-	-
۶۵	مُروئی	-	-
۶۶	ممبک زئی	-	-

۶۷	راہ زئی	۱ر۱۰۰	میر قیصر
۶۸	شادن زئی	-	-
۶۹	شاہوزئی	-	-
۷۰	کُنتن زئی	-	-
۷۱	رمضان زئی	-	-
۷۲	شیرزئی	-	-
۷۳	گلزئی	-	-
۷۴	بنگلزئی وغیرہ وغیرہ	-	-

اگر اس کا کوئی مصرف ہوتا تو میں کم از کم ان سے دوگنا درج کر دیتا لیکن مندرجہ بالا فہرست میں تمام کثیر التعداد قبائل شامل ہیں اور براہوئی قبائل کی کثرت کو بخوبی آشکار کرتے ہیں ۔ اُن اَن گنت خیلوں کا تو کہنا ہی کیا ہے جس میں یہ قبائل مزید تقسیم ہوتے ہیں ۔ مذکورہ اسما میں سے اکثر کی وجہ تسمیہ ہے لیکن بقایا مہمل ہیں ۔ قمبرانی قمبر سے منسوب ہیں جو بانیٔ حکومت تھا اور خان بلوچستان، محمُود خان کا مورث اعلیٰ ہے ۔ زہری اور پندرانی انہی ناموں کے علاقوں میں رہتے ہیں ۔ گرگنانیوں کا نام میرے خیال میں فارسی لفظ گرگ (= بھیڑیا) سے ماخوذ ہے ۔ اسیطرح شیر داڑی اور شیرزئی فارسی لفظ شیر سے ہیں ۔ ہارونی اور قیصرانی ان کے سرداروں کے موروثی القاب ہارون خان اور میر قیصر سے منسوب ہیں ۔ محمُودانی موجودہ خان قلات محمود خان سے ماخوذ ہیں ___ جمالزئی، چنگوزئی، شادن زئی اور گلزئی الفاظ جمال (خوبصُورت) چنگو (اچھا) شادن (خوش) اور گل (گلاب) سے ہیں جو لاحقہ زئی بمعنی قبیلہ یا لشکر سے مل کر خوبصُورت قبیلہ وغیرہ کا معنی دیتے ہیں ۔ آخر میں عرض ہے کہ دودائی دو قبائل کا مجموعہ ہیں جو دودائیوں کا اختصار ہے ۔ ان میں بہت سی دیگر مثالوں کا اضافہ ہو سکتا ہے جنہیں مشرقی فضلا فوراً شناخت کر سکتے ہیں ۔ ملک کے ایک حصّہ سے دوسرے میں ہجرت کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے قبائل کے نام اکثر بدل جاتے

ہیں میرے اس قیاس کی بنیاد یہ ہے کہ میں نے کئی براہوئیوں سے کئی بار پوچھا کہ وہ موجودہ سکونت سے قبل کہاں تھے لیکن وہ کاملاً ناواقف تھے یا صرف یہ کہہ سکے کہ اُس وقت ان کا کوئی اور نام ہوگا۔ حالانکہ مجھے یقین تھا کہ وہ چند سال پہلے کسی اور علاقے میں مقیم تھے۔

براہوئی باہمی رشتے ناطے کرتے ہیں لیکن قمبرانی اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ وہ سب قبائل سے اس لئے ممتاز و ممیز ہیں کہ وہ تین درجوں میں تقسیم ہیں جو احمد زئی، خانی اور قمبرانی سے موسوم ہیں ــ ۱۸۱۰ء میں جب میں قلات میں تھا تو احمد زئی صرف سات افراد پر مشتمل تھے یعنی محمود خان، اُس کا بیٹا، دو بھائی، ایک بہن، اُس کی چچی اور عمزاد بھائی۔ خانی ثانوی درجے کے سردار ہیں جیسے میر مُراد علی (خضدار) اور اس کے بھائی۔ اس درجہ میں بیس یا تیس افراد ہیں۔ باقی قمبرانی ہیں گو یہ سارے قبیلہ کا بھی عام نام ہے قمبرانی دوسرے قبائل کی لڑکیوں سے شادی کر لیتے ہیں لیکن اپنی بیٹیاں دوسرے قبائل میں نہیں بیاہتے۔ کچھ براہوئی اور رند بلوچ اس معاملہ میں ایک ہی سطح پر ہیں لیکن مجھے اس کی کوئی شافی وجہ نہ مل سکی لہٰذا میرا خیال ہے کہ یہ انہی کے فرضی احساس فوقیت و برتری کا ہی نتیجہ ہے۔

قلات میں جو ہندو رہائش پذیر ہیں وہ زیادہ تر ملتان اور شکار پور کے تجارتی سیٹھ بار ہیں اور حکومت اور عوام دونوں ان کی عزت کرتے ہیں اور انہیں اپنی پوجا پاٹ میں پوری آزادی ہے لیکن وہ اپنی بیویوں یا دیگر مستورات کو یہاں نہیں لاتے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خود انہیں حکومت کی نیک نیتی پر اتنا کامل یقین نہیں ہے کہ وہ یہاں آباد ہو جائیں حالانکہ حکومت کی رواداری اور اس کی حوصلہ افزائی ہر لحاظ سے سازگار ہیں۔ ان کی تعداد یہاں کافی ہے کیونکہ فصیل شہر کے اندر وہ چار پانچ سو بہترین مکانات میں سکونت پذیر ہیں اور ان میں سے اکثر انتہائی دولت مند ہیں لیکن ان کی دولت اور اس کے بیشمار فوائد کے باوجود قلاتی ہندو خستہ حال لوگ ہیں۔ وہ عموماً تین چار سال بعد اپنے آبائی گھروں کو جاتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت کے بعد لیکن اتنے لمبے وقفوں میں اپنے بیوی بچوں

دُوری کی وجہ سے وہ ایک قابلِ رحم اور تکلیف دہ زندگی گذارتے ہیں اور مایوس، غیر مطمئن اور مریضانہ ذہنیت کے لوگ بن جاتے ہیں۔ حرص زر ہندو کردار کا خاصہ ہے اور یہ لوگ اس حرص و طمع کی افسوسناک ترین مثال ہیں جو انتہائی آزادی حاصل ہونے کے باوجود اپنی ہر انسانی نعمت اور دنیاوی خوشی کو اپنی مرضی سے مال و زر کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ انہیں قلات میں مذہبی آزادی میسر ہے لہٰذا ان کا اپنا مندر ہے اور کئی برہمن اس سے منسلک ہیں۔ مندر اور برہمنوں کے اخراجات ذاتی چندوں سے ادا ہوتے ہیں جن کے علاوہ ایک محصول بھی ہے جو قدیم فرمان کے مطابق ہندو اس سامان پر عاید کر سکتے ہیں جو شہر میں داخل ہوتا ہے۔ اسے دھرم پیسہ یا مذہبی محصول کہتے ہیں۔ یہاں کے ہندو برہمن قوانین کے سختی سے پابند نہیں ہیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ یہاں کے برہمن اور ان کے بالکے گائے کے گوشت کے سوا ہر قسم کا گوشت کھاتے ہیں خواہ یہ مسلمانوں کے ہاتھ کا ہو۔ وہ چمڑے کے مشکیزوں سے ہی پانی پیتے ہیں اور ان میں سے بعض تو بخارا کی کھالوں سے بنی ہوئی ٹوپیاں بھی اوڑھتے ہیں اور یہ سب باتیں ان کے دھرم کی خلاف ورزی ہیں۔ اُن کا لباس چھینٹ کی الخلق یا بنڈی ہے جسے وہ سینے کے دائیں طرف بند کر لیتے ہیں۔ یہاں کے ہندو لباس کا یہی امتیازی نشان ہے کیونکہ مسلمان اپنی بنڈیاں بائیں طرف سے بند کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ لمبا تنگ پاجامہ پہنتے ہیں جو ان کے پاؤں کو چھوتا ہے۔ وہ اپنی اپنی پسند کے مطابق سفید یا رنگین پگڑی بھی پہنتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی ہو بہو نقل معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی جلد سانولی اور بال اور داڑھی گہرے سیاہ ہوتے ہیں۔ وہ پوری داڑھی رکھتے ہیں۔ ان کی زبان ہندی کی وہ شاخ ہے جو پنجاب میں بولی جاتی ہے اور اسی میں وہ اپنا حساب کتاب رکھتے ہیں۔

میں نے پہلے بابیوں پر ایک طائرانہ سا تبصرہ کیا ہے جو میرے خیال میں قلات کی مستقل آبادی کا تیسرا جُزو ہیں لیکن چونکہ وہ بلوچستان کے اصلی باشندے نہیں ہیں اور نہ ہی وہ اپنے وطن کے کسی اہم قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ان پر مزید لکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ

محنتی شبانی لوگ ہیں جو زیادہ تر شاہ کابل کی سلطنت اور درانی علاقہ[1] میں رہتے ہیں جہاں وہ اپنے ریوڑ چراتے ہیں اور خیمہ گزیں ہیں۔ ان میں سے بعض بڑے بڑے سوداگر بھی ہیں جو تجارتی اغراض کے لئے بنوں کو چھوڑ چھاڑ شہروں اور قصبوں میں بس جاتے ہیں۔ قلات کے بابی ایسے ہی ہیں اور میرے خیال میں ان کے بہت سے لوگ صوبہ گجرات کے شمال میں بھی موجود ہیں۔

دہوار یا دہقان ہم معنی الفاظ ہیں اور گنوار کا مطلب دیتے ہیں۔ یہ قلات کی آبادی کا چوتھا اور آخری جزو ہیں۔ یہ بھی دوسروں کی طرح اس شہر تک محدود نہیں بلکہ ملک کے مختلف علاقوں میں انہی سے ماخوذ ناموں کے تحت موجود ہیں جیسے مستونگ، تیری اور بڑنگ آباد (قلات کے شمال کے گاؤں) کے دہوار دہواروں کی بجائے مستونگی، تریچی اور بڑنگ آبادی کہلاتے ہیں۔ مجھے ان کے ماخذ کے مصدقہ آثار نہ مل سکے۔ ان کی بول چال کی زبان عام، خالص فارسی ہے جس سے بہت سوں نے نتیجہ نکالا کہ وہ ان لوگوں کی اولاد ہیں جو ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کے بلوچستان سے نکلنے کے بعد یہاں رہ گئے تھے لیکن اس نظریئے کی تردید یوں ہو جاتی ہے کہ ہندوستان پر حملۂ نادری سے بہت پہلے بھی ہمیں اسی نام کا قبیلہ یہاں ملتا ہے۔ وہ کاشتکار ہیں اور قلات کے اندر یا اس کے قرب و جوار کے دہوار تو خان کے بیگاری بھی

---

[1] درانی اعلیٰ ترین افغان ہیں۔ احمد شاہ ابدالی درانی تھا اور حکومت اسی کے خاندان میں مرکوز ہے۔ وہ اُلوس یا قبائل میں تقسیم ہیں اور ان کا علاقہ بہت وسیع ہے۔ قندھار درانی علاقے کا صدر مقام ہے جس کے آس پاس اور بھی چھوٹے چھوٹے شہر ہیں۔ ان کی بلکہ افغانوں کی تاریخ کے مطالعہ کے لئے میں اپنے قاریوں کو دربار کابل کے سابق سفیر آنریبل ایم۔ الفنسٹن کی کتاب کی طرف متوجہ کروں گا جو حال ہی میں چھپی ہے۔ وہ حکومتِ ہند کے نمائندے تھے اور اب پونہ میں ریذیڈنٹ ہیں۔ ان کے علم و فضل ایسے تصنیفی کارنامہ کے عین مطابق تھا اور میں ان کی دوستی اور مراسلات کے لئے ان کا ممنون ہوں۔

ہیں جو خان کے مہمانوں، اُن کے رفقا اور جانوروں کو پانی، ایندھن، چارہ اور غلہ مہیا کرتے ہیں، شکار کے وقت خان کے جلو میں رہتے ہیں اور سرکاری کاموں کے سلسلے میں اُس کے قاصد بنتے ہیں۔ اس بیگار کے صلے میں اُنہیں متعدد مراعات بھی حاصل ہیں مثلاً اُن کی زمینات محصول سے آزاد ہیں، پیداوار منڈی میں لانے پر کوئی ٹیکس نہیں۔ قلات کے باہر عسکری خدمات کی پابندی نہیں اور زیر کاشت یا احاطہ بند زمینوں کے علاوہ وہ اپنے ریوڑ قلات کے علاقے میں کہیں بھی چرا سکتے ہیں۔ عادات و اطوار اور ناک نقشہ میں دہوار دیگر تمام بلوچستانیوں سے منفرد ہیں۔ وہ پُر امن اور بے ضرر لوگ ہیں اور بلوچوں اور براہوئیوں کی خود ساختہ فوقیت کو بدل و جان تسلیم کرتے ہیں تاکہ نقضِ امن کا اندیشہ نہ رہے۔ ان کے ساتھ وہ رشتے ناطے کے بھی مجاز نہیں ہیں۔ وہ دیہات میں رہتے ہیں اور کبھی ہجرت نہیں کرتے بلکہ آس پاس کی زمینیں کاشت کرتے ہیں اور پیداوار خانہ بدوشوں، چرواہوں اور ہندوؤں کے ہاتھ بیچتے ہیں۔ قلات سے دُور رہنے والے دہوار اُن سرداروں کو بھی تھوڑا سا حصہ پیداوار دیتے ہیں جن کی وہ حفاظت و سیادت میں ہیں۔ قد و قامت اور شکل و صورت کے لحاظ سے دہوار درمیانے درجے سے کچھ کم ہیں اور دیگر باتوں کے اعتبار سے بھی وہ ایک خوش وضع نسل نہیں ہیں۔ اُن کے بے حس خط و خال، رُخساروں کی اُبھری ہڈیاں اور بے ہنگم رُخسار انہیں بدوضع بنا دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے چہرے صاف گوئی، ایمانداری اور شگفتہ مزاجی کا تاثر دیتے ہیں اور من موہ لیتے ہیں۔ وہ پردیسیوں کے ساتھ شائستہ اور مہربان ہیں لیکن بلوچوں اور براہوئیوں کی مہمان نوازی سے عاری ہیں۔ گو وہ جنگ کے وقت مقررہ دستہ فوج پیش کرنے کے پابند نہیں تاہم وہ اتنے وفادار اور قابلِ اعتبار سمجھے جاتے ہیں کہ اُنہی کا دستہ میری قلات اور ابواب شہر کا محافظ ہوتا ہے۔ سب سُنّی مسلمان ہیں اور مذہبی اور گھریلو عادات و کردار میں براہوئیوں سے کافی ملتے جلتے ہیں لہٰذا مزید کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ عورتوں کی پردہ داری کی مسلمانی رسم کو وحشیانہ اور سنگدلانہ سمجھتے ہیں، اور

عورتوں سے اتنا اچھا سلوک کرتے ہیں کہ مجھے پیغمبرِ عربی کی اُمّت میں ان سے زیادہ روشن خیال لوگ کہیں اور نہیں ملے۔ افغانوں میں ایک تاجیک نامی کثیر التعداد قبیلہ ہے جن کے اطوار و اقدار دہواروں سے اتنے مشابہ ہیں کہ مجھے ان کے ہم ماخذ ہونے کا پُورا یقین ہے۔ تاجیک بے ضرر جفاکش، قول کے دھنی، زراعت اور شبانیت کے رسیا اور دیہات کے کچّے مکانوں کے باشندے ہیں جو افغانستان کی عمومی اصطلاح تمن کی بجائے دیہہ کہلاتے ہیں۔

اپنے مشاہدات اور اہالیان قلات کے متعلق اپنے تحقیقاتی نتائج قلمبند کرنے کے بعد میں اب اپنا سفرنامہ جاری رکھوں گا لیکن یہاں یہ عرض کئے دیتا ہوں کہ دو تین مزید طبقے بھی ہیں جیسے کچھ گنداوا کے جٹ، مکران کے مکرانی اور سندھ کے سندھی جن کا بیان انہی صوبوں کے ذکر میں آئے گا۔

باب پنجم

بیان سفر ـــ ملاقاتی ـــ دوا ـــ محمود خان کا داروغہ ـــ خط ـــ تحفہ ـــ شہر کا دوسرا چکر ـــ مقصد ـــ واقف کار ـــ کرمانی ملّا کی آمد ـــ بات چیت ـــ اس کے سفر کا حوصلہ شکن بیان ـــ امیدیں ـــ ملّا کی تجویز ـــ منظور کی گئی ـــ سامان پہنچا ـــ وجہ تاخیر ـــ بزنجہ بلوچوں کی کارروائی ـــ دھمکیاں ـــ جواب ـــ بالآخر رویّہ اور لن ترانیاں ـــ امیران سندھ کے اقدامات مصنف اور اس کے ساتھی کو دریافت کرنے کے سلسلہ میں ـــ ایک خط میں بیان کردہ ـــ نتیجۃً فیصلہ ـــ قلّات سے روانگی کی تیاری ـــ ہمارے افغان ملازموں کے عزائم ـــ کیسے بچے ـــ ہماری دواؤں کے متعلق مضحکہ خیز منظر ـــ پینے والوں کی غلطیاں ـــ مہلک نہیں ہیں ـــ ہنڈیاں ـــ راستے کی دریافت ـــ عزم مصمّم ـــ نوشکی ـــ براہوئی شتربان کرائے پر ـــ ہندوؤں کا تاخیری حربہ ـــ مقصد ـــ کامیابی ـــ ان کے کاروباری معاملات پر تبصرہ ـــ ایک نوجوان کی متاثر کن کہانی ـــ اس کے باپ کا قتل ـــ مبیّنہ وجہ ـــ مصنف اور اس کے ساتھی کی شہرت بطور ڈاکٹر ـــ ایک وزیر کے خاندان کو دیکھنے کی درخواست ـــ قبول ـــ ملّا کی تلقین ـــ حرم سرا میں کیپٹن کرسٹی کا استقبال اور وہاں سے روانگی ـــ وزیر کا داروغہ دوا کے لئے آتا ہے ـــ اس کی لاف زنی ـــ درخور اعتنا نہیں سمجھی گئی ـــ شہر میں ڈاکہ ـــ اقدامات ـــ چور گرفتار اور سزا دہی ـــ کیسے ـــ اس پر تبصرہ ـــ خان کے داروغہ سے ملاقات ضروری ـــ ہندو قلّات سے روانگی کے لئے دن کا تعیّن کرتے ہیں ـــ افغان کی مداخلت ـــ داروغہ کا تجسس ـــ اغلب وجہ اور فائدہ ـــ کابلی وفد

۔ دربارِ محمود خان میں — جواب — قیاس آرائی — وزیر کی بیگم کی دوستانہ پیشکش — منظور۔

۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰ اور ۲۱ فروری:

میں بہت سے دنوں کا احاطہ یک مشت کر رہا ہوں تاکہ ہر ایک پر باقاعدہ شذرہ نہ لکھنا پڑے، کیونکہ یہ دن انوکھے پن یا دلچسپی سے عاری تھے۔ ہمارے پاس حسبِ معمول ملاقاتیوں کا جمگھٹا لگا رہا۔ ان میں سے کچھ ہم سے ادویات کا تقاضا کرتے رہے لیکن فوری طور پر ہم ان کے اصرار کو یہ کہہ کر ٹالتے رہے کہ ہمارا سامان ابھی نہیں پہنچا گو یہ ایسا عذر ثابت ہوا جو بعد کی تکلیفات کے پیشِ نظر افسوسناک تھا۔ سولہ تاریخ کو ایک نہایت شائستہ اور معزز آدمی یعنی داروغہ محمود خاں ہمیں ملنے آیا جو کچ گنداوا سے دو دن پہلے آیا تھا تاکہ خان کو مطلوب بعض اشیائے جائے۔ جو میر مُراد علی بنگر کی ایک بیٹی سے شادی رچانے والا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اسے اتفاقیہ پتہ چلا تھا کہ سُندرجی (جس کے بھائی کے ساتھ اس کے گہرے مراسم رہے تھے) کے دو گماشتے بمبئی سے آئے تھے لہٰذا اُس نے ہماری عزت و خدمت کے لئے حاضر ہونا مناسب سمجھا۔ ہم نے اُس کی خوش اخلاقی کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ وہ ہماری طرف سے ایک عریضہ اپنے آقا کو پیش کر دے جس کا مضمون یہ تھا کہ وہ ہمیں قلات یا اپنی قلمرو میں کہیں اور کچھ عرصے کے لئے قیام کی اجازت مرحمت فرمائے۔ داروغہ نے کہا کہ وہ بہت خوشی سے یہ خط لے گا اور اولیں موقعہ پر خان سے گفتگو کر لیگا جو ہماری درخواست کو شرفِ قبولیت بخشنے سے دریغ نہ کرے گا۔ اٹھارہ کو وہ پھر ہمارا خط لینے کے لئے حاضر ہوا تو کیپٹن کرسٹی نے اسے مطلع کیا کہ سندرجی نے ایک تحفہ بھی خان کے لئے بھیجا تھا جو سامان آنے پر کچ گنداوا روانہ کیا جائے گا۔ لیکن اس نے کہا کہ تحفہ کا مناسب وقت خان کی قلات واپسی پر آئے گا۔

اس شہر میں ہمارا قیام پہلے ہی ہمارے اندازے سے زیادہ ہو گیا تھا لیکن کوہن وٹ میں ہمارے سامان کا محافظ ملازم ہنوز نہ پہنچا تھا اور اب ہمیں اس کی سلامتی کے سلسلہ میں طرح

طرح کے خدشات ہو رہے تھے اور ہم شہر سے جانے کے لئے قطعی انتظامات بھی نہ کر سکتے تھے۔ لیکن ہم ہر روز نہایت اشتیاق سے ان ممالک کے جغرافیہ اور ماہیت کے متعلق معلومات اندوزی کرتے رہے جن سے ہمارا آئندہ راستہ گذرنا تھا۔ بمبئی سے ہمارے ساتھ آنیوالا ہندو اس قسم کے موضوع پر تحقیقات کے سلسلہ میں بیحد کوتاہ اندیش اور پھوہڑ تھا لہٰذا ہم نے خود ہی بیس کو شہر جانے کا فیصلہ کیا۔ سوداگروں، مسافروں، فقیروں اور قسمت آزماؤں کے گروہ سے ہماری ملاقات کرائی گئی۔ ان میں ایک کرمانی ملا بھی تھا جو خاص کرمان کا رہنے والا تھا۔ وہ قلات اپنی بہن کی تلاش میں آیا تھا جسے بمپور کے ناہروئی ایک چھاپہ میں اٹھا لائے تھے اور جو محمود خان کے رازدار مختار کار اور مشیر سلطان صاحب کے خاندان نے لونڈی کے طور پر خرید لی تھی۔ ہم نے اس آدمی کو گھر پر بلایا تاکہ ایران سے سفر کے بارے میں اس سے استفسار کر سکیں۔ چنانچہ وہ اکیس کی صبح کو آیا اور اس سے پتہ چلا کہ وہ کرمان سے بمپور اور کیچ[1] کے راستے قلات آیا تھا۔ ان مقامات اور ان کے باشندوں کا اس نے مختصر اور جامع خاکہ پیش کیا لیکن جب ہم نے اسے تجویز دی کہ وہ ہمارا رفیق و رہنما بنے تاکہ ہم کرمان کی منڈی سے گھوڑے خرید کر سکیں تو اس نے حضرت محمدؐ اور ریش شاہ[2] کی قسم کھا کر کہا کہ کوئی طاقت اسے اسی راستے سے واپس جانے پر آمادہ نہ کر سکتی تھی۔ اس نے کہا "اس میں صرف دو ہی راستے ہیں اور جو ان میں سے کوئی سا بھی چنے گا اللہ اور اس کا رسول اس پر رحم کریں! ایک راستہ دشت بے آب و گیاہ سے گذرتا ہے جہاں نہ پانی دستیاب ہے نہ خوراک، دوسرا ان خنزیر ناہروئیوں کے علاقہ سے گذرتا ہے جہاں آپ کسی لمحہ بھی تباہ ہو سکتے ہیں"۔ اس نے پرجوش دعا اور مبہم سے کہا کہ خدا اس پوری نسل کو غارت کرے کہ انہوں نے اس کا گھوڑا

---

[1] بمپور ناہروئی سردار کی جائے قیام ہے۔ کیچ مکران کا صدر مقام ہے۔

[2] ایران میں یہ قسم عموماً کھائی جاتی ہے۔

اور ہر چیز چھین لی، حتیٰ کہ اُس کے جسم کے کپڑے بھی۔ یہ بیان کافی حوصلہ فرسا تھا لیکن ہم نے یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لی کہ ایرانی مبالغہ آمیزی تو رسوائے زمانہ ہے بالخصوص جب اُن کی سلامتی کا سوال ہو لہٰذا ہمیں یقین تھا کہ اگر ہم اسی راستے سے گئے تو حالات اتنے ناساز گار نہ ہوں گے جتنے ملّا بتا رہا تھا۔ ہم نے اس سے مزید سوال پوچھنا مناسب نہ سمجھا مبادا وہ شک وشبہ میں پڑ جائے۔ آدھ گھنٹہ غیر متعلقہ موضوعات پر گفتگو کے بعد وہ شہر کو لوٹ گیا اور وعدہ کر گیا کہ کسی دن وہ ہمارے لیے فارسی کتب لائے گا اور ہمیں پڑھ کر سنائے گا۔ اس تجویز کو ہم نے فوراً مان لیا تاکہ ہماری صبحیں خوش اسلوبی سے گذریں جو عدم تفریح و مصروفیت کے باعث رینگ رینگ کر گذرتی تھیں۔

۲۲ فروری:

آج تین بجے بعد از دوپہر ہمارا سامان پہنچا تو تسکین ہوئی اور ہندوستانی ملازم (جو اس کا ذمہ دار تھا) نے سردی اور خراب اُونٹوں کی وجہ سے پیش آمدہ مصائب و نوائب کی دردناک تصویر کھینچی۔ وہ بمشکل مشکلات کے بعد آگے بڑھنے میں کامیاب ہو سکے (گو وہ جوُں کی رفتار سے چلے) کیونکہ اہلِ خضدار قدم قدم پر قلات کی خوفناک سردی سے اتنا ڈرتے تھے کہ وہ بمشکل ہی جانور لانے پر آمادہ کیے جا سکے۔ اُس نے بتایا کہ ہماری روانگی کے دو دن بعد تک انہوں نے کوہن وٹ انتظار کیا جس کے دوران نہ رحمت خان آیا نہ بھاڑے کے اُونٹوں کا مالک، جس کا مطلب یہ تھا کہ موخر الذکر کو بزنجوؤں سے سراغ مل گیا تھا۔ تیسرے دن کی صبح کو رحمت خان آٹھ مسلح آدمیوں کے ساتھ آیا اور تحکمانہ انداز میں پوچھا کہ ہم کہاں تھے۔ اُسے بتایا گیا کہ ہم اس کے بغیر ہی چلے آتے تھے تو وہ پیچ و تاب کھانے لگا اور بار بار پوچھتا رہا کہ ہم سوداگر تھے یا چور جو اس طرح فرار ہو گئے تھے۔ شام کے وقت اُس کا بھائی بہادر خان اور شتربان بھی آ گئے۔ شتربان نے اپنی تاخیر کے لئے عذر لنگ پیش کیا۔ یہ دونو سردار سخت غیظ و غضب میں تھے کہ ہم اُن کے پنجوں سے بچ نکلے تھے۔ وہ کبھی اپنے اختیارات کی توہین

پر بل کھاتے اور کبھی ہماری واپسی پر سخت ترین انتقام کی دھمکیاں دیتے لیکن آخر کار وہ ہمارے سامان کے معائنہ پر مرکوز ہو گئے اور کم از کم ایک ہزار روپیہ سُنگ یا محصُول کا تقاضا کرنے لگے۔ ہمارے آدمی نے اُنہیں بتایا کہ سامان تو اس سے آدمی قیمت کا بھی نہ تھا اور سُنگ کا اُنہیں کوئی حق نہ تھا اور پھر اس موضوع پر ہمارا کوئی حکم بھی نہ تھا۔ رحمت نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا "شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ہم زنجوؤں نے مُغل سوداگر کو اسی جگہ پر لوٹا تھا اور قتل کر دیا تھا۔[1]" ہمارے ہندوستانی نوکر نے جواب دیا "تم ہمارے ساتھ وہی سلوک نہیں کر سکتے اور نہ ہی یہ فرض کر سکتے ہو کہ ہم چار پانچ مسلح آدمی اُس ڈرپوک مغل کی طرح اپنی جانیں اور مال تمہارے سپرد کر دیں گے۔" زنجوؤں پر اوس پڑ گئی اور وہ کہنے لگے کہ وہ سختی کرنا نہیں چاہتے تھے اور ہمارے آدمیوں سے کہا کہ تلواریں اتار دیں اور آرام کریں کیونکہ وہ خود ساری رات سامان کی حفاظت کریں گے۔ اس پر ہمارے نوکر نے جواب دیا کہ دوران سفر کمر بستہ رہنا[2] اُس کی اور اُس کے رفقا کی عادت تھی۔ آخر کار ہمارے آدمیوں کو ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر اور اشیائے خوردنی کے عدم وجود کی وجہ سے زنجوؤں نے اپنے گھروں کو واپس جانے کا فیصلہ کیا اور صرف چار روپے کے برابر سفید کپڑا مانگا جو انہیں دے دیا گیا۔ رحمت نے کہا کہ ایسے سامان کے ساتھ جانے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ رستہ اس کے بغیر بھی محفوظ تھا اور اگر ان کے پاس لاکھوں روپے ہوں تو بھی کوئی ان کو تنگ نہ کریگا کیونکہ اُس نے گذرنے کی اجازت دی تھی۔

---

[1] یہ واقعہ ہے۔ اُنہوں نے ایک مغل سوداگر پر حملہ کیا جس نے کوئی مزاحمت نہ کی اور انہوں نے اُسے اور رفقا کو مار ڈالا۔ خان قلات اس پر اتنا بپھرا کہ رحمت خان کے والد کو بُلایا اور راستے ہی میں اسے اور چالیس قبائلیوں کو تہ تیغ کروا دیا۔

[2] کمربستہ کیلئے ہماری زبان میں کوئی شافی و کافی مرادف نہیں۔ اس کا مفہوم ہے مادی طور پر مسلح اور ذہنی طور پر مصمم۔ یہ کمر بستن سے ماخوذ ہے۔

اس شوں شاں کے بعد وہ اور اس کے شہدے گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو کر چلتے بنے اور ہمارے لوگ اگلی صبح طلوعِ آفتاب پر روانہ ہوئے۔

خضدار پہنچے تو معلوم ہوا کہ میر مراد علی نے اپنے نائب کو لکھا تھا کہ ہمیں کچھ گندا دا بھیج دے جہاں ملک کے سب گھوڑے جمع تھے۔ یہ منصوبہ خواہ دوستی کا نتیجہ ہو یا نہ ہو اس لئے بنایا گیا کہ ہم نے اس تیز رفتاری سے سفر کیا تھا۔ یہ بالآخر مبارک ثابت ہوا کیونکہ نائب نے ایک آدمی قلات تک ہمارے سامان کے ساتھ کر دیا اور وہ سہراب میں بہت مفید ثابت ہوا جہاں کے داروغہ نے ہر چیز پر چنگی کا مطالبہ کیا اور بضد ہوا لیکن میر مراد علی کے آدمی نے میر کا خط دکھایا تو اسے سانپ سونگھ گیا کیونکہ اس میں تحریر تھا کہ ہمارے ساتھ اخلاق و مروت سے پیش آئیں۔

ایک قاصد خضدار میں ہمارے آدمیوں سے ملا جو بیلہ میں سُندرجی کے گماشتہ کا خط لیکر آیا تھا کہ ہماری سونمیانی سے روانگی کے بعد چھ آدمی کراچی (سندھ) سے اس لئے آئے تھے کہ یہ معلوم کریں کہ ہم کون تھے اور یہ سن کر کہ ہم تو اندرونِ ملک چلے گئے تھے اُن میں سے دو تو واپس کراچی چلے گئے اور باقی ہمارے پیچھے بیلہ آئے جہاں سے بھی ہم ان سے پہلے نکل چکے تھے۔ لہٰذا وہ جام سے ملے اور کھلے دربار میں امیرانِ سندھ کی طرف سے ہمارا اتا پتا اور غرض و غائت معلوم کرتے رہے۔ جام نے انہیں بتایا کہ اُس نے ہمارے نام یا نظریات نہ پوچھے تھے لیکن بشنید یہ تھی کہ ہم سندرجی کے گماشتے تھے اور اسی کے کام سے قلات جا رہے تھے۔ مایوس ہو کر سندھی واپس حیدرآباد (سندھ کا دارالحکومت) چلے گئے تاکہ امیروں کو مطلع کر سکیں۔ اس خط سے یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ ہمیں گرفتار کروانے اور ملک بدر کروانے کی سعی جاری رکھیں گے اور گو ہمیں محمود خان اور امیرانِ سندھ کے درمیان مغائرت کا پتہ تھا تاہم یہ پیش بینی ناممکن تھی کہ وہ اُن کی افترا پردازیوں پر کیا قدم اٹھائیں گے لہٰذا مناسب یہی تھا کہ ہم فوراً قلات چھوڑ دیں۔ اس یکلخت فیصلہ کو چھپانے کے لئے ہم نے مشہور کر دیا کہ سُندرجی نے ہمیں فی الفور قندھار اور

ہرات (خراسان کا صدر مقام) جانے کا حکم دیا تھا تاکہ ہم آمد بہار تک جتنے گھوڑے مل سکیں لے آئیں۔

اس لمحے مشکل بالائے مشکل یہ ہوئی کہ ہمیں معلوم ہوا کہ دونوا فغان ہمارے آدمیوں کیسا تھ جھگڑتے رہے تھے اور حفندار میں تو انہوں نے برملا کہہ دیا کہ ہم سوداگر نہ تھے بلکہ جاسوس تھے جو ملک کا معائنہ کرنے آئے تھے اور ہماری نیت کابل یا پشاور میں شاہ سے مل کر ایران جانے کی تھی۔ میر مراد علی کے داروغہ نے یہ سن کر ہمارے ہندوستانی نوکر کو بتایا اور مشورہ دیا کہ وہ ہمیں ان بدمعاشوں سے مطلع کرے جن کے متعلق ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے پردہ داری کے لئے ایک ایک اونٹ بطور رشوت لینے کا معاہدہ کر لیا تھا۔ یہ بدمعاشی ان کی فوراً علیحدگی کی متقاضی تھی لیکن مصلحت ضبط میں تھی لہٰذا کیپٹن کرسٹی نے انہیں صرف یہ تنبیہہ کر دی کہ اگر وہ سندرجی سے کچھ معاوضہ کے خواہاں تھے تو آئندہ کے لئے زبان کشائی میں محتاط رہیں۔ انہوں نے اسے بہتان قرار دیا اور وعدہ کیا کہ ہماری ہدایات پر کاربند رہیں گے۔ بعد از دوپہر کرمانی ملا یوسف زلیخا کی فارسی نظم لے آیا اور چند گھنٹے پڑھ کر سناتا رہا۔ ہمارا دھوار مالک مکان فارسی سمجھتا تھا اس لئے وہ بھی ہمسایوں کے ساتھ آ گیا اور ہم ملا کی نظم خوانی سے محظوظ ہوتے رہے۔ ملا بہت خوب پڑھتا تھا اور وجد میں آیا ہوا تھا۔

۲۳ فروری:

صبح صبح سارے شہر میں ڈنکا بج گیا کہ ہمارا سامان بالآخر پہنچ گیا تھا اور ناشتہ کے وقت تک ہمارے پاس ادویات کی عرضیوں کے ڈھیر لگ گئے اور یہ سلسلہ بلا وقفہ شام تک جاری رہا۔ سائل کوئی عذر سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ ایک تماشائی کیلئے یہ منظر نہایت مضحکہ خیز تھا کیونکہ کیپٹن کرسٹی اور میں لوگوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ انہیں دنیا بھر کے روگ لگے ہوئے تھے اور وہ اپنے روگ اور فن تشخیص کو بیک وقت بیان کرتے جا رہے تھے اور لطف یہ ہے کہ یہ سب کچھ ایسی زبان میں بولا جا رہا تھا جسے ہم میں سے کوئی بھی صحیح طور پر نہ سمجھتا تھا۔ ہم

نے فوراً ان کو کچھ ترتیب دی اور نہ صرف از راہِ تلطف بلکہ بغرضِ حصول دوستاں اپنی تشخیص اور تصور کی بنا پر کھلے دل سے عطائی دوائیں دیں۔ کچھ مریضوں نے بیہودہ ترین غلطیاں کیں کیونکہ وہ ہماری ہدایات کو نہ سمجھ سکے یا ان پر عمل پیرا نہ ہو سکے۔ ایک آدمی نے آنکھوں کی دوائی پینا شروع کر دی اور واپس آکر بتایا کہ یہ تو قے آور تھی۔ دوسروں نے وہ دوائیاں کھالیں جو صرف ملنے کے لئے دی گئی تھیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان کا کوئی مضر اثر نہیں ہوا۔ لیکن سنگین ترین غلطی ہمارے ہمسایہ چکی والے نے کی جس نے دست آور دوا کی بہت بڑی مقدار ایک ہی دفعہ پی لی، اور مرتے مرتے بچا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اس کے سات آٹھ حصے بنا کر استعمال کرنا لیکن اس نے آسان طریقے سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اعتراف کیا کہ اس نے ہماری ہدایات کے باوجود ساری دوا کو ملایا اور ایک ہی دفعہ پی گیا۔

۲۴ فروری :

ہم نے آج اپنے ہندو کو حکم دیا کہ وہ ہرات (خراسان) اور کرمان و یزد (ایران) کے لئے سندرجی کے آڑھتی کے نام ہمارے لئے ہنڈیاں بنوالے لیکن وہ ایران کے لئے نہ بنوا سکا۔ بہر حال اس کی تحقیقات سے ایک ایسی دریافت ہو گئی جو بالآخر سیستان کے راستوں میں ہمارے لئے نہایت اہم ثابت ہوئی جو ہم اختیار کرنے والے تھے۔ چونکہ سب راستے ہماری صحیح ترین معلومات کے مطابق قلات سے ساٹھ ستر میل شمال مغرب میں ایک گاؤں، نوشکی میں آملتے تھے لہٰذا ہمارا ارادہ پہلے نوشکی پہنچنے کا ہوا تاکہ وہاں سے جیسے مناسب ہو آگے بڑھا جا سکے۔ بیلہ سے جام نے جو آدمی ہمارے ساتھ کئے تھے وہ اب فارغ ہو کر گھر جانا چاہتے تھے اور چونکہ ہم خود بھی قلات کو خیر باد کہنے سے پہلے انہیں رخصت کر دینا چاہتے تھے لہٰذا ہم نے یہ درخواست فوراً مان لی، انہیں معاوضہ دے دیا گیا اور ایک خط بنام جام بھی۔ ان کی جگہ ہم نے چار براہوئی شتربان رکھ لئے۔

۲۵، ۲۶، ۲۷ اور ۲۸ فروری:

ہرات کے لیئے ہماری ہنڈیاں مرتب کرانے میں ہندوؤں کی تاخیر اور انکی کسی دوسری جگہ سے تیاری میں ان کی پیدا کردہ مشکلات نے ہمیں تین چار دن تک گومگو اور تذبذب کے عالم میں رکھا۔ اصل میں ان کا منصوبہ یہ تھا کہ غیر معمولی تصدیق سے ہم سے زیادہ سے زیادہ مہاجنی اور دلالی وصول کرسکیں۔ ایک دفعہ تو انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ہم انہیں کسی شرط پہ حاصل نہ کرسکتے تھے جبتک شلوبل شکارپور خط لکھ کر جواب حاصل نہ کرے اور ہم اسوقت تک قلات نہ ٹھہریں۔ چونکہ اس میں تین ہفتے لگتے لہذا کیپٹن کرسٹی نے فوراً انکار کر دیا اور ہندوؤں کی بے حد تکرار اور حیلہ سازی کے بعد ہمیں بالآخر ساڑھے پانچ فیصدی کمیشن دینے پہ رضامند ہونا پڑا۔ روزمرّہ کی باقاعدہ مہاجنی اس کے علاوہ تھی ہمیں اس پر بہت افسوس ہوا لیکن چند سو روپے کا نقصان قلات سے جان چھڑانے کے مقابلہ پہ ایک ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ ایسا دو یہ ہندوؤں کے خالص تاجرانہ خیالات و معاملات کے عین مطابق ہے وہ کسی شخص کی فوری ضرورت سے پیسہ حاصل کرنے کے لئے ایسی سودابازی کو ہمیشہ ایک منصفانہ اور ناقابل اعتراض کاروائی گردانتے ہیں۔ بسندرجی کے گماشتوں نے اس کے مفاد کے پیشِ نظر زیادہ سے زیادہ سودمند معاہدہ کی کوشش کی لیکن فریقِ ثانی نے ہماری بیقراری بھانپ لی اور اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔

چھبیّس تاریخ کو ایک معزز مرد بزرگ نے اشکبار آنکھوں سے التجا کی کہ ہم اس کے ساتھ شہر چلیں اور ایک مریض کو دیکھیں جسے ہم نے نہایت کمزور مریل حالت میں پایا۔ ہم نے اس کے لئے ایک دوا تجویز کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا اور وہ چار پانچ دن بعد چل بسا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمیں اس کی موت کا ذمّہ دار نہ ٹھہرایا گیا بلکہ صحیح طور پر اس دیر پا زہر سے منسوب کیا گیا جو اس کی پانچ سوتیلی ماؤں میں سے کسی نے اسے دے دیا تھا۔ ہم نے پہلی دفعہ اُسے دیکھا تو وہ ایک شکستہ و ریختہ جھونپڑے میں بند تھا لیکن وہ شاندار طور پہ

ملبوس تھا اور بہت سے خدام اس کے لئے مامور تھے۔ استفسار پر پتہ چلا کہ وہ لاکھ پتی بابی سوداگر، رُوح اللہ بیگ کا بیٹا تھا جسے خان قلات کے بھائی، میر مصطفیٰ خان نے کوئی دو ہفتے پیشتر کچ گنداوا میں مار دیا تھا۔ اس نوجوان کی حالت سوگوار تھی لیکن اس کے بلند پایہ انداز و اطوار نے ہمارے تجسس اور جذبہ دردمندی کو جگا دیا اور ہمیں اس کے والد مقتول کے حالات معلوم کرنے پر مجبور کر دیا۔

ہمیں بتایا گیا کہ میر مصطفیٰ خان بہت دیر سے یہ سمجھتا تھا کہ وہ فتح خان سے باغیانہ خط و کتابت کرتا تھا (جو شاہ محمود کا وزیر تھا اور شاہ محمود اپنی جگہ اس وقت تخت کابل کا ایک امیدوار تھا) لہذا وہ ایک رات اپنے چار نوکروں کے ساتھ کچ گنداوا میں اس کے گھر گیا اسے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ بابی ایک ضعیف اور غیر مسلح آدمی تھا لہذا یہ ظالمانہ اور بزدلانہ فعل ہر طبقے کے لوگوں میں زیر تنقید آیا کیونکہ اتنے صاحب حیثیت انسان کو یُوں بیدردی سے مارنا ایک بے نظیر واقعہ تھا۔ میر نے اسی وقت قلات کو بھی ایک ایلچی بھیج دیا کہ رُوح اللہ بیگ کے بیٹوں کو حراست میں لے لیا جائے اور ان کی جائیداد کو ضبط کر لیا جائے جس پر بہت سے لوگوں نے یہ دعوے سے کہنا شروع کر دیا کہ صرف دولت ہی اس بدنصیب انسان کا جرم تھا۔ صداقت کچھ بھی ہو اس حکم پر فوراً عمل ہوا اور داروغہ میر نے اس کے مکان اور گوداموں پر قبضہ کر لیا اور قیمتی اشیا کی ایک فہرست بنا کر میر کو بھیجدی۔ یہ اشیا تین لاکھ روپے (۳۷٫۵۰۰ پاؤنڈ) سے زیادہ مالیت کی تھیں۔ مقتول کے دو بیٹے قید میں ڈال دیئے گئے اور تیسرا خطرناک طور پر بیمار ہونے کی وجہ سے جھونپڑی میں رہنے دیا گیا اور اس پر بندوقچی تعینات کر دیئے گئے۔ ہم نے اسے اسی جھونپڑی میں دیکھا تھا۔

کرمانی ملا اب ہر روز آنے لگا تھا۔ وہ تھا بھی اتنا خوش بیان اور ذہین کہ ہم بیتابی سے اس کی راہ تکتے۔ ۲۷ کو اس کے ساتھ پانچ نہایت چست لڑکے بھی آئے جو خان کے ایک وکیل (مختار) سلطان صاحب کے بیٹے تھے۔ اُن میں سے سب سے بڑے نے لذیذ انگوروں کا ایک چھوٹا سا کھوکھا ہمیں پیش کیا جو رُوئی کی تہوں میں لپیٹے ہوئے تھے

اور جانے سے پہلے بتایا کہ اس کی والدہ کی خواہش تھی کہ آپ مشہور ڈاکٹر ہونے کی بدولت ہماری دو بہنوں کو دیکھ لیں جو کچھ عرصے سے ناساز تھیں۔ اُس نے ہمیں منوانے کے لیے اصرار کیا تو کیپٹن کرسٹی نے وعدہ کر لیا کہ اگلے دن اُن کے ہاں جائیں گے اور فیصلہ ہوا کہ ملّا صاحب آئیں گے اور اُن کے گھر لے چلیں گے۔ چنانچہ وہ ۲۸ کو بہت جلد آگیا اور ہم نے دیکھا کہ وہ ہم سے بھی زیادہ ہماری معالجانہ مہارت کے کمال کا خواہشمند تھا تاکہ ہماری وساطت سے وہ اپنی بہن کو آزاد کرا سکے جو اس خاندان میں خادمہ تھی جیسا کہ اُوپر ذکر کیا گیا۔ کیپٹن کرسٹی سے اس نے کہا" اپنی کتاب اپنی بغل میں دبا کر لے جاؤ اور خاتون کی نبض دیکھو اور پھر کہو کہ ضروری ادویات پر بے حساب رقم خرچ ہوگی۔ تمہیں یاد رکھنا ہوگا کہ تم اُس وقت تک اُنہیں کوئی نسخہ نہیں دو گے جب تک ان کی بیٹیوں کی صحت یابی کے بدلے اپنی رقم کا سودا نہ کر لو۔ اُن کا باپ بیحد امیر ہے اور اگر تم چاہو تو وہ علاج کے لیے تمہیں بخوشی دو تین سو روپے دے سکتے ہیں"۔ اس تلقین کے بعد کیپٹن کرسٹی اور ملّا روانہ ہوئے اور چونکہ منظر اتنا دلنشین تھا کہ میں اپنے الفاظ کی بجائے اسے اپنے مرحوم دوست کے الفاظ ہی اس کے جرنل سے یہاں پیش کرنا درست سمجھتا ہوں:

کیپٹن کرسٹی لکھتا ہے کہ گھر پہنچنے پر ہمیں چند منٹ صحن میں انتظار کرنا پڑا۔ اُس کے بعد داروغہ نے مجھے خوش آمدید کہا اور مجھے حرم میں لے گیا۔ کمرے میں داخل ہوا تو سلطان صاحب کی بیگم نے میرا استقبال کیا۔ وہ ایک کم قد دُبلی پتلی خاتون تھی جو ایک ڈھیلی ڈھالی بھورے رنگ کی قمیص میں ملبوس تھی جو سامنے سے کھلی تھی اور ایڑیوں کو چھوتی تھی۔ میں اس کے پاس نمدے پر بیٹھ گیا اور خادمائیں مقابل صف بستہ ہو گئیں۔ بہت سی معذرت کے بعد اُس نے اپنی بڑی لڑکی کا حال بتایا جو پندرہ سال کی تھی اور جلدی عوارض میں مبتلا تھی۔ اُس نے ایک کپڑے کے نیچے سے اُس کا ہاتھ نکالا تاکہ میں اس کی نبض دیکھ سکوں لیکن میں اُس کا منہ نہ دیکھ سکا۔ بازو پھیلانے کے لیے جب اُس نے کپڑا اٹھایا تو میں صرف یہ دیکھ سکا کہ اُس کا قد و قامت کوتاہ لیکن

پُرشکوہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اُس کی بیماری کھجوریں، شکریں اور دیگر حدت بخش چیزیں کھانے سے پیدا ہوئی تھی لہٰذا میں نے اسی کے مطابق علاج تجویز کیا۔ میں نے اسے گوشت کھانے سے منع کیا یا اس میں کمی پر جو اصرار کیا تو ان کے لئے یہ ایک بڑی مشکل تھی کیونکہ براہوئی عورت اسے بہت بڑی محرومی سمجھتی تھی۔ اس کے بعد ایک دُوسری بیٹی کا حال بتایا جو بارہ سال کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس کی آنکھیں کمزور تھیں۔ جب میں نے معصومانہ طور پر اُنہیں دیکھنے کے لئے کہا تو ان میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ فوراً مان گئے اور ایک ایسے چہرے سے نقاب اٹھایا گیا جو حسین ترین تھا۔ اُسے صرف آنکھوں کی دُھلائی کی ضرورت تھی اور میں نے کہا کہ میں اسے اپنے پاس سے بھجوا دوں گا۔ میں نے بڑی بیٹی کی نبض دیکھتے ہوئے اپنی جیبی گھڑی نکال لی تھی تاکہ میرا معائنہ سائنسی ہو سکے اور پھر بے خیالی میں میں اسے داروغہ کو دے بیٹھا تھا جو ایک مُلتانی ہندو تھا۔ اُس نے اپنی نسل کی مخصوص جہالت وحماقت کے تحت اسے کھول دیا اور مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہُوا کہ یہ بند ہو گئی۔ میں نے گھور کر اسے دیکھا اور کہا "کرمساک (بدمعاش) تم نہیں جانتے تم نے کیا گڑبڑ کر دی ہے۔ وہ گھبرایا اور ہنسا اور کہنے لگا کہ میں اسے ٹھیک کرنے کے فن سے بھی واقف تھا۔ جب میں جانے کے لئے اُٹھنے لگا تو خاتون نے کہا "ٹھہریئے لالہ کُر (اصطلاحِ محبت)، میرا ایک چودہ سالہ بیٹا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ آپ اسے قوت بخش دوائیں دیں۔ اُس کی شادی ہونے والی ہے لیکن وہ لاغر اور ناتواں ہے۔ میں چاہتی ہوں آپ اسے کوئی ایسی دوا دیں جس سے اُس کی ہڈیاں اور اعضا مضبُوط ہوں اور وہ ایک مرد بن سکے۔ میرا مطلب آپ سمجھ رہے ہیں نا؟" اس پر خادمائیں مسکرائیں تو اس نے پہلے اُنہیں اور پھر مجھے کہا "ڈاکٹر میرا بھائی ہے۔ میں اس سے کیوں کوئی بات چھپاؤں؟ لیکن کافی دیر ہو گئی ہے اور میں نے آپکو کافی زحمت دی ہے"۔ میں نے رخصت چاہی اور ایسے تکلیف دہ مریضوں سے چھٹکارا پایا لیکن نچلے دروازے پر مجھے سب خادماؤں نے گھیر لیا۔ ایک آنکھوں کے لئے دوا مانگ رہی تھی، دُوسری [illegible] کی خواہشمند تھی۔ تیسری کو باد یا ریح تھی لیکن میں جلدی جلدی اُن [illegible] کے باہر نکل [illegible] خانوں

سے مل کر بازار میں چلنے لگا حتیٰ کہ دو تین خادماؤں (جو میرا پیچھا کر رہی تھیں) کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔"

کوئی ایک گھنٹہ بعد کیپٹن کرسٹی گھر واپس آئے۔ پیچھے ہی پیچھے سلطان صاحب کا داروغہ ادویات لینے آیا جو اسے دیدی گئیں۔ وہ مزے لے لے کر اپنے آقا کے اقتدار و اختیار پر تبصرہ کرتا رہا اور ہمیں یقین دلانے لگا کہ اگر ہم نے اُسے اپنا دوست بنالیا تو ہمارے تاجرانہ عزائم کے راستے میں کوئی مشکل یا رکاوٹ حائل نہ ہو سکتی تھی۔ اُس کی معمولی سی التجا پر خان ہمارے سامان پر محصولات معاف کر سکتا تھا۔ ہم نے اپنے اطمینان کا اظہار کیا کہ غالباً ہم ان دو بیٹوں کی صحتیابی کے لئے مفید ہو سکیں جنہیں کیپٹن کرسٹی نے دیکھا تھا لیکن داروغہ کی لن ترانیوں سے نہ تو اس سلسلے میں ہمارا اشتیاق بڑھا اور نہ ہی ہم اس پر آمادہ ہو سکے کہ قلات چھوڑنے سے پہلے سلطان صاحب ہمیں اپنے حلقۂ احباب میں شامل کر سکیں۔

یکم اور دو مارچ:

یکم مارچ کی صبح کو شہر میں شور و غوغا اور کہرام مچا ہُوا تھا کہ رات کو مرحوم رُوح اللہ بیگ کے مکان میں چوری ہو گئی تھی اور ڈاکو پینتالیس ہزار روپے کی مالیت کے شال اور دیگر قیمتی اشیا اڑا لے گئے تھے۔ اقدامات سے یہ واضح ہو گیا کہ ڈاکو اجنبی نہ تھے اور چونکہ کچھ مال مسروقہ اونٹوں پر لے جایا گیا تھا اور قلعہ کے دروازے رات بھر بند ہوتے تھے لہٰذا خان کے نائب نے حکم دیا کہ کوئی شخص اگر تین دن تک قلات کے بیس میل کے اندر اندر کی سڑکوں پر چلا تو وہ گرفتار کر لیا جائے گا۔ چار آدمی چور ثابت ہوئے اور انہیں اگلی رات حراست میں لے لیا گیا کیونکہ انہوں نے کچھ سامان اُونٹوں پر لادنے کی کوشش کی۔ نائب نے واقعہ کی اطلاع خان کو دی اور دریں اثنا ان چوروں کو سخت کوڑے لگوائے گئے، اُن کی داڑھیاں جھلسا دی گئیں اور انہیں دو اُونٹوں کی پُشت سے باندھ کر گلی کوچوں میں پھرایا گیا اور اس عرصے میں ڈھنڈورہ ان کے آگے آگے پٹتا رہا۔ لوگ ان پر نعرے لگاتے رہے۔ آوازے کستے رہے اور نفرین بھیجتے

ہے اور نہ صرف کیچڑ، انڈے اور دیگر بے مزہ چیزیں پھینکتے رہے بلکہ ان پر گلوخ اندازی اور خشت باری کرتے رہے اور جلتی ہوئی لکڑیاں پھینکتے رہے حتیٰ کہ انہیں ادھ مُوا کرکے واپس قید خانے میں لے گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ میر مصطفیٰ خان کے پروردہ و رازدار ہونے کی وجہ سے زیادہ زیرِ عتاب آئے گویا بغضِ معاویہ برسرِ کار تھا لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو بھی نچی ڈاکے سے بلوچوں کی جبلّی نفرت ایسی ہی سزا کی متقاضی تھی۔

۲؍ مارچ:

دو مارچ کو ایک ملاقاتی اتفاقیہ طور پر آ گیا جس نے ہماری قلات میں آمد کے ایک دو دن بعد کا وعدہ یاد دلایا کہ ہم میر مصطفیٰ خان کے داروغہ سے ملیں گے جو ہنوز بیمار تھا لیکن ہر روز ہمارا منتظر تھا اور ہماری بے اعتنائی کو توہین سمجھتا تھا۔ ہم نے عدم مداخلت کا عذر پیش کیا لیکن ہمارا یاد دہندہ، داروغہ کا نوکر مطمئن نہ ہوا اور ہمیں با دلِ ناخواستہ اگلی صبح داروغہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا وعدہ کرنا پڑا۔ ہم نے چار تاریخ کو قلات سے روانہ ہونے کا فیصلہ کیا تھا اور آٹا اور کھجوریں قرزینوں[1] میں باندھ لی تھیں لیکن دو کی شام کو ہمارے سب ہندو واقف کار باجماعت آئے اور اصرار کیا کہ ہم جمعہ سے پہلے نہ جائیں کیونکہ اُس دن چاند کی پہلی تاریخ ہو گی جو نہایت مُبارک ہو گی۔ دونوں افغان اُس وقت موجود تھے اور ہماری روانگی کا سُن کر وہ کیپٹن کرسٹی سے ملتجی ہوئے کہ ہم انہیں اپنے آئندہ لائحہ عمل بتا دیں لیکن کیپٹن نے انہیں کسی نہ کسی طرح سمجھا دیا کہ ہم شاید دس دن تک بھی روانہ نہ ہوں۔ پھر انہوں نے مشورہ دیا کہ ہم سیدھے قندھار جائیں اور پھر ہرات کیونکہ سیستان کے غیر مانوس راستوں سے سفر کی وجہ سے ہم مشتبہ ہو جائیں گے اور اگر شاہ کابل یا اس کے وزیر کے کانوں میں بھنک پڑ گئی تو وہ ہمیں فرح (خراسان کا قصبہ مابین قندھار و ہرات) ہی روک لیں گے۔ ہم ان کے مشورے کی بدخواہی اور فاسد نیت سے بخوبی واقف تھے لیکن ہم نے انہیں بغور سُنا اور

---

[1] خورجی کی ایک قسم گھوڑوں یا اُونٹوں کے لئے، نمدے کی بنی ہوئی اور وسط میں تسمہ دار۔

وعدہ کیا کہ ہم روانہ ہونے سے پہلے ان کے مشورے کو ذہن میں رکھیں گے۔

۳ , مارچ :

ہم مصطفیٰ خان کے داروغہ سے ملے جو کل کے واقعہ کے برعکس خلاف توقع بہت تپاک سے ملا۔ اُس نے کہا کہ وہ ہماری ہر مطلوبہ چیز حاصل کرنے کے لئے تیار تھا۔ ہمارے آئندہ عزائم کے متعلق اُس نے بیشمار سوال پوچھے ۔ کیا ہم شمالی ممالک کو جانا چاہتے تھے یا قلات میں ہی ٹھہرنا چاہتے تھے ؟ ہمیں کس قسم کے اور کتنے گھوڑے درکار تھے ؟ کیا ہم اپنے طور پر تجارت کر رہے تھے یا کسی کے ملازم تھے ؟ وہ ہمارے سب جوابات ایک پُرزہ کاغذ پر لکھتا گیا اور حقیقت یہ ہے کہ اُس کا انداز اول تا آخر ایسا تھا کہ ہمیں کوئی شُبہ نہ رہا کہ اُسے خان یا اُس کے بھائی نے حال ہی میں ہمارا آگا پیچھا معلوم کرنے پر مامور کیا تھا۔ بظاہر ہم نے اُسے اپنی سوداگری کا قائل کر لیا اور اگر ہم محمود خان کے علاقے میں مزید ٹھہرتے تو داروغہ کی رپورٹ پہلے سے بھی زیادہ ہمارے بہروپ کو کامیاب بنانے میں ممد و معاون ہوتی۔ اُس نے یہ خبر بھی دی کہ کل شام پچاس گھوڑ سوار قلات سے گذرے تھے جو تندھار سے کچھ گندا واجا رہے تھے تاکہ شاہ کابل کے وزیر کی طرف سے مرحوم رُوح اللہ بیگ کے خاندان کی رہائی اور اُس کے مال و متاع کی بحالی کا مطالبہ کریں۔ اس اطلاع سے میر مصطفیٰ خان کے اس دعوے کو تقویت پہنچتی ہے کہ اس نے بابی سوداگر کو کیوں مارا۔ ویسے بھی وہ بہت منصف حکمران مشہور ہے۔ بعد ازاں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ وفد ناکام ہوا کیونکہ مصطفیٰ خان نے وزیر کے فرمان کے جواب میں سخت زبان میں صرف یہ کہلوا بھیجا کہ وہ جاہل مطلق تھا جو یہ تصور کرتا تھا کہ میر اس کے ایسے احکامات کو خاطر میں لائیگا۔ یہ بھی کہلوایا کہ آئندہ وہ اپنا کوئی آدمی ایسے کام کے لئے نہ بھیجے ورنہ طرفین کے درمیان تعلقات کی خوشگواری جاتی رہے گی۔ شام کو بیگم سلطان صاحب نے کہلوایا کہ اگر جاتے وقت کوئی قیمتی چیز چوروں کے ڈر سے ان کے گھر پہنچانا چاہیں تو اسے انتہائی حفاظت سے رکھا جائے گا۔ ہم نے اس پیشکش کے لئے شکریہ ادا کیا اور گو ہمارے پاس کوئی

ایسی چیز نہ تھی تاہم اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے پرانے کپڑوں کا ایک بنڈل اپنے ہندو ملازم کے ہاتھ بھجوا دیا جن کی مالیت پانچ شلنگ بھی نہ تھی۔ یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی اور اس پورے خاندان اور بہت سے دوسرے مشکوک لوگوں کو یقین ہو گیا کہ ہم واقعی تلاٹ میں دوبارہ بھی آنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

باب ششم

ہندو خطوط طالب بن کر حاضر ہوتے ہیں ــ قلات سے روانگی ــ افغانوں کا غم و غصہ ــ مخبری کی دھمکی دیتے ہیں ــ کیسے رام ہوئے ــ گاؤں غرتک ــ بارش ــ راستہ ــ راہ قندھار ــ کنواں ــ نک یا گھاٹیاں ــ ایک بہت خطرناک پانی ــ سخت برفیلی رات ــ بنجر علاقہ ــ مشکل درہ ــ مکمل بیان ــ صحرا ــ مصنف کے اس کے متعلق احساسات ــ درے سے اترائی ــ دریائے خیسار ــ کنارے پر پڑاؤ ــ ببول کا درخت ــ صحرائی گھاس ــ شتر کانٹا ــ کہر ــ تمن نوشکی ــ استقبال ــ ناخوشگوار ــ الجھن ــ موزوں اور برمحل نصیحت ــ مہمان خانہ ــ لوگوں کے رویّہ میں فوری تبدیلی ــ عشائیہ ــ سردار کی آمد ــ گفتگو اور تجاویز ــ فیصلہ ــ تبدیلی ــ وجہ ــ رائے ــ رہنماؤں پر اتفاق ــ بلوچی مہمان نوازی کا قابل ذکر قصہ ــ ملاقاتیوں سے زحمت ــ مسلمانی عقائد ــ سردار ــ چائے ــ بلوچی عدالت ــ مقدمہ کا بیان ــ اس کا ماخذ ــ فیصلہ ــ براہوئی ــ رال ــ مضحکہ خیز دنگا فساد ــ شکایت ــ ازالہ کیسے ہوا ــ رال کے پودے کا بیان ــ اسی نام کی دوا ــ کس طرح جمع ہوتی ہے ــ کہاں سے لائی جاتی ہے ــ مجوزہ راستے پر بڑھنے کے شکوک ــ تحقیق ــ ایک اور راستہ کی دریافت ــ مصنف اور اس کا ساتھی علیحدگی کا فیصلہ کرتے ہیں ــ ہدایات کے برعکس ــ ان کو نظر انداز کرنے کے وجوہات

——اس علیحدگی کے جواز کا طریقہ- کارگر—— روانگی کے لئے بیقراری—— دو چھوٹی چھوٹی بکریاں ذبح کیں——فضول خرچی——ہندو کا تحفہ——تعجب——تمّن رال سے متنفر-

---

۴، ۵، اور ۶ مارچ:

پہلے دو دنوں میں کوئی نیا واقعہ رُونما نہیں ہُوا۔ چھ مارچ کو ناشتے کے بعد ہندو خطوط اور ہنڈیاں لے آئے جو انہوں نے ایک شبھ گھڑی میں بھر کئے تھے اور انہیں پرماتما سے بہت سی دُعاؤں اور التجاؤں کے ساتھ کیپٹن کرسٹی کو پیش کیا۔ ہم نے اُونٹ فوراً تیار کرنے کا حکم دیا تو افغان ہکا بکا رہ گئے اور ہم پر منافقت اور غداری کا الزام لگایا۔ آخر کار وہ غضب ناک ہوگئے اور دھمکیاں دینے لگے کہ وہ خان کے نائب کو ہمارے فرار کا بتا دیں گے جو گھوڑ سوار ہمارے تعاقب میں بھیج کر ہمیں واپس منگوا لیگا۔ کیپٹن کرسٹی نے یہ سوچ کر کہیں وہ واقعی ایسا نہ کر بیٹھیں ہمارے ہندو سے کہا کہ وہ ان میں سے ہر ایک کو تحفہ دے اور ساتھ ہی خفیہ طور پر اسے کہہ دیا کہ روانگی کے انتظامات چند روز ملتوی کر دے۔ اس سے ان کا غصہ ٹھنڈا ہُوا اور اس کے بعد وہ بلا مزید تکلیف قندھار کو چلے گئے۔

ہماری جماعت ہم دو نوں کے علاوہ دو ہندوستانی ملازموں اور چار براہوئی شتربانوں پر مشتمل تھی۔ ہمارے پاس پانچ اُونٹ تھے اور ایک حادثہ کی صُورت کے لئے فارغ تھا اور ہر ایک پر دو دو بیٹھتے تھے جس کے لئے دوہری کاٹھیاں بنوائی گئی تھیں۔ آج کا راستہ ننگی پہاڑیوں کے درمیان سے گذرتا تھا۔ دو طرف پہاڑ بھی قریب ہی تھے۔ سڑک اچھی تھی اور عمدہ پانی بہ افراط میسر تھا اور چھوٹا چھوٹا جنگل بھی تھا۔ ہم آگے جانا چاہتے تھے لیکن بعد از دوپہر بارش کے آثار کی وجہ سے ہم کچھ

لہ قلات کے ہندوؤں نے مسلمانوں کی بہت سی بیہودہ رسمیں اختیار کرلی ہیں بلکہ وہ ان سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ ستاروں اور واقعات کے حساب کے بغیر کچھ نہیں کرتے اور ہر حادثے کو اسی زعم (جیسا کہ وہ سمجھتے ہیں) سے غفلت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

داہنی طرف مڑ گئے اور قلات سے سات میل شمال مغرب میں ایک چھوٹے سے گاؤں، غزک میں ٹھہر گئے۔ یہ جگہ اور کچھ ملحقہ زمین محمود خان کے ایک ماتحت، سید مراد کی ہے جو خان کے ساتھ ہی کچھ گندا دا میں تھا۔ اس کے ایک عزیز نے ایک خالی گھر دے دیا اور یہ سوچ کر آرام کرنے لگے کہ ہم پھر سفر پر رواں دواں تھے۔

۷، مارچ:

ہم سات بجے صبح غزک سے نکلے۔ رات سخت سرد اور بارانی تھی اور اونٹ بھیگنے کی وجہ سے سارا دن ٹھیک نہ چل سکے لہٰذا ہم صرف اٹھائیس میل کا فاصلہ طے کر سکے اور غروبِ آفتاب کے قریب ایک پہاڑی نالے کے پاٹ میں ٹھہر گئے۔ ہمارے قریب ہی بارش کے پانی کا ایک تالاب تھا اور ایندھن بھی کافی اکٹھا ہو سکتا تھا۔ غزک سے چار میل کے فاصلے پر ہم نے قلات سے قندھار کی سیدھی سڑک کو عبور کیا اور دس میل آگے آ کر روٹی اور کھجور کا ناشتہ کیا اور ایک کنوئیں پر سستائے جہاں کچھ راہوئی بھی ملے جو اپنے گدھوں پر نوشکی کو گندم لئے جا رہے تھے۔ علاقہ پہاڑی اور ویران تھا۔ ہم دو گھاٹیوں پر بھی چڑھے جن میں سے ایک تو بہت ہی خطرناک تھی۔ سنگلاخ راستہ دو فٹ سے زیادہ چوڑا نہ تھا اور بائیں طرف کم از کم ایک چوتھائی میل گہرائی تھی۔ ہم زیادہ تر مغرب کی طرف شمال کے رخ پر چلے لیکن سڑک اتنی غلطاں و پیچاں تھی کہ ہم ان سمتوں کا کوئی اندازہ نہ رکھ سکے۔ صرف دو ہی جگہوں پر ہمیں پانی ملا۔ غزک سے بارہ میل کے فاصلے پر اور پھر اپنے پڑاؤ کی جگہ۔

۸، مارچ:

شدید سردی کے باعث رات بہت مشکل سے گذری چونکہ ہمارے پاس نہ گرم کپڑے تھے نہ گرم بستر، لہٰذا سونا ناممکن تھا اور ہم صبح نو بجے سے پہلے ہلنے کا نام بھی نہ لے سکے۔ پھر سورج کی کرنیں گرم ہوئیں اور ہمیں حرارت بخشی تو ہم پا بر کاب ہوئے اور پانچ بجے شام تک اکتیس میل طے کر گئے۔ درمیانی علاقہ کل کے علاقے سے بھی زیادہ ویران و سنسان تھا اور راستہ

ویسا ہی پیچدار تھا۔ ہمیں بہت سے لک، یا دروں سے گذرنا پڑا۔ جن میں سے آخری قابلِ ذکر ہے - یہ
سرِ صحرا پر واقع ہے اور قدرت نے اسے ان بلند خطوں کے لئے ایک ناقابلِ عبور رکاوٹ بنا دیا ہے
مجھے اس سے زیادہ مشکل گھاٹی کسی ملک میں نظر نہیں آئی۔ یہ جنوب مشرق یا قلات کی طرف ایک گہری
اور تنگ گھاٹی کے ذریعے دوسرے پہاڑوں سے جدا ہوتا ہے جس کی اطراف ٹھوس سیاہ چٹانیں
ہیں اور تقریباً عمودی ہیں۔ ایک سنگلاخ راستے سے اس قعر سے نکل کر ہم درے کی جنوب مشرقی
طرف سے چڑھے جس کی چوٹی سے پورا صحرا نظر آتا ہے اور افقوں تک پھیلا ہوا ہے اور ریت پر
سورج کے انعکاس سے ایک ہموار سمندر معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت میرے اور میرے ساتھی کے
تاثرات قابلِ رشک تھے۔ ہم اپنے سامنے کے منظر میں اپنے نصف خوابوں کی تعبیر دیکھ رہے تھے
اور اس شہرۂ آفاق صحرا کے متعلق ہمارے شکوک رفع ہو گئے تھے۔ ہم نے اس مقصد کی تکمیل پر
ایک دوسرے کو مبارکباد دی جس کے لئے ہم ہندوستان سے آئے تھے اور جس کے حصول کے لئے
اس منظر نے ہمارے رگ و پے میں نیا ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ لک کی شمال مغربی طرف اترنے کے لئے ہمیں
پانچ گھنٹے لگے کیونکہ یہ گیارہ میل لمبی اور ڈھلوان ہے۔ ہم پہاڑوں کے درمیان ایک نالے کے
پاٹ میں آئے اور بے شمار ببول نبتیوں سے گذر کر صحرا میں داخل ہو گئے۔ ہمارے راستے کا آخری
نصف میل دریائے خیسار کا پاٹ تھا جو اس موسم میں قلات کا آسان ترین لیکن طویل ترین راستہ
ہے۔ یہ دریا برسات میں بہت گہرا اور تیز ہوتا ہے لیکن مئی، جون اور جولائی کے گرم مہینوں
میں اکثر خشک ہوتا ہے۔ جب ہم نے اسے عبور کیا تو دھارا دو تین فٹ گہرا اور چھ سات گز
چوڑا تھا۔ ہم نے رات کے لئے دوسرے کنارے پر پڑاؤ ڈالا کیونکہ نوشکی ہم اندھیرے سے
پہلے نہ پہنچ سکتے تھے - آج ہمیں جو پودے نظر آئے وہ ببول کی ایک قسم کی خشک جھاڑیاں
تھیں۔ دریا کے پاٹ میں لائی یعنی تمرس کی بہت بڑی تعداد تھی۔ مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ ہمارے راستے
کا ایک پہاڑ گل لالہ کی مانند گٹھی دار جڑوں سے پٹا پڑا تھا جو کھلنے والی تھیں اور ہمارے براہوئیوں
نے مجھے یقین دلایا کہ ایک ماہ تک ان کی خوشبو دور دور تک پھیل جائے گی۔ یہاں خشتے پت نامی

گھاس بھی بہت ہے جسے براہوئی مناسب وقت پر جمع کر لیتے ہیں تاکہ ان کی بھیڑیں بکریاں سردی میں کھاتی رہیں۔ یہ خوشوں میں اُگتی ہے اور اس کے تنے موٹے اور کھردرے اور پتے لمبے اور سروں پہ دندانے دار ہوتے ہیں۔ یہ بیحد شیریں اور قوت بخش ہوتی ہے۔ شینز (جسے ایرانی خارشتر کہتے ہیں) بھی یہاں موجود ہے لیکن اتنی نہیں جتنی نشیبی علاقوں میں۔

۹ مارچ :

رات سخت کہر آلود تھی لیکن پچھلی رات سے پھر بھی کم سرد تھی۔ ہم تمن یا گاؤں نوشکی صبح ۹ بجے پہنچ گئے۔ ہمارا سفر صحرا میں چھ میل جنوب سے مغرب کی طرف تھا۔ صحرا میں ریت کے ٹیلے ہیں اور دو تین میل تک الگ تھلگ پہاڑیاں جو یہاں کے جنوب مغربی سلسلۂ کوہ سے پھوٹتی ہیں۔ ہمیں آتے ہی تمن کی پوری آبادی نے گھیر لیا کیونکہ یہاں اجنبیوں کا ظہور ایک انوکھا واقعہ تھا۔ ہم نے سُکارام نامی ہندو کو بلایا جس کے نام ہمارے پاس تعارفی خط تھا۔ وہ آیا تو ہم نے اسے کچھ آٹا اور کھجوریں لانے کے لئے کہا تاکہ ہمارا ذخیرہ بھر جائے کیونکہ ہم فوراً آگے چلے جانا چاہتے تھے۔ وہ ہماری بے باکی پر مسکرایا اور کہنے لگا کہ سڑک پر لٹنے اور مارے جانے کا اندیشہ تھا لیکن ساتھ ہی اُس نے بتایا کہ کل ہی ایک کارواں گرم سیل (نوشکی سے شمال مغرب کا ضلع ۷۵ میل دُور) کو گیا تھا اور اگر ہمیں جانا ہی تھا تو ایک رہنما لیکر اس کے ساتھ مل جانا بہتر تھا۔ ہم نے اسے رہنما کی تلاش کا حکم دیا اور اس کی غیر حاضری میں ہم اونٹوں سے اُترے اور ناشتہ کے لئے صحرا میں ہی بیٹھ گئے۔ ہندو فوراً ہی ایک بوڑھے آدمی کو لے آیا جس نے ہمیں گرم سیل پہنچانے کے لئے چالیس رُوپے مانگے۔ ہمیں یہ بیہودہ مطالبہ منظور نہ تھا لہٰذا ہمیں رُکنا پڑا۔ سُکارام ہم سے بھی زیادہ بے بس تھا اور ہماری کوئی مدد نہ کر سکتا تھا۔ سردار تمن گھر سے باہر تھا اور ہمارے ارد گرد بلوچ کج خلق اور تکلیف دہ ہو رہے تھے ہم ادھیڑ بن میں تھے کہ ایک آدمی (جو لباس کے اعتبار سے ایرانی معلوم ہوتا تھا) آیا اور ہمیں یہاں خان کے جانے کا مشورہ دیا۔ اُس نے کہا "وہاں آپ محفوظ اور سکھی رہیں گے اور شام کو جب سردار آجائیگا

تو وہ آپ کے لئے ایک رہنما کا بھی بندوبست کر دیگا"۔ ہم نے یہ مشورہ مان لیا۔ لوگوں کے رویہ پر بھی اس کا فوری اثر ہُوا اور گو وہ اب بھی ہمارا اتا پتا جاننے کے لئے متجسس تھے۔ تاہم وہ ہماری ضروریات اور آرام کا سوچنے لگے، دری بچھائی، سردار کے گھر سے تکیے لائے غرضیکہ مہمان خانہ میں آنے کے ساتھ ہی اپنے سردار کے مہمان سمجھنے لگے اور بلوچی حقوق مہمان نوازی کے مستحق گردانے گئے۔ اور یہ حسن سلوک صرف ہم اور ہمارے آدمیوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ انہوں نے ایک آدمی ہمارے جانور چرانے پر بھی مقرر کر دیا۔

مہمان خانہ ایک گدان تھا جو بید کی ٹہنیوں کا ڈھانچہ تھا جس کی چھت سیاہ کمبل سے ڈھکی ہوئی تھی۔ عین دوپہر کے وقت تین گھنٹے سُرخ ریت پر بیٹھنے کے بعد یہ گدان ہمیں ٹھنڈا اور فرحت بخش معلوم ہُوا۔ ہم نے جان و مال کے فکر سے آزاد ہو کر اپنا اسلحہ ایک طرف رکھا اور سو گئے۔ غروب آفتاب کے وقت اُنہوں نے سردار کے گھر سے گرم روٹیوں اور مٹر شوربا کی ایک تُرے بھیج دی اور ہمارے کھانے کے تھوڑی دیر بعد سردار خود بھی آگیا۔ رواج کے مُطابق بغل گیری کے بعد وہ حیران ہُوا کہ ہم قلات یا پنج گندا وا سے اس کے نام خطوط کیوں نہیں لائے تھے جبکہ ہم وہاں رہے تھے یعنی پنج گنداوا۔ ساتھ ہی اُس نے کہا کہ خان سے دوستی کی بنا پر وہ بچ نکلنے میں (کیونکہ اسے یقین تھا کہ کوئی ہمارا پیچھا کر رہا تھا) ہماری کوئی مدد نہ کر سکتا تھا کیونکہ ہم بابلی سوداگر رُوح اللہ بیگ کے بیٹے تھے۔ بسلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اُس نے کہا "لیکن تم آرام کرو میرا فرض ہے کہ میں یہاں قیام کے دوران آپ کی حفاظت کروں"۔ ہم نے اُسے بتایا کہ اُس کا اندازہ بالکل غلط تھا۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا، تو خان سے بذاتِ خود ہم پاسپورٹ لے لیتے اور ہم ایک اوزبک تاتار خاندان کے خستہ حال لوگ تھے جو چند پشتیں پہلے ہندوستان میں بس گیا تھا اور اب ہم ایک ہندو کے ملازم تھے اور اُس کے لئے ہرات سے گھوڑے خریدنے جا رہے تھے۔ اُس نے اس موضوع پر مزید کچھ نہ کہا لیکن اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اٹھتے ہوئے کہا "میں آپ کو ہندو سُکارام کے ذریعے پیغام بھیجوں گا جو ہمارا مشترکہ واقف کار ہے اسے آپ واضح جواب دیجئے اور پھر آپ کا کام حسبِ منشا ہو

جائے گا"۔ کوئی دس منٹ میں سکارام واپس آیا۔ سردار کا پیغام بھی اُس کے استفسارات کے عین مُطابق تھا۔ ہم نے اپنا سابقہ بیان دہرایا اور ہندو سے پوچھا کہ وہ کس طرح اسے مشکوک سمجھ سکتا تھا جبکہ قلاّت کے آڑھتیوں سے بھی اُسے ہماری یہی اطلاعات ملتی رہی تھیں اُس نے ہمیں برحق سمجھا اور کہا کہ اُس نے سردار کو قائل کرنے کے لئے یہی دلیل دی تھی اور اسنے دو رہنماؤں کی پیشکش بھی کی جو ہمیں صرف راستہ دکھائیں گے اور ہماری سلامتی سپردِ خدا ہوگی یا پھر سردار معمولی معاوضہ کے بدلے اپنا بیٹا اور بارہ بندوقچی ہمارے مختصر سے قافلہ کے ساتھ سیستان[1] کے دارالحکومت، دُوشنک تک بھیج دیگا جو ہماری منزلِ مقصود، ہرات کے راستے پر وسط میں تھا۔ ہم نے ان تجاویز پر غور کرنے اور سردار کو صبح اپنا فیصلہ بتانے کا وعدہ کیا جس پر سُکارام واپس چلا گیا۔

۱۰ / مارچ:

ہم نے رات کو دو رہنما لینے کا فیصلہ کیا تاکہ تیاری کی لیت ولعل سے بچ سکیں اور کیپٹن کرسٹی خود طلوعِ آفتاب کے بعد سردار کو مطلع کرنے گیا جو گداں کے سامنے ہمارے اُونٹوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ یہ سُن کر مایوس نہیں ہُوا اور کہا کہ وہ فوراً تیار ہو سکتے ہیں لیکن ہمیں یاد رکھنا ہوگا کہ وہ ہماری حفاظت کے لئے قطعاً ذمہ دار نہ ہوگا۔ جس کی اُس نے کوئی وضاحت نہیں کی کیونکہ ہمارے لئے یہی تنبیہہ کافی تھی۔ ہمیں امید تھی کہ یہ اشتباہ مصنوعی تھا تاکہ سردار ہمارے ساتھ سودا بازی کر سکے لہٰذا ہم اپنے فیصلہ پر ڈٹے رہے۔ اس لمحہ وہی آدمی جس نے ہمیں کل مہمان خانہ آنے کا مشورہ دیا تھا اور جس کے متعلق اب ہمیں معلوم ہُوا کہ وہ بدھو نامی ایک سیستانی ہندو تھا ہمارے پاس اتفاقیہ آگیا اور گفتگو سُن کر کہنے لگا "بہتر ہوگا کہ آپ ان دو رہنماؤں کے ساتھ نجاوٴ کی سوچیں۔ میں ان علاقوں سے واقف ہوں۔ اگر سردار آپ کے ساتھ اپنا بیٹا بھیج دے

---

[1] کیپٹن کرسٹی بعد میں دُوشنک سے ہی گذرا۔

تو پس و پیش نہ کریں اور معاہدہ کرلیں۔ بے محافظ جانے کی صورت میں آپ کی جان و مال کو جو خطرہ
درپیش ہے اس کے مقابلہ پہ یہ خرچ بالکل حقیر ہوگا۔" دوسرے ہندوؤں نے بھی یہی مشورہ دیا اور یہ
سوچ کر کہ ہمارے لُٹ جانے سے ہی ہمارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ ہم نے
اسی مشورہ کو مناسب سمجھا لیکن ہم نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ پورے تمن کا یہ تاثر دُور کر دیں کہ ہمارے
پاس بہت قیمتی سامان تھا چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ تمام ملبوسات واپس قلات بھیج دیں اور
اپنا سامان صرف تن کے کپڑوں اور آٹے اور کھجوروں کے تھیلے تک محدود کرلیں۔ ہم نے یہ
سردار اور لوگوں کو بھی اشارتاً بتا دیا لیکن وہ اصرار کرتا رہا کہ سردار زادے کی رفاقت کی
وجہ سے ہم جو چاہیں بلاخوف و خطر ساتھ لیجائیں۔ اب فیصلہ ہُوا کہ اُس کا بیٹا اور بارہ تفنگچی دوشک
تک ہمارے ساتھ جائیں گے اور ہم فوراً قلات کو ایک قاصد بھیج کر رقم منگوالیں گے، جو ان
محافظوں کو دینا ہوگی۔ رقم کا فیصلہ ہندوؤں پر چھوڑ دیا گیا۔

جب یہ سودا طے پاگیا اور سردار نے وعدہ کیا کہ وہ ہماری فوری روانگی کے لئے انتظامات
کریگا تو ہم مہمان خانہ میں واپس آئے اور روٹی اور دودھ سے ناشتہ کیا جو سردار کے گھر سے
بھیجا گیا تھا۔ آج صبح ایک واقعہ ہُوا جس سے یہ ثابت ہُوا کہ ان لوگوں میں مہمان نوازی کا جذبہ
جبلّی ہے۔ ہمارا ایک ہندوستانی نوکر روٹی پکا رہا تھا کہ بلوچوں نے اسے دیکھ لیا اور کہا یہ کیا؟
کیا تم ہمارے تمن کو کلنک کا ٹیکہ لگاؤ گے؟ کیا عیدل خان (سردار کا نام) اپنے مہمانوں کو
خوراک نہیں دے سکتا؟" نوکر نے انہیں بتایا کہ وہ ان کی رسومات سے ناواقف تھا جس
پر وہ خوش ہوگئے اور اُسے بتانے لگے کہ گو وہ صحرا میں رہتے تھے اور غریب لوگ تھے تاہم انہوں
نے ایک دفعہ نصیر خان[1] اور اس کی فوج کی پانچ دن تک ایسی خاطر تواضع کی تھی کہ وہ بعد میں

---

[1] موجودہ خان قلات کا والد۔ یہ درست ہے۔ وہ ایرانیوں کے خلاف شاہ کابل کی مدد کے لئے مشہد
(خراسان) گیا تھا اور واپسی ریگستان اور صحرا کے راستے سے آیا۔

ہمیشہ انہیں دلکشا، یعنی فیاض پکارتا رہا۔

قبل از دو پہر ہمارے پاس بیکار بلوچوں کا جمگھٹ لگا رہا اور ہم ان کی ناواجب طویل نشست اور فضول سوالوں سے تنگ آ گئے۔ ہم ایسی آزمائش کسی حد تک تو برداشت کر سکتے تھے لیکن یہ خوفناک حد تک صبر آزما ہو گئی۔ ان میں سے کچھ تو چار پانچ گھنٹے ڈٹے رہے اور تمباکو نوشی، گپ بازی اور گانے بجانے میں لگے رہے۔ وہ ایک شوخ نوجوان جمعہ خان کے ساتھ آئے تھے جس کے متعلق معلوم ہوا کہ وہی سردار کا بڑا بیٹا تھا اور ہمارا ہونیوالا رہنما تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی خاص طور پہ جاننا چاہتے تھے کہ ہم سُنی تھے یا شیعہ[1]۔ وہ سفید رنگ کی وجہ سے ہمیں عجمی[2] سمجھ رہے تھے اور بالآخر ہمیں کلمہ پڑھنے کے لئے کہا جو ہم نے سُنی عقیدہ کے مطابق پڑھ دیا کیونکہ وہ سب سُنی تھے۔ شام کو بوڑھا سردار خود مجلس کے لئے آیا۔ ہمارے پاس بمبئی سے آورده تھوڑی سی چائے تھی لہٰذا ہم نے اسے ایک کپ بنا دیا۔ وہ اس التفات پر بہت خوش ہوا اور اس کے بعد بھی اکثر آتا رہا۔ ہم اس کی آمد سے خوش ہوتے تھے کیونکہ وہ دوسروں کو ضبط میں رکھتا تھا۔ بہت سی معلومات و حکایات کا حامل تھا اور ہمارے سوالات کے جوابات کے لئے کمربستہ ہوتا تھا۔

۱۱، مارچ:

آج ہمیں سردار کی عدالت دیکھنے کا خوشگوار موقعہ ملا جو رات کے وقت کسی چوری یا ڈاکہ کے سلسلہ میں لگائی گئی۔ مدعی کوئی تین میل دور تمن بہادر خان کے مینگل براہوئی تھے اور مدعا علیہ نوشکی کے بلوچ۔ طرفین ایک دوسرے کے خلاف دلائل دے رہے تھے اور چونکہ ان کے دلائل وزنی اور زوردار نہ تھے لہٰذا وہ اس کمی کو زورِ خطابت سے پورا کرنا چاہتے تھے اور تین گھنٹے تک کانوں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر ایک اپنی اپنی کہہ رہا تھا اور سب مسلسل بولتے

---

[1] مسلمانوں کے دو بڑے فرقے۔ دیکھئے باب چہارم میں بلوچوں کے مذہب پر نوٹ۔

[2] عجمی یعنی ایرانی جو تمام شیعہ ہیں۔

جا رہے تھے۔ ایسے میں اُسی کی سُنی جانے کی توقع تھی جو سب سے زیادہ چیخ سکتا تھا۔ سردار نے ان سب کو نہایت صبر و اطمینان سے سُنا اور جب وہ بولتے بولتے تھک گئے تو اُس نے اپنے تاثرات بتلائے اور فیصلہ سُنا دیا۔ اس کے بعد لوگ منتشر ہو گئے۔

جہاں تک میں سمجھ سکا قصہ ایک قریبی پہاڑی پر چرائی کے حق سے متعلق تھا۔ بلوچ ڈانٹ ڈپٹ سے براہوئیوں کو یہاں سے ہٹانا چاہتے تھے اور جب وہ نہ مانے تو زبردستی ان کے ریوڑ پکڑ لئے لیکن براہوئی جیت گئے کیونکہ فیصلہ یہ ہوا کہ اُن کا بھی کم از کم برابر کا حق تھا۔ یہ فیصلہ (جسے بلا چون و چرا تسلیم کیا گیا) سُناتے ہوئے سردار نے اپنے جیل کو یاد دلایا کہ براہوئی اصل میں خان اور خود اُس کی منظوری سے نوشکی کے قریب آباد ہوئے تھے لہٰذا وہ ہر قسم کی مراعات کے مستحق تھے۔ میں نے دیکھا کہ مینگل سردار کا ایک عزیز بھی اپنے لوگوں کے ہمراہ تھا اور سردار تحقیقات کے دوران بار بار اُس سے مخاطب ہوتا تھا۔ یہ عدالتیں ہمیشہ مہمان خانہ میں ہوتی ہیں بشرطیکہ یہ خالی ہو لیکن ہم اُس وقت اس میں مقیم تھے لہٰذا قالین اور نمدے دروازے کے سامنے بچھائے گئے اور سب لوگ بلا حیل و حجت دھوپ میں بیٹھے رہے۔

کاروائی کے دوران ایک بدنصیب پہاڑیا آگیا جس کے پاس دو گدھے سال کے پودوں سے لدے ہوئے تھے جو وہ بیچنا چاہتا تھا۔ لوگ انہیں خریدنے کے اتنے مشتاق تھے کہ وہ سب کے سب اس پر اور اس کے سامان پر پل پڑے اور کوئی آدھ گھنٹہ وہ دھینگا مشتی اور چھینا جھپٹی ہوئی کہ خدا کی پناہ! سب کے سب اس میں شریک ہو گئے سوائے سردار، اور مینگل معتبر اور ہم دونوں کے اور ہم چاروں اس ہنگامے پر خوب قہقہے لگاتے رہے۔ غریب آدمی کی خوب درگت بنی لیکن اس نے جلدی جلدی اپنے کو اور اپنے گدھوں کو نرغے سے نکالا اور اس بدسلوکی پر سردار سے شکایت کر دی۔ ان تمام نے کہا کہ حملہ ہندوؤں نے شروع کیا تھا تاکہ وہ اسے پرچون میں بیچ سکیں لہٰذا وہ بھی شریک ہو گئے اور مال غنیمت سے جتنا حصہ ہلا لے گئے۔ فیصلہ صادر ہوا کہ وہ براہوئی کو مطمئن کریں چنانچہ اسے تمباکو اور چینی

دے کر خوش کر دیا گیا۔

بلوچ اور ہندو دونو رال کے پودے کے رسیا ہیں اور اسے سوغات سمجھتے ہیں۔ وہ اس کے تنے کو بھون لیتے ہیں اور اُس کے پتوں اور سرے کو اُبلتے ہیں یا گھی میں تل لیتے ہیں۔ یہ پودا بلوچستان کے شمالی حصّوں کے پہاڑوں پر باافراط ہوتا ہے جہاں سے چرواہے اسے منڈیوں میں لاتے ہیں۔ پک جائے تو اُس کا سرا گوبھی کا پھول معلوم ہوتا ہے جو ہلکے بھورے کے رنگ کا ہوتا ہے۔ تنا ایک سے ڈھائی فٹ تک لمبا اور تین چار انچ موٹا اور اُس کے[1] پتے ہندوستانی چقندر سے ملتے جلتے ہیں۔ اسی نام کی دوا یوروپ سے ہر سال بیحد مقدار میں ہندوستان میں لائی جاتی ہے اور بلوچ اور ایرانی اسے شیر ہینگ یا رال کا دودھ کہتے ہیں۔ یہ جڑ یا اس کے پاس سے نکالا جاتا ہے جب پودا ابھی پکا ہو اور جب اس کے پتے اپنا قدرتی گہرا سبز رنگ چھوڑ کر ہلکا زرد رنگ اختیار کر رہے ہوں۔ اس وقت اس کے تنے کو زمین سے کوئی چھ انچ اُوپر کاٹ دیا جاتا ہے۔ آس پاس کی زمین صاف کی جاتی ہے اور وہاں قریباً ایک انچ لمبا چیرا دے دیا جاتا ہے جہاں سے شاخیں پھوٹتی ہیں۔ رال کی ایک ڈنٹھل قریباً ایک پاؤنڈ یا زیادہ ہوتی ہے۔ ڈنٹھل کاٹنے کے بعد اسے تین دن میں اکٹھا کر لیا جاتا ہے اور جڑ آئندہ بہار میں پھر اُگ آتی ہے۔

---

[1] ہندوستان کو آنیوالی رال بلوچستانی نہیں کیونکہ یہاں تو گھر یلو کھپت کے لئے بھی کافی نہیں ہوتی۔ ہرات (خراسان) کے قریبی پہاڑوں میں یہ پودا بہت ہوتا ہے۔ کیپٹن کرسٹی نے اپنے تذکرہ کے ایک پیرا میں لکھا ہے (جو اسوقت میرے سامنے ہے) کہ اُس کا راستہ انہیں پہاڑیوں سے گذرا جہاں اس کی بہتات ہے اور اس نے اسے ہرات کی اہم پیداوار قرار دیا۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ اگر مناسب وقت پر تنے میں چیرا نہ دیا جائے تو یہ پھٹ جاتا ہے اور اس کا دودھ (جسے ہم ہوا کے اثر سے ٹھوس اور سخت شکل میں دیکھتے ہیں) رسنے لگتا ہے اور یوں اس قدرتی عمل سے اس کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔ اچھا رال پہلے زرد رنگ کا اور بالکل خشک ہوتا ہے۔ اسے جمع کرنے والے عموماً گھی ملا کر اس کا وزن بڑھا لیتے ہیں۔

۱۲، ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ مارچ:

پچھلے چار دنوں میں ہم نے سردار کے ساتھ جو مشورے کئے ان کی روشنی میں اس سمت میں آگے بڑھنا کچھ ممکن دکھائی نہ دیتا تھا لہٰذا ہم بلوچستان و مکران کے جنوبی حصوں کے راستوں کے متعلق معلومات حاصل کرتے رہے۔ چودہ کی شام کو سردار کا بیٹا اور اس کا بھتیجا مراد خان بھی ملنے آئے اور جب بات حسبِ معمول ہمارے سفر کی چھڑی تو انہوں نے بھی عیدل خان سے اتفاق کیا اور یہی مشورہ دیا کہ ہم سیستان کی بجائے کسی اور راستے سے جائیں۔ مراد نے کہا "آپ لوگ کیچ (مکران کا صدر مقام) اور بمپور کے راستے کرمان کیوں نہیں جاتے؟ یا اس جگہ سے جسر (بلوچستانی مغربی سرحد پر ایک گاؤں) اور پھر نرمن شیر (کرمان کا جنوب مغربی ضلع) کے ذریعے کرمان کیوں نہیں جاتے جہاں سے آپ ہر وقت ہرات جا سکتے ہیں۔ اگر آپ ان دونوں میں سے کوئی بھی راستہ اختیار کریں تو میں خود شاہ ایران کی سلطنت کی حدود تک آپ کی رہنمائی کروں گا" ذہن میں فوراً دونوں راستوں کے استعمال کا خیال آیا اور جب ملاقاتی چلے گئے تو ہم دونوں نے تبادلۂ خیال کیا اور فیصلہ کیا کہ ہم دونوں صحرا سے الگ الگ راستہ لیں۔ یہ تجویز ہندوستان میں آغازِ سفر پہ ملنے والی ہدایات سے مختلف تھا لیکن زیادہ سے زیادہ جغرافیائی اور شماریاتی معلومات کے حصول سے مسلمہ فوائد کے پیشِ نظر ہم اس فیصلہ میں حق بجانب تھے لہٰذا اگلے دن جب سیستانی ہندو بصو (جو مستعد تھا اور جسے ہم نے سنکارام کی جگہ تعینات کر لیا تھا) آیا تو ہم اپنے ارادے اس پر ظاہر کرنے کے لئے تیار تھے بشرطیکہ وہ انہیں پہلے سے طے شدہ نہ سمجھ لے۔ اُس نے اپنی گفتگو کا آغاز ہی راہ سیستان کو ترک کرنے کی التجا سے کیا اور کہا "میں عیدل خان سے باتیں کرتا رہا ہوں اور وہ اتنے خطرات و مشکلات کا ذکر کرتا ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ آپ جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں یا لُٹ پٹ نہ جائیں"۔ پھر اُس نے کہا کہ وہ قندھار میں اپنے گماشتوں کے نام خطوط دیگا جہاں سے ہرات کی سڑک پر خوب چہل پہل رہتی ہے لیکن یہ راستہ بھی بامر مجبوری اختیار کرنا چاہیے۔ ہم نے صاف انکار تو نہ کیا اور کہا کہ سندر جی کے ملازم ہونے کی حیثیت سے ہم خود فیصلہ کے مجاز نہ تھے اور عین ممکن ہے کہ قلات سے آنے والا قاصد جسر اور نرمن شیر کے راستے کرمان جانے کا حکم لے آئے۔ اس خیال

کو اس نے پورے تمن میں گھما دیا اور یہ بالآخر ہمیں اپنا منصوبہ زیرِ عمل لانے کے لئے بہت کامیاب حربہ اور معقول ترین بہانہ ثابت ہُوا۔

نوشکی میں ہم پانچ دن گذار چکے تھے اور اب ہم بے تابی سے قاصد کے منتظر تھے تاکہ فوراً روانہ ہو سکیں۔ ہمارے میزبان کی مہمان نوازی میں سرِ مُو فرق نہ آیا۔ ہر صبح دُودھ، دہی اور پنیر آتے رہے جو ہم سب کے لئے کافی ہوتے اور اس کے نوکر نہلانے کے لئے پانی لاتے۔ شام کو بھی اسی کا اعادہ ہوتا۔ دو دفعہ ہم نے برّے خریدے اور ذبح کئے، ایک ران سردار کو بھیجی اور بقایا کا کچھ حصہ ہندوؤں کو دیا لیکن ہمیں پتہ چلا کہ وہ اسے اسراف سمجھتے تھے حالانکہ ہر برّہ کی قیمت صرف ایک روپیہ تھی۔ گوشت کے ایک ٹکڑے کے بدلے بُدھو ایک شام کھانے کے وقت اسی کے بقول ایسی مزے کی چیز لایا جس کی تعریف کے اس نے پُل باندھ دیے گویا کہ وہ ایک پُر ذوق عیش پسند تھا۔ یہ رال کا ایک نرم و نازک پَودا تھا جسے اُس نے بدبو دار مکھن میں تلا تھا۔ ہم اپنے اس مہربان دوست کو قائل نہ کر سکے کہ ہم اس نفیس غذا سے لُطف اندوز نہ ہو سکتے تھے کیونکہ ہر ابودا تودہ کی نسبت زیادہ متعفّن اور رقت آور ہوتا ہے۔ ہماری قوّتِ شامہ اس کی تصدیق کر رہی تھی اور یہ وہی پودے تھے جو بڑا ہوئی لایا تھا اور اس کے دو تین دن بعد تک اسے پانی سے تازہ رکھ کر تیار کیا گیا تھا اور ہوا میں بھی اس کی بساند اور سڑاند پھیلی ہوئی تھی۔

باب ہفتم

قاصد قلات سے آتا ہے — کیپٹن کرسٹی روانگی کی تیاری کرتا ہے — مصنف کو ہدایات دیتا ہے — نامبارک دن — اس پر گفتگو — غیر تسلی بخش نتیجہ — سردار کی تنبیہہ اپنے بھتیجے کے بارے میں — التجا — منظور شرائط — نااُمیدی — سردار پر جھوٹ بولنے کی لعن طعن — اُس کا جواب — تیز ہوا — ریت — مزید تاخیر کے خدشات — غلط — کیپٹن کرسٹی مصنف کو نوشکی چھوڑ دیتا ہے — سردار کو اُس کا تحفہ — پیش کرنے کے وجوہات — ہوادار اور اداس دن — سردار کی توجہ — موسلادھار بارش — مصنف کی غیر آرام دہ کیفیت — قلات سے دوسرا قاصد — خطوط — خبریں مصنف کے لئے بجد اہم — سندھی قلات میں — اعلان — کاروائی — نتائج سے بچنے کے لئے اقدامات — ایک رہنما کرائے پر — گرفت سے بال بال بچاؤ — قصہ — قلات میں ہندو کو لکھتے ہیں — سردار کو پیغام — اُس کی حیرت — ڈانٹ ڈپٹ — کس طرح ٹالی — خطوط کی پیش کش۔

۱۶، ۱۷، ۱۸، اور ۱۹ مارچ :

ہمارا قاصد سولہ کو قلات سے واپس آیا اور اپنے ساتھ ہنڈی بھی لایا اور قلات کے ہندو

کا خط بھی لایا چنانچہ کیپٹن کرسٹی سردار کے پاس گیا، اُسے طے شدہ رقم ادا کی اور روانگی کے فوری انتظام کی درخواست کی۔ اُس نے اسے یہ بھی بتایا کہ مجھے جنوبی راستے سے کرمان جانے کا حکم ملا تھا لہٰذا میں یہیں نوشکی ٹھہروں گا۔ تاکہ کوئی آدمی آئے اور ہم سے زائد از ضرورت اشیاء لے سکے۔ بوڑھا سردار کیپٹن کرسٹی سے کسی مبارک دن کی باتیں کرتا رہا تاکہ سفر کا آغاز ہو سکے لیکن بیچارہ کو وہ اپنی موجودہ تیاریوں میں اتنا سرد مہر اور تاخیر انداز معلوم ہوا کہ کیپٹن نے اسے کہہ دیا کہ اگر وہ کسی دن کا پختہ فیصلہ نہیں کرتا تو ہم لوگ واپس قلات چلے جائیں گے۔ سردار نے نہایت ہوشیاری سے قابل اعتبار اور فرمانبردار رفقائے سفر کے نہ ملنے کا عذر پیش کیا لیکن بالآخر فیصلہ کیا کہ ۲۰ کو روانگی ہوگی اور اس سے پہلی شام مجھے کیپٹن کرسٹی سے مندرجہ ذیل ہدایات ملیں:۔

"نوشکی" : ۱۹ / مارچ :

اوّل :

تم غالباً براستہ سرحد چالیس دن میں کرمان پہنچو گے جہاں سے تم مجھے خط بند کر کے ہرات بنام ہری سنگھ بھیجو گے جو وہاں ہمارا ہندو گماشتہ ہے۔

دوم :

مجھے براستہ دُوشک تیس دن میں ہرات پہنچنے کی امید ہے۔ اگر ایسا ہوا تو میں اس کے بیس دن بعد کرمان آؤں گا بشرطیکہ کوئی نادیدہ رکاوٹیں نہ ہوں لیکن میں ہری سنگھ کو ہدایت کر دوں گا کہ وہ تمہیں خط لکھ دے۔ اگر بالفرض میں تمہارا قاصد آنے سے پہلے چلا جاؤں اور اگر میرے لئے دُوشک سے گذرنا ناممکن ہو (اور اس امکان کو تم بھی سمجھتے ہو) تو بھی میں ہری سنگھ کو کہلوانے کی پوری کوشش کروں گا کہ وہ تمہیں اس صورت حال سے مطلع کر دے اور وہ تمہیں مطلوبہ اخراجات کے لئے اُدھار دے دے۔

سوم :

اگر تم خدانخواستہ کرمان نہ پہنچ سکو تو احتیاط سے شمال کیطرف چلو اور اگر بالآخر وہاں سے

بھی مغرب کی طرف جانا ناممکن ہو تو ساحل سمندر کی طرف جاؤ یا بمپور کی طرف اور پھر وہاں سے کرمان آؤ۔

چہارم :

اگر خدانخواستہ تم صاحب فراشں یا گرفتار مصیبت ہو جاؤ تو مجھے بہر طور اسکی اطلاع دو تاکہ میں حتی المقدور تمہاری مدد کر سکوں اور اگر مجھے ایسی صورت پیش آجائے تو تم بھی یہی کرو گے۔

پنجم :

اگر میں ختم ہو جاؤں جس کا شاید تمہیں ہری سنگھ وغیرہ سے پتہ چلے تو تمہارے لئے محفوظ ترین راستے سے جنرل میلکم سے مل جانا بہتر ہو گا۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو تم خود فیصلہ کر لینا کہ تمہارے لئے واپس جانا یا ساحل سمندر کو جانا بہتر ہو گا لیکن یہ یاد رکھنا کہ جان ہے تو جہان ہے۔

ششم :

اگر مجھے آئندہ یکم جون تک تمہارا کوئی خط ملا اور نہ ہی کوئی پتہ چلا تو میں سمجھ لوں گا کہ تم واپس چلے گئے ہو یا موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے ہو اور ایسی صورت میں تم بھی میرے متعلق یہی سمجھ لو گے۔

ہفتم :

کرمان پہنچ کر وہاں کے بڑے ہندو کے پاس چلے جاؤ تاکہ میں اس شہر میں پہنچتے ہی اس سے تمہاری خیریت و کیفیت معلوم کر سکوں۔

(دستخط) چارلس کرسٹی، کیپٹن"

۲۰ / مارچ :

آج صبح کیپٹن کرسٹی روانگی کے لئے بالکل پا بر کاب تھا اور وہ سردار کے پاس گیا سردار نے کہا کہ مجھے وعدے کا پاس ہے لیکن آج ہندوؤں کا تہوار ہولی ہے جو نہایت منحوس ہے اور کوئی صاحب ہوش و حواس آج سفر نہ کرے گا۔ اس خرافات پر کیپٹن نے جواب دیا کہ ہمیں اس بنا

پر کوئی اعتراض نہ ہوگا اس لئے کہ ہم تو کئی ماہ سے سفر کرتے آرہے ہیں۔ سردار نے جواب دیا "تم ٹھیک کہتے ہو لیکن جو لوگ یہاں سے تمہارے ساتھ جا رہے ہیں وہ تو سفر پر نہیں ہیں لہٰذا تمہیں روانگی کے لئے کوئی مبارک وقت چُننا ہوگا"۔

ہمارے اختیار کردہ مسلمانی بھیس نے اس نئی تاخیر اندازی کو پلٹ کر استحقار سے ٹھکرانے سے منع کر دیا اور اس سے پیدا شدہ تشویش کے باوجود کیپٹن کرسٹی نے ۲۱ کی شام تک اپنی روانگی ملتوی کر دی جب ہولی ختم ہوگی۔

سونے سے پہلے سردار نے اپنے ایک غلام کے ذریعے ہمیں بُلوا بھیجا اور تمن سے بہت دُور صحرا میں لے جاکر ہماری منت سماجت کرنے لگا کہ ہم اُس کے بھتیجے مراد خان کو کسی صورت میں ساتھ نہ لیجائیں جسے وہ جی بھر کر گالیاں بھی دیتا جارہا تھا۔ اُس نے کہا "وہ یقیناً تمہیں گمراہ کرے گا۔ اور پھر اُس بدمعاش سے کون جواب طلب کرے گا؟ اگر میں تمہیں دھوکہ دینے میں شریک ہو جاؤں تو میں ماخوذ ہو سکتا ہوں اور جواب دہی کے لئے ذمہ دار ہوں لیکن وہ بدمعاش تو ان شکنجوں سے آزاد ہے"۔ ہم نے وعدہ کیا کہ ہم مراد کو ساتھ نہیں لیجائیں گے بلکہ اس کے توسط کے بغیر اُس سے کوئی سروکار نہیں رکھیں گے جس پر وہ بیحد خوش ہوا کیونکہ اسے اس قبولیت کی توقع نہ تھی لیکن ہم نے آپس میں طے کیا کہ ہم اس پر اسی وقت تک کاربند رہیں گے جبتک ضروری اور مفید مطلب ہو۔ ہمارا قیاس تھا کہ سردار نے اپنے بھتیجے کے خلاف بدعنوانیوں کے جو دعوے کئے تھے وہ جزوی طور پر من گھڑت ضرور تھے یا کم از کم اُن کا اظہار کر کے اُسے ہماری کوئی بہتری مقصود نہ تھی بلکہ وہ صرف رہنماؤں یا مدد کے لئے اپنے سوا ہر شخص سے ہمیں باز رکھنا چاہتا تھا۔

۲۰ر اور ۲۱ر مارچ:

نوشکی سے روانگی کے سلسلہ میں بار بار کی مایوسی حوصلہ شکن اور امید فرسا ہوتی جارہی تھی اور افواہیں اتنی گشت کر رہی تھیں اور اس مبالغے اور تواتر سے ہمارے کانوں تک

پہنچ رہی تھیں کہ ہم یہ سمجھنے لگے کہ سردار کیپٹن کرسٹی کو کوئی محافظ دینا ہی نہ چاہتا تھا۔ اس تاثر کے تحت کیپٹن نے ایک دفعہ پھر ۲۱ کو سردار سے درخواست کی کہ قافلہ روانہ کر دیا جائے اور اسے عہد شکنی پر آڑے ہاتھوں لیا اور ساتھ ہی کہدیا کہ اگر ہمیں قلات کو واپسی کی دھمکی پر واقعی عمل کرنا پڑا تو ہمارا مالک ہندو سیٹھ یقیناً اس معاملے کو محمود خان کے سامنے ایسے انداز میں پیش کریگا کہ خان اور اس کا بھائی پورے خیل کو اپنے غیظ و غضب کا نشانہ بنائیں گے۔ کیپٹن نے مزید کہا "ابھی رات ہی کی بات ہے کہ تم نے مجھے اپنے بھتیجے کے مکارانہ وعدوں سے خبردار کیا لیکن اب میں کیا سمجھوں جب تم خود بھی اسی مکاری اور عیاری سے کام لے رہے ہو جو تم اس سے منسوب کرتے ہو؟"

اس زجر و توبیخ سے وہ اتنا گھبرایا کہ کیپٹن سے کہنے لگا کہ وہ لاجواب ہو گیا تھا۔ وہ تقریباً تیس سال سے نوشکی خیل کا سربراہ تھا اور اس پر کبھی دغابازی کا الزام نہیں لگا تھا اور پھر اُس نے قسم کھا کر بتایا کہ اُس کے بیٹے نے تمن کے دو ملاؤں کے ساتھ مل کر استخارہ کیا تھا اور اُنہوں نے متفقہ طور پر اُس دن کی روانگی کو بدشگون بتایا تھا اور اسی لئے اُس نے اگلی صبح تک تیاریاں ملتوی کروا دی تھیں جس کے بعد ہر صورت میں روانگی کا فیصلہ کیا گیا تھا خواہ کچھ بھی ہو۔ ڈانٹ ڈپٹ کے بعد تالیف قلب کے لئے اُسے ان بیشمار افواہوں سے آگاہ کیا گیا جو گشت کر رہی تھیں۔ جس پر اُس نے اعتراف کیا کہ واقعی ہمیں غیر مطمئن ہونا چاہیئے تھا اور ہمارے قیام میں مزید تاخیر تکلیف دہ تھی۔

تین چار دن سے ایک تیز شمال مغربی ہوا چل رہی تھی جو آج شام تیز تر ہو گئی اور صحرائی ریت کے بادلوں نے دوپہر سے سورج کو بھی ڈھانپ لیا اور مہمان خانے کے کھلے حصوں سے ڈھیروں ریت اندر آ گئی اور ہمارے اردگرد کئی انچ موٹی تہہ جم گئی۔ رات کے وقت طوفان ریگ کچھ تھما تو ہم نے سکھ کا سانس لیا لیکن یہ سُن کر سخت کوفت ہوئی کہ سردار کے بیٹے اور کیپٹن کے بڑے رہنما جمعہ خان کا اونٹ صحرا میں گم ہو گیا اور لوگ اُس کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ہم نے اُسے محض ایک چال سمجھا اور یہ سوچ کر آرام سے سو گئے کہ یہ کیپٹن کو مزید روکنے کا ایک اور

ہتھکنڈہ تھا لیکن یہ غلط فہمی ثابت ہوئی۔

۲۲؍ مارچ:

آج صبح بالآخر کیپٹن کرسٹی روانہ ہوا۔ اُونٹ پر سوار ہونے سے پہلے اُس نے سردار کو ایک مختصر لیکن نہایت دلپسند سکاچ چار خانہ، ریشم کا آدھا تھان، ایک چاقو اور ایک قینچی بطور تحفہ دیئے۔ سردار اس پر بہت خوش ہوا۔ گو وہ تاخیر اندازی کی وجہ سے اس اعزاز کا مستحق نہ تھا تاہم ایک غیر مہذب، جاہل وحشی کے لئے یہ ایک قدرتی بات تھی کہ اُس کے تمن میں آمدہ دو سوداگروں (یہ اُس کا حسن ظن تھا) سے اتنا پیسہ تو وصول کرے جو اُس کے قبیلے کی مہمان نوازی کے مطابق ہو۔

کیپٹن کرسٹی کی روانگی تک جمعہ خان کا اُونٹ نہ ملا تھا لہٰذا سردار نے اعلان کیا کہ اگر دوپہر تک مل گیا تو فبہا ورنہ وہ گھوڑے پر پیچھے چلا جائیگا۔ اُس نے امید ظاہر کی کہ کیپٹن رخشانیوں کے ساتھ قیام کے دوران اُن کی غفلتوں کو معاف کر دیگا اور یقین دلایا کہ اُس کا بیٹا اور دیگر رُفقا اُس کے حکم کے بندے تھے اور وقت آنے پر اُس کی حفاظت کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔ آخر میں اُس نے اُس کے لئے سلامتی و خوشحالی کی دُعا کی اور قافلہ روانہ ہوا۔ کوئی آدھ گھنٹے کے اندر جمعہ خان کا اُونٹ بھی مل گیا اور وہ فوراً اس پر سوار ہو کر اس کے پیچھے چلا گیا۔

دن غیر معمولی طور پر تاریک اور اداس تھا اور ایک تیز غضبناک ہوا چل رہی تھی۔ بجلی بھی کڑک رہی تھی۔ بلوچ بارش کی آمد آمد کے منتظر ہے لیکن شام تک طوفان تھم گیا۔ پھر سردار مہمان خانہ میں میرے پاس آیا اور مجھے اپنے محترم و محتشم ساتھی کی جدائی پر پژمردہ دیکھ کر حوصلہ دیتا رہا اور وعدہ کیا کہ وہ میرے بھائی کی خاطر (سفر میں ہم دونو بھائی بنے ہوئے تھے) میرا ہر طرح خیال رکھے گا جس نے مجھے اُس کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ بہت مشفقانہ بلکہ متاثر کن طور پر مجھ سے پیش آیا اور مجھے نہ صرف اُس کی گفتگو سے بہت خوشی ہوئی بلکہ بہت سی معلومات بھی حاصل ہوئیں جو اِس کتاب میں جابجا بکھری ہوئی ہیں۔

۲۳، مارچ :

کل سے بارش کے آثار تھے اور آج واقعی موسلادھار بارش ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی طوفان باد و ریگ اتنا تھا کہ دس پندرہ گز کے فاصلے پر بھی کوئی چیز پہچانی نہ جا سکتی تھی۔ گدان کی چھت پانی سے محفوظ نہ تھی اور اس کی اطراف ریت کی زد میں تھیں۔ ہر کونے سے چھت ٹپکنے لگی اور شام تک عالم یہ ہوگیا کہ میں کیچڑ کے بستر میں بیٹھا ہوا تھا بلکہ اسی کا بستر پہنے ہوئے تھا۔

قلات سے دوسرا قاصد ایک آدمی کو ساتھ لیے ہوئے واپس آیا جو ہمارے ہندو نے فالتو سامان لیجانے کے لئے بھیجا تھا۔ اس کے ساتھ دو خط بھی تھے جن میں سے ایک فارسی میں تھا اور دوسرا شاستری یا ناگری رسم الخط میں جو اس خطۂ ارض میں سرتاپا ایک چیستان تھا۔ فارسی خط میں کوئی ایسی خبر یا بات نہ تھی جو ہماری اصلیت کی غماز ہوتی لہٰذا میں نے اسے دیکھ ڈالا کر سردار کو تھما دیا جو پتہ کرنے کے لئے آیا تھا تاکہ اسے یقین ہے کہ میری کوئی بات خفیہ نہ تھی۔ دوسرے خط میں میرے لئے نہایت اہم خبر تھی کہ امیران سندھ کے فرستادہ دو آدمی قلات آئے تھے تاکہ وہ مجھے اور کیپٹن کرسٹی کو پکڑ کر حیدر آباد لے جائیں جہاں بے جاکہ وہ ان کے بقول ہمیں ڈنڈوں سے مارنا چاہتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ خان کے پاس کچھ گندا وا گئے تھے جس نے ان کے استفسارات کے جواب میں کہا کہ اس نے سنا ضرور تھا (بذریعہ خط) کہ اس قسم کے دو آدمی قلات آئے تھے لیکن اسے یہ پتہ نہ تھا کہ وہ یوروپی تھے جس پر اسے شک تھا لیکن اگر وہ ثابت کر سکیں کہ ہم کسی قوم کے جاسوس تھے تو بیشک پکڑ لیں لیکن اگر ہم سوداگر یا گماشتے ہوں خواہ کسی بھی ذات یا ملک سے تعلق رکھتے ہوں تو وہ ہم سے کوئی تعرض نہ کریں۔

امیروں کے آدمیوں نے خان کو بتایا کہ ہم میں سے کم از کم ایک پچھلے سال سندھ میں برطانوی سفیر[1]

---

[1] آنریبل کمپنی کی سول سروس کا نکولسن جسٹی سمتھ انگوار (دیکھئے باب ہشتم، حصہ دوم)

کے ساتھ تھا اور ہم گھوڑوں کے سوداگر نہ تھے بلکہ صرف ملک کا جائزہ لینے کے لئے یہ بھیس بدلے ہُوئے تھے۔ یہ آدمی دو دفعہ ہمارے قلات والے مکان میں گئے۔ انہوں نے ہمارے ہندو کو بھی ڈرایا کہ اگر اُس نے بلا کم وکاست سب کچھ نہ بتایا تو امیر بہت بُرا انتقام لیں گے لیکن خان کے سخت احکامات نے اُنہیں ہندو کو بزور سب کچھ اُگلوانے سے باز رکھا۔ اُس کے اخفائے راز سے مایُوس و مجبور ہوکر اُنہوں نے کہا کہ ہم بالآخر قلات ہی آئیں گے کیونکہ بچ نکلنے کا یہی واحد راستہ تھا لہذا وہ خاموشی سے انتظار کریں گے۔ ہمارے ہندو نے یہ لکھ کر خط ختم کردیا کہ اُس نے ہر قاصد کو ان سندھیوں کی نظروں سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی اور اُسے وثوق تھا کہ وہ کامیاب رہا لیکن قلات کے بعض ہندوؤں کو پتہ تھا (جن کے ساتھ اُس کا لین دین تھا) کہ ہم ابھی تک نوشکی میں تھے لہذا ممکن تھا کہ امیر کے آدمی یہاں سے بہ آسانی ہمیں گرفتار کرلیں۔ اسی لئے اُس کا مشورہ یہ تھا کہ ہم فوراً نوشکی چھوڑ دیں۔

خط پڑھ کر میں نے اگلی ہی صبح نوشکی سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے سیستانی ہندو بُدھو کو حکم دیا کہ وہ کچھ کھجوریں اور آٹا مہیا کرے اور خفیہ طور پر مراد خان کو بلوا کر اُسے بلوچستان کی مغربی سرحد پر واقع گاؤں سرحد تک رہنما بننے کے لئے ساٹھ روپے پر فیصلہ کرلیا۔ میرا اس عاجلانہ معاہدے سے مقصد اپنی فوری روانگی تھی۔ اگر محض رُوپیہ زیرِ غور ہوتا تو غالباً سردار اپنے وعدوں کے مُطابق سستے داموں رہنما مہیا کر دیتا لیکن مجھے پتہ تھا کہ اس پر دار و مدار رکھنے سے دیر ہوگی اور اگر خدانخواستہ مجھے اڑتالیس گھنٹے (دو دن) لگ گئے تو میں ایک عظیم خطرہ مول لے لوں گا۔

آج میں ایک پریشان کن واقعہ کی وجہ سے ایک اُلجھن میں پھنستے پھنستے بچا۔ کیپٹن کرسٹی اور میں نے معاہدہ کرلیا تھا کہ ہم دُوسروں کے سامنے صرف ہندوستانی میں بات کریں گے اور ہم اس پر عموماً کاربند رہے لیکن ایک دن سیستانی ہندو بُدھو کی موجودگی میں بے خیالی میں انگریزی بولتے رہے۔ اُس نے پوچھا کہ یہ کونسی زبان ہے تو میں نے اُسے

بلا تامل تلنگو بتا دیا[1] کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ یاتمن کا کوئی آدمی اس زبان سے سرے سے واقف نہ تھا اور یہ ایسے ہی تھی جیسے یونانی یا عبرانی۔ بات آئی گئی ہوگئی اور میں اسے بالکل بھول گیا لیکن بدھو نہیں بھولا۔ اور جب کھانا کھا رہا تھا تو وہ ایک فقیر کو مہمان خانے میں لے آیا تاکہ مجھ سے تلنگا میں گفتگو کر سکے۔ میں چکرا گیا کیونکہ میں تو اس سے قطعاً نابلد تھا لیکن میں نے حوصلہ کیا اور اس کے بیٹھتے ہی پے در پے انگریزی میں بہت سے سوال پوچھ لئے۔ اس نے زبان کے معنی خیز چٹخارے[2] اور سر کی جنبش سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا اور جب میں نے اس سے اس کی سیر و سیاحت کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ سوات سے ایک قدم آگے نہیں گیا تھا لہٰذا اس کی نام نہاد تلنگہ دانی سے کوئی خوف و خطرہ نہ تھا۔

۲۴ مارچ :

بعد از دوپہر چلنا ممکن نہ تھا لہٰذا میں نے اپنی روانگی کل تک ملتوی کر دی اور قلات کے ہندو کو لکھا کہ وہ وہاں اپنا حساب بند کر دے اور بیلہ واپس چلا جائے تاکہ مزید دقت نہ ہو تاوقتیکہ کیپٹن کرسٹی یا مجھ سے نئی ہدایات نہ ملیں۔

شام کے وقت میں نے اپنے ہندوستانی نوکر فتح محمد کو سردار کے پاس بھیجا کہ وہ آئندہ صبح میری نوشکی سے روانگی سے مطلع کر دے اور یہ بھی کہہ دے کہ جانے سے پہلے میں اس کی مہمانداری کے لئے ذاتی طور پر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ اس پیغام پر حیران رہ گیا اور نوکر سے کہا کہ وہ آدھ گھنٹہ میں مجھے ہندو بدھو کے گدام میں ملے گا چنانچہ میں وہاں گیا اور مختلف موضوعات پر گفتگو کے بعد اپنے عزم روانگی کا اظہار کیا۔ وہ کہنے لگا کیا تم وہ احتیاط فراموش کر گئے جو میں نے تمہارے بھائی کے لئے رہنماؤں کی تلاش کے سلسلہ میں برتی تھی؟ کیا مراد خان کے بارے میں

---

[1] تلنگو وہ زبان ہے جو تلنگانہ اور شمالی سرکاروں میں بولی جاتی ہے۔

[2] ایشیا کے اکثر حصوں میں یہ عام طریقہ ہے اظہار نفی کا۔

تم دونوں کو کی گئی تنبیہہ کا یہ حشر ہے ؟ تم ابھی نوجوان ہو اور خدا نہ کرے کہ تمہیں میرے بھتیجے کی واقفیت پر پچھتانا پڑے !" ممکن ہے وہ رَو میں اسی نہج پر گھنٹہ بھر بولتا رہتا لیکن میں نے چپکے سے بیس روپے اُس کے ہاتھ میں تھما دیئے جو میں نے اُسے چپ کرانے کے لئے تیار رکھے تھے ۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں کوئی قابل قبول چیز نہ دے سکتا تھا لہٰذا وہ خود ہی اِس رقم سے ایک پگڑی خرید لے ۔ اس کا فوری اور حیرت انگیز اثر ہُوا اور وہ مطمئن ہو گیا اور رخصت ہونے سے پہلے کہہ گیا کہ وہ ان سرداروں کے نام خطُوط دے گا جن کے علاقوں سے مجھے گذرنا تھا ۔
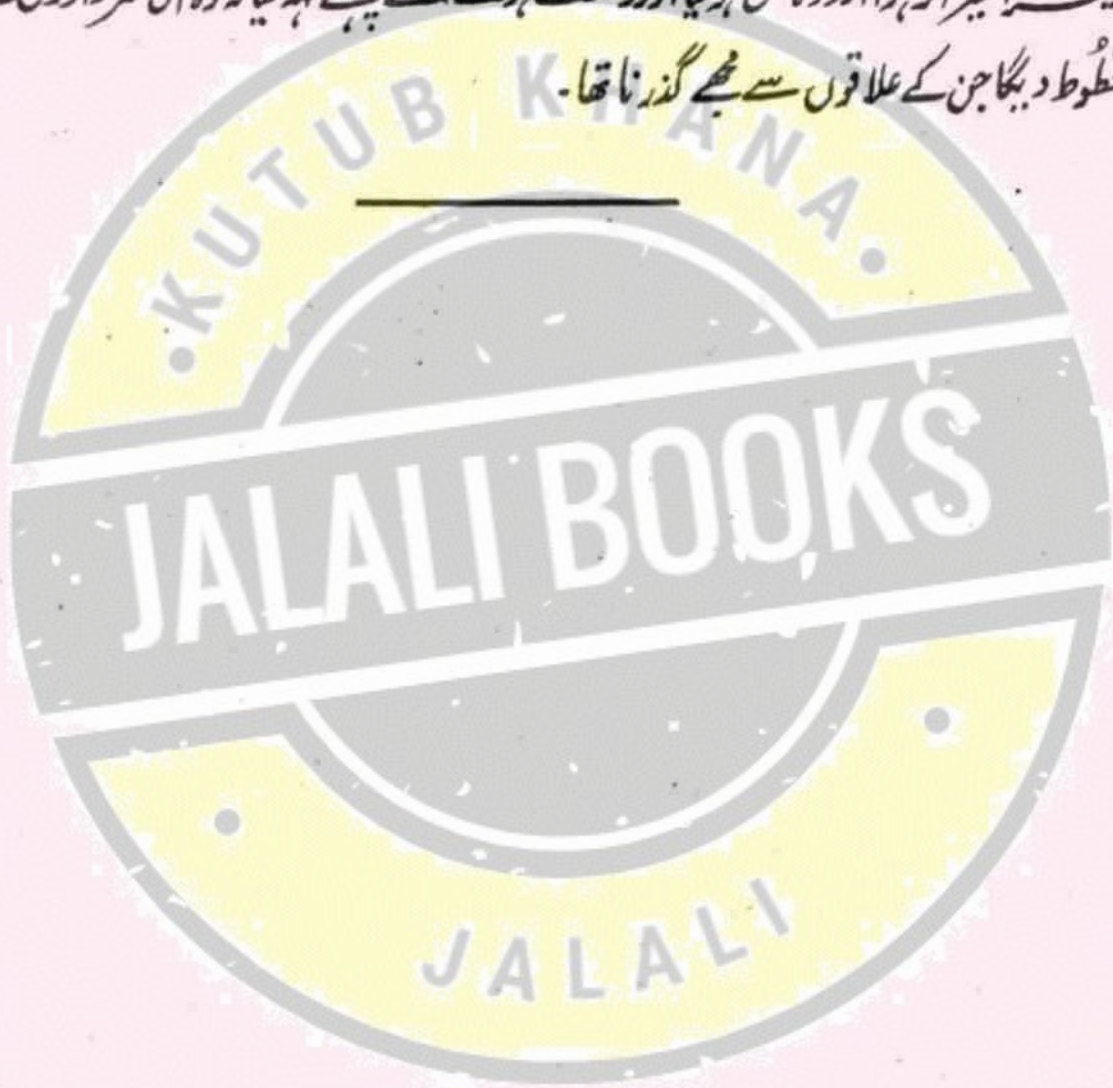
باب ہشتم

خطوط ـــ مصنف نوشکی سے روانہ ہوتا ہے ـــ اطمینان ـــ قافلہ ـــ اسلحہ ـــ صحرا کا گنبد ـــ ایک شہر کے متعلق انوکھی روایت ـــ سڑک کے کناروں کے پتھر ـــ رستم کا گھوڑا یعنی رخش رستم ـــ ان کو رکھنے کی محنت و مشقت ـــ ملک ـــ کاریز گاؤں ـــ براہوئی تمن ـــ نوشکی ـــ ضلع ـــ باشندے ـــ سردار ـــ اُس کی آمدنی ـــ ذرائع ـــ تمن ـــ گدان ـــ تفصیلی بیان ـــ ہندو دکاندار ـــ بلوچوں سے ان کا خوف ـــ بلوچ کردار کا مختصر خاکہ ـــ مصنف مبتلائے بخار ـــ دریائے بیل ـــ راستہ ـــ سنگِ مرمر ـــ دال کے پودے ـــ پانی ـــ لکڑی ـــ راستہ اور فاصلہ ـــ خاص عمارات کی دریافت ـــ بیان ـــ مقابر یا معابد ـــ مقامی لوگوں کی رائے ـــ غالباً صحیح ـــ طوفان باد و باراں ـــ مصنف اور اُس کے ساتھی محفوظ ـــ اس کے خدشات غلط ثابت ہوئے ـــ سراوان کا قصبہ ـــ بیان ـــ دریائے بیل ـــ کنواں ـــ دریائے بڈو ـــ تہاچرواہا ـــ سردار سراوان ـــ مالیہ ـــ علاقہ کی زرخیزی ـــ لک یا درہ قلات کے راستہ پر ـــ جن علاقوں سے گذرا ـــ ضلع خاران ـــ ٹڈی دل ـــ مقامی لوگوں کے مطابق ان پرندوں کی دانائی ـــ قصبہ خاران ـــ اُس کا سردار ـــ قبائل ـــ وسائل ـــ خاران اونٹوں کے

لئے مشہور — مختصر سا سفر — ریگ زار — اسے پار کرنے کے لئے دوسرے رہنما کی خدمات۔

---

۲۵ ، مارچ :

سردار طلوعِ آفتاب کے بعد ایک ملا کے ہمراہ مہمان خانہ میں آیا اور سرداروں کے نام اسے تین مکتوبات لکھائے جن کا میں بعد میں ذکر کروں گا۔ آدمی فالتو سامان اور میرا خط لیکر ناشتے کے فوراً بعد قلات روانہ ہوگیا اور میں خود کوئی دس بجے نوشکی سے نکلا اور اتنا خوش و خرّم تھا گویا قید خانے سے نکلا تھا۔ یہاں میرا قیام یکے بعد دیگرے در اندازیوں سے سولہ دن تک طوالت پکڑ گیا تھا حالانکہ تمن میں آمد پر میں یہاں سولہ گھنٹے ٹھہرنے پر بھی تلملاتا میرے قافلے میں میرے علاوہ پانچ اور تھے اور ہم میں سے کوئی بھی پوری طرح مسلح نہ تھا اور یوں ہم لٹیروں سے بچنے کے لئے اپنے ذرائع مدافعت سے زیادہ اپنی خوش قسمتی پر ہی دار و مدار رکھ سکتے تھے۔

تمن سے تین میل دور ہم ایک گنبد کے پاس سے گذرے جو روایت کے مطابق ایک قدیم قصبہ کے پاس ایستادہ ہے جس کے باشندے اتنے دولت مند تھے کہ اپنی بے پناہ دولت کو مکانات و عمارات کی تعمیر کے چونے میں پانی کی بجائے دودھ استعمال کرکے خرچ کرتے تھے۔ اس بے جا اور نمائشی اسراف پر دیوتا ان سے اتنا خفا ہوا کہ قصبے پہ پھٹکار بھیجی اور یہ بتدریج انتشار و ادبار کی نذر ہوگیا۔ اس وقت یہ گنبد ہی اس امیرانہ شہر کا نشان واحد ہے اور پہاڑوں سے دور (جو یہاں سے جنوب کی طرف ہٹ جاتے ہیں) اور صحرا میں واقع ہونے کی وجہ سے بینظیر منظر پیش کرتا ہے۔ میں طرزِ تعمیر (آیا یہ موجودہ اسلوب کے مطابق ہے یا نہیں) اور سامان تعمیر کا ماہرانہ مطالعہ نہ کرسکتا تھا لیکن طرز میں کوئی خاص قابل ذکر چیز نظر نہ آئی اور سامان کے سلسلہ میں مراد نے بتایا کہ واحد قابل مشاہدہ چیز چونے کی حیران کن صلابت ہے جس کا مقابلہ اس نے سنگ مرمر سے کیا۔ تھوڑا سا آگے میں نے راستے کی ایک طرف بہت بڑے بڑے پتھر دیکھے جو ایک دوسرے سے بیس یا تیس گز کے فاصلے پر پڑے ہوئے

تھے۔ استفسار پر مجھے نہایت سنجیدگی سے بتایا گیا کہ یہ رستم[1] نے رکھے تھے کیونکہ یہاں اس کا پسندیدہ گھوڑا سرپٹ دوڑا تھا۔ ظاہر ہے کہ میں اس توجیہہ پر ہنسنے لگا لیکن جس مقصد کے لئے بھی یہ یہاں لائے گئے ہوں۔ یہ یقینی ہے کہ ان کو قریب ترین پہاڑ سے یہاں لانے میں بیحد محنت اور لاگت صرف ہوئی ہوگی۔ ان میں سے اکثر کئی ٹن وزنی اور چھ سات گز مربع ہیں۔

ہم آج ایک ریتیلے ہموار علاقے میں سولہ میل چلے اور غروب آفتاب پر ایسی جگہ ٹھہر گئے جہاں پہاڑ صرف ساڑھے تین میل اور عین ہمارے سامنے تھے۔ آتے وقت صحرا کے ارد گرد پہاڑ آٹھ نو میل تھے اور ہمارے بائیں طرف تھے۔ جبکہ دائیں طرف وقفے وقفے سے ریت کے ٹیلے تھے۔ قریباً وسط میں ہمیں ایک ویران گاؤں کاریز نامی ملا۔ اس کے پاس ہی اچھے پانی کا کنواں ہے جہاں سے ہم نے رات کے لئے پانی لیا۔ میں نے اونٹوں کے بہت سے ریوڑ دیکھے جو یہاں گز اور شینز چرنے کے لئے چھوڑ دیئے جاتے ہیں جن سے یہ میدان بھرا پڑا ہے۔ شام کے وقت ہمیں اپنے پڑاؤ سے گزگی براہوئیوں کے ایک تمن سے دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیا لیکن چونکہ یہ دور تھا لہٰذا ہم وہاں نہیں گئے۔

اب میں ضلع نوشکی کی حدود پر تھا جس کے متعلق مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے پہلے ہی بتا دیا ہے کہ یہ ناہروئی بلوچوں کی شاخ رخشانی کا گھر ہے۔ سردار عیدل خان قریباً ساٹھ سال کا ہے وہ بہت سے ایسے خصائل کا مالک ہے جو اسے اپنے اہل وطن کے اونچے حلقے میں بھی ممتاز کر سکتے تھے لیکن افسوس کہ یہ خصائل اس کی طمع لامحدود کی وجہ سے ماند پڑ گئے ہیں۔ اس کا واحد ذریعہ آمدنی دریائے خیسار پر ایک پن چکی ہے اور وہ بھی ہمیشہ قلت آب کی وجہ سے معرض خطر میں ہے۔ نوشکی کا تمن دو سو گدانوں پر مشتمل ہے جن کی تشکیل بیان ہو چکی ہے۔ میں دو دفعہ سردار کے گدان میں گیا جو دوسروں سے تھوڑا بھی مختلف نہ تھا۔ آگ فرش کے وسط میں تھی

---

[1] شاہنامہ فردوسی کا ایرانی ہیرو۔

اور اس کے دونو طرف چھ فٹ اُونچی دیواریں تھیں۔ اس میں دریاں بچھی ہوئی تھیں اور یہ بالکل صاف ستھرا تھا۔ خاندان کی توڑے دار بنادیق، تلواریں اور ڈھالیں چھت سے معلق تھیں۔ تمن میں چھ ہندو دکاندار ہیں جو اپنے اہل و عیال کو تو ساتھ لے آئے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ وہ اپنے محافظوں یعنی بلوچ باشندوں سے دہشت زدہ رہتے ہیں جو عام طور پر کاہل، جاہل پھوہڑ اور غارت گر ہیں۔ آخری وصف ان کی پوری نسل کا خاصہ ہے۔ اسیطرح وہ جوئے بازی کے بھی عادی ہیں۔ مہمان نوازی اور قول کی پابندی (بموجب ذاتی شجاعت و وفاداری) واقعی ان کی صفات ہیں۔ جب نوشکی میں فصل نہ ہو (جو کیفیت دس میں سے نو سالوں میں ہوتی ہے) تو وہ گرم سیل اور کچ گنداوا سے غلہ خریدتے ہیں بلکہ ہر سال ہی تھوڑا بہت ان جگہوں سے لاتے ہیں۔

۲۶، مارچ:

میں بخار کے باوجود آج صبح چھ بجے روانہ ہوا اور تین میل میدان میں چلنے کے بعد ایک سنگلاخ راستے سے پہاڑیوں میں داخل ہوا۔ جلدی ہی بلند پہاڑ شروع ہو گئے جو ایک عظیم سلسلہ کی شاخ ہیں۔ سترہ میل تک ان کے دامنوں یا چٹانی وادیوں میں چلتے ہوئے ہم دریائے بیل کے قریباً خشک پاٹ میں آگئے اور پھر اس میں چھ میل مزید چل کر اپنے اونٹوں کے نکتہ نظر سے ایک چراگاہی جگہ پہ فروکش ہوئے۔ سڑک بہت خراب تھی اور کہیں کہیں دو گز سے زیادہ چوڑی نہ تھی اور دونو طرف چٹانیں کئی کئی سو فٹ اونچی کھڑی تھیں۔ میں نے پانی کے تنگ راستوں میں سفید سنگ مرمر کے متعدد قطعے دیکھے اور ہمارے اُوپر کی ڈھلانوں پر رال کے بے شمار پودے ملاحظہ کئے۔ بیل کا پاٹ بہت چوڑا ہے اور اس کی حد بندی کرنے والا ریتلا صحرا گذرگاہ سے کافی اُونچا ہے۔ آج میرے راستے کی سمت جنوب اور جنوب مغربی رُخ پر تھی اور فاصلہ انتیس میل۔ بیل کے علاوہ دو تین نالوں میں ہمیں بہت اچھا پانی ملا اور خشک لکڑی کے ٹکڑے بھی ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔

۲۷ ، مارچ :

میں شدید بخار کی وجہ سے اتنی نقاہت محسوس کر رہا تھا کہ آج صبح اُونٹ پر بیٹھنا بھی دُو بھر ہو گیا لیکن جو سفر مجھے درپیش تھا اُس کی بنا پر رُکنے کا سوال ہی نہ تھا لہٰذا آج صبح سات بجے روانہ ہوا اور ایک براہوئی کو پشت پناہ بنا لیا۔ میں جنوب اور جنوب مغربی سمت میں پچیس میل چلا۔ راہ بے نشان زیادہ تر بیل کا پاٹ یا اُس کا اُونچا ساحلی میدان تھا جو اکثر پیچ و خم سے مملوٗ تھا۔ ہمیں دریا کے پاٹ میں پانی با افراط ملا اور ببول، لائی[1] اور تغز[2] کا جنگل اتنا گھنا تھا کہ ہمارے اترنے کے باوجود اُونٹ مشکل سے ہی اس سے گذر سکے۔

ہمارے پڑاؤ سے کوئی چار میل کے فاصلے پر آج شام ہم نہایت غیر معمولی مقابر کے کھنڈرات کے پاس سے گذرے جو دریا کے مغربی کنارے سے کوئی چار سو گز دُور بنائے گئے ہیں۔ یہ شکل میں مستطیل تھے اور ان میں سے ہر ایک کے گرد ایک عجیب و غریب کشادہ سنگ رنگ کی بنی ہوئی پُرشیبی دیوار سے محصور تھا جو مجھے اُس لمحے ایک جال کے پھندے معلوم ہوئیں جو ایک سرے پر مخروطی شکل میں پھیلے ہوئے ہوں۔ یہ دیواریں چار یا پانچ مربع گز رقبہ کا احاطہ کئے ہوئے تھیں اور ان کے اور عمارات کے دروازے عین مشرق کے رُخ پر تھے۔ کافی فاصلے پر صحرا میں مٹی اور پتھروں کی متعدد ڈھیریاں بکھری ہوئی تھیں اور میرا جی چاہا کہ اپنے اُونٹ کی مہار اُس طرف موڑوں لیکن اُس وقت بارش ہو رہی تھی اور میں بمشکل چل سکتا تھا لہٰذا میں انہیں بغور نہ دیکھ سکا۔ مجھے کوئی کتبہ بھی نہ مل سکا اور بعد میں ان کے

---

[1] لائی = ترس

[2] تغز ترس کی ایک قسم ہے جس کی نباتاتی کیفیت کہیں نہیں ملی اور نہ ہی یہ پودا مجھے بلوچستان کے سوا کہیں نہیں ملا۔ یہ لائی سے بہت حد تک مشابہ ہے لیکن چھلکا اور پتے پیلے سفید ہیں اور ایک قسم کے سفوف سے ڈھکے ہوئے ہوتے ہیں۔

متعلق میری جستجو بے سود ثابت ہوئی کیونکہ مجھے کوئی واقف کار آدمی نہ مل سکا۔ میرا رہنما صرف یہ بتا سکا کہ یہ گبروں کے زمانے میں بنے تھے لیکن یہ ایک ایسا ماخذ ہے جس سے اس ملک میں ہر نادر اور ناقابل تشریح چیز منسوب کر دی جاتی ہے لہٰذا اس پہ کامل بھروسہ نہیں کیا جا سکتا لیکن غالباً اس سلسلے میں اس کی قیاس آرائی درست تھی۔ ان کی طرز تعمیر میں کوئی مسلمانی یا ہندو اثر نہ تھا اور اگر یہ تعمیرات ان اقوام کی نہ تھیں تو قدرتی طور پر یہ پارسیوں کی ہیں بشرطیکہ یہ قدیم تر دور سے منسوب نہ ہوں۔ یہ ظاہر تھا کہ وہ بہت قدیم تھیں کیونکہ پائیدار سامان تعمیر کے باوجود ان میں سے ہر ایک شکست و ریخت کی زد میں تھی اور ملیامیٹ ہو رہی تھی۔ ان کے متعلق اہم ترین بات مراد خان نے یہ بتائی کہ جن پتھروں سے یہ بنی ہوئی تھیں وہ یہاں کسی علاقہ میں دستیاب نہ تھے۔ اُس نے مزید کہا کہ یہ سب بیکار ہو گیا تھا کیونکہ ہمارے موجودہ لوگ ایسی صناعی کے اہل ہی نہ تھے۔ مجھے اب بھی شبہ ہے کہ آیا یہ جگہیں قبریں تھیں یا عبادت گاہیں۔ ہر ایک کے اندر پتھروں سے ڈھکی ہوئی ایک اونچی ڈھیری تھی جو بلاشک و شبہ قبر معلوم ہوتی تھی لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آتشکدے[2] کی مقدس آگ کی قربانگاہ ہو گو ان کی تعداد انہیں قبرستان سمجھنے کی قوی ترین دلیل ہے۔

آدھی رات کو ایک زبردست طوفان برق و باراں آیا جو دو گھنٹے جاری رہا لیکن

---

[1] پارسی گبر کا موجودہ نام ہے۔ یہ اہل فارس سے مختلف ہے جو مسلمان ہیں۔

[2] گبر آگ کو خدا کی علامت سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں کئی آتشکدے ہیں۔ ایران کے شہر یزد میں (جسے دار العبادت کہا جاتا ہے) گبروں کو آتشکدہ سلامت رکھنے کی اجازت ہے (جہاں اُن کے بقول زردشت کے وقت سے آگ جل رہی ہے) جو ان کے اپنے حصہ شہر میں ہے لیکن یہ حق ایرانی حکومت کی رواداری کی بجائے حرص زر کا نتیجہ ہے جو ان میں سے ہر ایک سے پچیس روپے ٹیکس

وصول کرتی ہے۔

حسنِ اتفاق کہ اُس وقت بارش تھوڑی سی ہُوئی تھی جب ہم اُترے تھے لہٰذا ہم نے اپنا خیمہ کنارِ دریا کے سائے میں جمایا تھا جسے نیچے سے کسی سابقہ طغیانی[1] نے کھود کر کھوہ بنا دیا تھا۔ اسی بے ڈھنگی پناہ نے بارش سے بچا لیا اور یُوں میں بھیگنے سے محفوظ رہا جس کے میں اُس وقت قابل نہ تھا لیکن میں اِس ڈر سے سو نہ سکا، مبادا دریا میں چڑھاؤ آجائے اور ہم سب کو بہا لے جائے۔ یہ پناہ پانی کے بلند ہونے پر بھی قائم رہی گو یہ بہت شور اور طاقت سے گرنے والی تھی۔

۲۸ ، مارچ :

میں اسی سمت (جنوب جنوب مغرب) میں آج ایک عُریاں میدان یعنی دشت میں ۲۸ میل چلا۔ ہماری خوابگاہ سے کوئی تین میل کے فاصلے پر دریائے بیل کا پانی ایک جنوب مشرقی شاخ میں بہتا ہے اور قصبہ سرادان کا سامانِ حیات بنتا ہے جو اُس وقت مجھ سے عین مشرق میں تین منزل کے فاصلے پر تھا۔ مختلف قسم کے جھاڑ جھنکار اور ببول کے درختوں کے ایک جھنڈ کے میدان سے مزید پندرہ میل طے کرنے کے بعد میں بڈو نامی نالہ کے خشک پاٹ میں قابلِ قبول پانی کے ایک کنوئیں پر آیا۔ یہاں ہم نے ایک تنہا چرواہے سے سُنا (جو اپنی چند مریل بکریوں کو چرا رہا تھا) کہ پرسوں تک یہاں قریب ہی نوشیروانی بلوچوں کا ایک بڑا تمن تھا لیکن اب وہ پانی اور چارے کی قلّت کی وجہ سے خاران کے پہاڑوں میں چلے گئے تھے۔ اپنی مشکیں بھر کر ہم تھوڑا سا آگے بڑھے اور جنگل کے ایک گھنے قطعہ میں پڑاؤ ڈالا۔

قصبہ سرادان (جو آج میں نے دورانِ سفر دیکھا) بہت چھوٹا سا ہے جس میں پانچ

---

[1] یہ طغیانیاں بہت عام اور سخت خطرناک ہیں۔ میں نے ایک چار پانچ گہرے صاف شفاف نالے کو دیکھا جو دس منٹ کے اندر اندر ایک تیز اور ناقابلِ عبور دھارا بن گیا، اور یہ [illegible] گیا۔

سو سے زیادہ مکان اور چھپّر نہیں ہیں اور جس کے گرد مٹّی کی ایک بُرج دار فصیل ہے۔ یہ ایک دشت بے آب و گیاہ کے وسط میں واقع ہے جو سراوانی پہاڑوں سے بیس میل دُور ہے اور انہی کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے نقشہ نویس نے یہ جگہ کیوں منتخب کی؟ اس کی واحد وجہ صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ بیل اس کے باشندوں کو مستقل اور بافراط بہترین پانی مہیا کر سکتا ہے اور یہ ماننا پڑے گا کہ خشک سالی اور اس کے جلو میں آنیوالے قحط و قلت کے اس ماحول میں پانی کی بلا روک ٹوک موجودگی کے فوائد اَن گِنت اور گراں قدر ہیں۔ سردار سراوان گل محمد خان قمبرانی ہے جو خان کو خراج نہیں دیتا بلکہ اپنے پورے دو سو مسلح آدمی اپنے خرچ پر حکومت کو مہیا کرتا ہے۔ اس کی آمدنی معمولی ہے اور وہ پیداوار کی مقدار کے مطابق اسے بصورت جنس وصول کرتا ہے جو زمین کے عام بنجر پن کے باوجود کبھی کبھار صارفین کی ضروریات سے اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ڈھائی تین من گندم ایک رُوپے میں مل جاتی ہے۔ جب فصل کم ہو (جیسا کہ ۱۸۰۸، ۱۸۰۹ اور ۱۸۱۰ میں) تو یہ لوگ اپنے اُونٹ (جو بیشمار ہیں) گرم سیل، کچھ گنداوا اور سندھ کو بھیجتے ہیں اور مطلوبہ غلّہ وہاں سے لاتے ہیں۔

سراوان سے قلات کے سیدھے راستے کے پہاڑوں کے اُوپر ایک تنگ یا درّہ ہے لیکن مجھے معلوم ہوا کہ یہ اتنا دشوار گذار ہے کہ لدے اُونٹ اس کی بجائے سراوان سے خاران اور پھر قلات کا رُخ کرتے ہیں جو طویل تو ہے لیکن آسان راستہ ہے۔

۲۹ مارچ:

خدا کا شکر ہے کہ آج بخار نے میرا پیچھا چھوڑ دیا اور میں ہشاش بشاش طلوع آفتاب سے پہلے سوار ہو گیا۔ میں مغرب، جنوب مغرب سمت میں تیس میل سے زیادہ چلا۔ سفر زیادہ تر خاران کے بنجر علاقوں جلالان، خرگوشکی اور بھگٹ میں گذرا۔ ان کی کافی زمین قابل کاشت ہے اور کچھ زیر کاشت بھی لائی گئی ہے لیکن بارش نہ ہونے کی وجہ سے بیج بھی اُگ نہ سکا اور جو حصہ آبپاشی اور دیگر مصنوعی ذرائع سے محفوظ رہا تھا وہ بھی ٹڈی دل کی نذر ہو گیا اور

بیچارے کاشت کاروں کو پہاڑیوں میں سر چھپانا پڑا۔ یہ ایک عجیب وغریب لیکن ناقابل انکار حقیقت ہے کہ یہ تخریبی کیڑے مکوڑے ان علاقوں میں اسی وقت آتے ہیں جب خشک سالی اور قحط کا سماں ہو۔ یہ گویا اس وقت تباہی کو انتہا تک پہنچانے کے لئے آتے ہیں — مزید حیران کن بات یہ ہے کہ یہ جنوب مشرق سے برامد ہوتے ہیں اور اسی طرف کو واپس لوٹ جاتے ہیں لہٰذا مقامی لوگ تصدیق کرتے ہیں کہ وہ صحرا کی موجودگی سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ اگر مزید شمال مغرب کو گئے تو لازماً ہلاک ہو جائیں گے۔

آج ہم ایک بہت گہرے کنوئیں کے پاس سے گذرے جس کا پانی یا تو خشک ہو چکا تھا یا اتنا نیچے تھا کہ ہمارا رسہ اس تک نہ پہنچ سکا لیکن چونکہ ہمارے پاس کل کا ذخیرۂ آب تھا لہٰذا چنداں تردد نہ تھا۔

شام کو ہمارے پڑاؤ سے مشرق اور جنوب مشرق کی سمت میں قصبہ خاران کوئی پینتالیس میل دُور تھا۔ یہ سراوان سے بڑا بتایا جاتا ہے اور ویسے ہی قلعہ بند ہے۔ اس کا ہمنام علاقہ انتہائی پہاڑی ہے اور سراوان[1] صوبہ کا آخری شمال مغربی حصہ ہے۔ اس کا سردار عباس خان نوشیروانی محمود خان کا باجگزار تھا لیکن پچھلے چار سال کے اندر اس نے اس کا جُوا اتار پھینکا۔ وہ اپنے پانچ چھ سو آدمی میدان کارزار میں لا سکتا ہے اور نوشیروانی بہترین اور سخت سپاہی شمار ہوتے ہیں۔

خارانی اُونٹ اپنی قوت اور مستعدی کی بدولت ان علاقوں میں بہت مشہور ہیں لہٰذا ان کے مالک لوٹ مار کے معرکوں میں اپنے ہمسایوں پر سبقت لے جاتے ہیں۔

۳۰ / مارچ:

آج میں صرف ساڑھے سترہ میل کا فاصلہ طے کر سکا کیونکہ میں ایک جگہ چار گھنٹے کیلئے

---

[1] سراوان بلوچستان کا ایک بہت بڑا صوبہ ہے۔

رُکا تاکہ بُتر براہوئیوں کی ایک جماعت سے مل سکوں جو حُسنِ اتفاق سے وہاں تھے۔ انہی میں سے ایک کو معمولی معاوضہ کے بدلے میں نے اگلے دن صحرائی دشت میں رہنما بننے پر آمادہ کر لیا۔ کیونکہ مراد کو اس کا پورا علم نہ تھا اور اس آدمی کے ملنے کے بعد اس نے اعتراف کر لیا کہ وہ یہاں سے کبھی شمال کی طرف نہ گیا تھا۔ یوں میرا تردّد ختم ہوا۔

ہم نے اپنا ایک مشکیزہ گندے بارانی پانی کے تالاب سے بھر لیا جہاں ہم اُترے تھے اور رات صحرا میں ہی سوئے جس میں اونچ نیچ بڑھتے جا رہے تھے۔
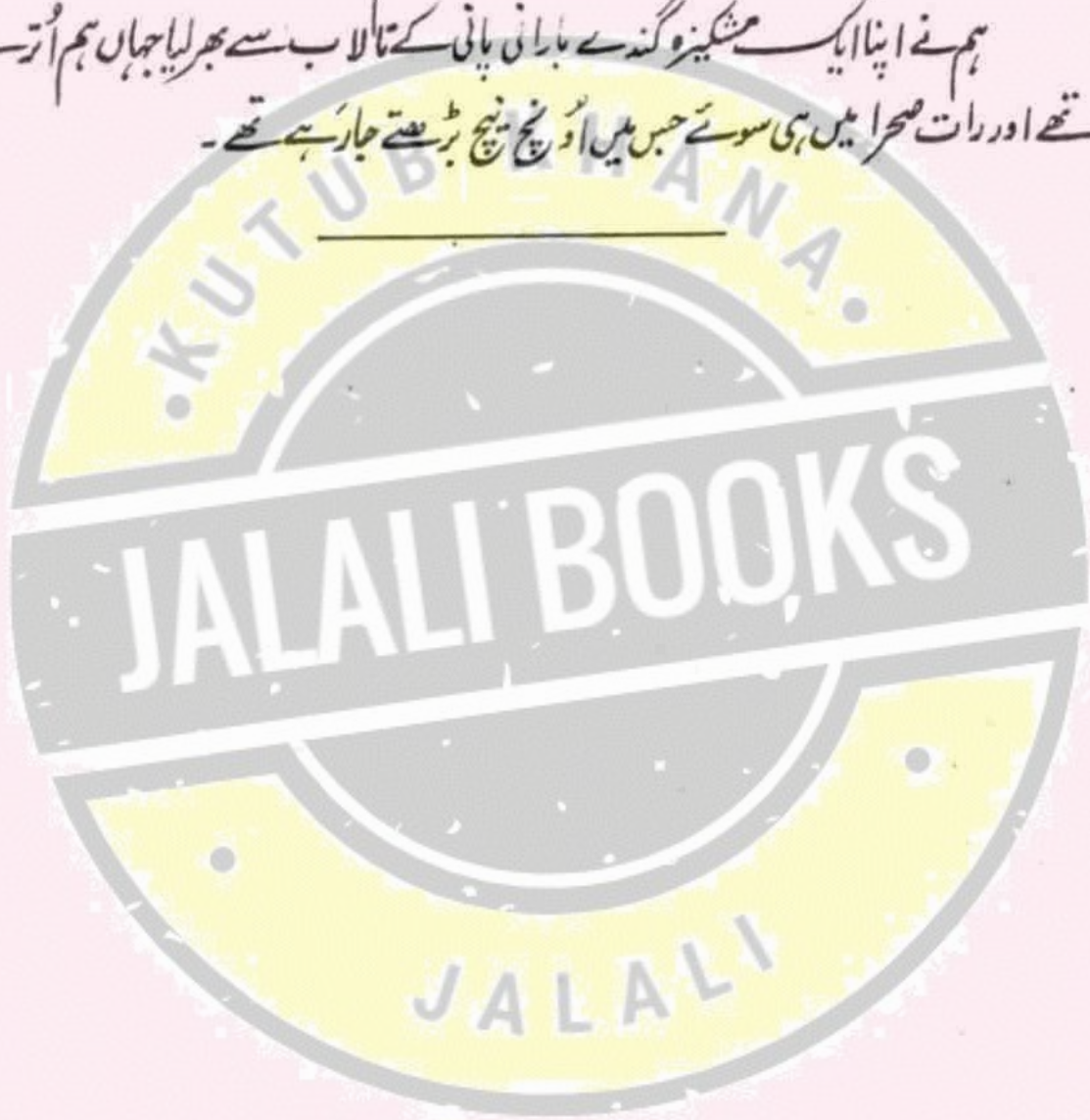
باب نہم

صبح سویرے روانگی — کنواں اور اس کا بیان — پانی کھاری — سرخ ریتیلا صحرا — مشکلات — لہریں — اُونٹ گھٹنوں کے بل گر جاتے ہیں — ہریاولی ندارد — پہاڑ نظر آتے ہیں — موج ریگ کے عقب میں پڑاؤ — فضا تکلیف دہ — صحرا پر سے سفر — غیر معمولی ترین منظر — بیان — مقامی لوگوں کی رائے — مصنف کا نظریہ — ریگ پراں سراب ہے — مختلف ثبوت — فقیر کی تصدیق — بڈور خشک دریا — ریگان کا ویران گاؤں — پانی — ریگان سے روانگی — سخت کالا صحرا — نظر آنیوالے پہاڑ — پڑاؤ — شدید طوفان — اس کی وجہ اور رفتار — ناخوشگوار — سودمند — بادِ سموم — انسانی جسم پر اس کے خوفناک اثرات — اس کی آمد اچانک — قیاس اور حفظِ ماتقدم — مؤخر الذکر آسان — رات کا سفر — رہنما راہ گم کر دیتا ہے — مصنف قطب نما سے سمت دوبارہ سمجھ لیتا ہے — عقلمندی پر تحسین و آفریں — بہت لمبے دن کا سفر — پڑاؤ پر مجبور — نہ پانی نہ رسد — دیہہ گلوگن میں آمد — مصنف ایک مذہبی فقیر کا بھیس بدلتا ہے — اس کی وجہ — استقبال — ایک رہنما کی دغا بازی — اُلجھن — دُوسرا رہنما اور حفاظتی دستہ — سردار اور لوگوں سے

طویل گفتگو — ان کی جہالت کا خلاصہ بصورت قصّہ - اس پر غور و فکر۔

۳۱، مارچ :

آج ہم چار بجے صبح اپنے اونٹوں پر سوار ہو گئے اور پانچ میل مغرب کی طرف جنوب کے راستے سے ایک کنوئیں پر پہنچے اور صحرا کی صبر آزمائی کے پیش نظر ہر چیز میں پانی بھر لیا جو اس قابل تھی - یہ کنواں کم از کم ڈیڑھ سو فٹ گہرا تھا اور قریباً ایک مربع تھا اور قطر میں چھ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ اس کی اطراف سطح سے بارہ فٹ نیچے (جس گہرائی پر تہیں سخت اور مضبوط ہو جاتی تھیں) اُفقی طور پر رکھے ہوئے کھجور کے کاٹے ہوئے درخت کے سہارے پر کھڑی تھیں اور اسی لکڑی کے ٹکڑوں کے سروں کے دباؤ سے اپنی جگہ قائم تھیں جو گڑھے کے آر پار عموداً لگائے گئے تھے۔ ایک کونے میں ایک سوراخ تھا تاکہ پانی کھینچنے کے لئے ایک ڈولچہ یا تانبے کا برتن اندر جا سکے - اتنی گہرائی میں پانی کے لئے تگ و دو کے بعد میں پریشان اور مایوس ہوا کہ پانی اتنا کھاری تھا کہ پیا نہ جا سکتا تھا۔

سورج نکلتے ہی ہم اس کنوئیں سے آگے چل پڑے اور ستائیس میل کا مزید فاصلہ زیادہ تر پیدل طے کیا جو سرخ ریت کے صحرا سے گذرتا تھا۔ اس ریت کے ذرّات اتنے لطیف تھے کہ مٹھی بھر لینے سے بمشکل محسوس کئے جا سکتے تھے۔ ہوائیں اس ریت کو لہروں کے بے ہنگم ڈھیر کی صورت میں پھینکتی ہیں جو شرقاً غرباً گرتے ہیں اور دس سے بیس فٹ تک اونچے ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ہوا کے شمال مغربی رُخ کے مخالف عموداً کھڑے ہوتے ہیں اور دور سے اینٹوں کی ایک نئی دیوار کا تاثر دیتے ہیں۔ اس کی ہوا کے رُخ کی طرف دوسری لہر کی بنیاد کی طرف ڈھلوان ہوتی جاتی ہے - پھر یہ ایک خط مستقیم میں بیان کردہ غیر معمولی انداز میں اوپر کو اٹھتی ہے حتیٰ کہ ان کے درمیان ایک خلا یا پگڈنڈی بن جاتی ہے - جہاں تک سمت سفر نے اجازت دی میں ان پگڈنڈیوں میں چلتا رہا لیکن اونٹوں کو ان لہروں پر

چلانے میں بہت مشکل اور مشقت پیش آئی، خاص طور پر جب ہمیں ان کی ہوا کے رُخ پر یا عمودی طرف چڑھنا ہوتا تھا۔ ان کوششوں میں ہم بسا اوقات ناکام ہوئے اور اردگرد گھومتے تھے، تاکہ آسان جگہ یا موڑ مل سکے۔ ترچھی طرف تو اُونٹ آسانی سے چل لیتے تھے کیونکہ ان کے چوڑے پاؤں اُن کو ہماری طرح کھُبنے سے بچا لیتے تھے لیکن لہر کی چوٹی ان کے بوجھ سے دبتی تو وہ نہایت مشاقی سے گھٹنوں کے بل گر جاتے اور اسی حالت میں ریت کے ساتھ ساتھ نیچے کو کھسکتے جو خوش قسمتی سے اتنی بے جوڑ تھی کہ پہلا اُونٹ اسے یہاں تک تہس نہس کر دیتا کہ دُوسرے بخوبی چل سکتے تھے۔ آج سفر کے آخری دس میلوں میں سبزے کا نام و نشاں بھی مٹ گیا تھا صرف تغز کی کچھ لُنڈ مُنڈ جھاڑیاں نظر آئیں اور ایک چھوٹا سا سخت جان پَودا ملا جسے بلوچی میں سرِ کوہ[1] کہتے ہیں۔ اس میں ارغوانی پھُول لگتا ہے جو بیحد سخت خوشبو دار ہوتا ہے۔ میرا رہنما ایک سلسلۂ کوہ کو دیکھ کر آگے بڑھ رہا تھا جو کبھی کبھی جنوب کی طرف نظر آ رہا تھا۔ صحرا کو جلد از جلد پار کرنے کے لئے میں اُس وقت ٹھہرا جب اندھیرا گھُپ ہو گیا۔ ہم نے رات ایک موج ریگ کے سائے تلے گذاری جہاں غیر معمولی گرمی اور حبس تھا۔

یکم اپریل:

میں آج بھی بیس میل صحرا میں چلا جو کل جیسا ہی تھا اور ویسا ہی دشوار تھا لیکن یہاں ایک اور مصیبت کا اضافہ ہو گیا۔ ریت کے اُڑتے ہوئے ذرّوں سے مجھے میرے رفقاء اور ہمارے اُونٹوں کو سخت مشکل پیش آئی اور یہ عجوبہ میرے لئے ایک چیستان سے کم نہیں۔ جب میں نے اُسے دس بجے کے قریب پہلی دفعہ دیکھا تو صحرا کوئی نصف میل دُور معلوم ہوتا تھا اور اس کی سطح لہروں کی چوٹیوں سے چھ سے بارہ انچ تک اُونچی لیکن ہموار دکھائی دیتی تھی۔ آگے بڑھنے پر یہ حجاب کم ہونے لگی لیکن ایک دو دفعہ تو اُس نے ہمیں کا ملاً گھیر لیا حتیٰ کہ اُفق بھی محدود ہو کر

---

[1] لفظی طور پر پہاڑ کی چوٹی۔ مجھے اس کا کوئی نباتاتی نام یا بیان نہیں ملا۔

رہ گئی اور دیکھنے والے کے ذہن پر ایک نہایت افسردہ کُن اور غیر قدرتی اثر ڈالنے لگی ساتھ ہی ساتھ باریک ریت کے بیشمار ذرّے ہماری آنکھوں، مُنہ اور نتھنوں میں نادیدہ اور بے تحاشا طور پر گھستے گئے جن سے سخت سوزش ہونے لگی۔ اس سوزش نے انتہائی پیاس لگا دی جسے سُورج کی بے پناہ گرمی نے اور بھی جان لیوا بنا دیا۔ میرا راہوئی رہنما گو ایک مطلق وحشی تھا تاہم وہ میرے قافلے میں سب سے زیادہ مقامی معلومات کا مالک تھا۔ اُس نے پوچھنے پر بتایا کہ یہ جھنجھلاہٹ سُورج کی کرنوں سے پیدا ہوتی تھی جو بقول اُس کے گردِ صحرا کو ہوا میں اڑا دیتی تھیں۔ تجربے کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ خیال کسی حد تک درست ہے کیونکہ میں بزور کہہ سکتا ہوں کہ یہ بحرِ ریگ صرف ان کے گرم ترین حصے میں ہی نظر آتا تھا۔ میرے اشتباہ نظر کا شبہ دُور کرنے کے لئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس منظر اور سراب کو صحراؤں کے مقابل حصوں میں اتنی دفعہ اور بیک وقت دیکھا ہے کہ اس کا سوال ہی نہ

---

[۱] میں جھجکتے جھجکتے ان ریگہائے رواں کے متعلق سادہ ترین نظریہ پیش کرتا ہوں۔ جب خوفناک صحرائی گرد باد ہوا کے تند جھونکوں میں تحلیل ہو جاتے ہیں تو وہ ناقابل مزاحمت طاقت سے کئی مربع میل پر پھیل جاتے ہیں اور بے حساب ریت کو اُوپر اُٹھا لیتے ہیں جو اُس کی محرّک ہوا کا زور ٹوٹنے کے بعد مذکورہ انداز میں نیچے گرتے ہیں اور ایک نادر منظر پیش کرتے ہیں۔ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ آخر یہ ریت ان لہروں پر کیوں نہیں جم جاتی؟ میرا جواب یہ ہے کہ کثیف ذرّے جم جاتے ہیں لیکن باریک حدت آفتاب سے اتنے لطیف ہو جاتے ہیں کہ وہ ایک غیر معیّن اور لہریا شکل میں رہتے ہیں حتیٰ کہ درجۂ حرارت کی واپسی پر انکی مخصوص کششِ ثقل بحال ہوتی ہے اور پھر قدرت کے غیر متبدل قانون کے مُطابق یہ زمین پر آ رہتے ہیں۔ یہ کسی حد تک مقامی براہوئی نظریہ کے مطابق ہے گو اس کے مُطابق ریگہائے پرّاں شدید گرمی میں ہر وقت نظر آنے چاہیئں حالانکہ ایسا نہیں ہے لہٰذا اس مظہرِ فطرت کے بنیادی سبب کا سراغ لگانا ضروری ہے۔

تھا۔ یہ دونو اپنی اپنی جگہ واضح نظر آئے جن میں سے اول الذکر غبار آلود اور دھندلا تھا' اور مؤخر الذکر اتنا چمکدار تھا کہ اسے غلطی سے پانی سمجھا جا سکتا تھا۔ میری تصدیق ایک کابلی فقیر نے بھی کر دی جو سیستانی صحرا سے گذر کر آیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اُس نے مجھ سے بھی زیادہ ریگِ جنباں دیکھی تھی کیونکہ اُسے تو اس کے شدید گرد باد کی وجہ سے بیٹھنا ہی پڑ گیا تھا۔

آمدم بر سر مطلب: آخری پڑاؤ سے سولہ میل کے فاصلے پر ہم بڈور نامی خشک دریا کے مشرقی کنارے پر آگئے جو کم از کم پانچ سو گز چوڑا تھا اور جنوبی جنوب مشرق سمت میں ساحل کو جاتا تھا۔ اس کا پاٹ بہت سی جگہوں پر درختوں اور جھاڑیوں کے گھنے جنگل اور گیدڑوں' بھیڑیوں اور دیگر وحشی جانوروں کی وجہ سے ناقابل گذر تھا۔ ہم دائیں طرف مڑے اور شمال مغربی سمت میں پاٹ کے ساتھ ساتھ پانچ میل چل کر ایسی جگہ پہنچے جہاں چند ماہ پہلے ریگان[1] نامی گاؤں تھا۔ اس کے باشندے قلتِ آب و اشیاء کی وجہ سے گرم سیل چلے گئے تھے جو اس جگہ سے شمالی، شمال مغربی سمت میں ہے۔ یہاں ہم مغربی کنارے پر ٹھہرے اور کافی مشکل اور کھدائی کے بعد دو مشک پانی بھرا۔ میرا خیال ہے کل والے کنوئیں سے یہاں تک کا سیدھا راستہ تقریباً مغربی سمت میں تھا لیکن ہمارا رہنما جنوب کی طرف سے چلا۔ تاکہ گم نہ ہو جائے اور پہاڑ نظر میں رہیں۔

۲، اپریل:

میں عین طلوعِ آفتاب کے وقت ریگان سے چلا اور اکیس میل مغرب کیطرف سفر کر کے تین بجے رُکا۔ صحرا اتنا زیادہ ریتلا نہ تھا بلکہ بہت سی جگہوں پر ایک سخت سیاہ

---

[1] ریگ کی جمع بمعنی ریت۔ میں نے دریائے بڈور اور اس کے تخمینی منبع پر حصّہ دوم میں روشنی ڈالی ہے۔

بجری سے پٹا پڑا تھا اور ہریاول بلکہ جھاڑی تک کا بھی دُور دُور تک کوئی نام و نشان نہ تھا۔ بعد کے سفر میں میں نے ایک بلند سلسلۂ کوہ کو واضح طور پر دیکھا جو عین ہمارے سامنے جنوب مغرب سے شمال مغرب کو ایستادہ تھا۔ جب ہم اونٹوں سے اترے تو میرے رہنما نے وہ شگاف مجھے دکھایا جس کے ذریعے ہم اس جانسوز ویرانے سے نکلنے والے تھے۔

آج بعد از دوپہر میں نے ایک سخت جھکڑ دیکھا جس کے ساتھ ہی ساتھ کوئی آدھ گھنٹے کے لئے زبردست بارش بھی ہوئی لیکن بارش کے پانی کو زمین ساتھ ہی ساتھ پی گئی۔ یہ دفعتاً آیا اور اگر رہنما نے مجھے اس کے زور سے آگاہ نہ کر دیا ہوتا تو ہمارا بُرا حشر ہوتا کیونکہ اُس کے غیض و غضب کے دوران اُونٹوں پر بیٹھنے کی کوشش کرنا جان سے کھیلنے کے برابر تھا۔ اس کے شروع ہونے سے پہلے آسمان صاف تھا اور صرف شمال مغربی کونے میں چند ابر پارے تھے۔ اس کی آمد کے واحد آثار سخت گھمس اور چاروں طرف اُٹھتے ہوئے گردباد[1] تھے۔ بدا ہوئی نے جونہی ان بگولوں کو جادوئی انداز میں بکھرتے ہوئے اور گرد و غبار کے امنڈتے ہوئے انبار کو دیکھا تو اس نے ہمیں اُترنے کا مشورہ دیا۔ ہم مشکل ہی اُتر کر اُونٹوں کے عقب میں بیٹھ سکے تھے کہ بلا کا طوفان ہم پر ٹوٹ پڑا۔ بارش کے اتنے بڑے بڑے قطرے گرنے لگے جو میں نے کبھی نہ دیکھے تھے اور اتنا اندھیرا چھا گیا کہ مجھے

---

[1] شاید ان کے لئے کوئی اور نام موزوں ہوتا لیکن میں ان سے خارج ہونیوالی ہوا کی وجہ سے یہی لفظ استعمال کر رہا ہوں۔ یہ ریت کے بڑے بڑے مینار ہوتے ہیں جو معمولی سی ہل چل سے سطح صحرا پر گھومتے ہوئے شروع ہوتے ہیں اور بتدریج اُوپر اٹھتے ہیں اور پھیلتے ہیں حتیٰ کہ انکی چوٹیاں نظر نہیں آتیں۔ یُونہی یہ ہوا کے تھپیڑوں سے ریت کے ستون کی طرح چکّر کھاتے ہیں۔ میں نے ایک ہی وقت پر مختلف جسامتوں کے تیس چالیس بھی دیکھے ہیں جو قطر میں ایک سے بیس گز تھے جن لوگوں نے سمندر پر پانی کا دھارا دیکھا ہے وہ ساحل پر بھی ریت کے ایسے بگولوں کا تصور کر سکتے ہیں۔

پانچ گز کے فاصلے پر بھی کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ مراد مجھ سے چند قدم آگے تھا لیکن طوفان کے دوران وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے سمجھا کہ شاید اُس نے جگہ بدل لی لیکن طوفان تھما تو میں نے دیکھا کہ وہ وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ طوفان یہاں آئے دن آتے ہیں اور گو یہ وقتی طور پر تکلیف دہ ہیں تاہم ان کے کچھ فوائد بھی ہیں۔ یہ فضا کو ٹھنڈا اور صاف کرتے ہیں جو ان کے بغیر ناقابل برداشت ہوتی اور ان کے باوجود جون سے ستمبر تک ناخوشگوار ہوتی ہے۔

اس کے دوران اس صحرا کی ہوائیں اتنی نقصان دہ اور دم سوز ہوتی ہیں کہ انکی زد میں آنیوالے حیوانات و نباتات مرجاتے ہیں اور ہمارا یہ راستہ ناقابل گذر ہوتا ہے۔ بلوچستان میں اس ہوا کے کئی نام ہیں جیسے جلوٹ یا جلو (شعلہ) اور بادسموم۔ یہ اتنی زبردست نفوذ پذیر ہوتی ہے کہ اُونٹ اور دیگر سخت جانور بھی اس کی نذر ہو جاتے ہیں اور عینی شاہدوں کے بقول انسانی جسم پر اس کے اثرات اتنے خطرناک ہوتے ہیں کہ بیان سے باہر ہیں۔ اعضا سخت ہو جاتے ہیں اور پژمردہ ہو جاتے ہیں۔ جلد سکڑتی ہے اور ایک اذیت ناک ہیجان پیدا ہوتا ہے گویا پورا جسم آگ کی زد میں ہو اور بالآخر یہ گہرے زخموں میں پھٹ جاتا ہے اور جریان خون پیدا کرتا ہے جو اس کی اذیت کی انتہا ہے۔ بعض اوقات زندگی فوراً ختم ہو جاتی ہے اور بعض اوقات وہ چند گھنٹے یا دن اس کے شکنجہ میں گرفتار رہ کر ختم ہوتا ہے اور یہ عذاب دردناک اور بھی مہیب ہو جاتا ہے کہ یہ عموماً اچانک آتا ہے اور اس کی پیش بندی ناممکن ہے۔ جتنے بلوچوں سے میں نے اس پر استفسار کیا وہ صرف یہی کہہ سکے کہ اس کے آثار ہوا کا غیر معمولی حبس اور آنکھوں کو متاثر کرنیوالی گرمی ہے۔ حفاظتی تدبیر یہی ہے کہ اپنے آپ کو لپیٹ کر زمین پر چت لیٹ جائے۔ اس طریقے سے ایک انوکھی حقیقت یہ ظاہر ہوتی ہے کہ باریک سے باریک کپڑا بھی انسانی جسم کو بادسموم کے مضر اثرات سے بچا سکتا ہے۔

۳/ اپریل :

چونکہ مجھے طویل مسافت طے کرنا تھی لہٰذا آدھی رات چلنے کا فیصلہ کیا۔ رہنما نے کہا کہ وہ راستہ جانتا تھا اور واقعی اگر وہ راستے کو کچھ بھی سمجھتا ہوتا تو وہ غلطی نہ کرسکتا کیونکہ اب ہم ریت سے نکل چکے تھے اور صحرا ایک گہری سیاہ بجری کی سطح بن گیا تھا جس میں کوئی جھاڑ جھنکار، پتھر یا بے ہنگم اشیا نہ تھیں جو ہمارا راستہ روکتیں۔ اس کے باوجود پانچ سو گز جانے کے بعد مجھے قدرتاً معلوم ہوا کہ ہم تو اپنے ستانے کی جگہ کے گرد ہی دو تین پورے چکر کاٹ چکے تھے۔ ہم سب ششدر رہ گئے اور میں طلوع آفتاب تک التوائے سفر کا اعلان کرنے ہی والا تھا کہ یکلخت خیال آیا کہ مجھے پہاڑوں کے درے کے رُخ کا پتہ تھا اور یہ کہ میں قطب نما کی سوئی سے سمت سفر کا تعین کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اس کا شیشہ نکالا اور قطب نما کو دائیں ہاتھ میں پکڑ کر گھوما حتیٰ کہ انڈکس کا شمالی نقطہ میرے انگوٹھے کی طرف آگیا اس طرح مغرب بالکل میرے مقابل ہوگیا، میں نے کچھ ستاروں کو دیکھا اور خود رہنما بن گیا۔ مراد اور براہوئی دونو مجھے اس سعیٔ لاحاصل سے روکنے کی کوشش کرتے رہے کہ کہیں ہم مزید گمراہ نہ ہو جائیں لیکن میرے ہندوستانی نوکر نے میری تائید و پیروی کی لہٰذا دوسرے بھی متفق ہو گئے۔ ہم چلتے رہے اور طلوع کے وقت اپنے آپ کو اس سیدھے راستے پر پایا جہاں رہنما دوپہر کو کہیں لاسکتا تھا۔ اب ہم پہاڑوں سے تیرہ میل قریب تر آگئے تھے میرے ساتھی قطب نما کے استعمال سے ناواقف تھے[1] اور انہوں نے اس معمولی واقعہ کو الہام سمجھا اور کوئی دو ہفتے بعد مجھے ایک اور آدمی سے یہ سُنکر حیرانی ہوئی کہ یہ میری بصیرت کا

---

[1] جب بھی کوئی میرا قطب نما دیکھتا اور اس کے بارے میں پوچھتا تو میں کہتا کہ یہ قبلہ نما ہے جو میں نماز کیلئے استعمال کرتا ہوں۔ قبلہ مکہ میں آنحضورؐ کا مقبرہ ہے جس کی طرف تمام مسلمان نماز کے لئے رُخ کرتے ہیں۔

حیرت انگیز ثبوت سمجھا گیا کیونکہ مراد نے اسے یہ سُنایا تھا۔

ہم شام سات بجے تک بلا توقف چلتے رہے اور میرے اندازہ کے مُطابق اڑتالیس میل سے زیادہ فاصلہ طے کر لیا۔ میں تو آگے چلتا رہتا لیکن میرے رفقا اور اُونٹ تین دنوں کے تھکے ماندے تھے لہٰذا یہ فیصلہ کیا کہ پہاڑوں کے پاس پہنچ کر ڈیرے ڈالیں۔ مصیبت یہ ہُوئی کہ رسد ختم ہو گئی اور پڑاؤ سے پہلے ہی پانی بھی ختم ہوا اور رات تھکاوٹ، بھُوک اور پیاس کی وجہ سے جاگتے گذاری۔ مجھے پیاس زیادہ تکلیف دے رہی تھی لیکن میں نے حوصلہ برقرار رکھا اور اپنے مایوس رفقا کو بھی حوصلہ دیا کہ صبح کو ہر ضروری چیز میسر آجائیگی۔

۴/اپریل:

گاہے کنکریلے صحرا اور گاہے خشک سنگلاخ پہاڑیوں میں اپنے پڑاؤ سے بارہ میل کا فاصلہ طے کر کے میں کلوگن کے گاؤں میں پہنچا جو مکران کی ایک تنگ لیکن رُومانوی ترین وادی میں واقع تھا۔ نوشکی چھوڑتے وقت میرا ارادہ چودہ میل شمال کی طرف واقع قصبہ جلک جانے کا تھا لیکن مراد چونکہ یہاں کے سردار کی بیٹی سے بیاہا ہوا تھا لہٰذا وہ مجھے یہاں تک مجبوراً لے آیا۔ جب میں گاؤں سے آدھ میل کے فاصلے پر تھا تو اس نے مجھے کہا کہ میں کھجور کے درختوں کے سائے میں ٹھہروں اور وہ خود جا کر سردار کو میری آمد کی اطلاع دے۔ میں نے اس پر اعتراض کیا کہ یہ خوامخواہ خود معتبری کے مترادف ہو گا لیکن مراد نے مجھے یقین دلایا کہ یہ یہاں مہمانوں کی ریت تھی چنانچہ میں نے اس ملک میں اسی پر عمل کیا۔ مراد تھوڑے عرصہ بعد واپس آیا اور مجھے بتایا کہ سردار میر خداداد نے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں پیرزادوں کا نام اور برتاؤ اپنالوں ورنہ وہ اپنے گھر میں بھی میری حفاظت کا ذمہ دار نہ ہو گا۔ مراد نے مزید کہا "تم اب خان کے علاقے میں نہیں ہو اور نہ ہی یہاں ویسا نظم و ضبط اور امن و امان ہے۔ اب ہم مکران میں ہیں جہاں ہر شخص نسلاً ڈاکو ہے اور بھائیوں اور ہمسایوں کو بھی نہیں بخشتا۔ آگے سفر کے لئے تمہارا نام مصیبت کا پیش خیمہ ہے اور لوگوں کو یہ سمجھانا

بے سُود ہوگا کہ ایک سوداگر کے نوکر کے پاس مال نہیں ہے یا وہ خرید و فروخت کے لئے مال سے عاری ہے"۔ مجھے مراد کی بات میں بدنیتی کا کوئی شائبہ محسوس نہ ہوا اور گو میں نے اسکی مبالغہ آمیزی کو بھی ملحوظ رکھا تاہم نوشکی کے بوڑھے سردار نے مجھے جو کچھ بتایا تھا اُس کے پیش نظر مجھے اس میں کافی صداقت محسوس ہوئی۔ حیص بیص کا مقام نہ تھا اور میں نے فوراً میر خداداد کی ہدایات پر عمل کیا اور پیرزادے کے مذہبی عادات و اطوار اور انداز اپنا لئے۔

گاؤں میں داخل ہوکر میں مسجد کے دروازے پر اترا جہاں مراد نے باقاعدہ میرا تعارف اپنے خسر سردار اور تین چار مُلاؤں سے کرایا اور بتایا کہ میں تلات کا ایک پیرزادہ تھا اور حج پر جا رہا تھا۔ سردار نے معذرت کی کہ وہ مجھے مسجد میں ٹھہرانے پر مجبور تھا کیونکہ مہمان خانہ اچھی حالت میں نہ تھا لیکن ایک خالی مکان میرے لئے صاف کرایا جا رہا تھا۔ میں نے جواباً کہا کہ میرے مختصر قیام کے لئے کوئی بھی جگہ موزوں تھی۔ اس کے بعد سردار اور بے فکروں کا گروہ (جو حال سننے کے لئے جمع ہوگیا تھا) مجھے ایک دو گھنٹے آرام کرنے کے لئے چھوڑ گئے۔ شام کو مجھے نئے مکان میں لے گئے جو دو کمروں کی ایک خستہ حال جھونپڑی تھی اور فوراً ہی سردار نے میرے اور رفقا کے لئے کھانا بھیجا جو تیس گھنٹے کے فاقہ کے بعد بیحد خوش آئند تھا۔ مجھے رات کو ہلکا سا بخار دوبارہ محسوس ہوا اور میں نے سردار سے ذکر کیا تو اس نے ایک نوکر کو چپی[1] کرنے کے لئے بھیج دیا۔

مجھے اس سے بہت تسکین ہوئی اور وہ مجھے دباتا رہا حتیٰ کہ میں گہری نیند سو گیا اور اگلی صبح تازہ دم اور ہشاش بشاش ہو کر اُٹھا۔

---

[1] چپی کا عام طریقہ گویا جسم کو گوندھنا ہے اور بیک وقت جوڑوں کو بھینچنا اور پھیلانا ہے۔ اس کے دُوسرے طریقے بھی ہیں۔ میں نے ایک آدمی کو دیکھا جس کے لیٹتے ہی تین چار آدمیوں نے اس کے پورے جسم حتیٰ کہ منہ کو بھی سہلانا اور تھپکنا شروع کیا حتیٰ کہ وہ سو گیا۔

۵، اپریل :

سرداد نے ناشتہ بھی رات کے کھانے کی طرح جوار کی روٹیوں اور دہی کا بھجوایا چنانچہ
اس سے فارغ ہو کر میں نے مراد کو ایک طرف کر کے کہا کہ میرا کاروبار ایک مزید دن
سے زیادہ یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہ دے گا جس کے بعد مجھے سرحد روانہ ہونا ہوگا لہٰذا میں نے
اسے کہا کہ وہ مناسب قیمت پر مطلوبہ رسد حاصل کرلے اور آگے بھی میرا ساتھ دے۔ اس نے
جواب دیا کہ قحط (جس کے آثار میں نے اس مختصر عرصے میں بھی دیکھے تھے) کی وجہ سے غلّہ
کی قیمت چڑھ گئی تھی اور اس کا ملنا محال تھا لیکن اُس کا سُسر اُس کی خاطر میرے لئے
کچھ کھجوریں اور اپنے گودام سے جوار کا آٹا ضرور مہیا کرے گا۔ گرانی کی یہ خبر میرے لئے تکلیف دہ
نہ تھی لیکن مراد کی اس بات پر میں ضرور مضطرب ہُوا کہ تفنگچیوں کے بغیر آگے بڑھنا انتہائی
خطرناک تھا اور جسد کو جانے کا تو سوال ہی نہ تھا کیوں کہ وہاں کے بلوچوں (کُردوں) نے
ابھی تین ہفتے پہلے ہی کلوگن کو لوٹا تھا اور دونو گاؤں کے لوگ ایک دُوسرے کے جانی دشمن
تھے۔ اُس نے کہا لہٰذا بہتر ہوگا کہ تم بمپور یا مغتور کا راستہ لو۔ معمولی خرچ ہوگا اور میر خداداد
خود ہمارے ساتھ چلے گا۔ اس پر میں نے اسے کہا کہ میرے پاس پیسہ نہ تھا اور اُسے یاد دلایا کہ اُس
نے خود وعدہ کیا تھا کہ وہ جسد تک مجھے مزید رہنماؤں کے لئے زیر بار نہ کرے گا۔ اس نے یہ
بات تسلیم کر لی لیکن کہنے لگا کہ اُس وقت اسے علم نہ تھا اور وہ علاقے کی پُرفتنہ حالت کی
پیش گوئی نہ کر سکتا تھا تاہم وہ اب بھی میری خدمت کیلئے کمربستہ تھا بشرطیکہ میں واپس
نوشکی چلوں لیکن اگر مجھے سفر جاری رکھنا تھا تو کسی دُوسرے کی حفاظت کے بغیر یہ ممکن العمل نہ تھا۔
میں نے اس کا ارادہ بدلنے کے لئے دلیل پہ دلیل پیش کی لیکن میں اس بدقماش کے قبضے میں تھا اور
وہ جانتا تھا کہ مجھے نہ واپسی سے فائدہ ہوگا اور نہ ہی اُس کا اصل وعدہ پورا کروانے کے ذرائع میرے
پاس تھے لہٰذا وہ اڑا رہا اور مجھے بالآخر اُس کے ساتھ معاہدہ کرنا پڑا کہ میں مغتور یا بمپور تک
جانے کے لئے میر خداداد (بمعہ چھ مسلح آدمی) کو پچاس روپے ادا کروں اور روانگی اگلے دن کی

نماز کے بعد طے ہوئی۔ میں نے یہ رقم فوراً ہی اسے تھما دی اور مزید مطالبات سے بچنے کے لئے اسے باقیماندہ چھتیس روپے بھی دکھا دیئے جو ساتھ سومیل کے آئندہ سفر میں ہماری خوراک اور رہنماؤں پر اتفاقی اخراجات کے لئے ہی بمشکل کافی ہوں گے تاکہ ہم شہر کرمان پہنچ سکیں۔ اس بدمعاش نے اس تھوڑی سی پونجی کو بھی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور مجھے کہا کہ اللہ تعالےٰ کے فضل وکرم پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ مجھے اس بدسلوکی پر مایوسی ہوئی اور میں اُس کے پاس سے چلا آیا۔ چند منٹ میں اُس نے اپنے سسر کو میرے پاس بھیج دیا اور وہ مجھے یقین دلاتا رہا کہ وہ اس فیصلے پر کاربند رہے گا اور مجھے مقررہ وقت پر روانگی کا یقین رکھنا چاہیئے جس پر میں نے ترشی کی تاخیر اندازیوں کی وجہ سے خاص طور پر زور دیا تھا۔

غروب آفتاب کے وقت حسب معمول ہمارا رات کا کھانا آیا اور جب تک میں نے اسے عجلت سے ختم کیا اُس وقت تک مکان لوگوں سے بھر چکا تھا۔ خدا داد بھی ان میں شامل تھا اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ شام تک میری ناسازیٔ طبع کی وجہ سے اتنا متفکر تھا کہ کسی ملاقاتی کو میرے پاس نہ آنے دیتا تھا۔ یہ احتیاط والتفات سونمیانی پر اُترنے کے بعد پہلی دفعہ دیکھنے میں آیا اور کلوگن میں تو مجھے اس کی دور کی بھی امید نہ تھی۔ ہم مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے رہے جن میں سے بعض سے تو میں گریزاں تھا مثلاً مذہب لیکن سردار بار بار اس کو بیچ میں لے آتا تھا تاکہ میرے فرقہ کا معلوم کر سکے۔ مجھے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ وہ کٹر سنی تھا لہٰذا میں نے سنی افکار وعقائد کا ہی اظہار کیا اور نہ صرف سخت مناظرے سے بچ رہا بلکہ اپنے ہندوستانی نوکر فتح محمد کی تلقین واعانت سے غلطیوں سے بھی محفوظ رہا اور سامعین میرے علم شریعت سے اتنے متاثر ہوئے کہ دو تین مواقع پر میری آواز نے زیر بحث نکتہ کا فیصلہ کر دیا۔ کوئی دس بجے کے قریب میں نے ایک کونے میں اپنا کمبل بچھایا اور لیٹ گیا تاکہ مجمع بھی میرے نقش قدم پر چلے اور رخصت ہو جائے لیکن میری توجہ فوراً ہی ایسے مسئلہ پر مرکوز ہو گئی جو تفنن طبع کا باعث بنا۔ یہ دو گنواروں کے درمیان اٹھا۔ ایک زور شور سے کہتا تھا کہ سورج اور چاند ایک ہی ہیں،

لیکن دوسرا میری سمجھ کے مطابق اس کے خلاف ثبوت دیئے جا رہا تھا اور بالآخر اس نے سب کو چپ کرا دیا اور کہا" میں اس کو قطعی جواب دوں گا" پھر اس نے حقارت سے کہا کہ وہ آسمانوں پر سورج اور چاند کی بیک وقت متقابل سمتوں میں موجودگی کے بارے میں کیا کہتا تھا؟ دوسرا ذرا سنبھلا لیکن قائل نہ ہونے کی وجہ سے یا اپنے وقار کی خاطر کہنے لگا کہ چاند سورج کا عکس تھا۔ ممکن ہے یہ تکرار چلتی رہتی لیکن معاملہ میرے سپرد کر دیا گیا۔ میں نے نیند کا بہانہ بنایا ہوا تھا گویا میں نے کچھ نہیں سنا تھا لیکن اب مجھے ثالث بنایا اور میں نے کہا کہ میں آخری مقرر سے اتفاق نہ کرتا تھا۔ اس کو انہوں نے درست مان لیا اور سب چلے گئے۔ یہ واقعہ ان کی جہالت کا مظہر ہے اور اپنے خالق کے علم و عقیدہ سے متصف اور قوت استدلال کے مالک انسانوں تخلیق ہمارے نظریہ سے متصادم ہے جو ایسی خرافات کا متحمل نہیں۔

باب دہم

نماز — مصنف شرکت پر مجبور — کلوگن سے روانگی — رہنما کی بدمعاشی — قافلہ — کلوگن گاؤں — وسعت — طرز تعمیر — نصب العین — معاشرے پر مختصر تبصرہ — مصنف کی معالجانہ شہرت — کیسے ہوئی — نتائج — عورتوں کا مجمع — چم چچڑ بن — بگاڑ — قصے کا تسلسل — شب مرطوب — خراب راستہ — علاقہ کلپورکن — دزک — دو غیر معمولی پہاڑیاں — نام — ان کا بیان — حملے سے بال بال بچنا — دیہہ گل — دعوت — تفریح — مصنف ایک الجھن میں — نماز دہراتا ہے اور بچتا ہے — علاقہ دزک — سردار کا نام — مالیہ — شاہ محراب خان — مذہبی تنازعہ — ایک عام آدمی کے نظریات اور مصنف کی تردید — سفر پر روانگی — سب کا علاقہ اور قصبہ — دیہات کلوگی اور پگی — الشیخ مراد خان کرد بلوچ کا بیان — زمین کی ماہیت — پیچیدہ سڑک — علاقہ کی سطح کا تغیر — کوتل یا درہ — اس کا بیان — دیہات شورک اور مگسی — سردار مگسی کا قتل — اس کا بیان — وجہ — مصنف کا تبصرہ — لورطی — مشرق کے خبیثی — عادات و تفریحات — رمل اور قرعہ — لوڑیوں کا مذہب — انوکھی کہاوت — لباس — برائیاں — نفس پرستی — محرمات کی تجارت

— خان جہاں خان کا چیاؤ — لوٹ مار — مصنف کو پتہ چلتا ہے کہ رہنما اسے واقعی عابد و زاہد سمجھتا ہے — مذہب پر تبادلہ خیال — استدلال — رہنما کو چپ کرانے کے طریقے — کامیابی — تشریح۔

---

۶ / اپریل :

میر خداداد اپنے وعدے پر قائم رہا اور میں نماز ظہر ختم ہوتے ہی کلوگن سے روانہ ہوا۔ مجھے مجبوراً مسجد میں جا کر نماز ادا کرنا پڑی اور میں آج تک اس مخالفت سے بچتا رہا تھا لیکن سردار میرے مکان پر آیا اور مجھے بھی نماز کے لئے پکارا کیونکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ میں روانگی سے پہلے نماز ادا کرنا چاہتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ گریز ناممکن تھا لہٰذا سردار کو دیکھ دیکھ کر رکوع و سجدہ کرتا رہا اور کچھ پڑھتا رہا۔ جب میں اونٹ پر سوار ہونے لگا تو مراد نے میرے ہاتھ کو بوسہ دیا اور کہنے لگا کہ چونکہ میرا اُسّر جا رہا ہے لہٰذا میرے جانے کی ضرورت نہیں میں نے اس شاطر سے کوئی اختلاف نہیں کیا بلکہ اُس کے نہ جانے پر خوش ہوا۔ میرا محافظ دستہ اب صرف تین آدمیوں یا لڑکوں پر مشتمل رہ گیا جن کے علاوہ میر خداداد اور ایک کابلی فقیر تھے جو عازمِ مکہ تھا۔ ہم مغرب کے رُخ پر چھ میل جنوب کی طرف چلے۔ ہمارا راستہ پہاڑوں کے درمیان ایک آبی گذرگاہ تھا اور ہم دو دیہات پُورا اور ببی سے گذرے۔ چار بجے شام ہم ایک نہایت کھلی جگہ ٹھہرے تاکہ رات کے وقت اچانک حملہ کا امکان نہ رہے۔

کلوگن میں کوئی ڈیڑھ سو مکانات ہیں جن میں سے کم شدہ بلکہ سہ منزلہ ہیں تاکہ حملے کی صورت میں بالائی حصوں میں پناہ لی جا سکے یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ اوپری حصوں میں ہی سوتے ہیں جو ایک خفیہ دروازے سے سیڑھی چڑھتے ہیں اور پھر سیڑھی اُوپر اٹھا لیتے ہیں تاکہ اگر رات کو ڈاکو آئیں تو وہ خاندان کو ایذا نہ دے سکیں اور غلہ و رسد بھی نہ لیجا سکیں

گاؤں نخلہائے خرما کے ایک تنگ جھنڈ کے پہلو میں آباد ہے۔ یہ جھنڈ ایک میل سے زیادہ جنوب تک پھیلا ہوا ہے۔ گاؤں کی زمین پر چاول اور دوسرے اناج بوئے ہوئے تھے۔ وسط سے ایک نالہ گذرتا تھا جس کے کناروں پر بہت سے لدے پھندے درخت سرافراختہ تھے۔ اس موسم میں پہاڑ سرسبز تھے اور گاؤں سے نظر آتے تھے اور مجموعی طور پر مجھے یہ گاؤں قدرت کا سب سے زیادہ ساختہ پرداختہ معلوم ہوا۔ یہ تاثر شاید اس لئے گہرا ہوا کہ میں جن چٹیل اور بسیط علاقوں سے گذر کر آیا تھا یہ عزلت گزیدہ اور خوبصورت گاؤں ان کا عین تضاد تھا۔

میں نے کتاب کے حصہ دوم میں صوبہ مکران پر تفصیل سے لکھا ہے اور چونکہ یہ علاقے اسی کا حصہ ہیں لہٰذا میں ان پر صرف ایک مختصر سا تبصرہ یہاں پیش کروں گا۔ ہر گاؤں کا اپنا اپنا سردار ہے جو رائے عام کا منتخب کردہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ غلہ اور کھجور کی سالانہ پیداوار کا تھوڑا سا حصہ لیتا ہے اور اس کے بدلے مستحق مسافروں کی آؤ بھگت کرتا ہے لیکن مکران میں مہمان نوازی کا جذبہ بلوچستان کی نسبت بہت ہی کم ہے اور اس کے مواقع بھی شاذونادر ہی آتے ہیں۔ کلوگن سے مہفتار تک کے لوگ مکرانی کہلاتے ہیں۔ وہ تھوڑے سے لوگ ہیں اور گو بہت سخت جان اور بہادر ہیں تاہم وہ ہر وقت بلوچوں سے خوفزدہ رہتے ہیں جن کا وہ انہی کے بقول مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان کا لباس، پیشے اور عادات انہی طاقت ور ہمسایوں جیسی ہیں۔ ان کی مستورات بالکل عامیانہ ہیں اور میں نے خاص طور پر کلوگن (جس میں کچھ ٹھہرا اور گھوما اور اس تبصرے کا اہل ہوا) میں کوئی ایسی عورت نہیں دیکھی جس کی آنکھیں کمزور نہ ہوں۔ اس بیماری کے لئے میں نے سردار کی دو تین عزیز خواتین کو دوائی دی جو پھٹکڑی اور افیم کی بنی ہوئی تھی۔ بس پھر کیا تھا۔ پورے گاؤں کی عورتوں نے مجھے گھیر لیا اور آنکھوں کی بیماریوں کے علاوہ انہوں نے مجھے پیرزادہ کہہ کر دنیا بھر کی بیماریاں بالتفصیل بتا ڈالیں۔ ان میں سے کئی نے بنام محمدؐ التجا کی کہ میں حج کی برکت سے ان کا بانجھ پن دور کرنے کے

لئے تعویذ دے دوں۔ کئی نے ہسٹریا اور ریاح کی شکایت بتائی۔ سچ تو یہ ہے کہ جتنی عورتیں تھیں اتنی ہی بیماریاں تھیں اور ہر ایک اپنی اپنی کہہ رہی تھی۔ ان کے جم چڑپن سے تنگ آکر مجھے یہ برملا کہنا پڑا کہ مجھے ان دکھوں کی ابجد سے بھی واقفیت نہ تھی اور میں کوئی نسخہ نہ دے سکتا تھا۔

۷ر اپریل :

آخر کار ایک مرطوب اور بے چین رات گذارنے کے بعد ہم طلوعِ آفتاب سے پہلے ہی ٹھنڈی زمین سے اٹھ کر چل دیئے تاکہ چلنے سے کچھ حرارت پائیں۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ میرا ایک جوتا گم ہو گیا تھا جسے شاید کوئی لومڑ یا دوسرا جانور لے گیا تھا۔ سڑک اتنی خراب تھی کہ ہر چند موٹر کے فاصلے کے دوران ہمیں دو تین دفعہ اترنا پڑتا تھا لیکن ان مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود میں اس دن چھبیس میل چلا۔ راستہ پہاڑوں کی چٹانوں یا سنگلاخ میدانوں کے درمیان کی آبی گذر گاہیں تھیں۔ راستے میں جنگل بہت تھے اس کا بیشتر حصہ کلپور کن[1] کے علاقے سے گذرا جو سردار دزک کے ماتحت ہے اور اسی کے بڑے قصبے کے پاس شام سات بجے ہم نے پڑاؤ ڈالا۔ اس کے پاس ہی دو غیر معمولی پہاڑیاں ہیں جن میں سے ایک کوہِ گبر کہلاتی ہے۔ میں اس سے بارہ چودہ میل سے کم فاصلے پر نہ تھا لیکن یہ وضع قطع میں بہت موثر ہے اور ایک بلند قبہ کی صورت میں اپنے ارد گرد کے پہاڑوں سے اوپر اٹھی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی چوٹی پہ ایک آتشکدہ ہے لیکن مجھے کوئی ایسا آدمی نہ مل سکا جو وہاں تک واقعی گیا ہو۔ دوسری پہاڑی الگ تھلگ ہے اور میدان میں ایستادہ ہے۔ یہ کوہِ گواانک یا گونج کا پہاڑ کہلاتی ہے کیونکہ اس کے دامن کے پچاس گز کے اندر اندر دبی زبان میں بولے جانے والے الفاظ نہایت حیرت انگیز طور

---

[1] میرے خیال میں کلپرکن کا معنی ہے پریوں یا روحوں کا مسکن۔

پر دہرائے جاتے ہیں۔ ہم کوئی چوتھائی میل کے فاصلے سے اس کے پاس سے سر شام گذرے اور میرے آدمیوں نے نعرے لگائے تو یہ ہُو بہُو دہرائے گئے۔ میرا قیاس ہے کہ یہ اندر سے کھوکھلی ہے اور ہندوستان واپس آکر میں نے انہی ملکوں کے ایک آدمی سے سُنا ہے کہ کوہِ گبر ترپر تصویری الفاظ بھی کندہ ہیں۔ لوگ انہیں آسیب زدہ سمجھتے ہیں اور بہت سی حیرت انگیز کہانیاں مشہور ہیں کہ جن لوگوں نے ماضی میں ان پر چڑھنے یا انہیں ٹٹولنے کی کوشش کی اُنہیں نقصان پہنچا یا وہ سحر زدہ ہو گئے۔ اسی لئے اب تمام لوگ اُن کا رُخ نہیں کرتے۔

جب ہم غروب آفتاب پر ذرا ٹھہرے کہ میرے خداداد اپنی نماز ادا کرلے (جو وہ دن میں تین دفعہ باقاعدہ پڑھتا تھا) تو اٹھارہ مسلح آدمی ہم سے آملے۔ ہم نے انہیں گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔ گویا وہ ہماری تعداد جانچتے پھر رہے تھے اور جب ہماری گفتگو ہوئی تو پتہ چلا کہ انہوں نے دو بجے بعد دوپہر ہمیں دیکھ کر یہ اندازہ لگایا تھا کہ ہم رات کے وقت کچھ دیہات کو لوٹنے والے تھے لہٰذا انہوں نے جھٹ پٹے میں ہم پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا تاکہ ہم بے خبری میں پکڑے جائیں اور جب ہم اُونٹوں سے اُترے تو وہ عندیہ لینے کے لئے ہمارے پاس آگئے تھے۔ چونکہ وہ مضبوط لوگ تھے، ہم سے تقریباً دو گنا تھے اور زیادہ مسلح تھے لہٰذا حملے کی صورت میں غالباً ہم میں سے کئی مجروح یا ہلاک ہو جاتے لیکن ہم من جانب اللہ جو رُکے تو ان کا منصوبہ خاک میں مل گیا اور اُلٹا وہ توجیہہ بتاتے پر مجبور ہو گئے۔ خداداد نے اُنہیں بتایا کہ میں ایک پیرزادہ تھا جو حج پر جا رہا تھا جس پر وہ مجھے معمولی سی گزند پہنچانے کی بد اندیشی کے تصوّر سے بھی کانپ اُٹھے اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اُنہیں اپنی غلطی کا بروقت احساس ہو گیا۔ مجھے ان سب سے بغل گیر ہونا پڑا جس کے فوراً ہی بعد وہ اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

۸ ,اپریل :

میں سات بجے صبح علاقہ دَرزک کے گاؤں گل پہنچا اور ابھی چند سو قدم ہی چلا تھا کہ مسجد کے مُلّا نے (جس نے پچھلی شام ہمیں ملنے والے چند آدمیوں سے میرے متعلق سُنا تھا) ایک لڑکے کے ذریعہ التجا کی کہ میں واپس جاکر کچھ نوش کر لوں۔ میں جانتا تھا کہ یہ مہربانی محض تجسس کا نتیجہ تھی لیکن میں مذہبی گفتگو کے پیش نظر پہلو تہی کرنا چاہتا تھا لیکن یہ انکار کی کوئی خاص دلیل نہ تھی اور میرے رفقا اسے منظور کرنے پر اصرار کر رہے تھے (کیونکہ وہ میری تکلف بندی کو ایک اچھے ناشتہ کے لئے رکاوٹ بننے کے خلاف تھے) لہٰذا میں واپس آیا اور دیکھا کہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے قالینوں پر چار پانچ معززین بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُن کے سامنے چوبی رکابیوں میں روٹی اور لسی رکھے ہوئے تھے۔ وہ سب کے سب تعظیماً کھڑے ہوئے اور دست بوسی اور بغل گیری کے بعد مجھے بڑے مُلا کے دائیں طرف بٹھا دیا۔ اُس نے بسم اللہ[1] پڑھی اور ہم سب کھانے میں اتنے محو ہوئے کہ کسی کو مجھ سے سوال پوچھنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ کھانے کے بعد ایک غلام نے ہاتھ دھلائے جیسے کھانے سے پہلے دھلائے تھے اور میری بائیں طرف کے مددگار (جو درمیانی فارسی بولتا تھا) نے دیکھا اور اجتماع سے کہا "اب پیرزادہ فاتحہ یا دعائے شکرانہ پڑھیں گے"۔ یہ دعوت غیر متوقع بھی تھی اور ناخوشگوار بھی اور میں ایک لمحہ کے لئے تو سراسیمہ ہوا لیکن چونکہ بمبئی سے روانہ ہونے کے بعد میں نے اپنے ہندوستانی نوکر سے مسلمانوں کی مقبول ترین دعاؤں کا معمولی علم حاصل کر لیا تھا لہٰذا میں نے نہایت سنجیدگی سے معنی خیز طور پر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرے اور چند فقرے بڑبڑایا لیکن اللہ، رسول اور شکر[2] وغیرہ کے الفاظ خوب اونچے ادا کئے۔ اس سے کام

---

[1] بسم اللہ، پارسا مسلمان ہر موقعہ پر پڑھتے ہیں خواہ وہ غیر اہم ہی ہو۔ یہ گویا (عیسائی) دعائے طعام کا معنی رکھتی ہے۔

[2] اللہ، رسول اور شکر ایسے الفاظ تھے یقیناً اس دعا کا حصہ ہوتے جو مجھے پڑھنے کے لیے کہا گیا تھا۔

بن گیا اور دست بوسی اور بغل گیری کے بعد ہم رخصت ہوئے۔

میں دزک کے زرخیز اور گنجان آباد علاقے میں زمیل کے قریب مزید چلا۔ اس میں سات آٹھ گاؤں ہیں اور ہر ایک کا اپنا اپنا نام ہے لیکن لوگ اپنے آپکو دزک سے ہی موسوم کرتے ہیں۔ یہ بلوچستان بلکہ ایشیا بھر کی عام رسم ہے جو پردیسیوں کو گمراہ کر سکتی ہے۔ بڑا سردار نعمت اللہ خان ہے جس کے نام مجھے سردار نوشیکی نے ایک خط دیا تھا لیکن میں نے یہ خط نہیں دیا ورنہ وہ مجھے چند گھنٹے بلکہ شاید رات بھر اپنے پاس ٹھہراتا۔ وہ پیداوار کا دسواں حصہ لیتا ہے جس کا مطلب بے اندازہ گندم اور کھجور ہے کیونکہ ایک دائمی نالہ اس وادی کو سیراب کرتا ہے۔ اور کھجوروں کے درخت بے حساب اور وسیع رقبے پر ہیں۔ شاہ محراب خان مفتور میں رہتا ہے جو چھ دن کے فاصلے پر ہے۔ اس کا ایک گاؤں یہاں بھی ہے اور بعد میں اس نے بتایا کہ یہاں سے اسے دس ہزار روپیہ سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے اور چونکہ نعمت اللہ خان کے ایسے ہی سات گاؤں ہیں لہٰذا اس کی آمدنی ساٹھ ستر ہزار روپے سالانہ ہوگی۔

آج صبح ہم سرجو نامی گاؤں کے پاس رکے کیونکہ مجھے جوتا خریدنا تھا تو ایک جم غفیر نے ہمیں گھیر لیا اور مذہبی سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ انہوں نے مجھے ایرانی اور لہٰذا شیعہ سمجھا جن سے وہ سخت متنفر ہیں لیکن میں نے جلد ہی انہیں اپنے ہندوستانی نوکر کے ذریعہ مطمئن کر دیا جو ایسے مواقع پر بہت کام دیتا تھا۔ میں رخصت ہونے کے لیے اٹھا تو ایک آدمی نے کہا کہ بہشت میرے مقدر میں تھی۔ اس نے کہا "تمہاری شکل و صورت بتاتی ہے کہ تمہیں اپنے وطن میں ہر قسم کا آرام میسر تھا لیکن تم نے یہ سب کچھ رضاکارانہ طور پر تیاگ کر مصیبت سفر اختیار کی جو آخرت کے انعام کا استحقاق پیدا کرتی ہے"۔ اس نے مزید کہا "لیکن اگر میں بھی یہی طریقہ اختیار کروں تو مجھے ایسے اجر کی توقع نہیں کیونکہ میں حضر میں بھی ایسا ہی نادار اور سوختہ ساماں ہوں جیسا سفر میں[1]"۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ میری اصل حیثیت یہی تھی

---

[1] یہ بات قرآنی تعلیم مساوات سے متصادم ہے لیکن اس کے کہنے کا مقصد امیر لوگوں کو بچ پاکسانا

جو ظاہر تھی لیکن وہ مسکراتا رہا اور پھر میرے پاؤں کو بغور دیکھنے کے بعد کہنے لگا کہ یہی میری تردید کر رہے ہیں اور ثابت کر رہے تھے کہ میں اس ہیئت گدائی کا عادی نہ تھا۔ مجھے فوراً اپنے جوتوں کا خیال آیا اور میں نے انہیں پہن لیا کیونکہ گو میں نے نہایت دلیری سے انہیں دھوپ میں ننگا رکھا تھا اور ان پہ آبلے بھی پڑ گئے تھے تاہم میں انہیں منہ اور ہاتھوں کی طرح موسم زدہ نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ آدمی میرے پیچھے پیچھے آیا جبکہ میں سوار ہو کر روانہ ہو گیا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ میری سفید جلد کے باوجود مجھ پر یوروپی ہونے کا شبہ نہ کر رہا تھا[1]۔

۹ر اپریل :

ہم نے رات دزک کی پہاڑیوں کے مغربی سلسلہ کی تلہٹی میں گذاری۔ ہم ان پہاڑیوں پر آج صبح چڑھے تھے اور مغربی سمت میں دس میل سے زیادہ گئے تھے کہ ایک بہت وسیع و بسیط میدان میں آ گئے جس میں ریب کا علاقہ ہے۔ میرے راستے کے چار میل جنوب میں اسی نام کا قصبہ ہے، دو میل مغرب میں گاؤں کلوگی ہے اور قریباً شمال میں اتنا ہی دور گاؤں پوگی ہے میں ان میں سے کسی گاؤں نہ جا سکا۔ یہاں کا سردار شیخ مراد خان ہے جو ایک کرد بلوچ ہے جسے قدیم باشندوں نے اپنے علاقے کی حفاظت کے لئے اپنے کچھ قبائلیوں کے ہمراہ آباد ہونے کے لئے بلا لیا تھا اور وہ واقعی بوجہ شجاعت و عزیمت اس کام کے لئے موزوں ہے۔ وہ اب تک اپنی آزادی برقرار رکھنے میں کامیاب رہا ہے گو یہاں کے قوی ترین سردار شاہ محراب خان

ہوتا ہے تاکہ وہ حرمین شریفین پر خیرات و صدقات کے علاوہ ٹھاٹ باٹ دکھا سکیں۔

[1] تمام ایشیائی سفید رنگت سے مراتب وابستہ کر دیتے ہیں۔ وجہ معلوم نہیں۔ شاید اس لئے کہ ان کے سردار عوام سے نسبتاً زیادہ سرخ و سفید ہوتے ہیں جس کی وجہ غالباً ان کی پرورش و تربیت میں زیادہ احتیاط اور موسموں اور آب و ہوا کے تغیر و تبدل سے حفاظت ہے۔ بڑے ہو کر بھی وہ طبعی اثرات سے کم ہی متاثر ہوتے ہیں۔

(قصبہ پُہرہ یا پہرا کا) نے اس پر بار بار حملے کئے ہیں۔ سب کا علاقہ عموماً بنجر ہے لیکن اس کے مغربی طرف کی ایک چوڑی آبی گذرگاہ نے اسے کاملاً غیر آباد نہیں ہونے دیا اور اس کے پاٹ میں گندم کے کھیت اور کھجوروں کے جھنڈ ہیں۔ میدان سب سے گذرے تو پست پہاڑوں کی ایک اور چوٹی آئی جس کی پشت پر ہم ٹھہرے۔ آج کا مجموعی فاصلہ تئیس میل تھا اور سمت تقریباً مغربی تھی۔ بعض تنگ گھاٹیوں میں مجھے لائی یا تمرس جھاڑیوں کے علاوہ کوئی سبزہ نظر نہ آیا۔

۱۰ر اپریل:

آج کے سفر کا پُرپار راستہ پُرپیچ تھا اور علاقے کی سطح حیران کن طور پر بدلی ہوئی تھی۔ اتنے تھوڑے سے فاصلے کے اندر اتنی ہمہ جہتی تبدیلی تصور میں بھی نہ آسکتی تھی۔ کلوگن اور دزک کے چوٹی تک جھاڑیوں اور سبزہ سے بھرپور پہاڑوں کی بجائے یہاں محض کالی چٹانوں کا ملغوبہ تھا اور کلپرگن، دزک اور سب کے بسیط اور ہموار علاقوں کی بجائے یہاں محض گنے چنے ہموار مقامات تھے جن کو پست سنگلاخ چوٹیاں اور گہری کھائیاں کاٹتی تھیں لہٰذا ان پر سفر کرنا مشکل اور تکلیف دہ تھا۔ ہمیں ایک کوتل[1] ملا جس کی چڑھائی یا لمبائی قابلِ ذکر نہ تھی لیکن اس کا قدرتی استحکام ایسا تھا کہ صرف معدودے چند آدمی ایک لشکر کے خلاف اس کا دفاع کر سکتے تھے۔ دس فٹ گہرا راستہ دو سو گز تک ٹھوس پتھر میں سے کھلا ہوا ہے اور چڑھائی اتنی ناگہاں ہے کہ گرنے یا لڑھکنے والا پتھر چڑھنے والے کے لئے یقیناً موت کا پیغام ہے۔ آج ہم زیادہ سے زیادہ اٹھائیس میل چلے گو ایک پڑاؤ سے دوسرے تک کا سیدھا فاصلہ اس کے نصف سے زیادہ نہ ہوگا۔ سترھویں اور پچیسویں میل پر علی الترتیب شورک اور گسی نامی فصیل بند گاؤں ہیں۔ میں گسی شب بسری کے ارادے سے گیا لیکن پتہ چلا کہ ابھی چند روز قبل لوڑیوں کے ایک گروہ نے وہاں کے سردار کو قتل کر دیا تھا اور اب اسی کا سرغنہ شاہ محراب خان کے حکم پر قائم مقام سردار تھا لہٰذا میں نے ایسے خون آشام لوگوں کے

---

[1] کوتل فارسی لفظ ہے بمعنی درہ یا گھاٹی۔ بلوچی میں لک کہتے ہیں۔

حلقۂ اقتدار میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور رات جنگل میں گذاری۔

گو میں اب ان مکانیوں کی وحشت وسفاکی کا عادی ہو چکا تھا تاہم میں اس خونی گروہ کے سردار کی بے دردی پر سراسیمہ رہ گیا جس نے خداداد اور میرے شتربانوں کو قتل کی داستان مزے لے لے کر سنائی اور پھر گاؤں کے ایک بلند مکان کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہاں اس بدنصیب سردار کے بیٹے نے پناہ لی تھی جب اس کے باپ کا خاندان قتل کیا جا رہا تھا اور اس کے وہاں سے اترتے ہی وہ بھی قتل کر دیا جائے گا۔ سفید مو قاتل نے مزید کہا کہ دراصل اسے جلد از جلد نیچے اتر آنا چاہیے تاکہ وہ اسے بھوکا مارنے کے صبر آزما کام سے بچ سکیں کیونکہ یہی اسے باہر لانے کا طریقہ تھا اور وہ عمارت اور اس کے سامان کو ضائع کرنا نہ چاہتے تھے۔ میں نے جرأت کر کے پوچھا کہ شاہ محراب خان کا اس قتل پر کیا نظریہ تھا جس کا مرحوم سردار باجگزار تھا اور یہ سنکر میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اس برے فعل سے پہلے لوٹیوں نے اسے سردار مان لیا تھا اور مروجہ جرمانے ادا کر دیئے تھے جس پر ان کی اطاعت بادشاہ نے تسلیم کر لی تھی اور مگسی کی سرداری انہیں تفویض کر دی تھی۔ صرف انتقام نے انہیں اس سفاکی پر اکسایا تھا۔ انہوں نے دو ماہ قبل فصل کی بوائی سے پہلے گاؤں کے قریب ٹھہرنے کی اجازت مانگی تھی تاکہ وہ بھی ایک قطعۂ زمین کاشت کر سکیں لیکن یہ التجا نامنظور ہوئی اور کہہ دیا گیا کہ اگر وہ مقررہ مدت کے اندر علاقے سے نہ نکلے تو برا حشر ہوگا۔ وہ غائب ہو گئے اور جب ان کو نکالنے کے لئے بلائے جانے والے مسلح آدمی اپنے زرعی کاموں پر واپس چلے گئے[1] تو وہ ایک رات اپنی پہاڑی کمین گاہ سے یکلخت نکل کر سردار کے مکان پر ٹوٹ پڑے۔

---

[1] یہاں بھی بہت سی دوسری جگہوں کی طرح لوگ بہار میں اپنے گاؤں سے کسی قریبی زرخیز وادی یا میدان میں چلے جاتے ہیں، اپنے ریوڑ چراتے ہیں، کچھ اناج اگاتے ہیں اور خزاں کے خاتمہ پر واپس آجاتے ہیں۔

اور اُسے اور اس کے سب اہل خانہ کو مار ڈالا۔ گاؤں والوں نے انہیں بچانے کی کوئی کوشش نہ کی اور سردار زادے کے متوقع حشر سے بھی وہ لاتعلق تھے۔ پُرامن علاقوں میں (جہاں انسانی جان و مال خدائی اور انسان ساختہ قوانین کی حفاظت میں ہے) ایسے فتنہ و فساد کے تصور پر بھی انسانی ذہن تھرّا اٹھتا ہے اور اسے قابلِ مذمت سمجھا جاتا ہے لیکن یہاں حالات مختلف ہیں۔ یہاں مرغوب ترین گفتگو قتل و غارت اور کشت و خون ہے اور یہاں کے لوگ جرائم کو نہ صرف آئے دن کا معمول سمجھتے ہیں بلکہ انہیں بیان کر کے حظ اٹھاتے ہیں حالانکہ فطرتِ انسانی ان پر کانپ کانپ اٹھتی ہے۔

لوڑی (جو اس مرقعہ پر پیش پیش تھے) آوارہ گرد لوگوں کا طبقہ ہے جن کے کوئی مستقل مساکن نہیں ہیں اور بہت سی دوسری باتوں میں وہ یورپ کے جپسیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ وہ اپنی مخصوص بولی بولتے ہیں۔ ان کے ہر جتھے کا بادشاہ ہوتا ہے اور وہ اغوا و سرقہ میں رسوائے زمانہ ہیں۔ ان کے محبوب ترین مشاغل شراب نوشی، اور رقص و موسیقی ہیں جن کے ساز وہ اپنے ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ ان کے ہمراہ نصف درجن ریچھ اور بندر بھی ہوتے ہیں جو ہر قسم کے بھونڈے شعبدوں میں سدھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر گروہ میں دو تین آدمی رمل[1]، قرعہ[2] اور پیش گوئی کے دیگر طریقوں کے ماہر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ان معاشروں میں فوراً مقبول ہو جاتے ہیں جن کے افراد تقدیر ناگزیر اور مشیت کے بری طرح قائل ہیں۔

---

۱ رمل ایک عربی لفظ ہے بمعنی ریت۔ اس کے ذریعے پیشگوئی کا طریقہ یہ ہے کہ کچھ رسومات ادا کرنے کے بعد ریت کو ایک تختہ پر بکھیر دیتے ہیں اور پھر اس کا ماہر رمال الفاظ پڑھتا ہے۔ قرعہ کا معنی ہے قسمت۔ اس کے کئی طریقے ہیں لیکن کثیر الاستعمال یہ ہے کہ مردے کی ہڈیوں کو پاسوں کی شکل میں کاٹ کر ان پر تصویری حروف لکھتے ہیں۔ تقدیر کا متلاشی انہیں پھینکتا ہے اور نجومی نتیجہ بتا دیتا ہے۔

لوڑیوں کا مذہب مبیّنہ طور پر اسلام ہے لیکن وہ اس سے عملاً دُور ہیں اور موقعہ کے مُطابق سنی اور شیعہ بنتے رہتے ہیں[1]۔ مجھے ان سے ان موضوعات پر گفتگو کا موقعہ نہیں ملا لیکن شنید ہے کہ وہ بہت سے قرآنی اصولوں کو بیہودہ گردانتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ انسان زندہ رہنے، مرنے، لڑنے اور بھلائے جانے کے لئے پیدا ہوا ہے اور اگر زندگی کے دوران وہ خوش ہو تو اس خوشی کی درازی کی دُعا مانگے لیکن اگر ناخوش ہو تو وہ دُعا کو ترک کر کے اپنے دکھوں کو ختم کرنے کا مجاز ہے۔ ان میں سے کوئی مر جائے تو وہ اُس کے ساتھ وہ سب کچھ دفن کر دیتے ہیں جو بلا شرکت غیرے اس کا تھا مثلاً کپڑے، تلوار، بندوق وغیرہ تاکہ ان کے عقیدۂ فراموشی پر پورا عمل ہو سکے!

ان کے مرد اور عورتیں نہایت بے ہُودہ اور بے ڈھنگے لباس پہنتے ہیں اور اپنے آپ کو پروں، کھالوں، گرندی نما پھلوں، گھونگھوں اور دیگر نمائشی چیزوں سے سجاتے ہیں۔ وہ کردار و اطوار میں بے شرم و بے حیا ہیں اور ہر قسم کی برائی اور نفس پرستی کے عادی ہیں۔ چنانچہ وہ شادی نہیں کرتے لہٰذا عورتوں اور مردوں کے آزادانہ جنسی تعلقات پر عمل پیرا ہیں۔ اس آزادانہ اختلاط کی کوئی حدیں نہیں ہیں۔ ان کے ہاں اولاد بہت کم ہوتی ہے لہٰذا وہ لڑکیاں اغوا کرتے ہیں جو اسی اختلاط کو اپنا لیتی ہیں لیکن اگر کوئی عورت حاملہ ہو جائے تو اولاد اجتماعی ملکیت سمجھی جاتی ہے اور بلوغت پر اسے اسی رنگ میں ڈھال دیا جاتا ہے۔

آج کے راستے میں مجھے سیستانی سردار، خان جہان خان کا مستقر دکھایا گیا جہاں وہ ان علاقوں کو تاخت و تاراج کرنے کے لئے اپنے سات آٹھ سو ڈاکوؤں کے ساتھ ٹھہرا تھا اور

---

[1] میں نے خان سنجرانی (مگسی سے اگلا قصبہ) قائم سے پوچھا کہ مجھے مگسی میں ملنے والے لوڑی سنّی تھے یا شیعہ؟ اُس نے ہنستے ہوئے کہا "نہیں وہ موقعہ محل کے مُطابق دونوں ہی ہیں۔ یہاں سنّی، ایران میں شیعہ اور اگر خوارج کے پاس چلے جائیں تو انہی کا مذہب اختیار کر لیں گے۔"

سب کچھ لُوٹ کر لے گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کی لُوٹ مار زیادہ نہ ہو گی لیکن مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ چند غلاموں اور اونٹوں کے علاوہ ہزاروں بھیڑ بکریاں بھی لے گیا تھا۔ بعد میں کیپٹن گرسٹی خان جہان خان کے قصبہ میں گیا تو اسے بتایا گیا کہ وہ ہمسایہ ممالک میں ہوّا بنا ہوا تھا۔

آج شام غروبِ آفتاب سے کچھ پہلے میر خداداد نے کہا کہ میں بھی نماز کے لئے چلوں۔ میں نے معذرت کی اور ٹہلتا ہوا پڑاؤ سے دُور نکل گیا۔ چونکہ کابلی فقیر اذان[1] دے رہا تھا اور وقت کم تھا لہٰذا وہ میرے پیچھے نہ آسکا لیکن نماز سے فارغ ہوتے ہی وہ میرے پاس آیا۔ میں مگسی کے غیر معمولی مناظر پر غور کر رہا تھا کہ اُس نے تمہید کے بعد پوچھا کہ میں اُن کے ساتھ نماز میں شریک ہونے سے کیوں کتراتا تھا۔ اُس نے کہا کہ فتح محمد بھی میرے ساتھ قابلِ مذمت تھا اور یہ غفلت ہم دونوں کے لئے ہر لحاظ سے ناقابلِ معافی تھی۔ بالخصوص جبکہ ہم حج پر جا رہے تھے اور مذہبی فرائض کی پابندی ہم پر دو چند لاگو ہوتی تھی۔ مجھے فوراً یاد آیا کہ مراد خان نے بھی کلوگن میں ہمیں عازمِ حج ثابت کرنے کے لئے بہت سے ثبوت دیئے تھے اور مجھے اپنی حماقت پر افسوس ہوا کہ میں نے یہ رُوپ کیوں نہ اختیار کیا۔

خداداد ابھی تک مصروفِ تلقین تھا کہ مجھے مذہب سے زیادہ واقف اور اس کی پابندیوں سے زیادہ آگاہ ہونا چاہیئے اور اُس نے یہ بھی کہا کہ وہ تو اپنی دعاؤں کے بغیر گھر سے ایک میل بھی نہیں جاتا۔ میں نے اس کی تردید کرنے کی کوشش نہ کی اور اس زجر و توبیخ کے جواب میں کہا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض حالات میں عبادتِ الٰہی اور دُرود سے منع فرمایا تھا اور میں نے اور میرے ساتھی نے ایک ماہ سے بھی زیادہ عرصے سے ایک ہی کپڑے

---

[1] اذان کے لئے مجھے انگریزی میں کوئی مترادف نہیں ملتا۔ یہ نماز سے پہلے تنبیہ یا دعوت ہے۔ اذان دینے والا موذّن کہلاتا ہے اور مساجد میں یہ بلند ترین مینار کی چوٹی سے دی جاتی ہے۔ یہ بعید دل خوش کن اور موثر ہوتی ہے بالخصوص جب موذن کی آواز صاف اور گمبھیر ہو جیسا کہ اکثر ہوتا ہے۔

پہن رکھے تھے حالانکہ نماز و دُعا سے پہلے ہر اچھے مسلمان کو جسمانی و ذہنی لحاظ سے پاکیزہ ہونا چاہیئے۔

مجھے امید تھی کہ یہ قرآنی دلیل اسے خاموش کر دے گی لیکن اس نے اپنا وعظ پھر شروع کر دیا اور مجھے یاد دلایا کہ میرے بیان کردہ حکم میں یہ بھی مذکور ہے کہ ابناء السبیل کے لئے رعائتیں ہیں اور پھر اُس نے کہا "لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ تقدیر نے مجھے کن لوگوں کا ہمسفر بنا دیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو۔ یہودی، کافر[1] یا شیطان ملعون"۔ میں نے پیغمبر کی قسم کھا کر کہا کہ ہم انمیں سے کوئی نہ تھے بلکہ سچے اور پکے" سنی مسلمان تھے اور میں اسی سلسلے میں دعوے سے مزید دلائل دینے والا تھا کہ میرا ایک شتربان آکر کہنے لگا کہ روٹی تیار تھی چنانچہ ہم اس کے ساتھ کھانے کے لئے آگئے۔ جب میں نے یہ قصہ شیخ محمد کو سنایا تو وہ یہودی کہنے پر بہت برگشتہ ہوا اور حلفاً کہنے لگا کہ میر خداداد ہونق تھا اور مذہب سے بالکل کورا تھا جسے وہ دوسروں کو سکھاتا پھر رہا تھا اور وہ کل کو سب کے سامنے اس کی قلعی کھول دے گا۔ چنانچہ اُس نے اسے روٹی کا ایک ٹکڑا دیا اور کہا کہ فقط حلال کھاؤ[2]۔ سردار اس درخواست کی باریکی کو نہ سمجھ سکا تو اُس نے اسے خوب آڑے ہاتھوں لیا اور کہا کہ دوسروں کی حرف گیری سے پہلے خود تو اپنے فرائض پر حاوی ہو جاؤ۔ اس کے بعد اس نے اسے یہ بات کھل کر سمجھائی۔

---

[1] میرے خیال میں کافروں میں تمام عیسائی بھی شامل تھے۔

[2] قرآن میں جہاں کئی مضحکہ خیز اور غیر اہم باتیں ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ آدمی کے لئے وہ چیز کھانا منع ہے جو کھانے کے دوران اُس کے دانتوں سے چپک جائے۔ اس کا مطلب صاف طور پر یہ تھا کہ پیروان رسول اپنے منہ صاف رکھیں لیکن کٹر مسلمانوں نے اسے اتنا بگاڑ دیا یا اس پر لفظی عمل کیا کہ وہ گوشت کے ہر لقمے کے درمیان اپنے دانت صاف کرتے ہیں اور منہ دھوتے ہیں۔

بابِ یاز دہم

بنجر اور غیر آباد علاقہ — سرحد کے بلوچ — اس گاؤں پڑاؤ کرنا — رہنما کی سرگوشیاں اور دھمکیاں — دریا کا پاٹ — گھنا جنگل — درختوں کی مختلف اقسام — راستہ پیچدار — گاؤں عثمان آباد — دریا کی گذرگاہ کا بیان اور اس کا دوب — پریشان رات بوجہ وحوش — گاؤں والے چوکنے — جنگلی سوروں کے شکار کے بارے میں ان کے غلط نظریئے — ایک فقیر قافلہ چھوڑتا ہے — مصنّف کا اطمینان — قصبہ سنفتور — استقبال — سردار — مصنّف پر مقامی حکمران کے بہروپ کا شبہ — وہ سردار کو پستول دیکر مطمئن کرتا ہے — ایک خط اُسے ملتا ہے — قصبہ لوہرا — استقبال — مصنّف کا یورپی ہونا — روشن خیال سردار کی بدولت کوئی بُرا نتیجہ نہیں نکلتا — رہنما کی پریشانی و مایوسی — اس کا ردِعمل — انتظامات کے لئے ایک دن ٹھہرتے ہیں — بلوچ بہت تکلیف دہ — ایک گوسائیں کی آمد — اس کی کہانی اور سیر و سیاحت — مصنّف اس کی رفاقت کا خواہاں ہے — سردار کے سپاہی — کہاں — شام کا اجتماع — بحث مباحثہ اور گفت و شنید — سردار کے بھونڈے نظریئے — ایک قصّہ سے واضح — مصنّف کی معذرت طوالت پسندی پر — اس موضوع پر تبصرہ

۱۱ر اپریل

آج میں پچیس میل چلا۔ میرا راستہ زیادہ تر ایک بنجر اور بے آباد علاقے سے گذرا

جہاں چٹانیں اور خشک دریائی گذرگاہیں تھیں جن کی تہوں میں کچھ گھنی جھاڑیاں تھیں جن میں اُونٹ چر سکتے تھے۔ انہی تہوں میں معمولی سا پانی بھی تھا۔ سمت کل کی طرح پیچیدہ اور مزید جنوبی رُخ پر تھی اور شام تک میرے اندازے کے مطابق ہم پچھلے پڑاؤ سے جنوب، جنوب مغرب کی طرف تھے اور ایک سیدھے خط میں شاید اس سے دس میل دور ہوں گے۔

بارہ اور ایک بجے کے درمیان میں سرحد کے گرد بلوچوں کے تین خاندانوں سے ملا جو اس جگہ سے بھاگے جا رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ پندرہ دن پہلے اسے بُری طرح لوٹا گیا اور سراسر ویران کر دیا گیا۔ یہ کارروائی خان جہان خان کے بھتیجوں نے اس کے کچھ سپاہیوں کے ہمراہ کی۔ میں نے ان بدنصیبوں سے ایک بکری خریدی (جو شیخ مراد خان کی جمعیت میں شامل ہونے کے لئے سب جا رہے تھے) جس کے لئے انہوں نے صرف نیم روپیہ مانگا۔ لیکن چونکہ میرے پاس ریزگاری نہ تھی لہٰذا انہیں پورا روپیہ مل گیا۔ میر خداداد خان ان سرحدیوں کی بپتا پر خوش ہُوا اور خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے کلوگن پر ان کے حملے کے عوض ان سے خوب بدلہ لیا تھا۔ اس نے بہت طمطراق سے کہا کہ وہ ان کے بلاجواز چھاؤ کے جواب میں اس قبیلہ کو نیست و نابود کرنے کی زحمت سے بچ گیا تھا لیکن اس کی پچھلی باتوں کے پیشِ نظر وہ اپنی عملی بہادری کا مظاہرہ کرنے کی نیت نہ رکھتا تھا۔

۱۲ر اپریل

میں آج صبح پانچ بجے روانہ ہُوا اور کوئی ڈیڑھ میل مغرب، جنوب مغرب کو پہاڑوں پر چل کر ایک ڈھلوان کنارے سے ایک دریائی گذرگاہ میں اُترا جو دو سو گز سے تین چوتھائی میل تک چوڑی تھی اور جس میں لائی (ترُس)، تغز، ببول اور خربو (زہریلی سدابہار بوٹی) کا ناقابلِ عبور جنگل اُگا ہُوا تھا اور پانی خوب فراواں تھا۔ آخری دونوں درخت یہاں بڑے بڑے تھے، جو بن پر تھے اور ان کی خوشبو دیگر چھوٹی چھوٹی جنگلی بوٹیوں کی خوشبو سے مل کر پوری فضا کو معطر کئے ہوئے تھی۔ اس خوشبو زار میں پگڈنڈی اتنی

پیچیدہ تھی کہ مجھے ہر لحظہ اسے کھونے کا خدشہ لگا رہا۔

ہم شاذ و نادر ہی ایک سمت میں پندرہ بیس گز چل سکے تھے، حتیٰ کہ ہم راستے کے آخری چار میلوں میں آ گئے جہاں دریا کا پاٹ ایک سخت ہموار میدان بن گیا جس میں جھاڑیاں اور محروم نمو درخت لاتعداد تھے۔ مَیں شام کے وقت اس میدان میں ٹھہر گیا جو سات میل بسیط ہے، پہاڑیوں سے محصور ہے اور اس کے پاس ہی ایک رقبۂ کاشتہ ہے اور ایک بڑے گاؤں عثمان آباد کے کھنڈرات ہیں جس کی آبادی دو تین خاندانوں کے سوا ہفتوزاد اور پوہرا منتقل ہو گئی ہے۔

آج کی مسافت میرے اندازے میں بتیّس میل تھی اور ہمارا راستہ کل جیسا ہی تھا۔ دریائی گذرگاہ اور اس کے جنوبی سرے کا میدان دونوں شدید طغیانیوں کا مُنہ بولتا ثبوت تھے۔ پاٹ میں لکڑی کے گھٹے، پتھر اور خس و خاشاک بل کھاتی ہوئی بھول بھلیوں میں اُلجھ اُلجھ کر بڑے بڑے ڈھیر بنے ہوئے تھے اور مَیں نے دیکھا کہ درختوں کی بالائی شاخوں میں زمین سے بارہ یا پندرہ فٹ تک اُوپر گھاس پھوس اور کوڑا کرکٹ اس طرح پھنسے ہوئے تھے کہ صاف معلوم ہوجاتا تھا کہ پانی کے اُتار کی کارگزاری تھی۔

رات کے دوران بھیڑیوں، چرخوں، گیدڑوں اور دیگر جانوروں کے ملے جلے شبینہ گیتوں نے ہمیں پریشان کئے رکھا جو ہم سے دور رہے، لیکن ممکن ہے کہ وہ قریب آ گئے ہوتے اگر اہلِ دیہہ کے نعروں اور شور و شر نے انہیں نہ ڈرایا ہوتا۔ یہ بیہودہ جانور اس علاقے میں بہت ہیں اور خاص طور پر ایسے جنگلوں میں تو یہ فراواں ہیں جہاں سے ہم صبح گذرے تھے۔ یہ وہاں سے رات کے وقت تیس تیس چالیس چالیس کے گروہوں میں نکلتے ہیں اور تھوڑے سے وقت میں ایکڑوں فصل ہڑپ کر جاتے ہیں۔ مقامی لوگ غلط طور پر اِن کے شکار کو حرام سمجھتے ہیں اور ان کی نسل کشی کے لئے کوئی اقدام

نہیں کرتے۔ لہٰذا وہ دن دُونی اور رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے جب تک
لوگ اپنی اِس غلطی کا احساس نہ کرلیں۔[1]

ہمارا دوست کابلی فقیر آج ہم سے جُدا ہُوا تاکہ کسی مکرانی بندرگاہ پر جاکر مسقط اور
جدّہ کے ذریعے مکّہ پہنچے۔ مَیں نے اُس کی رخصت پر اطمینان کا سانس لیا کیونکہ وہ چند
روز سے پابندیٔ نماز پر بہت مُصر اور تکلیف دہ ہو رہا تھا بلکہ اُس نے تو یہ قرآنی آیت
بھی سنائی کہ قرآن کی مقرر کردہ عبادات سے غفلت (خواہ وہ کسی بنا پر ہو) غافل مسلمان کو
تہِ تیغ کرنا جائز اور مستحسن قرار دیتی تھی۔ چونکہ یہ فقرہ اُس نے مجھی پر کسا تھا لہٰذا میں نے مداخلت
ضروری سمجھی اور اونٹ کی زین سے لٹکے ہوئے تھیلے سے اپنے پستول نکال لئے
مبادا وہ کوئی ایسی کوشش اور جرأت کرے۔ اُس کی عیب گیری کی یہ غیر متوقع مخالفت موثر
ثابت ہوئی اور اُس نے دوبارہ ایسے خیالات کا برملا اظہار نہیں کیا لیکن مجھے یقین ہے کہ
وہی میر خداداد کے مذہبی جوش وخروش اور ڈانٹ پھٹکار کا بڑا محرک ہوتا تھا۔

۱۳ اپریل۔

مَیں آج صبح چھ بجے قصبہ سفوتر پہنچا جو عثمان آباد سے ایک جھاڑی دار میدان کے

---

[1] یہ ایک غلط اور مستعار نظریہ ہے کہ ایک مسلمان سؤر کا گوشت نہ چھوئے اور ہمارے
بہت سے ہندوستانی نوکر (اپنے آقا کی بے نیازی یا خوش مزاجی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے) اس کی پلیٹ
میز سے نہیں اٹھاتے۔ مَیں کسی طبقے کے مذہبی تعصبات میں مداخلت نہیں کرتا لیکن مَیں ایسا نوکر پسند نہیں کروں گا
جو ایسا کرنے سے انکار کرے کیونکہ وہ ایسا کرکے ہاتھ دھو سکتا ہے۔ مَیں نے ۱۸۱۰ء میں بصرہ میں دیکھا کہ عرب کسی
معزز کے شکار کردہ خنزیر کا پیٹ چیرتے تھے، اندر کا حصہ نکال کر صاف کرتے تھے اور کندھوں پر اٹھا کر کشتی
میں لے جاتے تھے لیکن پست اور جاہل ہندوستانی دیکھتے رہتے تھے اور ہاتھ نہ لگاتے تھے۔ اِس کے
باوجود یہی لوگ اپنے آپ کو عربی النسل کہہ کر مسرور و نازاں ہوتے ہیں!

راستے چار میل جنوب مغرب میں تھا۔ جونہی مَیں مہمان خانہ میں اُترا ایک بلوچ نے قالین بچھا دیئے اور میرا نام اور کام پوچھا۔ مَیں نے اُسے کہا کہ مَیں ایک پیرزادہ ہوں اور مشہد مقدس[1] زیارت کے لئے جا رہا ہُوں۔ ناشتہ کے بعد سردار بھی ملنے آیا۔ وہ اپنے لباسِ خواب میں تھا اور صرف ململی قمیص، نیلی شلوار پہنے ہوئے اور سر پر پگڑی کی بجائے شال اوڑھے ہوئے تھا لیکن میں نے اِس سے زیادہ زیبندہ لباس کبھی نہیں دیکھا تھا اور اِس کے اطوار بحد پُروقار اور من موہنے تھے۔ وہ بہترین فارسی بول رہا تھا جو شاید ہی کسی بلوچستانی سے مَیں نے سُنی ہو اور جب ہم کچھ وقت باتیں کر چکے تو اُس نے کہا کہ اُسے یقین تھا کہ مَیں نے اُسے اپنے صبح کے پیغام میں اصلی کیفیت نہ بتائی تھی اور اُسے شبہ تھا کہ میں ایک شاہزادہ تھا جس نے بھیس بدلا ہُوا تھا۔ اُس نے التجا کی کہ مَیں سچ سچ بتا دوں اور یہ بھی کہا کہ میری پوری عزت و تکریم کی جائے گی۔ اپنی یقین دہانیوں کے باوجود اُسے مطمئن نہ پا کر گفتگو کا رُخ موڑنے کے لئے میں نے اُسے اپنے پستول دکھائے اور جب اُس نے ان کی صناعی کی تعریف کی تو مَیں نے اُسے ایک تحفۃً پیش کیا۔ وہ اِس پر بہت ممنون ہُوا اور دوبارہ اِس موضوع کو نہ چھیڑا۔

مَیں نے کچھ رسد لی اور قائم خان کا ایک خط بنام سردار پوہرہ لیا جو اُس کا بھائی تھا اور دوپہر دو بجے ہفتوز سے نکلا اور چھ بجے شام سے پہلے پوہرہ پہنچا۔ سڑک اچھی تھی اور گیارہ بارہ میل تک ایک کنکریلے میدان سے گذرتی تھی جس پر کہیں کہیں کھجوروں کے جُھنڈ تھے۔ ساتویں اور نویں میل پر دو بھر پور نالے بھی راستے میں آئے۔

---

[1] مشہد خراسان میں ہے۔ زیارت گاہ ہے جہاں امام موسیٰ علی رضا کا مزار ہے۔ محلِ وقوع کی وجہ سے ایرانیوں اور افغانوں کے درمیان وجہِ مخاصمت بنا رہا۔ تقدّس کی بناء پر مار دھاڑ یا جھاڑے قبضہ نہ ہو سکتا تھا لہٰذا قحط پیدا کر کے مطیع کیا جاتا رہا۔

سردار، شاہ محراب خان ایک مجمع کے ساتھ مسجد کو جا رہا تھا اور اُس نے مجھے بھی نماز میں شرکت کی دعوت دی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ نماز کے بعد خان مہمان خانے کے دروازے کے سامنے ایک پانچ چھ فٹ اونچے منبر پر چڑھا جس پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں اور پھر مجھ سے پوچھا کہ مَیں کہاں سے آیا تھا اور میرا مقصد کیا تھا۔ خداداد ترجمان کی حیثیت سے کھڑا ہُوا اور وہی جواب دُہرایا جو صبح میں نے قائم خان کو دیا تھا اور مزید کہا کہ مجھے ایک رہنما اور کچھ رسد کی ضرورت تھی تاکہ مَیں نرمن شیر کو جا سکوں۔ اب میں نے سفتور سے لایا ہُوا خط خان کو دیا اور اُس نے ایک میرزا (منشی) کو بلا کر اُسے پڑھنے کے لیے کہا۔ سب لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے رہے اور جب وہ قریباً پڑھ چکا تو مَیں ششدر رہ گیا کہ قائم خان نے میری مبینہ حیثیت پر شک کا اظہار کیا تھا، گو میں یہ ضرور کہوں گا کہ اُس نے نیک نیتی سے ایسا کیا تاکہ اُس کا بھائی مجھ میں دلچسپی لے۔

اِس لمحۂ تذبذب و تشکیک میں سب لوگ مجھے دیکھنے لگے اور ایک دس بارہ سال کے بچّے نے کہا۔ اگر یہ خود اپنے آپ کو پیرزادہ نہیں کہتا تو میں قسمیہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ گرانٹ[۲] فرنگی کا بھائی ہے جو پچھلے سال بمپور آیا تھا۔" مَیں نے بچے کی بات سے توجہ ہٹانے کی کوشش

۱۔ ایران کا جنوب مشرقی ضلع، حکومت کرمان کے ماتحت۔

۲۔ بنگال نیٹو انفنٹری کا کیپٹن گرانٹ مرحوم۔ یہ جرأت مند افسر مکران کی بندرگاہ گوادر پر ۱۸۰۹ء میں اُترا، بمپور (پوہرہ سے قریباً سولہ میل کے فاصلے پر) کی بلندی تک اندرونِ ملک سفر کیا، ایک دوسرے راستے سے ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ بندر عباس پہنچا اور پھر سمندر کے راستے بمبئی واپس آیا۔ اُس نے اِس پُرخطر سفر میں نہایت کثیر اور درست معلومات حاصل کیں۔ مجھے پتہ تھا کہ اُس کی سردار بمپور سے بہت دوستی ہو گئی تھی۔ اِسی لئے میں نے اُس کا رشتہ دار ہونے کا دعویٰ بیان کیا۔

کی لیکن میرے چہرے کی گھبراہٹ نے میرا ساتھ نہ دیا اور خان نے نہایت نرمی سے کہا کہ اگر ایسا ہی تھا تو مجھے سچ چھپانے کی ضرورت نہیں کیونکہ کوئی آدمی اس پر معمولی سی رکاوٹ یا توہین کا باعث نہ ہو گا۔ اس یقین دہانی پر میں نے مزید اخفا کو بے سود سمجھا اور تسلیم کر لیا کہ میں ایک یو۔پی کا رہنے والا ہوں اور ایک ہندو کا ملازم، اور اسی کے کاروبار کے سلسلہ میں کرمان جا رہا تھا۔

اس افشائے راز پر میر خداداد کی سراسیمگی اور غیظ و غضب کو بیان کرنے کی کوشش نری حماقت ہو گی جس کی تائید مزید کے لیے میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ میں گرانٹ کا بھائی تو نہ تھا لیکن اس کا قریبی عزیز ضرور رہا تھا۔ اُس نے اسے مجسّم تناقض سمجھا اور کبھی شاہ محراب خان اور کبھی دیہاتیوں سے مخاطب ہو کر وہ تمام طویل نوک جھونک دہرانے لگا جو کلوگن کے بعد ہمارے درمیان ہوتی رہی تھی اور وہ طریقہ بھی جس سے میں اس کے وعظ کی تردید کرتا تھا اور اسے جلی کٹی سناتا تھا اور اس کے داماد مراد خان کی شہادت جو اُس نے میری نیکی کے متعلق دی تھی اور پھر یہ سب کچھ اُس کی رائے میں دلائل و براہین کا ایک سلسلہ تھا جو میرے اقرار کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔ خان اس قصّے پر دل کھول کر ہنسا اور پھر اس غضب آلود مقرر سے کہنے لگا کہ صرف اسی کو دھوکہ نہیں ہوا تھا اور اس میں غالباً وہ اپنے بھائی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ خداداد نے جھڑک کر جواب دیا کہ وہ یہ سمجھتا تھا لیکن اُسے یقین تھا کہ کوئی اور آدمی میرے ساتھ اتنی دیر اور اتنی قریب نہ رہا تھا کہ مجھے پا سکتا۔ میرا ایک شتربان خوب زور سے چلّایا "میں دو ماہ سے اس کے ساتھ ہوں اور گو میں یہ جانتا تھا کہ یہ نہ سیّد[1] ہے نہ پیرزادہ لیکن (خدا مجھے بچائے) میں بھی تمہاری طرح یہ کبھی تصوّر نہ کر سکا کہ یہ فرنگی تھا۔" اب اس کی نفرت نے دوسرا رُخ اختیار کیا اور وہ مراد کو بے پیندے کا لوٹا کہہ کر سراپ دینے لگا جو ایسے گناہگارانہ بہروپ کا ممد و معاون بنا تھا۔ اب اندھیرا ہو چکا تھا اور سلسلۂ کلام خان کے اپنے گھر کی راہ لینے

---

[1] سادات وہ لوگ ہیں جو پیغمبر کی نسل سے ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔

اور میرے مہمان خانے کے ایک کونے میں دبکنے کی وجہ سے بند ہو گیا۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد میں نے دُنبے کے گوشت کا شوربا، گندم کی روٹی اور بوہلی کا پر تکلف کھانا کھایا۔

۱۴ اپریل

ناشتہ کے بعد میں شاہ محراب خان کے لئے تھوڑے سے عمدہ بارود، پستول کی چند گولیوں، جیبی چاقو اور ایک قینچی کا حقیر سا تحفہ لے گیا اور اس سے التجا کی کہ میری روانگی کا جلد بندوبست کر دے اور مجھے تھوڑا سا آٹا دے دے کیونکہ مستونگ میں دیا ہوا قائم خان کا ذخیرۂ آرد ختم ہو رہا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ کل صبح ایک رہنما تیار ہو گا اور اپنے دیوان کو حکم دیا کہ مجھے دس من (قریباً چودہ پاؤنڈ) جوار کا آٹا دیدے کیونکہ گندم کا آٹا دستیاب نہ تھا۔ پھر اس نے مشورہ دیا کہ میں پوہرا سے لسبان سیدھے راستے سے جاؤں اور یوں بمپور نہ جانے سے میرا دو منزل فاصلہ بچ سکتا تھا۔ میں نے اس خیر خواہی پر اس کا شکریہ ادا کیا لیکن اُسے بتایا کہ چونکہ کیپٹن گرانٹ بار بار بمپور کے محراب خان کی دریا دلی کا ذکر کرتا تھا لہٰذا اُسے ملنے کی خاطر میں اسی راستے پر جانا چاہتا تھا۔

خان نے فوراً اسے تسلیم کر لیا اور اسے میری مرضی پہ چھوڑ دیا لیکن حقیقت یہ تھی کہ مجھے ایرانی علاقہ نرمن شیر پہنچنے سے پہلے صحرا کو پار کرنا تھا اور مجھے خوراک کا ذخیرہ اس سے بھی پہلے ختم ہونے کا ڈر تھا لہٰذا میں سردار بمپور کی فیاضی پہ بھروسہ کر رہا تھا۔

اس کے بعد میں مہمان خانہ آ گیا اور باقی دن بیکار شور یلے بلوچوں میں گذرا جو مجھ سے انٹ سنٹ سوال پوچھتے رہے۔ بعد از دوپہر سرحد سے ایک گوسائیں[1] آ گیا اور یوں میری قدرے خلاصی ہوئی کیونکہ میرے آدھے سامعین تازہ ترین احوال کے لئے اس کے

---

[1] گوسائیں ایک قسم کا ہندو فقیر یا یاتری۔

گرد جمع ہو گئے۔ اُس نے بے حد فصاحت اور اثر انگیزی کے ساتھ سُنایا کہ خان جہان خان نے کس طرح سرحد گاؤں کو لُوٹا اور اُجاڑا۔ جب فرصت ملی تو میں نے ہم رہائش سے اُس کی سیر و سیاحت کا پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ ملتان سے چلا اور کشمیر، کابل، قندھار اور سیستان سے ہوتا ہوا اِس نیت سے آیا کہ سونمیانی کے قریب منگلاج کے مندر میں پرارتھنا کر سکے، لیکن اب ارادہ بدل کر ایران کے راستے بحیرہ کیسپئن پر واقع جوالامکھی[1] کو جا رہا تھا۔ چونکہ وہ ایک خوش گفتگو ساتھی معلوم ہوتا تھا اور اپنے فرقہ کے تعصّب و خرافات سے کافی مبرّا تھا لہٰذا میں نے اُسے کرمان تک اپنے ایک اونٹ پر جگہ دینے کی پیش کش کی جو اُس نے فوراً قبول کر لی۔ لیکن اونٹ بیمار ہونے کی وجہ سے وہ صرف بمپور تک جا سکا۔

خان نے نماز مغرب کے بعد مہمان خانے کے باہر منبر پر اپنا روایتی اجتماع کیا جس میں اکثر و بیشتر باشندے حاضر ہوئے اور یوں مجھے مقامی معلومات حاصل کرنے کا بہت اچھا موقع ملا اور میں نے اُس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ رات کے گہرے سائے ہمیں منتشر ہونے کی تنبیہہ کرتے رہے لیکن ہم ایک دوسرے کی صحبت سے اتنے خوش تھے کہ ایک ملّا نے جب تجویز پیش کی کہ کھانے کے بعد پھر مہمان خانہ میں مجلس ہوگی تو سب مرحبا مرحبا پکار اُٹھے۔ خان نے بھی ازراہِ شفقت آنے کا وعدہ کیا اور مہمان خانہ میں آدھی رات کے بعد خُوب چہل پہل رہی۔ خان کی موجودگی سے ہر شخص اپنی حد میں رہا لیکن اُس کی خواہش کے مطابق ہر ایک لطائف و ظرائف سناتا رہا اور کمالات دکھاتا رہا اور وہ خود بھی اِن دونوں میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا۔

---

[1] جوالامکھی کیسپئن پر واقع بادکُو یا باکُو میں ہے۔ یہ وہاں کثرتِ نفت کی وجہ سے ہے۔ دیکھئے کینز کا 'ایرانی سلطنت کا جغرافیائی تذکرہ'۔

مجھے اتفاقیہ پتہ چلا کہ وہ بالکل ان پڑھ ہے کیونکہ جب میں نے اُسے بتایا کہ میں نوشکی کے عیدل خان کے مختلف سرداروں کے نام لکھے ہوئے خطوط لایا تھا جو میں نے ان کے علاقوں سے گذرنے کے باوجود انہیں نہ دیئے تو اُس نے انہیں دیکھنے کی خواہش کی لیکن جب میں نے پتے پڑھنے شروع کئے تو وہ حیران ہو کر مجھ سے پوچھنے لگا کہ کیا میں ایک ملا یعنی خواندہ شخص تھا؟ میں نے جواب دیا کہ میں اپنی زبان تو اچھی خاصی جانتا تھا لیکن قدرے فارسی اور ہندی بھی سمجھتا تھا۔ اس پر اُس نے انگریزی اور فارسی تحریر کا فرق سمجھانے کے لئے کہا اور جب میں الفاظ سے اُسے نہ سمجھا سکا تو اُس نے قلم، دوات اور کاغذ منگوائے اور فقروں کا ایک لمبا صفحہ لکھوا دیا اور آخر میں اپنا نام مع القاب درج کروا دیا۔ اس نے درخواست کی کہ میں بھی اپنا نام، پیشہ، اس کے صدر مقام میں آمد کا سن عیسوی اور اچھا یا بُرا سلوک جو مجھ سے ہوا سب کچھ لکھ دوں۔ پھر اس نے وہ کاغذ اپنے میرزا (منشی) کو سنبھالنے کے لئے دیا تاکہ جب کوئی اور فرنگی آئے تو اس سے اس کا معنی پوچھا جائے اور میرے مزاج کا بھی پتہ چلایا جائے۔ میں نے محسوس کیا میری غلط نمائی کے باوجود وہ میری توقعات سے کہیں زیادہ مجھ پر شفیق تھا لہذا میں نے اپنے جذبات کا مخلصانہ اظہار کر دیا۔

میں نے آج شام کے واقعات پر کچھ زیادہ ہی لکھ دیا ہے جس کے شاید وہ بادی النظر میں مستحق نہ ہوں، لیکن میں نے کئی جگہ ایسی طوالت سے کام لیا ہے کیونکہ میرے خیال میں اکثر زیرِ تبصرہ فرد کے افکار و اطوار پورے قبیلہ کے آئینہ دار ہیں اور وہ میرے بلوچوں کے تجزیہ و نظریہ کا جواز پیش کرتے ہیں۔

یہاں ہم ایک ایسے سردار کو دیکھ رہے ہیں جو آمدنی اور حلقۂ اقتدار کے لحاظ سے اپنے معاصرین پر بھاری ہے۔ وہ اپنے حقیر ترین محکوموں سے ملتا

ہے، اُنہیں آزادانہ اظہارِ رائے کا موقع دیتا ہے خواہ وہ اُسی کے خلاف ہو اور ادب کا اِتنا گھٹیا نظریہ رکھتا ہے کہ لکھ پڑھ بھی نہیں سکتا:

صرف ایشیا میں ہی ایسی بربریت موجود ہے لیکن اس کے اطوار اور نظام ہُوبہُو ویسے ہی ہیں جیسے اُن وحشی اقوام کے تھے جنہوں نے سلطنتِ روما کو پاش پاش کر دیا!!
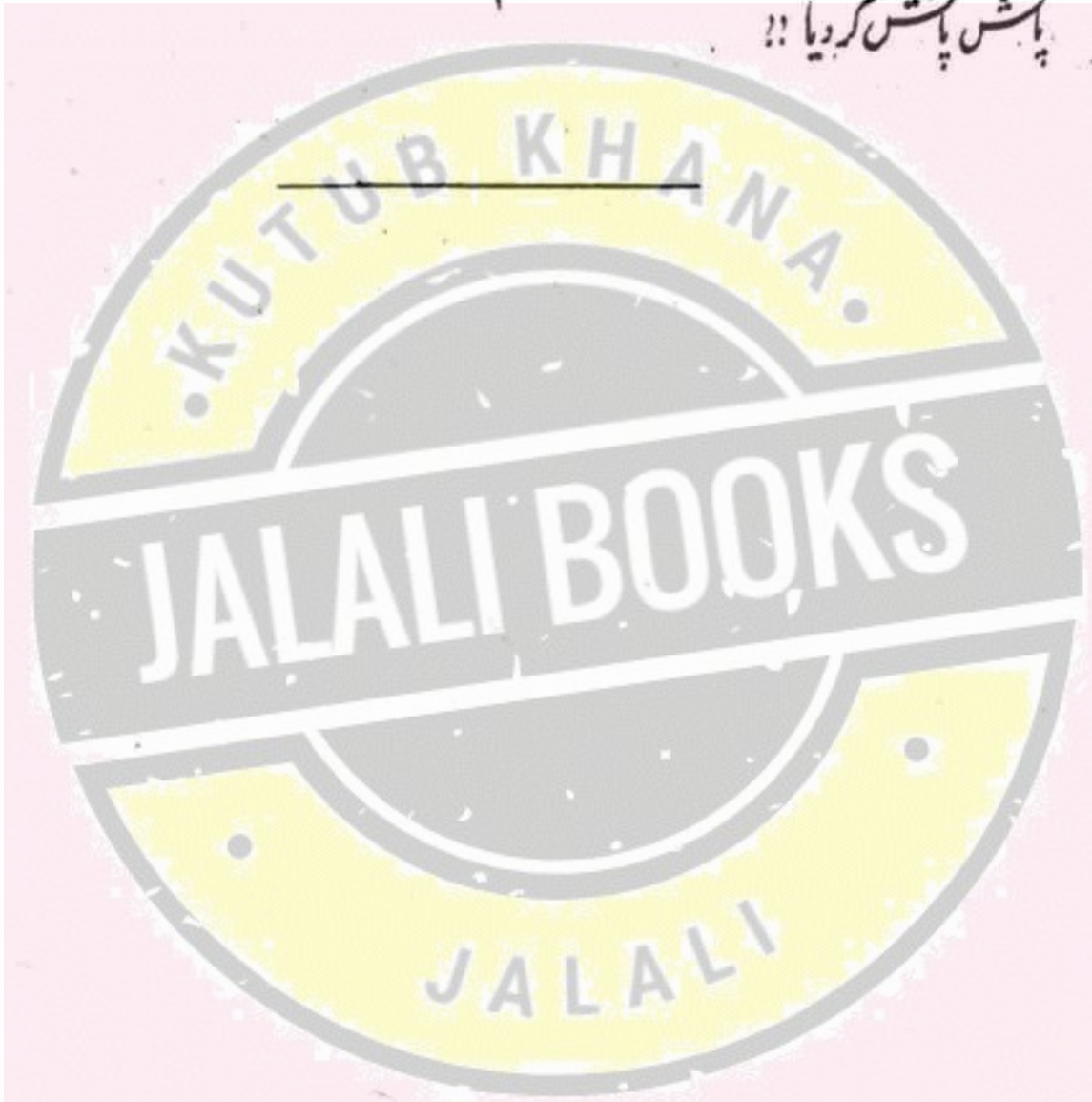
بابؔ دوازدہم

بمپور میں آمد ــ درمیانی علاقہ ــ نالے ــ رہنما اپنے گھر جاتا ہے اور اونٹ بطور تحفہ اُسے دے دیا جاتا ہے ــ ہفتوز اور پوہرہ کے قصبے ــ طول و عرض ــ سردار کا قبیلہ۔ اس کا مختصر تاریخی بیان ــ ابتدا ــ ملیکہ بلوچ ــ قریباً نیست و نابود ــ کس نے کیا۔ اُربابی ــ ان کی عام شکل و شباہت ــ بیان کا تسلسل ــ بمپور میں استقبال ــ سردار اکھڑ اور تندخو۔ اُس کی فولادی چھڑی ــ برطانوی افسر کے احترام کا واقعہ ــ قلیل کھانا ــ سردار کی حرص ــ مصنف کو اُس کا خصوصی مشورہ ــ ایران دشمنی ــ اس پر تبصرہ ــ مصنف کے سوالات ــ دشنام آمیز لیکن دلچسپ جواب ــ اس پر رائے ــ مصنف کی مدد سے انکار ــ اپنے پستول مانگتا ہے۔ انکار ــ کھانا بھیجنا بند کر دیتا ہے ــ گوسائیں اپنے لئے اور مصنف کے آدمیوں کے لئے بھیک مانگتا ہے ــ ایک دوست ــ اس کا مقصد ــ مصنف اپنے پستول چھوڑ دیتا ہے ــ بمپور سے روانگی ــ اس کے کوائف ــ قلعہ کی روایت ــ اس کی طاقت پر رائے زنی ــ بمپور کی آبادی ــ قبیلہ ــ سردار خیل ــ سولہ بیویاں ــ مصنف سب سے چھوٹی کو دیکھتا ہے۔ اس کی وضع قطع ــ مصنف کی قیاس آرائی ــ سردار کی آمدنی ــ بھائی ــ یہاں کی زبان۔ چالیس میل کا سفر ــ گنواں ــ خشک دریائے کسکین ــ مصنف کا آشوب چشم بوجہ دھوپ اور چمک ــ بسمان گاؤں میں آمد ــ استقبال ــ سردار کا مشورہ ــ توجہ۔ ایک روزہ قیام ــ قابل ذکر گرم کنواں ــ اس کا اور اس کے پانی کا بیان ــ آتش فشانی پہاڑیاں۔

روایت ــــ سردار کا تبصرہ ــــ پہاڑی کا نام ــــ ایمونیا اور گندھک کی موجودگی ــــ مصنّف کی بیقراری ــــ سردار سمجھ گیا ــــ رہنما آتا ہے ــــ مصنف پر بے حد مہربانی اور مہمان نوازی ــــ تشکّر ــــ اُس کے رفقاء سردار کا موثر شکریہ ادا کرتے ہیں!

---

۱۵ / اپریل

مَیں آج صبح قریباً دس بجے تک سخت منتظر رہا، حتیٰ کہ ایک آدمی مجھے خان کے گھر بُلانے کے لیے آیا۔ میں خوشی خوشی گیا تو دیکھا کہ خان اپنے میرزا کو دو خطوط لکھوا رہا تھا جو اُس نے مکمل ہونے کے بعد مجھے دے دیئے۔ اِن میں سے ایک سردار بمپور، محراب خان کے نام تھا اور دوسرا سردار لسمان، مراد خان کے نام۔ پھر خان نے رہنما کو سخت ترین احکامات دیئے کہ مجھے بمپور میں لازماً کوئی ثابت قدم آدمی ملے اور وہ خود میری اجازت کے بغیر مجھ سے جُدا نہ ہو۔ مَیں نے ایک دفعہ پھر اظہارِ تشکر کیا اور رُخصت لے کر دوپہر کو اپنے اونٹ پر سوار ہُوا اور قریباً ساڑھے چار بجے بمپور پہنچا۔ میں نے سولہ میل کا فاصلہ جنوب مغرب اور جنوب میں طے کیا جو دو تین کاشتہ قطعات کے سوا ایک جھاڑی دار میدان میں سے گذرا۔ دو مختلف جگہوں پر ہم ایک نالے کے کنارے کے ساتھ ساتھ کچھ عرصہ چلے جو وہی تھا جسے میں نے ہفتوراور رپوہرا کے درمیان عبور کیا تھا اور جو یہاں کی گھریلو اور کاشت کارانہ ضروریات کا کفیل ہے۔

میر خداداد کا غصہ رات کے دوران فرو ہوگیا اور وہ پہرہ سے ایک میل تک ساتھ آیا اور جب ہم جُدا ہونے پر بغل گیر ہوئے تو مَیں نے اُسے اپنے تین میں سے ایک اونٹ بطورِ اعترافِ خدمت دے دیا۔ نوشکی سے چلتے وقت یہ بہت اچھا تھا لیکن سفر کے دوران بہت دُبلا ہوگیا اور اب بارِ گراں بنتا جا رہا تھا۔ لہٰذا جہاں مَیں ایک وبالِ جان سے چھوٹا وہاں خداداد کو ایک دِل پسند تحفہ مِل گیا۔

ہفتوراور رپوہرا کے قصبے چھوٹے ہیں لیکن بہت صاف ستھرے اور خوش ساختہ ہیں۔

ہفتور میں دو سو پچاس اور پوہرا میں چار سو گھر ہیں اور دونوں کھجوروں کے جھنڈ میں واقع ہیں جن سے مالکوں کو کافی آمدنی ہوتی ہے۔ اس طرف شاہ محراب خان بہت طاقت ور سردار ہے۔ اس کا مستقل یا کم از کم ممکن لشکر چھ ہزار پر مشتمل ہے اور دزک سے بسمان تک اسی کا طوطی بولتا ہے۔ اس کا بھائی قائم خان ہفتور میں اس کا نائب ہے اور ایسے ہی نوّے یا سو میل کے حلقے میں دیگر سردار بھی اسی کے نائب ہیں۔ وہ ذاتی طور پر وجیہہ انسان ہے اور اس کا چہرہ مہرا ایک پیدائشی شائستگی اور برتری کا مظہر ہے۔ اس کا قبیلہ ناروئی کی شاخ اربابی ہے جو غیر اہم سمجھا جاتا تھا اور سرحد کے قریب ایک بنجر اور بلند قطعۂ زمین پر گمنامی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ حتیٰ کہ موجودہ خان کے مورث کچھ خدام کے ساتھ دزک آ گئے، جہاں کچھ مکرانی سرداروں کے زمینی عطیات نے ان کے پاؤں جما دیئے۔ لہٰذا شاہ محراب خان کی آبائی جائداد وہاں ہے۔ لیکن سردار بمپور، سید خان کی ایک بیٹی سے شادی کے بعد اس نے ایک فوج جمع کی اور اپنے لشکر کی مدد سے ہفتور اور پوہرا پر قبضہ کر لیا۔ یہاں سے فتوحات کا سلسلہ چل نکلا اور اب تو اس کی سالانہ آمدنی کا تخمینہ ساڑھے چار لاکھ روپے (۵۶،۲۵۰ پاؤنڈ سٹرلنگ) ہے۔

پوہرا، ہفتور، مگسی وغیرہ اور ان کے درمیانی علاقوں کے اصل مالک ملک بلوچ تھے جو اربابیوں کے ساتھ کشمکش میں ملیامیٹ ہو گئے اور جو تھوڑے سے شمشیر عدو سے بچے وہ نرمن شیر بھاگ گئے جہاں ایرانی حکومت نے انہیں ایک علاقہ دے کر تحفظ میں لے لیا۔ اربابی میرے مشاہدہ میں آنے والے بلوچوں میں حسین ترین ہیں اور ان کے چہروں سے ایک خاص عظمت نمایاں ہے جو دوسروں کو نصیب نہیں۔ وہ بلا استثنا طویل القامت اور خوش وضع لوگ ہیں اور بے حد چاق و چوبند ہیں۔ ان کا قزاقانہ کردار (جس پر وہ بہت فخر کرتے ہیں) ان کے کارناموں سے ظاہر ہے اور پہلے بیان کیا جا چکا ہے[1]۔

---

[1]۔ شاہ محراب خان نے خود مجھے فاخرانہ و فاتحانہ انداز میں بتایا کہ وہ حکومت ایران و کابل کا راندۂ قانون تھا۔ شاید یہ اہمیت اس کی نخوت کو شہ دیتی تھی کیونکہ وہ بلوچستان بھر میں جلاوطنی کی واحد مثال کے طور پر مشہور تھا۔

آمدم برسرِ مطلب۔ جونہی مَیں بمبور اُترا مَیں نے محراب خان کو خط بھیجا اور چند ہی لمحات میں ایک ساٹھ سالہ خمیدہ اور تومند بوڑھا انسان آیا جس کے ساتھ چھ یا آٹھ نوکر تھے۔ اگر وہ اکیلا ہوتا تو میں اُسے کبھی سردار نہ سمجھ سکتا کیونکہ وہ ایک بدلباس انسان تھا اور ایک سفید قمیص، نیلی سوتی شلوار اور ایک چھوٹی سی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ لیکن میں سب سے پہلے اُس کے ایک روغن شدہ فولادی عصا سے متاثر ہوا جو اُس کے ہاتھ میں تھا اور تقریباً چار فٹ لمبا اور چار انچ موٹا تھا۔ اُس پر فولاد کے بڑے بڑے چھلّے چڑھے ہوئے تھے جو ایک مستقل اور بلند جھنجھناہٹ پیدا کرتے رہتے تھے۔ قریب آنے پر معلوم ہوا کہ وہ لنگڑا ہونے کی وجہ سے عصا کا سہارا لیتا تھا اور اُس کی جھنجھناہٹ سے خوش ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ بات کرتے وقت بھی وہ ان چھلّوں کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھماتا رہتا تھا اور موٹھ دار سرے ان کو گرنے نہیں دیتے تھے۔

مَیں نے اُسے نہایت ادب سے سلام کیا تو اُس نے اکھڑ آواز میں تین چار دفعہ مجھے خوش آمدید کہا اور مہمان خانہ کے دروازہ پر رکھے ہوئے بنچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جس پر وہ خود بھی بیٹھ گیا تھا۔ میرا رہنما (جو سخت باتونی تھا) بلا استفسار وہ تمام واقعات دُہرانے لگا جو پورا میں ہوئے تھے۔ سردار کیپٹن گرانٹ کے متعلق بہت کچھ پوچھنے لگا جس کی وہ تہہ دل سے تعظیم و تکریم کر رہا تھا۔ ایک واقعہ اُس کے اس مرحوم افسر کے متعلق بلند نظریے کو ظاہر کرے گا۔ جب مجھے وہاں آدھ گھنٹہ ہو گیا تو اُس نے حکم دیا کہ اُس کے اصطبل (جس میں ستر اسی گھوڑے ہیں) کے بہترین گھوڑے (ماسوائے حاملہ گھوڑیوں کے) میرے سامنے یکے بعد دیگرے پیش کیے جائیں۔ اور پھر دو خوبصورت بچھیروں کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگا کہ مَیں انہیں خرید لوں۔ مَیں نے قلتِ زر کی بناء پر انکار کیا تو وہ کہنے لگا۔ "یہ کیسی رکاوٹ ہے؟ ساحلی قصبوں میں جاؤ اور صرف یہ کہو کہ مَیں گرانٹ کو جانتا ہوں (رشتہ دار کہنے کی بھی ضرورت نہیں) اور جتنا چاہو اُدھار لے لو!"
وہ فوراً ہی نمازِ عصر کے لئے چلا گیا اور کوئی ایک گھنٹہ بعد میرے لئے اور میرے تین آدمیوں کے

نے تھوڑا سا کھانا بھجوا دیا۔

۱۶ر اپریل

محراب خان آج طلوعِ آفتاب سے پہلے میری جھونپڑی میں آیا تو میں نے اُسے چند چقماق، عمدہ بارود کا ایک ڈبہ اور ایک چاقو بطورِ تحفہ پیش کئے۔ اس پر اُسے مایوسی ہوئی کیونکہ یہ اُس کی توقعات سے کم تھا اور اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا کہ وہ میری سب چیزیں دیکھے گا۔ مَیں نے اُسے جواباً کہا کہ میں اُس کے ہر حکم کی تعمیل کے لیے تیار تھا لیکن اُسے یاد رکھنا چاہیئے کہ میں تو کسی کے ملازم کی حیثیت سے سفر پر تھا لہٰذا مَیں اُسے صرف یہی کچھ پیش کر سکتا تھا۔ میرے اس بیان کی تصدیق اُس کے ایک رشتہ دار نے بھی کی جس سے میں رات کو گفتگو کر رہا تھا لیکن اس آدمی نے بدقسمتی سے عام پستولوں کا ذکر کر دیا جو فتح محمد اور ایک شتربان اپنی پیٹیوں میں رکھتے تھے۔ خان نے انہیں دکھانے کا حکم دیا اور چند منٹ دیکھنے کے بعد کہا کہ یہ اُن جیسے نہ تھے جیسے اُسے کیپٹن گرانٹ سے ملے تھے۔ مَیں نے اُسے پھر یاد دلایا کہ ہم دونوں میں بُعد المشرقین تھا۔ وہ ایک آزاد سوداگر تھا اور اپنے سرمائے کا مالک، لیکن مَیں تو محض گماشتہ تھا ایک ہندو سوداگر کا۔

اس بات پر اُس نے مداخلت کی اور کہا کہ مَیں ایک بدقماش بُت پرست کے ٹھاٹھ باٹھ کے لئے کیوں اتنے خطرات مول لے رہا تھا؟ اور مَیں نے کیوں یہ جوگ اختیار کر لیا تھا؟ اُس نے مزید کہا۔ "ایسی بے عزت غلامی سے تو ایک بندوق لے کر لڑنا بہتر ہے۔ یہ تو محض ایک مشقت ہے جس میں نہ کوئی نیک نامی ہے نہ سُود مندی۔ میری مانو تو کرمان جانے کے بغیر ہی واپس چلے جاؤ اور اس ہندو بدمعاش اور اُس کے کاروبار پر لات مارو، سپاہی بنو اور رچاؤ یعنی لوٹ مار کرو!" یہ زوردار تقریر (جو مقرر کی شخصیت کی بھرپور مظہر تھی) سُن کر مَیں نے کہا کہ اس کا مشورہ واقعی قابلِ تعریف تھا، لیکن مَیں اس وقت اس پر عمل نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اگر مَیں بخیریت کرمان پہنچ گیا تو مَیں ہندو کی ملازمت اور اس آوارہ گردی کو چھوڑنے کا سوچ رہا تھا۔ میں

وحشی کو میرے سفر جاری رکھنے کی وجہ قائل نہ کر سکی، لیکن مجھے تُلا ہُوا دیکھ کر اُس نے صرف یہ کہا کہ ابھی تو سفر کا مشکل ترین اور خطرناک ترین حصہ باقی تھا۔

جب وہ اپنی خطابت سے تھک گیا تو مجھ سے پوچھنے لگا کہ برطانوی حکومت کی ماہیت کیا ہے؟ اس کا بحری بیڑہ اور لشکر کتنا ہے؟ وہ کن وسائل سے انہیں تنخواہیں اور خوراک دیتی ہے اور انہیں پابند ضبط رکھتی ہے؟ کیا یہ سب مُلک کے اندر ہی فرائض انجام دیتے ہیں یا باہر؟ مَیں نے قابلِ فہم انداز میں اُسے یہ سب کچھ بتایا تو اُس نے پوچھا کہ ہم فرنگی ایرانیوں کو بیخ و بُن سے کیوں نہیں اکھاڑتے جو کافر شیعہ ہیں اور کہا "میں نے کیپٹن گرانٹ اور تم سے یہ سمجھا ہے کہ انگریز حکومت کافی مضبوط ہے اور اگر واقعی ایسا ہے تو اس قابلِ نفرت نسل کو ختم کرنا مشکل نہیں، کیونکہ میں بھی دو سو سوار بھیج کر ان کا ایک پُورا ضلع اجاڑ سکتا ہُوں اور ان کے کتوں کو بھی بھگا کر لا سکتا ہُوں!"

مَیں نے اُسے جواب دیا کہ یہ موضوعات میرے دائرے سے باہر ہیں اور میں کبھی ان پر سوچتا بھی نہیں۔

اب میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ایرانیوں اور بلوچیوں کے عمومی تعلقات کیسے ہیں تاکہ زمین شیر پہنچ کر میں اپنا رویہ انہی کے مطابق ڈھالوں، لہٰذا مَیں نے اُس سے پوچھا کہ آیا اُس کے اور حکومتِ کرمان کے درمیان رابطہ مستقل تھا اور بین الملکی تجارت ہوتی تھی یا نہیں؟ اُس نے ہنستے ہُوئے جواب دیا "رابطہ؟ نہیں، دو سالوں سے بالکل نہیں اور نہ تجدید کی اُمید ہے۔ اب سے چند ماہ پہلے شاہ محراب خان، تمام خان اور مَیں نے اپنا متحدہ لشکر لارستان (ایران کا جنوب مشرقی صوبہ) چپاؤ کے لئے بھیجا اور اسے خوب لُوٹا کہ تین ماہ تک یہ ہمارے قبضہ میں رہا اور جب لشکر واپس آیا تو اونٹوں کے بے حساب ریوڑ، سارا غلہ اور کھجوریں بھی ساتھ لے آیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ انہیں کوئی آمدنی نہ ہو سکی اور حاکم بیناب (لارستان کا صدر مقام) کو غبن کی جواب دہی کے لئے کرمان بلایا گیا اور جب اُس نے شاہزادہ کو اصل حالات بتائے تو اسے حراست سے چھوڑ دیا گیا اور دو ایلچی تہدیدی فرامین دے کر ہمارے پاس بھیجے گئے۔ ہمیں خبر ہو گئی اور ہم

نے بسمان کے سردار مراد خان کو لکھا کہ وہ انہیں اس گاؤں سے آگے بڑھنے سے روک دے پس وہ وہیں رُکے رہے، حتیٰ کہ ہم نے شہزادہ کے لئے خطوط بھجوائے جن میں اُن کا اور اُن کی دھمکیوں کا تمسخر اُڑایا اور اُسے بدنام پاجی کہہ کر پکارا۔" اس جواب کے ساتھ ساتھ ایسی بیہودہ گوئی اور دشنام طرازی کی گئی کہ کوئی سامع بھی ہنسنے سے باز نہ رہ سکتا۔ اور مزا یہ ہے کہ بوڑھا گموسٹ خوب جوش اور تاؤ میں آگیا اور اپنے عصا سے زمین کو اُیسے مسلتا رہا گویا وہ ایرانیوں کی ہڈیوں سے انتقام لے رہا ہو۔ اس کے بعد وہ اپنے مالِ غنیمت کا حصہ شمار کرنے بیٹھ گیا جو اس کے اندازے کے مطابق چھ ہزار روپے کی مالیت کا تھا۔ یہ رقم بظاہر مختصر معلوم ہوتی ہے لیکن اگر یہ یاد رکھا جائے کہ چپاؤ میں تین طاقت ور سرداروں کے لشکر شامل تھے اور چپاؤ کا علاقہ بنجر اور کم آباد تھا اور ہر فرد کو (خانہ زادگان یعنی گھریلو غلاموں کے سوا) اپنے مرتبے اور کارنامے کے مطابق لوٹ کا مال ملا تو یہ مختصر نہیں رہتی۔ اس کی گنائی ہوئی بڑی بڑی چیزیں دونوں اصناف کے غلام، اونٹ، کھجوریں، گندم، قالین، بندوقیں اور دیگر آلات تھے۔ یہ لوگ گھوڑے نہیں پکڑ سکتے کیونکہ معزز باشندے چپاؤ کا پتہ چلتے ہی ان پر سوار ہو کر رفوچکر ہو جاتے ہیں۔

خان جانے لگا تو میں نے اُسے قلتِ رسد کی تکلیف کا بتایا اور مدد مانگی، جس پر اُس نے رُوکھا اور وحشیانہ جواب دیا کہ رسد ساتھ لے جانے کے لئے دیا تو ایک طرف وہ تو شاید ہمیں بمپور کے قیام کے دوران کھانا بھی ٹھیک طرح نہ کھلا سکتا تھا۔ میں نے جواباً کہا کہ ہمارے ایک دو روز قیام پر جتنی خوراک صرف ہوگی وہ مجھے صرف وہی دے تو میں اسی لمحہ بسمان روانہ ہو جاؤں گا لیکن اس نے سُنی اَن سُنی کر دی اور کوئی ایک گھنٹہ بعد وہ پستول مانگ بھیجے۔ پہلے تو میں نے اس بلا جواز مطالبے کو ٹھکرا دیا اور نوکر کو حکم دیا کہ وہ اپنے آقا سے کہہ دے کہ راستہ خطرناک تھا اور میرے پاس یہی واحد ذریعۂ دفاع تھے لیکن اس کا اس وحشی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بالآخر فتح محمد کے کہنے پر میں نے ایک بھجوا دیا، لیکن اُس نے

فوراً ہی سلام دے کر یہ واپس کر دیا اور کہلوایا کہ وہ دونوں لے گا یا کوئی بھی نہیں ۔ یوں معاملہ سارا دن معلق رہا ۔ دراصل میں اس کا فائدہ جاننے کے لئے توقف کر تا رہا ۔ شام کو کھانا نہ آیا جو صریحاً آداب مہمان نوازی سے خسیسانہ غفلت تھی ۔ میں نے اسے پیرِ تسمہ پاکی ہٹ یا اپنی بدسلوکی کا پیش خیمہ سمجھا اور بھوکا اور نڈھال لیٹ گیا ۔ لیکن پو ہر اسے ساتھ آنے والا گوسائیں (جو میرے کھانے کا حصہ دار تھا) یوں چپکا نہ رہ سکتا تھا اور مانگنے کے لئے نکل گیا ۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد وہ اپنا کشکول پارہ ہائے نان اور خرما سے بھر کر لے آیا اور ہم سب نے خوب مزے کا کھانا کھایا ۔

۷ اراپریل

روشنی ہونے سے پہلے آج صبح ایک آدمی انتہائی رازدارانہ طور پر ملنے آیا اور گرانٹ کے ساتھ گہری وابستگی کے حوالے سے کہنے لگا کہ اگر میں نے دونوں پستول نہ دیئے تو خان نہ مجھے رہنما دے گا اور نہ یہاں سے جانے دے گا ۔ میں یوں مجبور کیے جانے پر سخت برگشتہ خاطر ہوا اور اپنے مخبر اور نام نہاد خیر خواہ کو ایک معمولی معاوضہ کے بدلے لسمان تک رہنمائی کے لئے کہا لیکن اس نے راستے سے لاعلمی کا اظہار کیا اور مزید کہا کہ اس سے تو جلاوطنی بہتر ہوگی کیونکہ وہ دوبارہ کبھی بمپور یا اس کے آس پاس بھی نہ آ سکے گا ۔ لہٰذا اس سے ایسی قربانی کی توقع رکھنا عبث تھا ۔ بعد میں غور کیا تو سمجھ آیا کہ اسے محراب خان نے خود ہی یہ خبر پہنچانے کے لئے مامور کیا تھا ۔ اب میرے لئے ایک ہی چارہ کار تھا ، چنانچہ میں نے دونوں پستول بھیج دیئے اور رہنما کے لئے درخواست کی ۔ آدھ گھنٹہ بھی نہ گذرا تھا کہ رہنما آ گیا اور محض رسماً سردار لسمان کے نام خط لے کر میں بمپور سے روانہ ہو گیا ۔ ہم نے ایک عریاں ، سنگلاخ اور بے آب و گیاہ میدان پر شمال ، شمال مغرب کی سمت میں سفر کیا اور غروب آفتاب پر رکے ۔

بمپور کا گاؤں چھوٹا اور بے ڈھب ہے ۔ کبھی وقت اس کے گرد ایک کچی فصیل تھی جس پر برج بھی تھے لیکن اب وہ گر چکی ہے اور چونکہ یہاں نہ کھجوروں کے درخت ہیں نہ اس کے

آس پاس آثارِ زراعت، لہٰذا یہ ویرانی و عُسرت کا منظر پیش کرتا ہے۔ سردار کا گھر یا قلعہ ایک غیر معمولی ڈھیری کی چوٹی پر ہے جس کے متعلق روایت یہ ہے کہ ایک گرلشکر یہاں سے گذرا تو سپہ سالار نے حکم دیا کہ پہاڑوں سے نکلتے وقت توبرے مٹی سے بھر لیں۔ چونکہ وہ لاتعداد تھے، لہٰذا جب انہوں نے ان توبروں کو اس جگہ خالی کیا تو یہ پہاڑی بن گئی۔ بمپور چھوڑنے سے پہلے میں نے آخری کام یہ کیا کہ خط لینے کے لئے اس کی چوٹی پر گیا۔ یہ کم از کم ایک سو گز اونچی ہوگی اور زمین پر اس کا محیط آٹھ سو گز ہوگا۔ تم ایک دس بارہ گز لمبی پست محراب سے اس میں داخل ہوتے ہو اور پھر ایک کھُردرے نیلے پتھر کی سیڑھی سے اوپر چڑھتے ہو۔ چڑھائی کا پہلا مرحلہ حیران کن طور پر گہرا ہے اور پیچھے کی طرف مُڑتا ہے تاکہ پہاڑی نظر آسکے، لیکن دیگر مرحلے ڈھیری کے اندر چار پانچ فٹ گہرے ہیں اور اوپر سے کھلے ہوئے ہیں۔ یہ کونوں سے ایک دوسرے کی طرف جاتے ہیں اور میرے خیال میں یہ قلعہ اتنا مضبوط ہے کہ کسی بھی ایرانی فوج کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ اگر یہ ڈھیری واقعی مصنوعی ہے تو یقیناً بہت محنت سے بنی ہے کیونکہ یہ پہاڑوں سے چودہ میل دور ہے اور اس کے پاس کوئی گڑھا یا گھاٹی بھی نہیں ہے جہاں سے اتنی مٹی لائی جاسکتی۔ قریباً وسط میں بہت عمدہ پانی کا کنواں ہے جس کے متعلق مقامی لوگ یقین سے کہتے ہیں کہ یہ ایک فرسخ (یا فرسنگ: ۲ء۳ میل) گہرا ہے۔

اہلِ بمپور رخشانی بلوچ ہیں جو نار مردیوں میں بڑا قبیلہ ہے، گو دولت اور تعداد کے لحاظ سے نمبر اوّل نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنے ہمسایوں نار مردیوں کی نسبت زیادہ مضبوط اور سیاہ فام ہیں۔ ان کے باہمی تعلقات دوستانہ ہیں اور دونوں قبیلوں کے سردار دوطرفہ شادیوں سے مربوط ہیں۔ بمپور کے محراب خان کی سولہ بیویاں ہیں جن میں سے آخری اس وقت موجود تھی جب میں سردار کی تعظیم کے لئے قلعہ میں گیا۔ وہ ایک نوخیز لڑکی تھی، نہایت سفید فام تھی لیکن خدوخال میں واجبی ہی تھی۔ بعد میں مجھے اپنے رہنما (جو خان کا عمزاد تھا) سے معلوم ہوا کہ وہ ایرانی النسل تھی اس نے اُسے میرے دیکھنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی اور کہا کہ وہ کیپٹن گرانٹ اور

مجھ سے سُن چکا تھا کہ ہماری رسمیں مختلف تھیں اور ان سے آگاہی نے اُس رونمائی پر آمادہ کر لیا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ خاتون کا جبلّی تجسّس اُسے میرے سامنے لے آیا اور یُوں مَیں اُسے دیکھ سکا۔

سردار بمپور کی آمدنی اجارہ سے آتی ہے اور اس موسم میں اسے ۲۶،۰۰۰ روپے، ۱۴۰ اونٹ، ۱۴۰ نبادیق، ۱۴۰۰ بھیڑیں یا بکریاں اور گندم اور کھجوروں کے ایک سو چالیس، ایک سو چالیس وزن ملے جبکہ ہر وزن ایک سو چھ پاؤنڈ کے برابر تھا۔ اُس کے علاقے کی وسعت اور حدود اربعہ حصّہ دوم میں آئے گا۔ اُس کے کئی چھوٹے بھائی ہیں لیکن وہ قلعہ میں نہیں آسکتے، نہ ہی دیگر رعایا سے خوشحال ہیں۔ بمپور کی زبان فارسی اور بلوچیکی کا ملغوبہ ہے۔

۱۸ اپریل

آج میں ایک بنجر ہموار علاقے میں چالیس میل سے زیادہ چلا اور صرف ایک جگہ، خشک دریائے کین کے پاٹ میں پانی کا ایک کنواں ملا جو ہمارے پڑاؤ سے چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ پانی وافر اور اچھا نہ تھا۔ کنواں بمپور سے قریباً بائیس میل ہے اور اس کے عین شمال میں ہے پوہرہ میں میری آنکھ میں دھوپ اور چمک کی وجہ سے سوزش ہو گئی تھی جو آج میری دوسری آنکھ کو بھی متاثر کر گئی اور بینائی اتنی کمزور ہو گئی کہ میں اپنے سامنے پانچ گز سے زیادہ فاصلے پر نہ دیکھ سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے آنکھوں کو دھوپ اور حدّت سے بچانے کے لئے انہیں ڈھانپے رکھا اور چہرے کو بچانے کے لئے پگڑی کے گرد ایک پرانا کالا ریشمی رومال باندھے رکھا، جس کی وجہ سے میں مزید مشاہدات نہ کر سکا۔

۱۹ اپریل

چار میل شمال مغرب کی طرف چل کر مَیں سات بجے لسمان پہنچا جو عین پہاڑوں کی آغوش میں کھجوروں کے جھنڈ میں واقع ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ مَیں گاؤں سے کوئی سو گز دور چند بہت عمدہ اور پھیلے ہُوئے اخروٹ کے درختوں کے سائے میں ٹھہرا اور میرا رہنما سردار مراد خان

کو مطلع کرنے کے لئے گیا اور اسی کی معیت میں واپس آیا۔ مَیں نے بُہرہ کے شاہ محراب خان اور بمپور کے محراب خان کے خطوط دیئے اور کہا کہ مَیں جلد از جلد زمن شیر پہنچنا چاہتا تھا، لہٰذا ایک رہنما کا فوری بندوبست ضروری تھا۔ وہ ابھی خط پڑھ رہا تھا کہ اُس کے غلام قالین لائے اور بچھا دیئے۔ جب ہم بیٹھ گئے تو اُس نے نہایت نرم اور ترغیب انگیز انداز میں وہی بات دہرائی جو بمپور کے سردار نے تنبیہاً کہی تھی، یعنی یہ کہ سڑک خطرناک تھی اور کوئی آدمی کئی ماہ سے دشت پار کرکے زمن شیر نہ گیا تھا اور اگر گنجائش تھی تو اُس کا مخلصانہ مشورہ یہ تھا کہ مَیں آگے جانے کا ارادہ ترک کر دوں۔ مَیں نے معذوری ظاہر کی تو وہ تھوڑی سی گفتگو کے بعد چونک اٹھا اور کہنے لگا۔ "مَیں انتظام کرلوں گا، لیکن مَیں کیسا غافل ہُوں کہ تمہاری ضروریات کا احساس کئے بغیر یہاں براجمان ہُوں۔ تم بھُوکے ہوگے۔" کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ایک زندہ بھیڑ آگئی اور سبز باجرے (جسے آگ پر گرم کرکے چھلکا اتارتے ہیں اور پھر اُسے کھُردرے کپڑے میں خوب ملتے ہیں) کی کھچڑی کا ایک بڑا پیالہ بمعہ لسّی پہنچ گیا۔ یہ ملغوبہ خوش ذائقہ نہیں ہوتا لیکن یہ ان کی من بھاتی خوراک نہیں ہے بلکہ ضرورتاً اور فاقہ کشی سے بچنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے اور یہاں قیام کے دوران مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ لوگ شہتوت کے پتوں اور ایک قسم کی گُودے دار تیز ابی گھاس کو اُبال کر کھا جاتے ہیں حالانکہ یہ گھاس صرف اونٹوں کا من پسند کھاجا ہے اور اسی لئے بلوچ اسے 'اُچ خور' کہتے ہیں۔ میرے شتربانوں نے فوراً بھیڑ ذبح کی اور بد ذائقہ کھچڑی کے باوجود ہم نے ایک پُرتکلف کھانا کھایا۔ شام کو مراد خان آیا اور کھانے کے وقت تک گپ شپ کرتا رہا۔ ہمیں دوبارہ باجرے اور دُنبے کے گوشت کا کھانا ملا

۲۰ر اپریل

میرا رہنما تیار نہ تھا لہٰذا سردار کی درخواست پر مَیں آج بسمان ہی ٹھہرا اور کوئی بارہ بجے گرم کنوئیں کی طرف ٹہلتا ٹہلتا گیا جس کا ذکر مَیں نے بُہرہ میں اور یہاں بھی بطور ایک عجوبہ سُنا تھا۔

کنوّاں محیط میں بارہ گز سے زیادہ تھا اور دو تین فٹ گہرا تھا۔ وسط میں ایک مدوّر پائپ تھا جو قریباً آٹھ انچ قطر کی سُرخ پختہ اینٹوں سے بنایا گیا تھا اور اُس کے اندر سے اُبلتا ہُوا پانی نکلتا تھا جو انسان کی ران جتنا جسیم تھا اور اتنے زور اور حدت سے نکلتا تھا کہ مَیں اپنا ہاتھ اُس میں ڈالنے کی جرأت نہ کر سکا۔ کنوئیں کی ایک طرف پانی کے مُسلسل بہنے سے بتدریج فرسودہ ہو گئی تھی اور اُس میں سے بہتا ہُوا ایک شفاف چشمہ گاؤں کے پاس سے گزرتا ہے جسے کاشت کار آب پاشی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مَیں اُس کے منبع سے پانچ گز کے فاصلے پر اس میں نہایا اور پانی کو خوشگوار حد تک گرم پایا۔ گو اُس میں گندھک کا تیز ذائقہ تھا اور اسی کی بُو رچی ہوئی تھی۔ اسی لئے یہ کھانے پکانے کے کام نہیں آسکتا لیکن بلوچ اسے تاثیر میں مسہل سمجھتے ہیں اور جلدی امراض میں بہترین بلکہ تیر بہدف دوا بتاتے ہیں۔

گاؤں واپس آیا تو مراد خان نے کوئی پندرہ میل دُور ایک پہاڑ کی طرف اشارہ کر کے یہ بتایا کہ وہاں چٹانوں کی مختلف دراڑوں سے پانی رِستا ہے جو اتنا گرم ہوتا ہے کہ آپ چند منٹ میں گوشت اُبال سکتے ہیں اور وہ خود اور بہت سے دوسرے یہ سمجھتے ہیں کہ جو چشمہ مَیں دیکھنے گیا تھا وہ ایک زمین دوز نالی سے اُس پہاڑی سے مربوط ہے اور اِس قیاس آرائی کو اس سے تقویت ملتی ہے کہ اِن دونو کے درمیانی علاقہ میں کئی جگہوں پر بالکل اسی شکل اور نوعیت کے خشت پارے بلکہ پوری کی پوری اینٹیں بھی ملی ہیں جیسی میں نے کنوئیں کی تعمیر میں دیکھی تھیں۔ مَیں نے اُس سے پوچھا کہ آخر وہ کون ہوسکتا تھا جس نے بے پناہ خرچ سے اتنی طویل نالی ایسے مشکل پہاڑی اور میدانی علاقے میں بنوائی تھی؟ اُس نے جواباً بتایا کہ کچھ لوگ اسے جنّات وغیرہ سے منسوب کرتے ہیں، لیکن قبائلی روایت یہ ہے کہ کسی وقت موجودہ بسمان کی جگہ یا اُس کے قریب ایک گبر شہر تھا جس کے باشندوں نے نہانے دھونے کے لئے یہ نالی بنائی تھی۔

اُس نے مزید کہا۔" لیکن یہ سب کچھ مشتبہ ہے اور ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ ہم بلوچ اپنے آپ کو ان خیالات اور تحقیقات سے پریشان نہیں کرتے ہم اسی پر قانع ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے اِسے جس حال میں دیکھا، اسی میں ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔"

سردار نے جس پہاڑ کی طرف اشارہ کیا وہ یہاں کوہِ نوشادر (سل ایمونیک) کہلاتا ہے، کیونکہ نوشادر یہاں چٹانوں کے شگافوں میں وافر ملتا ہے۔ مَیں خود تو اُس کا نمونہ نہ دیکھ سکا لیکن مراد خان نے یقین دلایا کہ یہ یعنی نوشادر اور کبریت (گندھک) کی پپڑی یہاں کثرت سے جمع کی جا سکتی تھی اور اگر میں اگلے دن بھی ٹھہرتا تو وہ یقیناً کسی آدمی کے ذریعے دونوں کے نمونے منگوا دیتا۔ اُس نے بتایا کہ وہ نوشادر کے استعمال سے ناواقف تھے لیکن یہ بات تجربہ میں آئی تھی کہ گندھک کو پیس لیا جائے تو وہ بارود کا اہم ترین عنصر بنتی ہے۔

آگے بڑھنے کے لئے میری بے قراری اتنی زیادہ تھی کہ سردار نے بھی اسے محسوس کیا اور وہ کوئی پانچ بجے شام رہنما کو میرے پاس لایا جو صبح روانگی کے لئے تیار تھا۔ جب مَیں مراد خان سے بغلگیر ہُوا اور رات کو اُسے خدا حافظ کہا تو مجھے سخت کوفت ہوئی کہ میرے پاس اُس کی فراواں اور ناقابلِ فراموش دوستی اور مہمان نوازی کے بدلے دینے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ مہمان نوازی تو اُس پر ختم تھی اور گرم جوشی اتنی تھی کہ نوشکی اور شیراز کے درمیان وہ واحد انسان تھا جسے مجھ سے دلی ہمدردی تھی اور جو میری فلاح و بہبود میں واقعی دلچسپی لیتا تھا۔

اِس میں شک نہیں کہ شاہ محراب خان اور دوسرے بھی مجھ پر اتنے ہی مہربان نہ تھے جتنا کہ میرا حق تھا لیکن مراد خان کا انداز اُس کے کردار سے بھی دلکش تھا جس سے یہ دو وحشی شتربان بھی اتنے متاثر ہوئے کہ اُس کے رخصت ہونے پر

یہ کہے بغیر نہ رہ سکے۔ "مراد خان! ہم تمہیں نہیں بھولیں گے۔ خدا تمہاری مُرادیں بر لائے اور تمہارے خزانے بھرے رہیں۔ تمہارے پاس زیادہ نہیں، لیکن جو کچھ ہے وہ تم کشادہ دستی اور خندہ رُوئی سے دوسروں کو دیتے ہو[1]!"

---
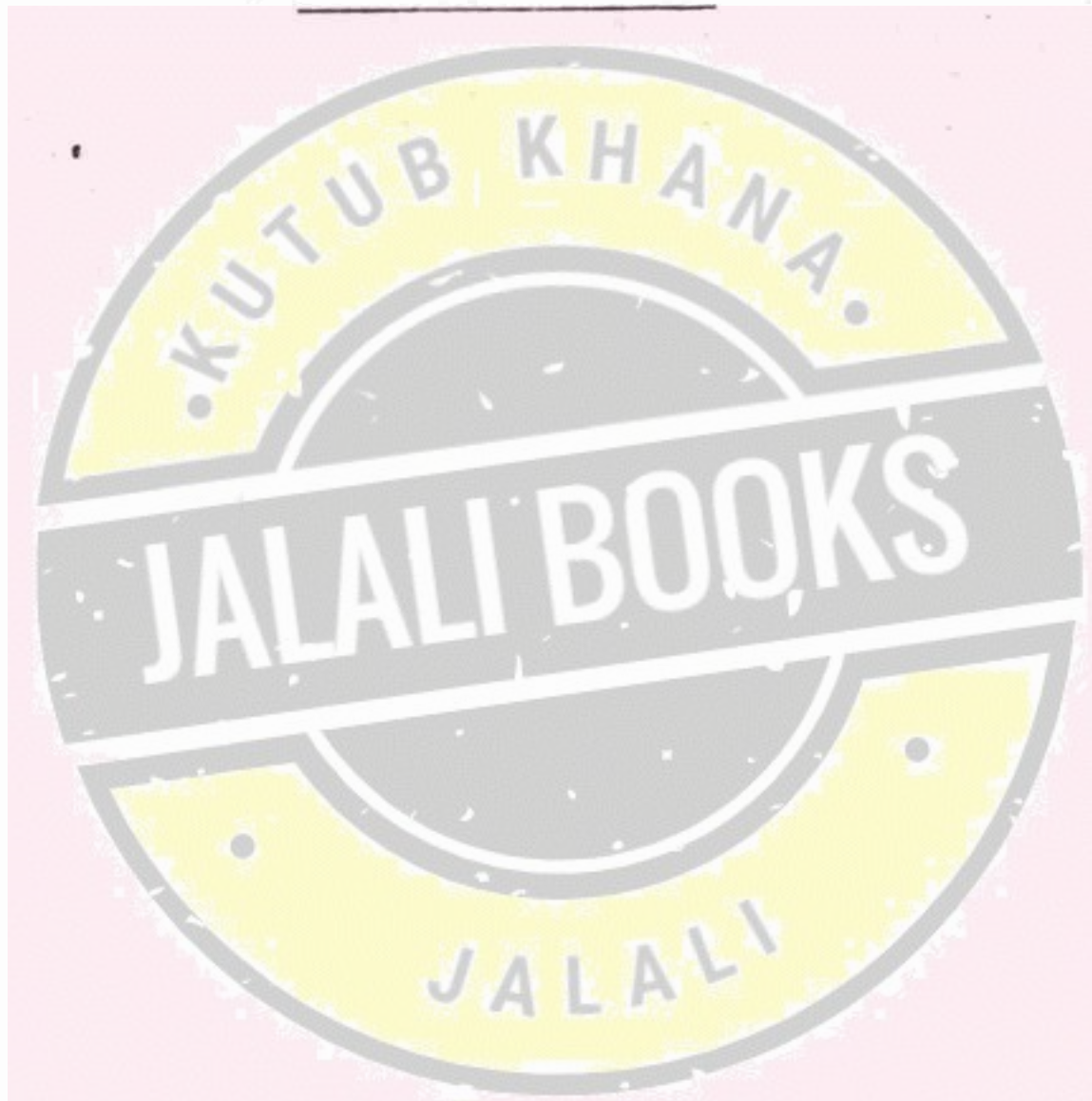
[1] مجھے اپنے براہوئیوں کا یہ اظہارِ تشکر خاص طور پر اس کی صنعتِ ایہام کی وجہ سے یاد ہے۔ فارسی دان ہی مراد خان اور مرادِ خانی (نیک خواہشات) سے لُطف اٹھا سکتے ہیں۔ مراد بمعنی خواہش اور خانی بمعنی نیک جسے بلوچ خان بمعنی معزز سے اخذ کرتے ہیں۔

باب سیزدہم

بسمان سے روانگی ــــ مصنّف رہنما کو فارغ کرتا ہے ــــ مقصد ــــ دوسرا رہنما ــ راستہ ــ علاقے کی نوعیت ــــ بسمان گاؤں ــــ بلوچستان کا آخری ــــ اس کا بیان ــ طرزِ تعمیر ــــ سردار ــــ قبیلہ ــــ آمدنی ــ عادات و اطوار ــــ زبان ــــ مشاغل ــــ ویران راستہ ــ انتہائی گرمی ــــ مصنّف اور اس کے ساتھیوں کی تکلیف بوجہ پیاس ــ نظریات ــــ سراب کی وجہ سے مزید محسوسات ــ اس کی مفروضہ وجہ ــــ ایک پہاڑی پر اس کا خلافِ معمول ظہور ــــ رات کا سفر ــــ گیہگان ــــ نمک ــ صوبہ نرمن شیر کے ریگان میں آمد ــــ درمیانی علاقہ مختلف السطح ــــ شدید گرمی کا دوسرا دن ــ برف پوش پہاڑ ــــ ان کا اثر ــــ ریگان میں استقبال ــــ خطرہ ــــ سردار ــــ خوش مزاج ــ ایک دن کا قیام ــــ ریگان ــــ اس کا بیان ــ لوگوں کے حفاظتی اقدامات ــــ سردار ــ اس کا خاندان ــــ جرید بازی اور اس کا طریقہ ــ

۲۱/اپریل

پانی سے مشکیں بھر کر میں طلوعِ آفتاب پر بسمان سے روانہ ہوا اور چند میل کے بعد رہنما کو ایک روپیہ دے کر فارغ کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ میں فرنگی کے لقب سے چھٹکارا حاصل کروں کیونکہ یہ سفر کے لیے فال بد تھا اور مجھے ہر قسم کے دھوکے اور استحصال کے

دائرے میں رکھنے کے علاوہ مجھے ناخوشگوار اور ناگزیر طور پر ہر قریہ و قصبہ کے لئے ایک نمائشی کھلونا بنا دیا تھا۔ میں نے اسے بلوچستان یا کم از کم اس کے آباد حصے سے نکلتے ہی چھوڑنے کا سوچا تھا اور آج کا سفر شروع ہوتے ہی میں یہ جان کر مضطرب تھا کہ میرے رہنما نے لسانی نہ ہونے کے باوجود میری قومیت کا خاص طور پر پتہ کیا تھا جس کا وہ پورے زمن شیر میں ڈنکا بجاتا۔ میرے شتربانوں نے پہلے تو ضد کی کہ وہ بھی رہنما کے ساتھ واپس چلے جائیں گے کیونکہ اس کے بغیر وہ صحرا میں کھو جائیں گے، لیکن میں نے انہیں اس اقدام کا قائل کر لیا اور یہ کہہ کر ان کے خدشات دور کر دیئے کہ ہم کچھ نہ کچھ چرواہوں سے ملیں گے جن میں سے کسی کو رہنما بنا لیں گے۔ لیکن اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہوا تو بھی مجھے اپنی سمت شناسی پر پورا بھروسہ تھا کہ ہم صحیح راستے پر رہیں گے۔

ابھی ایک ہی گھنٹہ گذرا تھا کہ میرے ایک آدمی نے پہاڑی پر ایک بلوچ کو دیکھا۔ اُسے بلایا اور وہ محتاط انداز میں ہمارے قریب آیا تو میں نے اُسے معقول معاوضے پر زمن شیر کے پہلے قصبہ ریگان تک رہنمائی کے لئے کہا۔ وہ پس و پیش کر تا رہا اور شاید یہ تجویز رد کر دیتا لیکن میرے ایک شتربان نے پوری حاضر دماغی سے کام لے کر اپنے آپ کو اور ساتھی کو بموری بناتے ہوئے اس سے کہا کہ میں ایک سید زائر تھا اور اُسے خوب معاوضہ دوں گا اور پھر گویا اس پورے جھوٹ کو راسخ کرنے کے لئے کہا کہ وہ ابھی کے ساتھ واپس آ جائے گا۔ تھوڑی سی مزید گفت گو کے بعد اُس نے مجھے ذرا توقف کے لئے کہا تا کہ وہ اپنے گدان سے ہو آئے۔ مجھے یہ بات پسند نہ آئی کیونکہ اس میں وقت کا زیاں تھا اور پھر اس کی نیّت خراب بھی ہو سکتی تھی اور وہ آٹھ دس مشٹنڈے لا کر ہمیں لُوٹ بھی سکتا تھا۔ یہ اصل میں اس چرواہے کے بارے میں میرا اپنا سُوءِ ظن تھا (اور مجھے اس کا اعتراف ہے) کیونکہ وہ فوراً ہی واپس آ گیا۔ وہ اپنے آپ کو بکسر بدل لایا تھا کیونکہ اس نے چیتھڑے پہن لئے تھے اور وہ اپنی تفنگ بھی چھوڑ آیا تھا جس کا اس نے بعد میں اعتراف کیا اور کہا کہ اس لئے چھوڑ آیا تھا

کہ ہمارے لُٹنے کا ڈر تھا۔ بہرحال اُس کے آنے پر ہم فوراً سوار ہوئے اور میرے اندازے کے مطابق ہم لسمان سے شمال، شمال مغرب میں چالیس میل سے زیادہ چلے اور گیارہ بجے رات پڑاؤ کیا۔ اِس سفر میں ساتویں میل پر سیہی چٹان میں ایک چھوٹے سوراخ سے پانی ملا لیکن لوہے سے آمیزش کی وجہ سے یہ پینے کے لائق نہ تھا۔ پورا علاقہ بنجر اور پہاڑی تھا اور آخری چھ میل ایک ویسا ہی بے آب وگیاہ لیکن سنگلاخ میدان تھا۔

میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ لسمان بلوچستان کی آخری آباد جگہ تھی اور میرا خیال ہے کہ آج کے سفر کے اختتام پر ہم اس ملک سے باہر نکل آئے۔ بلوچ اِس کے کچھ مغرب کی طرف بھی ہیں لیکن وہ یہاں کے اصلی باشندے نہیں ہیں اور چند سال پہلے آباد ہوئے ہیں۔ لہٰذا آئندہ اپنی تدریجی روداد سفر میں مَیں ایران کے جغرافیائی اور شماریاتی کوائف دوں گا، جو میرے اپنے مشاہدے اور مقامی روایات پر مبنی ہوں گے کیونکہ میں کتاب کے حصّہ دوم میں ایران اور اِس کی موجودہ سلطنت کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا۔

لسمان کا مختصر سا تذکرہ کافی ہوگا۔ اس میں کوئی ڈیڑھ سو گھر ہیں جن میں سے بعض دو منزلہ اور سہ منزلہ ہیں۔ یہ سیمنٹ یا گارے کے بغیر پتھروں سے بنائے گئے ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے اِس طرح پیوستہ اور باہم درآمیختہ ہیں کہ بارش سے بچ جاتے ہیں اور ان کے اندر مٹی کی لپائی ہے اور ان سب کے گرد مٹی اور پتھروں کی فصیل ہے۔ سردار مراد خان کرد بلوچ ہے جو شمال مشرقی پہاڑوں کا قبیلہ ہے۔ اُس نے کوئی دو سال قبل محراب خان بمپوری کی ایک بیٹی سے شادی کی اور سرداری لسمان جہیز میں پائی۔ اُس کے پاس پچاس کے قریب سپاہی ہیں اور گذر اوقات کے لئے محدود سی آمدنی ہے۔ وہ نرم خُو ہے اور اُس کے چہرے مُہرے اور نشست برخاست سے ایرانی نفاست و ثقافت جھلکتی ہے۔ یہ پہلی جگہ ہے جہاں فارسی بول چال کی زبان ہے۔ لسمانی عموماً اُربابیوں یا رخشانیوں کی طرح نہ بہن شانہ ہیں نہ طویل۔ ان کے آلات و مشاغل اُنہی جیسے ہیں۔

۲۲ر اپریل

چھ بجے صبح سے چھ بجے شام تک مَیں نے ایک بے آب و گیاہ میدان میں اکتیس میل سفر کیا۔ صرف کہیں کہیں خشک آبی گذرگاہوں میں مجھے تغز (ٹمرسس) کی محروم نمو جھاڑیاں یا شینز یا شترخار کے ڈنٹھل نظر آئے۔ کل دائے سلسلۂ کوہ کا ایک مغربی بازو اب مجھ سے پانچ چھ میل جنوب میں رہ گیا تھا لیکن کہیں کہیں وہ بڑھ کر سڑک کے قریب آجاتا تھا۔ ہندوستان چھوڑنے کے بعد اب سب سے زیادہ اور سخت گرمی محسوس ہو رہی تھی اور مَیں اور میرے آدمی قلّتِ آب سے سخت پریشان تھے اور مجھے ڈر تھا کہ بسمان کے تھوڑے سے بچے ہوئے پانی کا خفیہ خزانہ بھی ختم نہ ہو جائے۔ سراب (سُہر + آب = صحرا + پانی یعنی آبِ صحرا) ہمارے چاروں طرف لہریں لے رہا تھا، گویا ہماری صعوبتوں کا مذاق اڑا رہا ہو اور میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ ایسے علاقوں میں سب ضروریاتِ زندگی میں سے ناگزیر ترین پانی ہی ہے۔ انسان ماندگی، بھوک، گرمی، سردی اور طویل بے خوابی تک برداشت کر سکتا ہے لیکن حدّتِ سوزاں میں جلنا، اپنے پژمردہ اور خشک حلق سے بمشکل سانس لینا، منہ میں زبان نہ ہلانا کہ دَم نہ گھُٹ جائے اور ان تمام خوفناک اور رُوح فرسا محسوسات کے مداوا کے قابل نہ ہونا میرے خیال میں ایک سیّاح اور مسافر کی بدبختیوں کا سدرۃ المنتہیٰ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مذکورہ سراب انتہائے حدّت سے فضا کی تلطیف کا نتیجہ ہوتا ہے اور جو چیز اس فریبِ نظر کو دو چند کر دیتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ اکثر اُن کھلی جگہوں پر ہوتا ہے جہاں پانی ٹھہر سکتا ہے۔ مَیں نے اس میں جھاڑیوں اور درختوں کا اتنا صحیح عکس دیکھا ہے گویا یہ ایک صاف شفاف اور ساکن جھیل کی چادرِ آب ہو۔ ایک دفعہ ایران کے صوبہ کرمان میں تو یہ ایک پہاڑی پر چادرِ آب کی صورت میں نظر آیا جس کے دامن سے مَیں گذر رہا تھا اور جس کی وجہ سے اس کی چوٹی نظر آ رہی تھی۔ لیکن یہ منظر کبھی کبھار ہوتا ہے اور میرے ہمسفر ایرانیوں نے بتایا کہ یہ پہاڑی سے برآمد ہونے والے

شور کے ذرّات کی تجزیے پیدا ہوتا ہے۔

جب میرا وفادار نوکر فتح محمد روٹی پکا چکا[1] تو یہ متفقہ فیصلہ کیا گیا کہ باقی پانی ہم برابر برابر تقسیم کرلیں۔ چنانچہ ہر ایک کو ایک ایک پنٹ (گیلن کا ۱/۸) ملا اور اسے نوش کر کے ہم سو گئے۔

۲۳ر اپریل

رات چاندنی سے دُھلی ہوئی، نکھری ہوئی تھی اور بادِ خنک چل رہی تھی، لہٰذا میں نے اس نعمت غیر مترقبہ سے فائدہ اٹھا کر شام تک ریگان پہنچنے کا سوچا اور صرف دو گھنٹے آرام کے بعد رات ایک بجے روانہ ہو گیا۔ چھ میل کے فاصلہ پر ہم چشمہ گھگان آ گئے جس کا پانی اتنا کھاری تھا کہ ہم سخت پیاس کے باوجود اس سے حظ نہ اٹھا سکے لیکن خوب سیر ہو کر پیا اور مشکیں بھی بھر لیں۔ ہم بائیس میل اور چلے اور دس بجے نرمین نشیر کے جنگل کے سرے پہ ٹھہرے۔ یہاں سے ریگان کوئی پندرہ میل ہے جہاں ہم دو ٹوٹے ہوئے قلعوں اور ایک گاؤں، میدان کے پاس سے گزر کر کوئی پانچ بجے شام پہنچ گئے۔

آج کے علاقہ سفر کی سطح بو قلموں تھی۔ آخری پڑاؤ سے گھگان تک علاقہ پہاڑی تھا اور پھر نرمین نشیر کے جنگل تک ایک سخت چٹیل میدان، اس کے بعد نو دس میل تک زمین گیر جھاڑیوں اور درختوں کا جنگل تھا اور آخری پانچ چھ میل زرخیز تھے جن میں وسیع رقبے زیر کاشت تھے اور کئی پہاڑی ندیاں ان کو سیراب کرتی تھیں۔ ایک ندی سے ہمارے رہنما نے اپنی چھاگل

---

[1] ہمارا روٹی پکانے کا طریقہ مختصر ترین اور عاجلانہ تھا۔ سوکھی چھڑیوں کا ڈھیر لگایا اور اس کے اوپر کچھ ریت پھینک کر آگ لگا دی۔ چھڑیوں کے ختم ہونے تک ریت گرم ہو کر سرخ ہو گئی۔ گندھا ہوا آٹا اس کے وسط میں رکھ دیا اور روٹی دس منٹ میں تیار۔ اس عمل کی واحد احتیاط یہ ہے کہ آٹا پورا ڈھکا رہے ورنہ ہوا اُسے جلا دیتی ہے۔

بھری اور ہم سے رخصت لی۔ وہ ریگان سے تنہا واپسی سے خائف تھا لہٰذا میں نے اُسے چند سیر آٹا اور تین روپے دیے جس پر وہ بہت خوش ہوا۔ علاقے کی طرح ہمارے سفر کی سمت بھی بدلتی رہی اور ہمارا راستہ قطب نما کے جنوب مغربی اور شمال مغربی نقاط کے درمیان رہا۔

اگر میرے پاس مقیاس الحرارت ہوتا تو آج کی گرمی بھی کل جیسی ہی ثابت ہوتی، لیکن ہمارے پاس پیاس بجھانے کے لئے وافر پانی تھا اور پھر کم از کم میری قوّت تصوّر کے مطابق ایک فلک بوس اور برف پوش سلسلۂ کوہ ہم سے کوئی پچیس میل جنوب کی طرف ہونے کے باوجود ایک خوشگوار احساس خنکی پیدا کر رہا تھا۔ اگر اس کی طرف سے ہوا چل رہی ہوتی تو میرے احساسات زیادہ حقیقت پسندانہ ہوتے، لیکن ہوا بند تھی اور اگر تھی بھی تو مخالف سمت سے!

ریگان پہنچ کر میں سیدھا قلعہ کے دروازے پر گیا جہاں بہت سے لوگ بیٹھے تھے اور بچے کھیل رہے تھے۔ بچے تو فوراً چیختے چلّاتے بھاگ گئے اور آدمی بھی حیران و ہراساں ہو گئے۔ کچھ نے ہمیں چپاؤ کا ہراول سمجھا اور کوئی نہ سمجھ سکا کہ ہم یوں نادیدہ کیسے پہنچ گئے؟ پیشتر اس کے کہ میں اترتا اور وضاحت کرتا، خبر پورے قصبہ میں پھیل گئی اور سردار عباس علی خان نے فوراً پچھوایا کہ میں کہاں سے اور کس کام پر آیا تھا۔ میں نے اُسے اطلاع دی کہ میں ایک ہندو سوداگر کا گماشتہ تھا اور قلات سے کرمان کو سفر کر رہا تھا اور بات کرتے کرتے میں نے اُسے بسمان کے مراد خان کا خط بھی دے دیا تاکہ میری تصدیق ہو سکے۔ اُس نے سرداروں سے یہ سفارش بھی کی ہوئی تھی کہ مجھے رہنما یا دیگر ضروریات مہیّا کر دی جائیں۔ خط پڑھ کر اُس نے کہا کہ وہ نہ میری بات کو مشکوک سمجھتا تھا اور نہ ہی میری مدد سے گریزاں تھا، لہٰذا وہ میرے قریب ترین راستے سے کرمان جانے میں حارج نہ ہوگا گو شاہزادہ کے حکم کے مطابق وہ مجھے نرمن شیر کے گورنر، رشید خان کے پاس بھیجتا جو میرے راستے سے تیس میل ہٹ کر ایک قصبہ گرگ

میں رہتا تھا۔ بعدازاں اُس نے مجھ سے پوچھا کہ بلوچوں نے مجھ سے کیسا سلوک کیا اور حیران ہُوا کہ انہوں نے مجھے بلا ضرر کیسے آنے دیا۔ میں نے کہا کہ غریبی میرا پروانۂ راہداری تھا کیونکہ وہ مجھ سے چھین کچھ بھی نہ سکتے تھے بلکہ اُلٹا مجھے دینے پر مجبور تھے۔ وہ اِس بذلہ سنجی پر مسکرایا اور کہنے لگا کہ اِتنا عرصہ مہمانداری کی رسومات کا عادی ہونے کی وجہ سے شاید میں اُس سے بھی خاطر مدارات کی توقع رکھوں۔ میں نفی میں جواب دینے ہی والا تھا کہ اُس نے کہا" اور میں ضرور ایسا کروں گا تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ شاہسوار (قبیلہ کا نام) بدترین بلوچ ہیں۔" میں قلعہ کے باہر درختوں کے سائے تلے شب بسری کے لئے روانہ ہُوا کیونکہ یہ لوگ کبھی اجنبیوں کو دیواروں کے اندر سونے نہیں دیتے جو اِن کا دستور ہے۔ کوئی آدھ گھنٹہ میں باجرے کی روٹی اور دودھ کافی مقدار میں آگئے۔

۲۴ر اپریل

مجھے آج ریگان رُکنا پڑا تاکہ میرے لوگ اور اونٹ تھکاوٹ اور بھوک سے نجات پاسکیں کیونکہ بسمان سے لے کر اب تک اُنہیں صرف ایک وقت کا کھانا ملتا تھا اور اُونٹ تو اکثر بھوکے رہتے تھے اور چرنے کا موقعہ نہ ملتا تھا۔ وہ انتہائی کمزور اور دُبلے ہوگئے تھے اور نتیجۃً ہمیں بسمان سے ریگان تک اکثر و بیشتر پیدل چلنا پڑا اور وہ ہمارے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔[1]

ریگان ایک صاف ستھرا کچا قلعہ بلکہ ایک قلعہ بند گاؤں ہے۔ یہ ہر طرف سے قریباً ڈھائی سو گز

---

[1] اونٹوں کو روزانہ آٹا ملتا رہے تو وہ دیر تک بہت تیز چل سکتے ہیں۔ اسے عموماً آدھا گوندھ کر شیر خوار کے سر کے برابر گولے بنا لیتے ہیں اور پھر اُن کے حلق میں ٹھونس دیتے ہیں۔ بلوچ اکثر افیم اور گڑ بھی ملاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ جتنے بڑے ہوں اُتنے ہی سودمند ہوتے ہیں۔ کرمان میں میں اپنے اونٹوں کو روزانہ پندرہ پاؤنڈ آٹا دیتا تھا جو وہ ہر شام کھا لیتے تھے حالانکہ گھاس بھی کھاتے تھے۔ اِسی لئے وہ بھوک برداشت کر لیتے ہیں اور پانچ چھ دن تک فاقہ کر سکتے ہیں۔

مزلتی ہے۔ دیواریں اونچی اور صحیح سالم ہیں اور ان کے وسط میں اور کونوں پر برج ہیں۔ میرے خیال میں دیواریں بنیاد پر پانچ چھ فٹ موٹی ہیں لیکن اوپر کی طرف پتلے ہوتے ہوتے چوٹی پر اٹھارہ انچ سے زیادہ نہیں۔ صرف ایک دروازہ ہے جو مرکزی برج کے نیچے ہے اور یہاں مستقلاً ایک حفاظتی دستہ ہے جو اجنبیوں کو اندر نہیں جانے دیتا اور یہ نظام اس پورے صوبے میں رائج ہے اس کے اندر رہائش گاہوں کے گرد ایک دوسری دیوار ہے تاکہ خلوت میسر ہو اور دفاع آسان ہو۔ مختلف اونچائی اور مضبوطی (جو مکانداروں پر منحصر ہے) کی اندرونی دیوار اور بیرونی دیوار کا فاصلہ شاید تیس فٹ ہے جہاں رات کو ہر قسم کے جانور باندھے جاتے ہیں۔ پانچ چھ فٹ چوڑی پگڈنڈی لوگوں کے لئے مخصوص ہے اور باقی جانوروں کی تعداد کے مطابق چھوٹے باڑوں اور طویلوں میں تقسیم کردی گئی ہے۔ ان کا ہر مالک روزانہ صفائی کا ذمہ دار ہے۔ یہ قانوناً بھی ضروری ہے اور سودمند بھی، کیونکہ اسے خوب کھاد ملتی ہے۔

دروازے کے سرکاری تنخواہ دار تفنگچی محافظوں کے علاوہ سنتری اندھیرا ہوتے ہی برجوں میں چلے جاتے ہیں اور ساری رات پہرہ دیتے ہیں اور نعرے لگا لگا کر ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے اور چوروں کو ڈراتے رہتے ہیں۔ یہ شبینہ فرائض لوگ خود برضا و رغبت انجام دیتے ہیں تاکہ وہ بلوچان سرحد و بمپور وغیرہ کے حملوں سے خبردار رہیں جو سال میں ایک دو دفعہ ایرانی علاقوں پر ضرور دھاوا بولتے ہیں۔ سردار ریگان عباس علی خان نسلاً بلوچ ہے اور اسی طرح اس کی اکثر رعایا بھی۔ اس کے چھ بیٹے ہیں اور سب کے سب جوان اور ہوشمند ہیں۔ وہ مجھے خوش رکھنے کے لئے کمربستہ رہتے تھے۔ ایک دن شام کی گپ شپ میں انہوں نے جرید بازی (نیزہ بازی) کا ذکر کیا تو میں نے کہا کہ میں نے اسے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس پر ان میں سے دو نے فوراً اپنے گھوڑے منگوائے اور قلعہ کے دروازے کے سامنے والے میدان میں مقابلہ دکھایا۔ وہ زبردست شاہسوار تھے اور گھوڑے ان کے قابو میں تھے جو اس کھیل کے لئے ناگزیر ہے۔ یہ ایران کے تمام طبقوں میں مقبول ہے اور میں اسے مختصراً بیان کروں گا۔ یہ دو قسم کی ہے۔ ایک میں دو سوار بارہ فٹ یا اس سے زیادہ

لمبے نیزے لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ دوسری میں اکیلا سوار دو تین فٹ لمبی چھڑی لئے ہوتا ہے۔ پہلی میں دونوں معرکے باز باری باری ایک دوسرے کے پیچھے گھوڑا دوڑاتے ہیں۔ ایک پورے زور سے نیزہ پھینکتا ہے تاکہ دوسرے کو مارے اور گرا دے اور دوسرا ماہرانہ پھرتی سے چوٹ سے بچتا ہے اور نیزے کو پکڑ کر اس پر حملہ کرتا ہے۔ دوسری میں صرف گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے چھڑی کے ایک سرے کو زمین پر مارنا اور پھر اس کے ابھرنے پر اسے پکڑنا ہے۔ یہ طریقہ جلد سیکھ لیا جاتا ہے اور اس میں کوئی خطرہ نہیں۔ لیکن جب میں نے پہلی دفعہ جرید کو پوری رفتار سے دوسرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو بار بار کانپ اٹھا اور سوچتا رہا کہ یہ اسے لازماً زمین پر گرا دے گا۔ بہرحال اس رائے کا واحد انسان میں ہی تھا اور کھلاڑی لطف اندوز ہو رہے تھے اور تماشائی صرف اُن کی مہارت پر بڑھ بڑھ کر داد دے رہے تھے اور کسی اور تاثر کا مظاہرہ نہ کر رہے تھے!

بابِ چہاردہم

مصنّف ریگان سے روانہ ہوتا ہے — بُرجہ پہنچتا ہے — درمیانی علاقہ — سردار کی بدتمیزی — مصنّف ایک انگریز سوداگر بن جاتا ہے — جھگڑے کا انجام — قصبہ نعیم آباد — سردار — غیر موجود — ایرانی حکومت کی پالیسی — نعیم آباد کا بیان — پھر وہی رہنما — اس کی بے ایمانی — قصبہ جمالی — سردار نعیم آباد سے ملاقات — مصنّف اپنا تعارف کراتا ہے — اس کا مقصد — سردار کا تبصرہ — شہر بم کے گورنر کے نام خط دیتا ہے — گاؤں نور آباد — درمیانی علاقہ — بم میں آمد — گورنر سے ملاقات — محافظین محل سے خفگی — گورنر کی آمد — مصنّف کے لباس پر تعجب — اس کا بیان — دیوان عام — گورنر کا شائستہ برتاؤ — عمر — جائے پیدائش — سفر کی تیاریاں — بم سے روانگی — پن چکی — ایک سیّد کی بدتمیزی — مصنّف کو افغان کہتا ہے — اس کی غلط فہمی کے ازالہ کی وجہ — گفتگو — توہین آمیز — اسے بند کرنے کے جتن — مصنّف سے ایک خوشگوار سوال — جواب کیسے دیا — نتیجہ — صوبہ نرمن شیر — حدود اربعہ — کروک دار الحکومت — صوبہ اور لوگوں کا مختصر تاریخی جائزہ — سطحِ زمین — آب و ہوا — مصنّف کی رائے — آمدنی — پیداوار — شہر بم — بہت مضبوط قلعہ — بیان — شہرت — اس کا ماخذ — لطف علی خان زند یہاں گرفتار ہوا — وسیع کھنڈرات — عظمتِ ماضیہ — مشہور چشمہ — اس کا استعمال — شہر بم کا محلِ وقوع موزوں — بیان کا تسلسل۔

---

۲۵ راپریل

آج جونہی قلعے کا دروازہ کھُلا میرا مطلوبہ رہنما آ گیا اور میں صبح چھ بجے ریگان سے چلا اور ایک ہموار جنگلاتی علاقے سے شمال، شمال مغرب کی سمت میں چودہ میل کا سفر طے کر گیا۔ ہم ناشتہ کے لئے باجرے کے کچھ کھیتوں میں رُکے جنہیں مقامی لوگ کاٹ رہے تھے۔

مَیں اِس جلد کٹائی پر حیران ہُوا لیکن مَیں نے آگے مغرب کی طرف دیکھا کہ اناج واقعی زیادہ پک گیا تھا۔ جونہی شدید گرمی کم ہوئی مَیں آگے روانہ ہُوا اور سات بجے شام ایک چھوٹے سے مدوّر قلعہ بُرجہ نامی کے پاس ٹھہرا جس کے اندر پچاس ساٹھ گھروں کا گاؤں ہے۔ یہاں جنگل صبح کی نسبت زیادہ ناقابل گذر تھا اور راستہ اتنا ٹیڑھا میڑھا تھا کہ یقیناً ہم نے ریگان سے یہاں تک اصل فاصلے کا تین گُنا طے کیا ہو گا۔ مَیں نے شام کی مسافت کا اندازہ پندرہ میل لگایا اور یوں ہم نے انتیس میل سفر کیا تھا۔ رواں دواں ندیوں میں کافی پانی تھا اور کچھ مناظر تو بے حد خوبصورت تھے۔ درختوں میں مجھے پیپل، نیم، املی، ببول، آم، اخروٹ، جنگلی بادام اور گز (ہندوستانی تمرسں) نظر آئے۔ گز میرے مشاہدے میں آنے والے سب سے بڑے تھے اور یہ سب درخت خوب لدے پھندے اور بہار پر تھے اور ہماری بائیں طرف کے سنگلاخ اور برف پوش پہاڑوں کے مقابل ایک بھرپور اور حیران کُن تضاد پیش کر رہے تھے۔

مَیں اونٹ سے اُترا ہی تھا کہ ایک بدنما، میلا کچیلا کھوسٹ نمودار ہُوا اور نہایت تحکمانہ لہجے میں پوچھا کہ ہم کون تھے اور کیوں آئے تھے؟ بعد میں معلوم ہُوا کہ وہ یہاں کا کدخدا یا عامل تھا۔ مَیں نے بھی ویسے ہی تحکمانہ لہجے میں کہا کہ وہ کِن اختیارات کے تحت ہم سے یہ پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ اُسی وقت میرا رہنما (جو گاؤں میں گیا تھا تاکہ آگ جلانے کے لئے مشعل لا سکے) آ گیا اور سوال کنندہ کو کدخدا کہہ کر مخاطب ہُوا اور اُسے بتایا کہ مَیں ہی وہ آدمی تھا جس کا ذکر ہم نے کیا تھا۔ اِس پر مَیں اور چڑا کہ یہ سفلہ تو مجھ سے بِن پوچھے سب کچھ جانتا تھا اور محض

اپنی معتبری جتانے کے لئے قلعہ سے باہر آیا تھا اور یوں بدتمیزی کا مظاہرہ کیا تھا۔ بہرحال آخر کار اُسے اپنی احمقانہ غلطی کا احساس ہوگیا اور اُس نے رہنما سے کہا۔ "ہاں وہی ہے لیکن غالباً اسے اپنے مقام کا پتہ نہیں، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ وہ یہاں بااختیار ہے یا میں۔ میں اسے کل صبح ہی رشید خان کے پاس بھیجوں گا اور وہ اس کا دماغ ٹھکانے لگادے گا۔" ممکن ہے میں اس گیدڑ بھبکی پر ہنس دیتا لیکن یہ سوچ کر کہ وہ واقعی اپنی دھمکی پر عمل کرسکتا تھا، میں نے بہتر سمجھا کہ اسے دبانے کی بجائے ڈرایا دھمکایا جائے۔ لہٰذا میں نے اُسے کہا کہ میں ایک انگریز سوداگر تھا اور اُسے اس بدتمیزی کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ اس پر وہ بگڑ گیا اور پھر چند لمحے بعد وہ میرے بلوچوں سے کہنے لگا کہ ان کے پاس نرمن شیر میں آنے کا کوئی ایسا عذر نہ تھا اور انہیں تو انشاءاللہ ضرور گرگ جانا ہوگا۔

اس مُنہ زوری پر میں صبر نہ کرسکا اور کہا کہ وہ ایک ہیز بدمعاش تھا اور مجھے یا میرے کسی آدمی کو رشید خان کے پاس نہ بھیج سکتا تھا اور میں کرمان پہنچتے ہی شہزادے کو اس کی کجروی سے مطلع کردوں گا۔ اب رہنما اور کچھ تماشائیوں نے مداخلت کی اور میرا خیال ہے کہ اس لغلول کو احساس ہوگیا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا، کیونکہ وہ صرف دبی زبان میں غرایا کہ مجھے پتہ ہونا چاہیئے کہ میں شاہ کے علاقہ میں تھا جہاں وجہ بتائے بغیر کوئی اجنبی سفر نہ کرسکتا تھا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور چونکہ اس کے فوراً بعد بارش ہونے لگی لہٰذا وہ قلعہ میں جا گھسا اور میں وہیں ڈٹا رہا۔

۲۶ اپریل

میں نے رہنما کو اپنے پاس ہی سُلایا تاکہ اس کی وجہ سے دیر نہ ہو اور مُنہ اندھیرے ہی بُرجہ سے روانہ ہوگیا جب کوئی سفر کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ دس میل شمال، شمال مغرب کی طرف چلنے کے بعد میں قصبہ نعیم آباد پہنچا۔ علاقہ جھاڑی دار بھی تھا اور کچھ کاشتہ بھی۔ یہاں کا کدخدا کریم خان کُرد بلوچ تھا جو سرحد کے بڑے سردار، اُلفت خان کا بھائی تھا لیکن اُس سے

اور دیگر سرداران علاقہ سے لڑکر اور محروم وراثت ہوکر وہ زمین شیر بھاگ آیا تھا جہاں حکومت کرمان نے اُسے نعیم آباد کا کم آباد قلعہ اور قصبہ آباد کر دیا۔ عطیے کا یہ طریقہ پچھلے پانچ چھ سال میں اکثر استعمال کیا گیا ہے اور اس کا سبب آگے بیان ہوگا۔ کریم خان نے اپنے ہموطنوں کو اپنے نئے علاقہ میں آباد ہونے پر آمادہ کر لیا اور وہ اس میں اتنا کامیاب رہا کہ اب نعیم آباد ریگان سے کافی بڑا، گنجان آباد اور ترقی پذیر ہے۔ وہ کرک گیا ہوا تھا، لہٰذا میں قلعہ کا اندرونی حصہ نہ دیکھ سکا لیکن اس کے برو بجات اپنی صفائی اور ہمواری کی وجہ سے حسن انتظام کے مظہر ہیں۔ گویا وہ قلعہ بندی کی بجائے کسی گھر کی دیواریں ہوں۔ یہ ریگان کے نقشہ پر ہی بنا ہوا ہے، سوائے اس کے کہ مستطیل مربع ہونے کی وجہ سے اس کی طویل اطراف پر ایک کی بجائے دو برج ہیں۔ کریم خان کے انتظار میں سارا دن ٹھہرا اور پھر اسی رہنما کو دوبارہ مامور کر دیا جو ریگان سے آیا تھا تاکہ شہر بم تک راستہ دکھائے۔ اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور بہت زیادہ معاوضہ مانگا، حالانکہ مجھے اس پورے راستے کے لئے ستار شامل سکتا تھا، لیکن چونکہ میرے شتربانوں نے مجھے بتایا تھا کہ کریم خان ایک دفعہ محمود خان سے ملنے کے لئے قلات گیا تھا لہٰذا میں اس جا پر اس سے ملاقات کا شائق ہوگیا اور اس کے لطف و کرم کا مشتاق ہوا۔

۲۷ راپریل

ایک نہایت زرخیز اور زیر کاشت علاقے میں سے ایک شمالی، شمال مغربی راستے پر تیرہ میل چل کر میں نو بجے صبح ایک چھوٹے سے قصبہ جمالی پہنچا۔ اس علاقے میں ہر طرف ندیاں رواں دواں تھیں۔ قصبے کے گرد دو تین سو آدمی ایک افتادہ دیوار کو از سر نو تعمیر کر رہے تھے۔ ہم نے قصبے کے قریب ایک جوئبار کے کنارے پر اخروٹ کے سایہ دار درختوں کے نیچے ناشتہ کیا اور گیارہ بجے روانہ ہو گئے۔ ابھی بمشکل دو میل چلے تھے کہ کریم خان بھی سامنے سے آگیا۔ میں فوراً گھوڑا دوڑا کر اس کے پاس گیا اور اپنے متعلق بتا کر کہا کہ میں نے سنا تھا کہ وہ بھی قلات محمود خان سے ملنے گیا تھا اور اُمید ظاہر کی کہ خان کی دوستی کی بدولت

وہ مجھے ایک رہنما اور پاسپورٹ از بم تا کرمان حاصل کرنے میں مدد دے گا۔ اس نے مجھے جمالی واپس چلنے کے لیے کہا، جہاں کچھ اِدھر اُدھر کی گفتگو اور اپنے دو تین ہمسفر گھوڑ سواروں کے مشورہ کے بعد اس نے کہا کہ اجازت لینے کے لیے کرک جاکر رشید خان سے ملنا ضروری تھا اور یہ بتایا کہ یہ چھ فرسخ (بائیس میل) سے زیادہ نہ تھا۔ میں نے پھر اپنی بات دہرائی کہ مجھے ایسا کرنے میں کوئی عار نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ یہ راستہ سے ہٹ کر تھا اور مزید کہا کہ چونکہ میں کرمان جا رہا تھا جہاں میں لازماً شہزادہ سے ملوں گا لہٰذا کرک کا سفر غیر ضروری تھا اس نے ایک لمحہ سوچا اور بغیر جواب دیئے قلم، دوات اور کاغذ منگوایا اور شاید رشید خان کے نام ایک خط لکھا۔ لیکن خط لکھنے کے بعد اس نے یہ مجھے دکھایا اور کہا "میں نے اس خط میں تمہاری کہانی، گورنر بم، لطف علی خان کو لکھ دی ہے جو اپنی پسند کے مطابق تم سے سلوک کرے گا، لیکن تم زبانی اسے ضرور کہہ دینا کہ محض تمہاری التجا پر میں نے تمہیں کرک نہیں بھیجا تھا۔" میں نے اس ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور اسے خدا حافظ کہہ کر اونٹ پر سوار ہوا اور چودہ میل مغرب، شمال مغرب کی طرف چل کر نُورآباد کے چھوٹے سے گاؤں کے پاس آٹھ بجے رات ٹھہر گیا۔ درمیانی علاقہ پہلے نصف میل کے سوا بے آب و گیاہ چٹیل میدان تھا۔

۲۸ اپریل

ایک درمیانے سے زرخیز میدان پر دس میل شمال سے مغرب کی طرف چل کر میں آج صبح نُورآباد سے آٹھ بجے سے پہلے شہر بم پہنچ گیا اور بیرونی بازار میں ایک رنگریز کی خالی دکان میں ٹھہر گیا۔ ناشتہ کے بعد شہر گیا اور پوچھتے پوچھتے گورنر لطف علی خان کے مسکن یعنی قلعہ میں جا پہنچا۔ میں نے کریم خان کا خط بھجوایا اور پورے دو گھنٹے وہاں متعین بد تہذیب اور شوریلے تفنگچیوں کے درمیان دروازے میں کھڑا انتظار کرتا رہا اور وہ مجھے متجسسانہ بدتمیزی سے تنگ کرتے رہے۔ جب میں گورنر سے ملاقات یا خط کے جواب سے نا اُمید

ہو کر پژمردہ و افسردہ واپس جانے کے لئے پَر تول رہا تھا تو ایک آدمی یہ خبر لایا کہ خان چند ہی لمحوں میں دربار میں آئے گا۔ اور وہ واقعی جلد ہی اپنے لاؤ لشکر سمیت دربار میں آگیا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے ہاتھ سے پیچھے پیچھے چلنے کا اِشارہ کیا اور پھر ٹکٹکی باندھ کر مجھے سرتاپا دیکھتے ہُوئے میرے لباس پر تعجّب کا اظہار کیا جو واقعی اتنا بھونڈا تھا کہ ٹکٹکی کا ہر جواز موجود تھا۔ یہ لباس ایک میلی کچیلی بلوچی شلوار قمیص پر مشتمل تھا جو چھ ہفتے زیب تن رہنے کی وجہ سے اپنی سفیدی کھو کر بھوری ہو چُکی تھی اور قریباً پھٹ چکی تھی۔ اس کے علاوہ میں اُس وقت ایک نیلی پگڑی اور کمر کی پیٹی کی بجائے ایک سوتی رسّی پہنے ہوئے تھا اور ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا جو چلنے میں مفید رہتا تھا اور کتّوں سے بچاتا تھا۔

ہم دو تین چھوٹے چھوٹے علمدار صحنوں سے گذر کر دربار پہنچے جو ایک بڑے احاطہ کے آخر میں تھا۔ اس کے ہر طرف ایک تنگ گلی تھی جس کے وسط میں زمین کے ٹکڑے میں جنگلی پھُول کھلے ہوئے تھے اور تین فوّارے پھوٹ رہے تھے۔ جس کمرے میں ہم داخل ہوئے وہ ایک خوبصورت مُربّع تھا، جس کی ہر طرف ایک کُنج اور ایک نیم مدوّر دریچہ تھا۔ اُس کے فرش پر ایرانی قالین پھیلے ہُوئے تھے اور دیواروں کے ساتھ ساتھ بیٹھنے کے لئے نمدے پڑے تھے۔ اُس پر خالص سفید روغن ہُوا تھا جس کے آرائشی حاشیوں پر سونے کا ملمع ہُوا تھا اور مجموعی طور پر اُس کا تاثر بھڑکیلا نہیں تھا بلکہ روح افروز تھا۔ خان دریچہ کے پاس سامنے کے کُنج میں بیٹھا اور مَیں عین مقابل دروازے کے پاس۔ وہ مجھ سے سفر کے حالات پوچھتا رہا اور مَیں نے مختصر طور پر بیان کر کے جو کچھ کریم خان نے سمجھایا تھا وہ کہہ کر یہ بتایا کہ طہران میں برطانوی سفیر جنرل میلکم سے جا ملنا چاہتا تھا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ وہ شہزادۂ کرمان کو یہ بات لکھ دے۔ اس کے بعد قلیان لایا گیا اور کوئی ایک گھنٹے کے بعد اُس نے کہا "مَیں ایک چپپر (گھوڑ سوار ایلچی) شاہزادہ کے پاس بھیج رہا ہوں اور

وہ تمہارا ہم سفر ہوگا۔ وہ آج بعد از دوپہر روانہ ہوگا لہٰذا تم سامانِ خوراک خرید لو کیونکہ راستہ پر کچھ نہ ملے گا۔" میں نے شکریہ ادا کیا اور ایرانی نفاست کا عمدہ تاثر لے کر رخصت ہُوا۔ گو لطف علی خان اپنے اِس عہدہ کے مقابلے پر نوجوان تھا تاہم بہت بامروّت تھا۔ اپنی شکل وصورت سے وہ بائیس سال سے زیادہ کا معلوم نہ ہوتا تھا۔ مجھے معلوم ہُوا کہ وہ اصفہانی ہے اور اُس کے اطوار اپنے ہم عصروں سے زیادہ شُستہ و شاندار ہیں۔

میری عدم موجودگی میں میرا ہندوستانی نوکر آٹا حاصل کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا، لہٰذا مجھے کچھ باجرہ خریدنا پڑا کیونکہ صرف یہی دستیاب تھا اور اسے پسوایا بھی کہیں اور ہی جا سکتا تھا۔ میں نے عمدہ کھجور اور انار کی کافی مقدار بھی رکھ لی۔ چیڑ پانچ بجے شام آیا اور ہم روانہ ہوئے۔ ساڑھے تین میل کھنڈرات اور کوڑا کرکٹ میں چلنے کے بعد ہم برلب سڑک ایک پن چکی پر آ گئے یہاں رات کے لئے ٹھہرے۔ خوش قسمتی سے یہاں ہمیں مزدوری اور فضلہ کی روایتی کٹوتی کے بعد باجرے کے بدلے آٹا مل گیا۔

ہم کو خیر باد کہنے سے ایک دو گھنٹے پہلے مجھے ایک متعصّب مشہدی سیّد سے پالا پڑا جو میرا اُسن کر اترا تا ہُوا آیا تا کہ مجھے میرے مذہب کی حقانیت سے برگشتہ کرے۔ پہلے اُس نے میرے کمرے میں جھانکا اور پھر دعوے سے کہا کہ میں ایک یوروپی نہ تھا بلکہ بھیس بدلا ہُوا افغان تھا۔ اِن دونوں اقوام کے درمیان اٹ دشمنی کی وجہ سے میں ایسے غلط نظریے کی اِشاعت کے خطرات سے واقف تھا لہٰذا فوراً اٹھ کر برآمدے میں تردید کے لئے گیا۔ تردید تو کر دی گئی، لیکن اب اُس نے پینترا بدلا اور ہجوم کے رُوبرو عیسائیوں کو لتاڑنا شروع کیا جنہیں وہ کافر کہہ رہا تھا۔ پھر اُس نے مجھ سے کہا کہ میں مسلمانوں کے لباس میں کیوں تھا جب میں اُن کے پیغمبر کو نہ مانتا تھا، اور کیا میں علیؓ کے متعلق کچھ جانتا تھا؟ وہ تو اِس پر بھی مُصر تھا کہ میں اُس کے پیچھے پیچھے شیعہ کلمہ دُہراؤں۔ میں نے زور سے انکار کر دیا تو اُس نے موضوع بدلا اور پوچھا کہ میرے ملک میں ایک عورت کے کتنے شوہر ہوتے ہیں اور آیا بھائی اپنی بہنوں اور

قریبی ترین رشتہ داروں سے شادی نہیں کرتے ہیں ؟ اُس نے کئی اور توہین آمیز سوال پوچھے اور ان کی صداقت کے متعلق اُس نے ہجوم سے قسمیہ بیان کیا کہ دیولردبی باشندوں نے پچھلے سال مشہد میں ان کا اعتراف کیا تھا۔ اُس کے ساتھ ہی ساتھ خنزیر کے گوشت، شراب اور دیگر ممنوعات پر متعلقات کی بوچھاڑ ہوئی اور میں بمشکل اپنا غصّہ روک سکا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اگر میں اُس کے تھپیڑ رسید کرتا تو اُس کے تقدّس کی وجہ سے لوگ غالباً مجھے اور میرے آدمیوں کو مار ڈالتے۔ لہٰذا میں نے نرم جوابات سے اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور پھر لطف علی خان کی خفگی سے ڈرایا جو میری شکایت پر پیدا ہوگی۔ قصّہ دراز ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ بازار کے پُورے دو تین ہزار آدمی گھر کے گرد جمع ہو گئے اور مجھے ہر بُرائی کے لئے کوسنے اور بکنے دینے لگے۔

خوش قسمتی سے اُس نے بالآخر مجھ سے پوچھا کہ خدا کہاں ہے؟ میں نے جواباً کہا کہ اگر وہ میرے ایک سوال کا جواب دے دے تو میں بھی اُسے مطمئن کر دوں گا۔ وہ مان گیا تو میں نے اُسے پوچھا" مجھے بتاؤ کہ خدا کہاں نہیں ہے؟" وہ فوراً اٹھا اور مجمع سے کہنے لگا۔" خدا کی قسم! کاش یہ مسلمان ہوتا! یہ اچھا آدمی ہے!" یہ کہہ کر وہ مجمع کے ساتھ روانہ ہو گیا اور جان بچی اور لاکھوں پائے۔

صوبہ نرمن شیر بلوچستان سے شہر بم تک تخمیناً کچھ میل لمبا اور تیس تا چھتیر میل چوڑا ہے اُس کی مغربی سرحد صوبہ کرمان ہے جس کا اب یہ ایک ضلع ہے۔ مشرق میں صحرا ہے جس کا ذکر کیا گیا ہے اور شمال اور جنوب میں دو سلسلہ ہائے کوہ ہیں جن میں سے جنوبی بلند ترین ہے اور میرے مشاہدہ کے مطابق اُس وقت بھی برف پوش ہوتا ہے جب نیچے میدانوں میں بے پناہ گرمی ہوتی ہے۔

ؔ بعد میں معلوم ہُوا کہ یہ فرانسیسی مشن کے دو افسر تھے۔

میں نے قلعہ ریگان کو ۲۴ اپریل کی ڈائری میں بیان کر دیا ہے لہٰذا مزید کچھ نہیں کہنا سوائے اس کے کہ یہ اس صوبہ کے دیگر قلعوں کی مانند ہے جنہیں میں نے دیکھا یا ان کے پاس سے گذرا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ قصبہ کرک (جو گورنر کا صدر مقام اور مسکن ہے) کے گرد ایک خشک خندق ہے اور یہ نعیم آباد سے چار گنا بڑا ہے۔

ابھی نو سال نہیں گذرے کہ نرمن شیر پر دیرینہ قابض غلزئی افغانوں کو ایرانی حکومت نے نکال باہر کیا اور بلوچستان کے سرحدی قبائل کو متروکہ دیہات آباد کرنے کے لئے بلایا۔ اب وہ سب شیعہ ہو چکے ہیں اور شاہ ایران کی رعایا ہونے پر ڈینگیں مارتے ہیں۔ نکالے ہوئے غلزئی زیادہ تر صوبہ سیستان، خراسان کے شہروں جیسے، بینہہ اور قائن اور قلات (بلوچستان) میں آباد ہو گئے۔ وہ یہاں کے اصلی باشندے نہ تھے بلکہ ۱۷۱۹ میں ایران پر افغان حملہ آوروں کی نو آبادی سے برآمد ہوئے تھے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ آیا یہ آبادکاری کسی معاہدے کا نتیجہ تھی یا کسی قبیلہ کو بجبر نکال کر کی گئی تھی۔ میرا قیاس ہے کہ انہوں نے یہ حق نادر شاہ سے دوستانہ طور پر لیا کیونکہ گو وہ آخری اور کمزور ترین صفوی حکمران شاہ طہماسپ کا سپہ سالار تھا تاہم وہ مطیع ہونے کی بجائے اس پر حاوی تھا۔ پھر اسی نے ایران میں غصب کردہ اور غیر مستحکم افغان اقتدار کا خاتمہ کر دیا تاکہ خود مقتدر ہو سکے اور تمام ذرائع متفق ہیں کہ مسند شاہی پر جلوہ افروز ہونے کے بعد وہ افغانوں پر بہت مہربان تھا لہٰذا یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ غلزیوں کو نرمن شیر سے بے اقتدار کر کے اور انہیں شکنجۂ غلامی میں جکڑ کر وہ اس سلطنت میں ہی ان کو پناہ دے کر خوش تھا جس کا وہ شہنشاہ بننے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اس قیاس کو مزید تقویت اس سے ملتی ہے کہ اس کے دورِ عروج میں یہ لوگ اس زرخیز علاقے میں آباد و شاد رہے۔ انہوں نے اس کے جانشینوں کو بھی رام کر لیا اور زند خاندان کے ساتھ ان کی دوستی اتنی رہی کہ انہوں نے شاہی خاندان کے خلاف ان کی مدد کی اور اسی کے بدلے ان کی بیخ کنی ہوئی۔ ان

لوگوں پر مزید تبصرہ بالکل بیکار اور میرے اصل موضوع سے غیر متعلق انحراف ہوگا، کیونکہ وہ ایک عظیم قوم کی محض ایک چھوٹی سی نو آبادی تھے[1]۔

زمین کشمیر کی زمین گہرے رنگ کی ہے اور طاقت ور ہے لیکن جنوب کی طرف صحرا کے پاس ریتلی اور چٹیل ہو جاتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ بہت زرخیز ہے اور اسے کئی پہاڑی ندی نالے سیراب کرتے ہیں جن کے منبعے قدرتی چشمے بھی ہیں اور پگھلتی ہوئی برف بھی۔ کاشتکاری کے علاوہ ان چشموں سے پن چکیاں بھی چلتی ہیں اور میں نے ریگان سے بم تک بیس تو گنی ہوں گی۔ گرمی اور خزاں میں آب و ہوا گرم لیکن صحت بخش ہوتی ہے جیسا کہ لوگوں کے چہروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اگر یہ صوبہ کسی روشن دماغ حکومت کے ماتحت ہوتا تو یہ ایک دن سلطنت ایران میں سب سے زیادہ پیداور ہوتا۔ لیکن چند سالوں میں جب لوگ کچھ امیر ہوں گے تو وہ کھٹکنے لگیں گے اور بادشاہ اور اُس کے وزرا کی حرص و آز اُن کو تختۂ مشق بنائے گی اور جبر و استحصال اُس کی خوشحالی کو بہت جلد ختم کر دیں گے۔

۱۸۱۰ء میں یہاں سے چالیس ہزار روپے سے زیادہ آمدنی ہوئی۔ دیہات و قصبات کی حفاظت کے لیے جو عسکری عملہ یہاں تعینات ہے اُس کے اخراجات اس میں شامل نہ تھے جو پچاس ہزار روپے سالانہ سے کم نہ ہوں گے۔ گویا مجموعی سالانہ آمدنی قریباً ایک لاکھ یا ساڑھے بارہ ہزار پاؤنڈ ہے۔

اُس کی پیداوار میں ہر قسم کا غلہ، مجیٹھ، کپاس، گلاب جس سے مُربّہ بھی بناتے ہیں اور عرق بھی نکالتے ہیں۔ پھل جن میں سے اخروٹ، بادام اور خشک انگور دساور کو

---

[1] غلزئی امیر کابل کی رعایا ہیں۔ وہ قریباً دس لاکھ بتائے جاتے ہیں۔ وہ اپنے ہمسایوں یعنی ابدالیوں یا درانیوں سے خوش نہیں ہیں اور ان کے اقتدار کی وجہ سے حسد کرتے ہیں۔ ان میں سے کافی شیعہ ہیں اور وہ بہادری کی وجہ سے ہمیشہ ممتاز و معزز رہے ہیں۔

جاتا ہے، شہد اور گوند جو ببول کے مختلف النوع درختوں سے برآمد ہوتا ہے اور بحیرہ خزر کے گوند سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ اسے پیڑیں تھیلوں میں بند کر کے کرمان کی منڈی میں بیچا جاتا ہے اور ہر تھیلا ساڑھے سات پاؤنڈ ہوتا ہے۔

افغانوں کے اخراج تک شہر بم صوبہ کرمان کا سرحدی قصبہ تھا۔ انہوں نے بیس سال تک بلوچوں کی مدد سے اس پر قبضہ کرنے کی بار بار کوششیں کیں کیونکہ شاہی افواج نرمن شیر کو تختۂ مشق بنائے ہوئے تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی قلعہ بندی اتنی مضبوط کر دی گئی کہ آج یہ ایران کا محفوظ ترین شہر ہے۔ یہ اونچی جگہ واقع ہے۔ اس کے گرد ایک بلند، موٹی اور کچی دیوار ہے اور گرداگرد ایک گہری، عریض اور خشک خندق ہے۔ دیوار کی ہر طرف بڑے بڑے برج ہیں۔ کونوں کے برج ان کے علاوہ ہیں جو دوسرے برجوں سے کئی گز اونچے ہیں۔ یہ سب کچھ مٹی، توڑی اور دیگر ریشہ دار اشیائ سے مل کر بنا ہوا ہے اور جنوبی طرف کے دو مرکزی برجوں کے درمیان دروازہ ہے۔ قلعہ اس کا بلند ترین مقام ہے اور دہیں قصبہ ہے جو فصیل بند ہے اور جس کے ہر کونے پر مینار ہے۔ اس بند احاطے میں گورنر کا محل، اور دیگر سرکاری عمارات ہیں۔ بازار کافی بڑا ہے اور اس میں ہر چیز میسر ہے۔ میرے قیام کے دوران گندم کی قلت تھی لیکن باجرہ، کھجور، دودھ اور ہر قسم کے پھل فراواں فراواں تھے۔ یہاں کے باغات اناروں کے لئے مشہور ہیں اور مجھے ان جیسا ذائقہ اور رسیلا پن مشہور عالم شیرازی اور بغدادی اناروں میں بھی نہ مل سکا۔

پچھلے چند سالوں میں بم ایرانیوں کے یہاں ایک خاص اہمیت کا مالک بن گیا ہے کیونکہ یہیں زند خاندان کے آخری فرد لطف علی خان نے جنگِ تخت نشینی لڑی اور کوئی ۱۹ سال پہلے گرفتار ہوا۔ جس جگہ پر وہ فرار ہونے کے لئے اپنے گھوڑے پر سوار ہوتا ہوا پکڑا گیا وہاں آج بھی اس کے حامیوں کی کھوپڑیوں سے بنا ہوا اہرام موجود ہے جو اس کے مدِّمقابل اور قاچار خاندان کے ظالم بانی آغا محمد خان نے تعمیر کروایا تھا۔ میں اس جاں فرسا واقعہ کے کچھ اور کوائف بھی

دوں گا، جب کرمان کا ذکر کروں گا۔ فی الحال یہی کافی ہے۔

موجودہ قلعہ کے گرد کے کھنڈرات اور شکستہ و ریختہ عمارات کے آثار سابقہ شہر کی بے پناہ وسعت کے مظہر ہیں جو اپنے ایّام عظمت میں ایران کے بڑے سے بڑے شہر کا ہم پلّہ تھا۔ افغانوں نے ۱۷۱۹ء میں ایرانی سلطنت پر حملہ کیا اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہی اسے زیب و زینت بخشی لیکن وہ اس کے بانی نہ تھے کیونکہ یہ شہر بہت قدیم ہے۔ یہ یقینی ہے کہ غلزئی اس پر قابض ہونے کے بعد اس کی تباہی و بربادی کے ذمہ دار تھے۔ کچھ فوارے یہاں ایسے بھی تھے جو حیران کن بلندی اور فاصلے تک پانی پھینکتے تھے اور ایران کا موجودہ علم آبرسانی بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، گو ایرانی فواروں اور ان کے مرمریں حوضوں کے بے حد شائق ہیں اور کوئی گھر ان سے خالی نہیں۔ قلعہ سے کوئی تین میل کے فاصلے پر میرے رہنما نے مجھے کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا ایک باغ دکھایا جو کسی وقت دیوار بند تھا، جس کے ہر زاویئے پر گرمائی مکانات تھے اور جسے بقول اس کے افغانوں کے دور عروج میں ایک مرکزی طاس سے روزانہ دو دفعہ پانی دیا جاتا تھا۔ یہ طاس اب کوڑا کرکٹ سے بھرا ہوا ہے۔ شہر بم کا محلِ وقوع اس قسم کی نفاستوں اور ناز برداریوں کے لئے موزوں ہے۔ یہ فلک بوس پہاڑوں کے قریبی میدان میں بنا ہوا ہے جو اکثر و بیشتر برف آلود رہتے ہیں، لہٰذا یہاں پانی مسلسل اور فراواں فراواں میسر ہے۔ اب میں پھر بیان کے تسلسل کی طرف لوٹتا ہوں۔

سفرنامہ
بلوچستان و سندھ
مصنف: لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر
ترجمہ: پروفیسر ایم انور رُومان
حصہ دوم

سفرنامہ

بلوچستان و سندھ

اور

اِن ممالک کا ایک تاریخی و جغرافیائی مطالعہ

حصّہ دوم

مصنّفہ: لفٹیننٹ ہنری پوٹنگر منسلک بصیغہ ملازمت آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی و معاون ریزیڈنٹ در دربار اعلیٰ حضرت پیشوا و سابقہ معاون و پیمائش کار وفد سندھ و ایران۔

ترجمہ: پروفیسر ایم انور رُومان
ڈائریکٹر بیورو آف کریکولم
بلوچستان، کوئٹہ

نساء ٹریڈرز ۷۔ جناح کلاتھ مارکیٹ، کوئٹہ

فون: ۷۴۶۸۱

طابع ــــــــــ عابد بخاری
مطبع ــــــــــ علی پرنٹرز، پیسہ اخبار، لاہور
طبع اوّل ــــــــــ مئی ۱۹۸۰ء
تعداد ــــــــــ ۲۵۰ جلدیں
قیمت ــــــــــ پچھتر روپے
کتابت ــــــــــ اے۔ایس ممتاز

اصل کتاب:

"Travels in Baluchistan and Sind"

کے نام سے ہنری پوٹنگر نے تحریر کی جس کی اوّل اشاعت ۱۸۱۶ میں ہوئی۔

اُردو ترجمہ پروفیسر ایم انور رُومان نے کیا۔

اشاعتی ادارہ:

نساء ٹریڈرز ۷۔جناح کلاتھ مارکیٹ کوئٹہ (پاکستان)

فون: ۷۴۶۸۱

تقسیم کار:

میسرز گوشۂ ادب، سرکلر روڈ۔کوئٹہ (پاکستان)

فون: ۷۵۰۰۲

مندرجات

باب اوّل ―――― ۵
باب دوم ―――― ۲۰
باب سوئم ―――― ۳۲
باب چہارم ―――― ۴۹
باب پنجم ―――― ۶۱
باب ششم ―――― ۷۶
باب ہفتم ―――― ۸۹
باب ہشتم ―――― ۹۶
باب نہم ―――― ۱۰۸
باب دہم ―――― ۱۱۷
باب یازدہم ―――― ۱۳۰
باب دوازدہم ―――― ۱۴۱
باب سیزدہم ―――― ۱۵۴
باب چہادہم ―――― ۱۷۰
باب پازدہم ―――― ۱۷۹
ضمیمہ ―――― ۲۰۲

بابِ اوّل

پھر وہی راستہ — علاقہ — سرائے — گاؤں سبزستان — قصبہ تہروت —
دریائے اشکو — اس کا بیان — گذرگاہ زیرِ کاشت — ویران علاقہ — خراب راستہ —
پیدل چلنے پر مجبور — قصبہ بہون — بیان — خوشحال — کاریزات — کیسے بنتی ہیں —
ان کے فوائد — مصنّف کرمان پہنچتا ہے — اس کے احساسات — کاروانسرائے جاتا ہے —
ملاقاتیوں سے خفگی — ے وٹی — اکثر مایوس کن — شہزادے کو پیغام — جواب —
بریگیڈیئر جنرل میلکم کو خط — شہزادے سے ملاقات — استقبال — شہزادے کے سوالات —
ریاست — شہزادہ کی شکل و شباہت اور پوشاک — اس کا عمومی کردار — مشکوک —
کرمان میں قیام — مصنّف وزیر سے ملتا ہے — بہت شائستہ — وجہ کی تشریح —
ایرانی عشائیہ — قلیان — دونوں قسموں کا بیان — قہوہ — پھل — گوشت اور اشٹو —
شربت — من بھاتا کھاجا — تکالیف — کھانے کا مکروہ انداز — ایرانی کردار کا خاکہ —
ہر برائی کے مجرم — ایرانی معاشرے پر مصنّف کی رائے کا خلاصہ — شہزادے کے ایک نوکر کی بدتمیزی —
مصنّف کا رویّہ — اس کے اچھے اثرات — ریچھ نچانے والے — ان کی پست زندگیاں —
شہزادہ کچھ قاتلوں کا فیصلہ کرتا ہے — عبرت ناک سزائیں — اہلِ شہر کا ہراس —
لباسِ انتقام — اس کا رنگ — اس کی دہشت آفرینی — شہزادے کا سنگدلانہ سکون —
ایک ایرانی کی عجیب و غریب تجویز — جواب — شیعہ مسلمانوں کی موثر آہ و زاری —

اس کے تاثرات ـــــ شہزادے کی انتہائی فرومائیگی ـــ مصنف کا ردِیہ ـــ کرمان شیراز روانہ ہوتا ہے

اگلا باب کرمان شہر دھوبہ کے لئے وقف۔

---

۲۹ اپریل

ہم آج صبح چھ بجے سے پہلے روانہ ہوئے اور شمال سے مغرب کی طرف چوالیس میل سفر کیا۔ آخری اٹھائیس میل میں پانی نہیں تھا اور یہ سارا دشت کا سفر ہے۔ راستہ اچھا تھا اور بم سے آٹھ میل کے فاصلے پر ایک سرائے ہے جہاں لذیذ ترین پانی کا ایک گہرا کنواں ہے۔ میں آدھی رات کو پہاڑیوں کے ایک پست سلسلہ کے وسط میں گاؤں سبزستان میں ٹھہر گیا جہاں سے آٹھ میل شمال مغرب میں قصبہ تہروت واقع ہے۔

۳۰ اپریل

آج کے سفر کے پہلے بارہ میل مغربی سمت میں ایک دشت میں گذرے۔ اس کے بعد میں ایک اشکو نامی دریا کی قریباً خشک لیکن بہت عریض گذرگاہ میں داخل ہوا جس کے اندر اور متوازی سڑک چھ میل سے زیادہ تک چلتی رہی۔ پھر ہم نے اسے عبور کیا اور مزید دس میل دشت میں چلے اور پھر کھاری پانی کے ایک تالاب کے کنارے ٹھہر گئے۔ اشکو تہروت کے پاس سے گذرتا ہے اور بم کے شمال مغربی پہاڑوں کے عقبی صحرا میں خشک ہو جاتا ہے۔ اس کی گذرگاہ کہیں ڈیڑھ سَو یا دو سَو گز اور کہیں کہیں ایک میل سے بھی زیادہ چوڑی ہے۔ کنارے ڈھلوان اور اونچے ہیں۔ یہ کسی وقت جھاڑیوں اور درختوں سے بھرا پڑا تھا لیکن جفاکش کسانوں نے بہت سی جگہیں صاف کر کے گندم، نیشکر، تمباکو، کپاس وغیرہ کی فصلیں اگانا شروع کر دی ہیں۔ ریون کا قصبہ ایک بلند سلسلہ کوہ کے سائے میں واقع ہے اور ہمارے پڑاؤ سے بائیس میل جنوب مغرب میں ہے۔

یکم مئی

آج مَیں نے ایک بنجر اور چٹیل علاقے سے انتیس میل سفر کیا۔ سمت کبھی شمال مغرب

اور کبھی شمال مشرق رہی۔ سولھویں میل پر ایک پہاڑی کے پہلو میں ایک چھوٹا سا چشمۂ آب ملا۔ راستہ خراب اور پتھریلا تھا اور اس کے دو رویہ پہاڑ ایستادہ تھے۔

۱۲ مئی

آج صبح پانچ بجے سے شام نو بجے تک مسلسل چلتا رہا۔ سڑک خراب ترین تھی اور اونٹ بھی بے حد لاغر اور کمزور ہو گئے تھے اور سارا راستہ پیدل چلنا پڑا۔ لہٰذا تیس میل سے زیادہ سفر نہ ہو سکا۔ گو نوکروں کی شکوہ سنجیوں اور اپنے پاؤں کے ورم کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ہم نے اس سے دوگنا فاصلہ طے کیا ہو۔ چھبیسویں میل پر ہم قصبہ مہون سے گذرے جو کرمان سے چوبیس میل جنوب مشرق میں واقع ہے۔ یہ بہت چھوٹا سا قصبہ ہے جس کے گرد ہر قسم کے پھلوں کے درختوں سے مملو احاطہ بند باغات ہیں۔ کرمان شہر اور صوبہ کے گورنر شاہزادہ ابراہیم خان کی یہاں ایک شکار گاہ ہے جو فاصلے سے بہت شاندار عمارت معلوم ہوتی ہے۔ یہیں حکومت کرمان کے گھوڑے اور خچر فارغ ایام میں رکھے جاتے ہیں اور پانچ چھ بڑی بڑی سرائیں ان کے متعلقہ عملے وغیرہ کے لئے وقف ہیں۔ اس سے آبادی اور تجارت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور مہون کے قرب و جوار کے علاقے بہت سرسبز و خوشحال ہیں۔ میں نے یہاں پہلی دفعہ تحت الزمین آب رسانی کا طریقہ دیکھا جو کئی ایشیائی ممالک میں رائج ہے۔ ایرانی انہیں کاریزات کہتے ہیں۔ تیس سے نوّے فٹ تک گہرے اور چھ فٹ قطر کے گڑھے ایک سو یا ڈیڑھ سو قدم کے فاصلے پر کھودے جاتے ہیں اور بعد میں انہیں ایک زمین دوز خندق یا سرنگ کے ذریعے ملا دیا جاتا ہے۔ اس طرح عملِ تبخیر نہیں ہوتا اور چشمے بھی چونکہ اکثر خندق یا گڑھوں میں ہی ہوتے ہیں لہٰذا پانی اپنے بنیادی منبع سے فاصلہ طے کرنے کے باوجود گھٹنے کی بجائے اکثر بڑھتا ہے۔ بنیادی منبع عموماً ایسی بلندی پر ہوتا ہے جہاں چشمے یا نالے زیادہ ہوں۔ میں نے اس پانی کو تیس یا چالیس میل تک جاتے دیکھا ہے۔ اگر کوئی کھودی ہوئی جگہ گر جائے تو ایک اور کنواں کھود کر اسے آگے پیچھے ملا دیتے

ہیں تاکہ پانی جاری رہے۔ ظاہر ہے کہ کاریزات میں جفاتی محنت و مشقت درکار ہے لیکن ان کے بغیر ایران کے بڑے بڑے صوبے اور علاقے اُجڑ جائیں۔

۳ر مئی

میں آج صبح دو بجے پڑاؤ سے روانہ ہُوا۔ میں نام نہاد خطرناک سفر کے سلامتی سے کٹ جانے پر خدا تعالیٰ کا شکر گذار تھا اور بہت خوشی محسوس کر رہا تھا۔ میں دس بجے کرمان پہنچا۔ فاصلہ بیس میل طے کیا جو درمیانے درجے کے زیرِکاشت میدان پر مشتمل تھا، جس میں کئی دیہات اور باغات بھی تھے۔

میرا رہنما بازاروں سے ہوتا ہُوا کاروانسرائے پہنچا جہاں مجھے فوراً ایک چھوٹا سا کمرہ مل گیا۔ فوراً ہی سینکڑوں لوگ مجھے دیکھنے کے لیئے دروازے پر جمع ہو گئے اور مجھ سے انٹ سنٹ سوال پوچھنے لگے۔ میں انہیں نہایت احتیاط سے مناسب جواب دیتا رہا۔ پھر میں نے گندم کی روٹی منگوائی جو میرے لئے جنسِ نایاب تھی لیکن یہاں بازار میں کُھلے بندوں فروخت ہو رہی تھی۔ میں اتنی دیر سے فاقہ کشی کا عادی ہو چکا تھا اور میری توقعات اتنی دفعہ ناکام ہوئی تھیں بالخصوص نرمن شیر میں کہ مجھے اب بھی شک تھا کہ کرمان میں بھی روٹی دستیاب ہو گی!

ناشتے کے بعد میں نے لطف علی خان کے آدمی سے کہا کہ وہ محل میں جائے اور شہزادے کو میری آمد کی اطلاع دے اور میرے لئے کرمان میں کچھ عرصہ ٹھہرنے کی اجازت لے۔ اس پیغام کے جواب میں مجھے ایرانی نفاست و لطافت کے مبالغہ آمیز اسلوب میں یہ کہا گیا کہ میں شہزادہ اس کی ہر چیز کو اپنا سمجھوں اور میرے آرام کی خاطر شہزادہ مجھے اگلے دن ملے گا مجھے شرفِ ملاقات کی اتنی جلد توقع نہ تھی کیونکہ میرے پاس تو کپڑے ہی نہیں تھے۔ لیکن میرے مقابل کمرے میں رہنے والے ہندو نے رضاکارانہ طور پر اس موقعہ کے لئے مجھے کپڑے مہیا کرنے کا وعدہ کیا اور میں نے بلا حیل و حجت اس پیشکش کو قبول کر لیا۔ لیکن ہندو کا شرمندۂ احسان

ہونے کی خبر فوراً پھیل گئی اور قیام کرمان کے دوران مجھے اپنی عزت و تکریم میں کافی فرق محسوس ہُوا۔

اندھیرا ہُوا تو میں خوش ہُوا کہ مجھے لاتعداد ملاقاتیوں سے چھٹکارا ملا۔ میں نے ایک دکان سے بہترین پلاؤ منگوا کر خوب سیر ہو کر کھایا اور ایسے مزے کی نیند سویا جو پچھلے تین ماہ سے نصیب نہ ہوئی تھی۔

۱۴ رمئی

آج صبح میں نے شیراز کو ایک قاصد بریگیڈیئر جنرل میلکم کے نام خط دے کر روانہ کیا کہ مَیں بحفاظت کرمان پہنچ گیا تھا۔ ایک فارسی خط بنام محمد نبی خان (وزیر فارس اور سابقہ سفیر بہ حکومت ہند) بھی بھجوایا کہ اگر جنرل میلکم شیراز میں نہ ہو تو میرا خط اُس تک پہنچا دے اور عظمت مآب شہزادے کو مطلع کر دے کہ مَیں تین ہفتے تک شیراز پہنچوں گا۔

کوئی دس بجے ایک آدمی آیا اور اطلاع دی کہ شہزادہ دربار میں ہے اور وہیں میرا استقبال کرے گا۔ مَیں نے فوراً ہی مستعار کپڑے زیب تن کئے اور قاصد کے ساتھ بہت سی گلیوں سے ہوتا ہُوا محل میں پہنچا۔ تین چار اندرونی کمروں سے گذرنے کے بعد ہمیں عرض بیگی ملا اور میرا نام پوچھ کر شہزادے کے پاس گیا، جس پر مجھے فوراً بلا لیا گیا۔ عرض بیگی نے مجھے ہدایت کی کہ مَیں جو بہو اُس کی حرکات و سکنات کو دُہراتا جاؤں۔ جب ہم شہزادے کے سامنے آئے جو ایک دس فٹ اونچی کھڑکی میں نشستہ تھا (جو ایک چھوٹے سے صحن میں کھلتی تھی اور جس کے وسط میں ایک فوارہ آب افگن تھا) تو ہم جُھکے، پھر چند گز آگے چل کر دوبارہ جھکے، پھر ایسے ہی سہ بارہ جُھکے اور شہزادہ ہر دفعہ معمولی سا سر جُھکا کر گویا اشارۂ قبولیت کرتا رہا۔ مجھے امید تھی کہ اِس کے بعد مجھے دربار میں داخل ہونے اور بیٹھنے کی اجازت ہو گی، لیکن غالباً میرا لباس معیاری نہ ہونے کی وجہ سے مجھے اِس اعزاز کا اہل نہ سمجھا گیا اور مجھے صحن میں شاہزادہ کے مقابل بٹھا دیا گیا جس کی دیواروں کے گرد تمام سرکاری افسر دست بستہ

کھڑے تھے۔ عرض بیگی نے مجھے بھی ایسا کرنے کے لئے سرگوشی کی لیکن میں جانتا تھا کہ ایران میں یہ صرف ملازم پر اپنے آقا کے حضور میں واجب العمل تھا لہٰذا اُس کا اطلاق مجھ پر اور شہزادے پر نہ ہوتا تھا، پس مَیں نے ایسا نہیں کیا۔ جب مَیں بیٹھ چکا تو شہزادے نے بآواز بلند پوچھا کہ مَیں کہاں سے آیا تھا، کس لئے یہ سفر اختیار کیا تھا اور کس طرح خطرات سفر سے بچا تھا؟

محل جانے سے پہلے مَیں نے ایک کہانی گھڑ لی تھی کہ مَیں اور ایک اور افسر افواجِ ہند کے لئے گھوڑے منتخب کرنے کی غرض سے قلات گئے تھے۔ جہاں سے ہمیں سمندر کے راستے ایران میں جنرل میلکم سے ملنا تھا لیکن چونکہ ساحل پر اُترنے اور وہاں سے سوار ہونے کا موسم جا رہا تھا لہٰذا مَیں نے بلوچستان کے برّی راستے سے آنا پسند کیا۔ یہ شہزادے کے لئے تیر بہدف جواب تھا اور کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد اُس نے مجھے انہی رسمیات کے بعد رخصت کر دیا۔

محل میں کافی شان و شوکت ہے اور خوش پوش خدام بڑی تعداد میں موجود تھے۔ جس کمرے میں شہزادہ بیٹھا تھا وہ چھوٹا تھا اور آرائش و زیبائش میں دوسرے کمروں سے گھٹیا تھا، لیکن بعض بڑے کمرے بہت عظیم الشان ہیں۔ شہزادہ بذاتِ خود ایک وجیہہ انسان ہے، اُس کا رنگ زیتونی ہے اور وہ چھوٹی چھوٹی سیاہ داڑھی رکھے ہوئے ہے۔ وہ ایک سادہ ولایتی چھینٹ کی قبا[1] میں ملبوس تھا۔ اُس نے بخارا کے بزغالہ کی کھال سے بنی ہوئی سیاہ ٹوپی پہن رکھی تھی۔ وہ شاہِ ایران سے داماد، بھتیجا اور سوتیلا بیٹا کی حیثیتوں میں سہ گونہ منسلک ہے۔ نجی زندگی میں وہ ایک نرم اور شفیق انسان ہے اور بحیثیت گورنر منصف مزاج اور توازن پسند ہے۔ ایران میں ظلم و استحصال، اختیار و اقتدار کے ساتھ لازم و ملزوم سمجھے جاتے ہیں اور ان کے بعض مظاہر بُرائی نہیں گردانے جاتے لیکن اُس کے متعلق ایسے قصّے مشہور ہیں

---

[1] قبا اُلخلق سے ملتی جلتی ہے اور اُس کے اُوپر پہنی جاتی ہے۔ دیکھئے نوٹ ۲۳ر جنوری۔

جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اِن دونوں لعنتوں سے پاک ہے۔ کرمان کا شہر اور صوبہ ایران بھر میں اپنی بے اعتدالیوں اور بدعنوانیوں کے لئے ضرب المثل ہے۔ لہٰذا اُس کی سخت گیریوں سے چشم پوشی کرنا پڑتی ہے۔

میں اِس شہر میں ۲۵ مئی تک ٹھہرا کہ شاید کیپٹن کرسٹی بھی ہرات سے پہنچ جائیں۔ لیکن چونکہ اِس طویل قیام کے دوران ہونیوالے واقعات تعداد یا ندرت کے لحاظ سے میری ڈائری کے تسلسل کے متقاضی نہ تھے۔ لہٰذا میں ان میں سے صرف انہی کا مختصر ذکر کروں گا جو تفننِ طبع یا دلچسپی کا باعث ہوں اور پھر اِس صوبے کے مختصر احوال بیان کروں گا۔

شہزادہ سے ملاقات کے اگلے دن میں وزیر کے ہاں حاضر ہوا جس نے میرا نہایت پُرتپاک اِستقبال کیا اور مجھے اُسی نمدے پر بٹھایا جس پر وہ خود بیٹھا ہوا تھا۔ اِس کی عنایت والتفات کی وجہ وہ خط تھا جو میں نے پہلے دن محمد نبی خان کو لکھوایا تھا۔ جس آدمی سے میں نے یہ لکھوایا تھا اُس نے میرے پھٹے پُرانے کپڑوں سے میرے مقام کا اندازہ لگا کر پہلے ایک عریضہ لکھا، لیکن جب اُس نے مجھے یہ بتایا تو میں نے اُسے رَد کر دیا۔ اِس پر اُس نے پوچھا کہ جنرل میلکم سے میرے تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ مجھے اور کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آیا سوائے اِس کے کہ میں اُس کا رشتہ دار بن جاؤں۔ چنانچہ میں نے اُسے کہا کہ میں اُس کا بھتیجا ہوں۔ یہ بات وزیر کے کانوں تک بھی پہنچی اور یہی اصل میں اُس کی انتہائی شائستگی کی محرک تھی۔ میں کوئی ایک گھنٹہ اُس کے ساتھ ہمکلام رہا اور رخصت ہوتے وقت اُس نے مجھے اگلی شام کھانے کی دعوت دی جو میں نے منظور کر لی۔ چونکہ ایرانی ضیافتیں ایک ہی جیسی ہوتی ہیں لہٰذا اُس کو بالتفصیل بیان کرنے سے میرے قارئین اُن کے گھریلو برتاؤ اور رکھ رکھاؤ کا پورا اندازہ لگا سکیں گے۔

جب میں شام سات بجے اُس کے گھر پہنچا تو سب سے پہلے قلیان لایا گیا۔ یہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ قرنئ اور دستو یا سانپ اور ہتھ قلیان۔ پہلا ہندوستان کے حقوں کی طرح

پیچواں ہوتا ہے اور چمڑے کا بنا ہوتا ہے اور دوسرا (جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے) ہاتھ میں پکڑ کر ایک چھوٹی سی نالی سے پیا جاتا ہے جو اکثر سونے یا چاندی کی ہوتی ہے اور اس پر خوبصورت میناکاری کی جاتی ہے۔ وہ باری باری پیئے جاتے ہیں اور ان میں تازہ تمباکو دھرا جاتا ہے تاکہ ہر حقّہ نوش ایک وقت پر دس بارہ کش کھینچ سکے۔ جب ہاتھ دُھلا دیئے گئے تو اکل و شرب کا آغاز ہوا۔ پہلے مٹھائی اور دو قسم کا قہوہ لائے گئے۔ ان میں سے ایک میٹھا قہوہ کہلاتا ہے جو شربت اور مختلف قسم کے پھلوں کے رس سے تیار ہوتا ہے۔ یہ اور اصلی قہوہ چھوٹی چھوٹی چینی پیالیوں میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ہر پیالی میں میز کے چمچے کے برابر قہوہ دیا جاتا ہے اور عموماً اسے زرّیں یا نقرئی پرچ میں رکھ کر پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد انواع و اقسام کے پھل، اچار اور مربہ جات تازہ اور خشک حالت میں پیش کئے گئے اور اس کے ساتھ ہی طشتریوں میں شربت کے جام تھما دیئے گئے جن کے ساتھ ایک بڑی چوبی قیف لگی ہوئی تھی تاکہ ہر شخص حسب منشا پی سکے۔ اس کے بعد مہمانوں کے سامنے فرش پر ایک دسترخوان بچھایا گیا جس پر چوڑی پتلی روٹیاں پھینک دی گئیں۔ اس کے بعد پلاؤ، اسٹو اور دیگر کھانے طشتریوں میں لائے گئے اور ہر مہمان کے سامنے ایک ایک طشتری رکھ دی گئی۔ جب سب چیزیں رکھ دی گئیں تو وزیر نے بسم اللہ پڑھ کر کھانے کا آغاز کیا، اور پھر ہر شخص کھانے میں مصروف ہو گیا۔ نوکر کمرے کے وسط میں کھڑے رہے تاکہ ہمیں حسب ضرورت شربت یا پانی دیتے رہیں۔ ہمارے میزبان نے میری خاطر شراب بھی منگوانا چاہی لیکن میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں نے تو اسے کئی ماہ سے چھوا بھی نہ تھا اور برف دار شربت مجھے بے حد پسند تھے۔ گوشت کے کم و بیش تین دور چلے اور چونکہ اتنی دفعہ اتنی پلیٹوں کا اٹھانا اور نئی کا آنا اچھا خاصا تھکا دینے والا کام تھا لہٰذا رخصت ہونے کے وقت میں بے حد خوش تھا۔

پیران کا مقبول ترین کھانا ہے اور عین ہمارے ڈنر سے ملتا جلتا ہے۔ وہ اس

وقت سے اگلی دوپہر تک کچھ نہیں کھاتے جو اُن کے ناشتہ کا وقت ہے، سوائے اس کے کہ صبح صبح تھوڑا تازہ پھل کھالیں۔ ان کے کھانوں میں دو تین چیزیں نہایت تکلیف دہ ہیں۔ تمہیں اپنے سے آگے پڑے ہُوئے کھانوں کو بھی کھانا پڑتا ہے یا پھر کوئی ایسا آدمی ہو جو کھانوں کے درمیان پاؤں رکھ کر تمہیں تمہاری پسندیدہ یا مطلوب چیز تمہیں پہنچا دے، اور اہلِ یوروپ کے لئے کھانے کے برابر آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کا طریقہ آرام دہ نہیں ہے بلکہ ایرانی بھی آرام سے نہیں بیٹھ سکتے۔ انگلیوں سے کھانے کی وجہ سے دست پاک بھی ضروری ہیں لیکن یہ کبھی نہیں لائے جاتے۔ بہت سے ایرانی ان کی جگہ روٹی استعمال کرتے ہیں، اور چونکہ یہ باریک ہوتی ہے اور دو تین فٹ مربّع کے ٹکڑوں میں پکائی جاتی ہے لہٰذا یہ ایک معقول متبادل بن جاتی ہے۔ ایک اور قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ مختلف ڈونگوں کے لئے علیحدہ علیحدہ چمچے نہیں ہوتے۔ مُرغا یا برّہ نہایت بے تکلفی سے ٹکڑے ٹکڑے کر لیا جاتا ہے جو ہمارے نظریاتِ صفائی سے متصادم ہے۔ لیکن ایک آدمی کو ہاتھ چاٹتے ہوئے دیکھنا اور پھر اُس کا اسی چکنے ہاتھ کو ڈونگے میں ڈال دینا جس میں اُس کے ہم نشین کا بھی ویسا ہی ہاتھ ہو، واقعی ایک وحشیانہ اور کراہت انگیز منظر ہے!

ایرانیوں کے علاوہ شاید ہی کوئی اور لوگ ہوں گے جو گھر میں آئے ہوئے مہمانوں یا اجنبیوں سے ان کی طرح حسنِ سلوک سے پیش آتے ہوں اور اگر ان میں اپنی برتری کا زعم نہ ہوتا تو وہ نہایت خلیق اور ملنسار رفقاء بنتے لیکن انانیت اور 'پدرم سلطان بود' کا جذبہ اُن کے ہر کہہ و مہ کی گھٹی میں پڑا ہُوا ہے جس کی وجہ سے وہ بچپن سے ہی گستاخی کی حد تک خودستائی کے عادی ہوتے ہیں۔

باہمی تعلقات میں اپنے برابر والوں کے ساتھ ایرانی بامروّت اور پرخلوص ہیں۔ بڑوں کی وہ چاپلوسی اور خوشامد کرتے ہیں اور چھوٹوں کے ساتھ تحکمانہ اور جابرانہ ہوتے ہیں۔ ہر طبقے کے لوگ یکساں طور پر حریص، خسیس اور بے ایمان ہیں لیکن بشرطیکہ انہیں موقع ملے اور پھر

انہیں پکڑے جانے کی بھی پرواہ نہیں ہوتی، بشرطیکہ وہ اپنی برتر ذہانت وفطانت سے فائدہ اٹھا چکے ہوں۔ اگر ان کا الّو سیدھا ہو سکے تو وہ دروغ گوئی کو نہ صرف جائز بلکہ انتہائی طور پر قابلِ تعریف سمجھتے ہیں اور وہ نیک نیتی، فیاضی اور تشکّر سے بے بہرہ ہیں۔ زناکاری میں تو ان کا کوئی ثانی ہی نہیں اور ان کے بعض رجحانات تو اتنے پست اور قابلِ نفرت ہیں کہ قلم پر نہیں لائے جا سکتے۔ قصّہ مختصر میں ایرانی کردار کے اس خاکے کو بلا خوفِ تردید یہ کہہ کر ختم کرتا ہوں کہ میرے اپنے مشاہدے کے مطابق موجودہ ایران ایسے ہمہ نوعی ظلم، جبر، بے مائگی، انصاف کشی، استحصال اور سیاہ کاری کا سرچشمہ ہے جو فطرتِ انسانی کو رسوا یا آلودہ کر سکتا ہے اور جو شاید معدودے چند ادوار یا اقوام میں پایا گیا ہو۔[1]

وزیر سے ملاقات کے چند روز بعد میں کاروانسرائے کے اپنے کمرے میں ایک ہندو سے مصروفِ گفتگو تھا کہ ایک خود پسند شخص نفیس ریشمی کپڑے پہنے اتراتا ہوا داخل ہوا۔ اس کے جلو میں ایک قلیان بردار نوکر بھی آیا۔ وہ اس کے استقبال کے لیے میرے نہ اٹھنے پر سخت حیران ہوا اور ہندو سے وجہ پوچھی تو اس نے اسے بتایا کہ میں فارسی سمجھتا اور بولتا تھا۔ اس پر اس نے وہی سوال متکبرانہ اور حقارت آمیز لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ میں نے اسے جواباً کہا۔ "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں کرمان میں اس لیے آیا ہوں کہ ہر ایرے غیرے کی آمد پر کھڑا ہو جاؤں؟"

---

[1] شاید میرے بعض قارئین اس تجزیہ کو بہت سخت سمجھیں۔ لیکن اگر ان میں سے چند کو ان لوگوں سے ربط وضبط کا موقع ملا ہو تو وہ ایسا نہ سمجھیں گے۔ میں ان حقائق کی بنا پر یہ کہہ رہا ہوں جو میں نے دیکھے یا موثق و معتبر ذرائع سے سنے۔ میں ایک خواندہ ایرانی کو جانتا ہوں جس نے اپنے محسن علیم سے روپیہ ٹھگ لیا اور جب اسے ڈانٹا گیا تو اس نے کہا کہ یہ اس کے تصرّف میں دیا ہی کیوں گیا تھا؟ ہر برائی جو میں ان سے منسوب کرتا ہوں میرے دائرہ مشاہدات میں اس کے لئے بے شمار مثالیں ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ برائیاں سلطنت کے دیگر حصوں کی نسبت دربار کے قرب وجوار میں کچھ زیادہ ہی ہیں۔

اس نے جواب دیا کہ جب شرفا آئیں تو مجھے ایسے ہی تعظیم کرنا چاہیئے۔ لیکن جب میں پھر بھی نہ ہلا تو وہ کہنے لگا۔" ایک کافر فرنگی سے اسی رویّہ کی توقع تھی۔ اس پر میں نہ رہ سکا، کھڑا ہوا اور اپنے ایک براہوئی سے کہا کہ اِسے باہر نکال دے، چنانچہ وہ کھسک گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شہزادے کا صرف پیش خدمت (ذاتی نوکر) تھا۔ اس تکرار کی خبر پوری سرائے میں پھیل گئی اور میرے ملاقاتی اس کے بعد اپنے اطوار و خیالات میں زیادہ محتاط ہو گئے۔ مجھے اب اِن سے بچنے کے لئے دروازے بند کر کے اندھیرے میں نہ بیٹھنا پڑتا تھا کیونکہ مجھے ان لوگوں سے مِل کر خوشی ہوتی تھی جن سے مجھے معلومات ملتیں یا کم از کم تفنن طبع کا سامان ہوتا لیکن ایسے لوگ بہت خال خال تھے اور زیادہ تر جاہل، کاہل بلکہ چیچڑ قسم کے ہوتے تھے جو میرے لئے وبالِ جان بنے رہتے تھے۔ مجھے ایک دن خاص طور پر یاد ہے جب میں شال کا کارخانہ دیکھ کر واپس آیا تو میں نے آٹھ لوطیوں (ریچھ والے) اور ان کے ریچھوں کو اپنے کمرے میں پایا۔ مجھے اچھی خاصی رقم دے کر ان سے چھٹکارا ملا اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ دوبارہ نہیں آئیں گے اور وہ واقعی اس پر قائم رہے۔ یہ لوطی ایران کے بھانڈ ہیں اور شاید سلطنت بھر میں واحد بے فکرے ہیں جو اپنی مرضی کے مطابق کہتے اور کرنے میں آزاد ہیں اور شاہی خاندان کے افراد اور سرکاری عمّال انہیں کبھی اشتعال نہیں دیتے۔ وہ کبھی کبھی شاہ کے زیرِ عتاب اُمرائے سے بدلہ لینے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں اور ان کی بیویاں اور دونوں اصناف کے بچّوں کو بدترین مقاصد کے لئے ان کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔[1]

۱۵ مئی کو شہزادے نے عدالت لگائی تاکہ اپنے نوکر کے قاتلوں کا فیصلہ کر سکے،

---

[1] ۔ میرے خیال میں اِس ایرانی رسم کی کوئی مثال موجودہ حکومت میں نہیں ملتی۔ آغا محمد خان کے وقت یہ اکثر ہوتا تھا۔

اور سب لوگ ایک ناقابلِ تصوّر دہشت و تذبذب میں رہے۔ شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے، باہر نکلنا ممنوع ہو گیا اور سرکاری دفاتر میں کام بند رہا۔ لوگوں کو بلا اطلاع گواہی کے لئے بلایا گیا اور میں نے دو تین مصیبت زدوں کو محل کی طرف ایسے جاتے ہوئے دیکھا جیسے وہ صلیب گاہ کی طرف جا رہے ہوں۔ کوئی تین بجے شام شہزادے نے فیصلہ دیا اور کچھ کو اندھا کر دیا گیا اور ان کے کان، ناک، زبانیں اور ایک یا دونوں ہاتھ کاٹ دیئے گئے اور کچھ کو آختہ کر کے ان کی انگلیاں اور انگوٹھے کاٹ دیئے گئے اور پھر ان سب کو گلیوں میں چھوڑ دیا گیا اور لوگوں کو تنبیہہ کر دی گئی کہ وہ ان کی کوئی مدد نہ کریں اور ان سے کوئی رابطہ نہ رکھیں۔

ایسے مواقع پر شہزادہ زرد سُوٹ پہنتا ہے اور اسی رنگ کا کپڑا اس کے قالین پر بچھایا جاتا ہے۔ اسے 'غضب پوشاک' کہتے ہیں۔ اِس پوشاک کے دوران وزیر بھی بلا حکم نہیں بول سکتے۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ اسی کھڑکی میں بیٹھا تھا جس میں وہ میری ملاقات کے وقت بیٹھا تھا۔ وہ اِن بدنصیب مجرموں کی قطع و برید کے وقت بیٹھا احکامات جاری کرتا رہا اور اِس زہرہ گداز منظر کو دیکھتا رہا!

ایک صبح ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اپنے نوکر کے ساتھ میرے کمرے میں آیا اپنے نوکر کو فارغ کیا اور دروازہ بند کرنے کی درخواست کی تاکہ وہ خلوت میں بات کر سکے۔ مَیں نے اجازت دے دی اور اُس نے عیسائیت کی خوبیوں پر ایک طویل وعظ دے کر مجھے بتایا کہ وہ عیسائی ہونا چاہتا تھا اور اس کے اہم اصول بتانے کی التجا کی۔ مَیں اس اعلان اور درخواست پر کافی حیران ہُوا لیکن چونکہ مَیں اس کے خلوص کا شاکی تھا، لہٰذا مَیں نے اُسے کہا کہ ان اصولوں پر روشنی ڈالنا میرے بس سے باہر تھا، بلکہ نہ رہنمائی کی اہلیت رکھتا تھا نہ اختیار، لیکن اگر وہ واقعی سیکھنا چاہتا تھا تو ہندوستان چلا جائے جہاں اُسے رہنما مل سکیں گے۔

اس میں ناکام ہو کر اس نے مجھے یقین دلایا کہ کرمان میں چھ ہزار آدمی انگریزوں کی آمد کے منتظر تھے اور پھر پوچھا کہ وہ کب آئیں گے۔ میں نے ان کے لفظ 'شما' کا معنی انگریز قوم کی بجائے صرف اپنی ذات لیا جس پر اس نے چڑ کر کہا۔ "تم مجھ پر اعتبار نہیں کرتے ہو؟ تم میری بات کیوں نہیں سمجھتے؟ میں تمہیں اپنا دوست بنانا چاہتا ہوں اور چھ ہزار آدمی میرے سپرد ہیں!" میں یہی ظاہر کرتا رہا کہ میں اس کا مطلب نہ سمجھ رہا تھا۔ پھر بھی میں نے کہا کہ اہلِ یورپ کسی ناآشنا کو رازدار بنانے کے قائل نہ تھے۔ وہ جواب دینے ہی والا تھا کہ ایک تیسرا آدمی اندر آ گیا اور مخبر رفو چکر ہو گیا۔[1]

اسی شام میں نے ایک غیر معمولی تقریب دیکھی جو میرے قیام کرمان کے دوران دو تین دفعہ دہرائی گئی۔ شام کے کوئی پانچ بجے کاروانسرائے کے چوک میں چار پانچ سو آدمیوں کا مجمع ہوتا اور ایک ملا وسط میں ایک منبر پر چڑھتا اور پھر نہایت بلند اور گرجدار آواز میں آنحضور کے داماد علیؓ کی مہمات و مصائب کا کچھ اس طرح ذکر کرتا کہ سب لوگ زار و قطار رونے لگتے۔ شروع شروع میں میں ان کے اس نوحہ کو مصنوعی سمجھتا رہا، لیکن جلد ہی یہ غلط ثابت ہو گیا۔ ملا پڑھتے پڑھتے رک جاتا اور کوئی دس منٹ تک آہ و زاری کرتا تھا اور حاضرین بھی ایسے ہی متاثر و مغلوب ہوتے تھے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں بھی اس منظر پر متاثر ہوتا تھا اور میرے آدمی بھی قریب قریب ایرانیوں کی طرح اشکبار ہو جاتے

---

[1] جنرل میلکم کے مشن پر جاسوسوں کا تقرر ایرانی حکومت کے عمومی رویہ کے خلاف تھا۔ اس کا مقصد صرف حکومت اور اس کے وسائل کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن یہ واقعہ یقیناً جاسوسی کا تھا۔ کوئی آدمی یوں میرے پاس شہزادے کے حکم کے بغیر نہ آ سکتا تھا اور اس کی تصدیق معلوم ہو گئی کہ یہ [illegible] عیسائیت کا دلدادہ حکومت کا ایک ادنیٰ ملازم تھا۔

تھے ۔ مجمع دس بارہ سالہ بچوں سے لے کر ستر اسی سالہ بوڑھوں پر مشتمل ہوتا تھا اور ان سب کو یوں دردناک طور پر روتے دیکھ کر اس مذہب کے احترام و جلال کا معترف ہونا پڑتا تھا ، جو خواہ کتنا ہی غلط ہو اپنے پیروؤں پر اتنا کامیاب اثر رکھتا تھا ۔

۲۵ کو ایک کارواں شیراز کے لیے روانہ ہونے والا تھا ، لہٰذا میں نے بھی سوچا کہ کیپٹن کرسٹی کی ہرات سے آمد کا انتظار بے سود تھا اور اسی کے ساتھ جانے کی تیاری میں لگ گیا ۔ وزیر کو پتہ چلا تو اس نے ۲۴ کو میرے پاس پیغام بھیجا کہ آیا میں روانگی سے پہلے رخصت کے لئے شرفِ ملاقات چاہتا تھا یا نہیں ۔ چونکہ شہزادے نے مجھ پر معمولی سی توجہ بھی نہ دی تھی لہٰذا میں نے اس سے انکار کر دیا ۔

ایلچی کو گئے ہوئے ایک گھنٹہ گذرا تو کارواں سرائے کا داروغہ آیا اور ایک روپیہ فی اونٹ اور فی گھوڑا (جو میں نے چند روز پہلے خرید لیا تھا) مروّجہ ٹیکس طلب کیا ۔ چنانچہ میں نے تین روپے اسے ادا کر دیئے اور سمجھا کہ مزید کچھ نہ دینا پڑے گا کیونکہ سرائے شہزادے کی ذاتی ملکیت تھی ۔ لیکن اگلی صبح وہ پھر آیا اور کمرے کا کرایہ مانگا ۔ یہ رقم صرف ایک نیم روپیہ اور تانبے کے چند سکے تھے ، لہٰذا میں نے ازراہِ تجسس اس سے پوچھ لیا کہ کس کے حکم پر وہ یہ رقمِ گراں طلب کر رہا تھا اور اس نے عین میری توقع کے مطابق جواب دیا کہ شہزادہ کے حکم پر ، کیونکہ اگر میں اس سے مل لیا ہوتا تو یہ کرایہ اور ٹیکس مجھے معاف ہو گیا ہوتا ۔ میں نے اسے سفلہ پن کی انتہا سمجھا اور داروغہ سے پوچھا کہ یہ رقم خواہ ہزاروں میں بھی ہو میرے لئے یا برطانوی حکومت کے کسی بھی افسر کے لئے کیا معنی رکھتی تھی ؟ میں نے اُسے مزید یاد دلایا کہ شہر میں آمد کے فوراً بعد میں نے شہزادہ سے مل کر اپنا فرض ادا کر دیا تھا اور اس کا فیصلہ اب مجھی پر تھا کہ مجھ سے مناسب سلوک کیا گیا یا نہیں ؟

داروغہ ایرانی ہونے کے باوجود اپنے آقا کے رویّہ پر شرمندہ ہُوا اور اس کے جواز میں کچھ کہنے کو ہی تھا کہ میں نے اُس کے ہاتھ میں ایک روپیہ تھما دیا

اور کہا کہ شہزادے سے کہہ دینا کہ وہ اِس تبدیلی پر خوش ہوگا۔

داروغہ نے روپیہ جیب میں ڈال لیا اور اپنے نوکروں سے میرے تاثرات کی صداقت کے بارے میں کچھ کہا اور چلا گیا۔ اس کے بعد مَیں نے شہزادہ یا اس کے نائبین کا کچھ نہیں سنا اور اسی دن تین بجے بعداز دوپہر مَیں شہر کرمان سے روانہ ہو گیا۔ اگلا باب اِسی شہر اور صوبہ کے مختصر لیکن جامع بیان پر مشتمل ہوگا۔
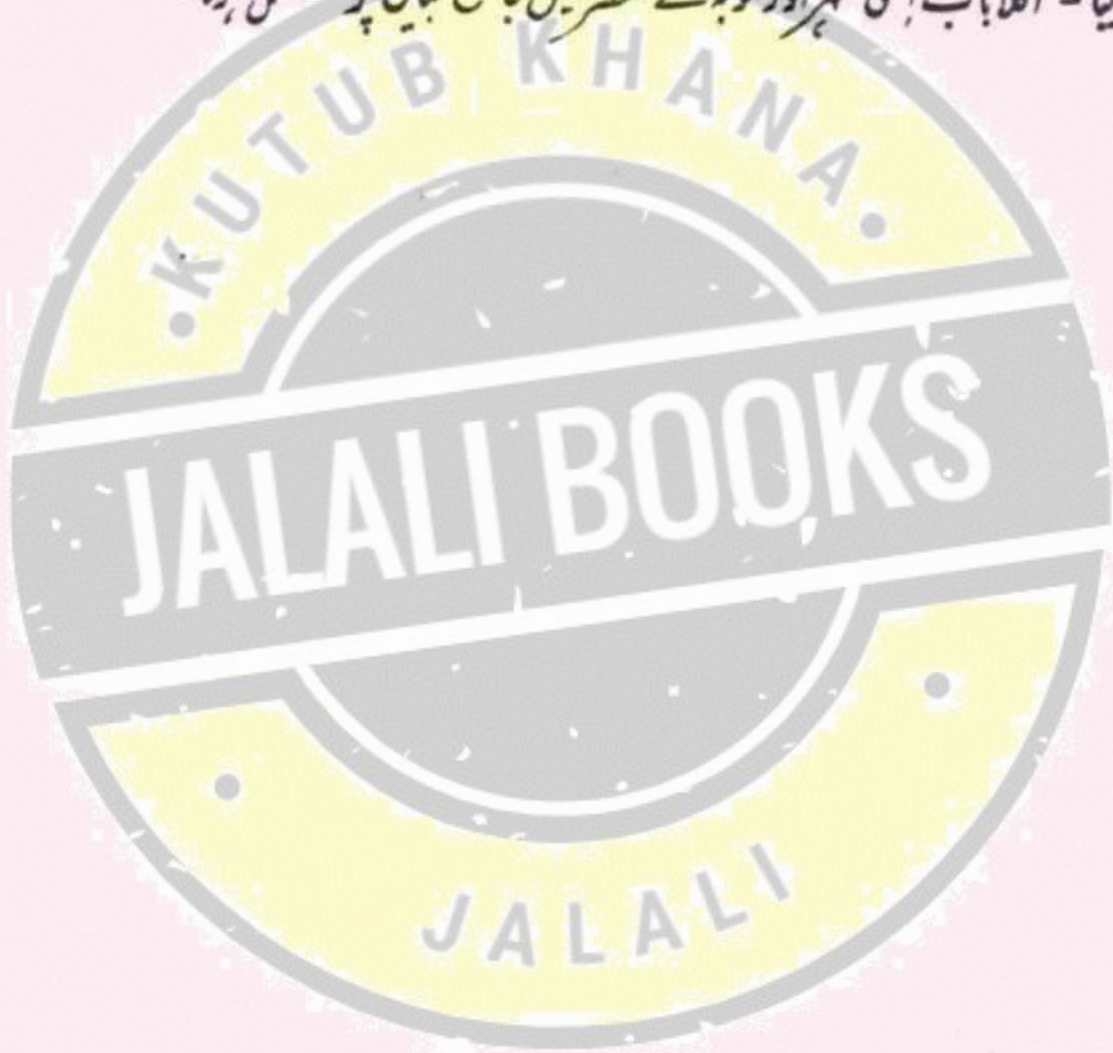
باب دوم

صوبہ کرمان ــ حدود اربعہ ــ تقسیم ــ طول ــ عرض ــ زمین کی نوعیت ــ سطح ــ دریا نداروـ ــ چشمے ــ کاریزات ــ صحرا کی غلبہ پذیری ــ پہاڑ ــ برف باری گرمامیں ــ آب و ہوا پر بُرے اثرات ــ گرم سیر ــ شہر کرمان ــ محلِ وقوع ــ کسی وقت بہت دولت مند ــ وجہ ــ اس کا قدیم بیان ــ اس کے نام کی روایات ــ عجیب و غریب ــ ان کا نتیجہ ــ شہر کے مختلف نام ــ آخری محاصرہ ــ کون تھا ــ آخری زند کی شکست ــ موجودہ شاہ کے چچا کی بربریت ــ شہریوں پر اُس کی فوج کے مظالم ــ شہر کی بربادی اور بے آبادی ــ دوبارہ کب تعمیر ہُوا ــ گورنر کا محل ــ بازار ــ کاروانسرائے ــ آبادی ــ تجارت ــ مصنوعات ــ کرمانی اُون ــ شال ــ ان کا انوکھا پہلو ــ اون کی حیران کُن نفاست ــ کھڈی کے لئے اس کی تیاری ــ کرمان کی درآمد و برآمد ــ آمدنی ــ کیسے ــ صوبہ کی آمدنی ــ قصبات ــ گمبرون یا بندر عباس ــ کرمان سے فاصلہ ــ سڑک کی حالت ــ اس قصبہ کی مختصر تاریخ ــ اب کس کے قبضے میں ہے ــ خراج ــ اصلی حالت ــ آبادی ــ صحرائے کرمان ــ وسعت ــ افغان لشکر کے مصائب ــ قصبہ ــ خبیس ــ قابلِ ذکر محلِ وقوع ــ باشندے ــ ان کا پیشہ ــ راستے اور بیان کا تسلسل۔

صوبہ کرمان کے مشرق میں سیستان اور بلوچستان، مغرب میں صوبہ فارس، جنوب میں لارستان، مکران اور خلیج فارس اور شمال میں عراق اور خراسان ہیں۔ یہ قدیم الایام سے دو حصوں میں منقسم ہے۔ قابلِ سکونت اور صحرائی۔ اور میں پہلے قابلِ سکونت حصّہ پر ہی لکھوں گا۔ نرمن شیر میں واقع ریگان سے لے کر فارس کی حدود پر واقع رباط تک اس کی انتہائی لمبائی تین سو پینسٹھ میل ہے[1] اور عراق عجم کی جنوبی حدود سے لے کر خلیج فارس کے ساحل پر واقع قصبہ گمبرون یا بندر عباس تک اس کی چوڑائی دو سو اسّی میل ہے۔ اس علاقے کی زمین زیادہ تر غیر زرخیز اور سطح بنجر اور ویران ہے۔

صوبے میں کوئی دریا نہیں[2] اور اگر خدانخواستہ پہاڑی علاقوں میں چند چشمے اور کاریزات (بیان کردہ در ڈائری ۲۸ مئی) نہ ہوتے تو لوگ زندہ ہی نہ رہ سکتے۔ لہٰذا پانی بہت توجہ اور محنت سے حاصل کیا جاتا ہے اور پھر بھی وہ اتنا نہیں ہوتا کہ بہت تھوڑے سے رقبے پر کاشت ہو سکے۔ نرمن شیر اس خشکی سے مستثنیٰ ہے لیکن وہاں بھی پانی پچھلے بیس سال میں کم ہو گیا ہے اور بم اور کرمان پہنچنے سے پہلے میں جن بے آب و گیاہ علاقوں سے گذرا وہ اس بات کے غماز ہیں کہ صحرا اس طرف غلبہ پذیر ہے اور یہاں کے باشندے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

عام اندازے کے مطابق کرمان ایک پہاڑی صوبہ ہے۔ اس کا بڑا سلسلۂ کوہ نرمن شیر کو

---

[1] میں خطِ مستقیم کے لحاظ سے [illegible] اور راستے کے موڑ تو ریگان تا رباط فاصلہ کو دوگنا کر دیں گے۔

[2] چونکہ میں اس صوبے میں مشرق سے مغرب کی طرف سفر کر رہا تھا لہٰذا میں یہ غیر مشکوک شہادت کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ شہر بم چھوڑنے کے دن (۳۰ اپریل) میں جس دریائے اشکور سے گذرا وہ صرف ایک بارانی پہاڑی نالہ ہے۔ کرمان سے بندر عباس تک اٹلسی یقیناً چار گذرگاہیں ہیں لیکن میرے خیال میں ان پر لفظ دریا کا اطلاق غلط ہو گا۔

لارستان سے جدا کرتا ہے اور پھر جنوب مغربی سمت میں چل کر گمبرون سے چار دن کے فاصلے پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ ساحل سے مڑتا ہے اور مغرب اور شمال مغرب کی طرف سے ہوتا ہوا عرض بلد ۴۰ ، ۲۹ درجے شمال اور طول بلد ۵۰ درجے مشرق میں فارس کے پہاڑوں سے جا ملتا ہے۔ اس دوران اس کی بے شمار شاخیں شمال اور جنوب کی طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ شمالی شاخوں بالخصوص مشرقی سمت والی صحرا تک پھیلی ہوئی ہیں اور عرض بلد کے تیسویں اور اکتیسویں درجے کے درمیان ختم ہو جاتی ہیں جبکہ مغربی صوبہ عراق تک پہنچی ہیں۔ کئی جگہوں پر ان کی بلندی صرف اتنی ہے کہ انہیں پہاڑیاں ہی کہا جا سکتا ہے، لیکن دوسری جگہوں پر وہ اتنی ہی بلند ہیں جتنا کہ اصل پہاڑ۔ وہ اس علاقے کو اس طرح کاٹتی ہیں کہ ان سے برآمد ہونے والے میدان شاذ و نادر ہی دس بارہ میل سے زیادہ عریض ہیں، گویا ان کا طول غیر معیّن ہوتا ہے۔

صوبے کی آب و ہوا اس کی سطح کی طرح مختلف النّوع ہے اور یہ ایران میں سب سے کم صحت بخش ہے۔ یہاں موسلادھار بارش شاذ و نادر ہی ہوتی ہے لیکن سردی میں پہاڑوں پر بے اندازہ برف جمتی ہے اور سال کا بیشتر حصّہ بوجہ بلندی جمی رہتی ہے۔ لہٰذا جب میدانی لوگ گرما کی شدّت سے ہانپ رہے ہوتے ہیں تو ان کے پاس کے پہاڑ برف آلود ہوتے ہیں۔ ان سے چلنے والی ہوا نہایت ٹھنڈی اور فراواں ہوتی ہے لیکن اپنے جلو میں تپ لرزہ اور دیگر بیماریوں کو لاتی ہے لہٰذا لوگ اس سے ڈرتے ہیں اور اس کے مضر اثرات سے مصیبت اٹھاتے ہیں اور وہ گرم ترین موسم کو ہی پسند کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا سلسلۂ کوہ کے جنوب میں اور اس کے دامنوں اور سمندر کے درمیان گرم سیر (یا گرم علاقہ) واقع ہے جو چوڑائی میں تقریباً نوّے تا تیس میل کی ایک تنگ پٹی ہے اور ایران کے ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ لارستان کے دارالحکومت میناب سے شط العرب (یا بصرہ کا دریا) کے دہانہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ کرمان کی حدود کے اندر یہ

علاقہ قریباً پورے کا پورا شور ریت پر مشتمل ہے اور یہاں کی آب و ہوا بالخصوص مضرِ صحت ہے۔ اس میں صرف گھٹیا درجے کی کھجوریں ہوتی ہیں اور نتیجتہً یہ قریباً غیر آباد ہے۔

شہر کرمان ۲۹.۵۶ درجے شمالی عرض بلد اور ۵۶.۰۶ درجے مشرقی طول بلد میں ایک وسیع و عریض میدان کے مغرب میں پہاڑوں کے عین قریب واقع ہے جن میں سے دو (جن کے اوپر قدیم مسمار قلعے ہیں) نے تو اسے آغوش میں لے رکھا ہے۔ یہ کسی وقت ایران کا خوشحال ترین شہر تھا اور وسعت میں دارالحکومت اصفہان سے ہی دوسرے نمبر پر تھا۔ یہ خراسان، بلخ، بخارا، ماوراء النہر اور ایرانی سلطنت کے دیگر شمالی حصوں سے براہِ راست بندر عباس سے مربوط و منسلک ہونے کی وجہ سے عظیم ترین تجارتی مرکز تھا اور دولت، عیش و عشرت اور شان و شوکت کا گڑھ تھا۔ اس مشہور شہر کے اصل بانی کے متعلق کوئی مثبت شہادت موجود نہیں اور میں صرف اتنی ہی کھوج لگا سکا کہ عرب حملہ کے وقت آخری ایرانی بادشاہ یہاں پناہ گزین ہوا اور اسے اپنا دارالسلطنت بنا لیا، حتیٰ کہ پوری سلطنت فتح ہو گئی اور زردشت کے پیرو منتشر ہو گئے۔

مجھے فتح مکران کے ایک نوّے ہجری کے تاریخی مسوّدے سے پتہ چلا ہے کہ اس وقت کرمان ایک بڑا شہر تھا، دولت سے مملو (بموجب مشرقی محاورہ) اور اپنی عمدہ شالوں اور اسلحہ کی وجہ سے مشہور تھا۔ مجموعی طور پر ہم شاید اس کی بنیاد یا کم از کم (اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد بھی) اس کی شوکت و ثروت کی ابتداء کو ساحل کرمان پر واقع شہر ہرمز کا ہم عصر قرار دے سکتے ہیں جسے ساسانی خاندان کے کسی ابتدائی شہنشاہ نے بنوایا اور مذکورہ بالا مسوّدہ کے اعتبار سے اسی کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں کئی روایات ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ یہ لفظ 'خرمن' سے نکلا ہے جس کا معنی ہے اناج گھر اور یہ بوجہ نباتات ہوا جو اسے نصیب رہی۔ اس کے ماخذ اور نام کی دوسری روایت یہ ہے کہ ایک گبر شہزادی موجودہ شہر کے محلِ وقوع کے قریب ایک سیب کھا

رہی تھی کہ اُس کے وسط سے ایک کرم یعنی کیڑا نکلا اور اُس نے اُسی وقت قسم کھائی کر وہ عین اسی جگہ ایک شہر بسائے گی جو سیب کے کیڑے کی طرح اپنے گرد و پیش سے بہرہ مند و خورسند ہو گا۔ یہ توجیہات افسانوی ہیں اور کوئی وقعت نہیں رکھتیں، لیکن یہ اُس کے محلّ وقوع کے حسنِ انتخاب کی تائید ضرور کرتی ہیں جس کی بناء پر اُس نے اتنے خوفناک نشیب و فراز دیکھے کیونکہ مشرق کا کوئی اور شہر اُس کی طرح گردشِ ایام کا تختۂ مشق یا مہلک ترین اندرونی اور بیرونی جنگوں کا شکار نہیں رہا۔

ان کی تفصیلات میں جانا میرے دائرہ کار میں شامل نہیں۔ خلفاء، چنگیز خان، تیمور لنگ افاغنہ اور نادر شاہ نے بار بار اور یکے بعد دیگرے اسے لُوٹا اور تباہ کیا۔ باہمی چپقلشیں ان کے علاوہ تھیں جنہوں نے اسے اکثر فاتح کے لئے لقمۂ تر بنا دیا۔ اس قسم کا آخری واقعہ ۱۷۹۴ء میں پیش آیا جب اسے آغا محمد خان (موجودہ شاہ کا چچا اور قاچار خاندان کا بانی) کے سپرد کر دیا گیا جس نے اسے کئی ماہ تک محاصرے میں لئے رکھا اور جس کے دوران دریا دل لطف علی خان نے حیران کُن استقلال اور پامردی سے مقابلہ کیا گو اُس کے مصائب کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ دو تہائی فوجی اور باشندے بھوک اور پیاس کی وجہ سے لقمۂ اجل بن گئے تھے[1]۔

آخر کار ۲ جولائی ۱۷۹۴ء کی رات کو ایک سردار، نجف قلی خان کو جان بخشی اور انعامات وافر کے بدلے اس پہ تیار کر لیا گیا کہ وہ آغا محمد خان کا ایک دستہ اس دروازے سے داخل ہونے دے جو اس کے زیرِ کمان حصّہ میں تھا۔ چنانچہ یہ دستہ داخل ہُوا اور اُس نے ایک ادھورے دروازے کو توڑ دیا اور ساری فوج اندر آ گئی۔ لطف علی خان یہ حالت دیکھ کر گھوڑے پر سوار ہُوا اور چند جاں نثاروں

---

[1] لطف علیخان زند خاندان کا آخری فرماں روا تھا۔ اکثر ایرانی آج بھی اس کی موت کا افسوس کرتے ہیں کیونکہ وہ بہادر بھی تھا اور تنگ دستی میں بھی دریا دل، جو ایرانیوں میں شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

کے ساتھ دشمنوں کو چیرتا پھاڑتا ہُوا رات کے اندھیرے میں نکل گیا اور بم چلا گیا۔ جہاں کے گورنر نے اسے دھوکے سے پکڑ لیا[1] اور آغا کے پاس بھیج دیا۔ آغا نے بدستِ خود اس کی آنکھیں نکال دیں اور بعد میں اسے طہران میں گلا گھونٹ کر مار دیا گیا تھا[2]۔ شہر کو تین ماہ کے لیے ایک مستقل اور بے لگام فوج کی لوٹ مار اور قتل و غارت کی نذر کر دیا گیا۔ شہریوں کی بیویوں اور بیٹیوں بلکہ کم سن بچوں تک کو ان کے شوہروں اور والدوں کے سامنے بر سر بازار نشانۂ ہوس بنایا گیا اور پھر یوں ان کو بے عزّت و دریدہ عصمت کر کے انہیں واپس لینے یا ختم کر دینے پر مجبور کر دیا گیا۔ شہر کی تمام قلعہ بندیاں اور شاندار عمارات (جو افغانوں[3] نے شہر کی خوبصورتی کے لیے بنوائی تھیں) مسمار کر دی گئیں۔ آغا محمد نے غیر جانبداروں کو تو ایک طرف ان لوگوں کو بھی مار دیا جو اس کے

---

[1] اس وقت محمد علی خان سیستانی گورنر بم تھا۔ اس کا بھائی بھی لطف علی خان کی خدمت میں تھا۔ جب وہ بم پہنچا تو گورنر نے اپنے بھائی کا پوچھا۔ اسے یقین دلایا گیا کہ وہ محفوظ تھا تو اس نے لطف علی خان سے تعرض نہیں کیا بلکہ عزّت و تکریم سے پیش آیا۔ اگلے دن اُسے معلوم ہُوا کہ بھائی تو آغا محمد کی قید میں تھا چنانچہ فدیہ کے طور پر لطف علی خان کو پکڑ لیا۔ لیکن اس دھوکہ کا کوئی فائدہ نہ ہُوا کیونکہ اس کا بھائی دوسروں کے ہمراہ کرمان میں مارا جا چکا تھا۔

[2] زند خاندان کے اس مکمل زوال کی یاد تازہ رکھنے کے لئے آغا محمد خان نے عین اس جگہ انسانی کھوپڑیوں کا مینار بنانے کا فیصلہ کیا جہاں لطف علی خان پکڑا گیا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے چھ سو قیدیوں کی گردن ماری اور اُن کے سر تین سو قیدیوں کے ذریعے بم بھجوائے اور ہر ایک کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے دو ساتھیوں کی کھوپڑیاں پہنچائے۔ ان تین سو بدبختوں کا بھی وہاں پہنچنے پر یہی حشر کیا گیا، اور یہ اہرام ۱۸۱۰ء میں میری موجودگی پر بھی قائم تھا اور خون آشام فاتح کا دہشت ناک مظاہرہ تھا۔

[3] افغان اپنے حملہ کے بعد کئی سال تک یہاں قابض رہے تھے۔

پُرجوش ۔۔۔ تھے اور پھر تیس ہزار باشندوں کو غلام بنا کر لے گیا یا انہیں کم ازکم مازندران اور آذربائیجان جیسے دُور افتادہ علاقوں میں جلا وطن کر دیا۔

شہر کئی سال تک اسی طرح ملیامیٹ رہا۔ حتیٰ کہ موجودہ شاہ نے اس کی قلعہ بندیوں کو ایک محدود پیمانے پراز سر نو تعمیر کروا دیا۔ اب بھی وہ ایک اُونچی کچی فصیل (جس کی ہر طرف انیس برج ہیں) اور بیس گز چوڑی اور دس گز گہری خشک کھائی پر مشتمل ہیں۔ اس کی جنوبی اور مشرقی اطراف پر کھنڈرات میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں اور فصیل کے اندر کافی جگہ ہنوز غیر آباد پڑی ہے۔ چار دروازے ہیں اور گورنر کی رہائش گاہ قلعہ کی جنوبی طرف ہے اور اس کے اردگرد بھی حفاظتی تعمیرات ہیں۔ بازار میں ہر نوع اور ہر قوم کی چیزیں میسر ہیں اور اس کے ایک حصہ میں خوبصورت نیلگوں پتھر کے بنے ہوئے پُرشکوہ گنبد ہیں جسے قریبی پہاڑوں میں پتھر کی کانوں سے لایا گیا تھا۔ فصیل کے اندر آٹھ نو کاروانسرائیں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی سرائیں باہر بھی ہیں۔ میں جس میں ٹھہرا وہ شاہزادہ کی ملکیت ہے لیکن یہ بعض دوسریوں کی طرح نہ اتنی کشادہ ہے نہ خوبصورت!

کرمان کی آبادی اب تیس ہزار سے زیادہ نہیں اور گبر یا پارسی اس کا عشر عشیر بھی نہیں لیکن ارمنی، ہندو یا یہودی بالکل نہیں ہیں۔ ارمنی اور ہندو کبھی کبھار یہاں کاروبار کے لئے آتے ہیں۔ تجارت زوروں پر ہے، لیکن آخری تباہی سے پہلے والی افراط کہاں؟ وہ زور وشور شاید کبھی واپس نہ آسکے کیونکہ سوداگروں کا رُخ روز بروز بندر عباس (یعنی کرمان) کی بجائے بوشہر بندرگاہ کی طرف ہوتا جارہا ہے۔ یہاں کی شالیں، بندوقیں اور نمدے ایشیا بھر میں مشہور ہیں اور دونوں اصناف کی قریباً ایک تہائی آبادی اسی پہ گذر اوقات کرتی ہے۔ شال کرمانیہ اون سے بنتی ہے اور میرے مشاہدہ کے مطابق نفاست بافت وساخت میں کشمیری شالوں سے بڑھیا ہے لیکن روئیں دار ملائمت اور گرمی میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جن بھیڑوں سے یہ اُون لی جاتی ہے وہ پست قد اور چھوٹی ٹانگوں کی ہوتی ہیں اور شاہ

فتح علی نے انہیں سلطنت کے مختلف حصّوں میں بھجوا دیا ہے جہاں یہ پھلتی پھولتی تو خوب ہیں لیکن اُون اتنی عمدہ نہیں رہتی اور پھر اس کی صحیح تیاری کے لئے کرمان ہی لانا پڑتا ہے یہ خیال غلط ہے کہ یہ خود بخود گرتی ہے۔ اسے کاٹنا ہی پڑتا ہے۔ کرمان کی آب و ہوا کشمیر کی آب و ہوا کی طرح اس کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔ میں نے کرمان میں شال کے سارے کارخانے دیکھے لیکن ان میں کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں۔ ایک میں مجھے نفیس ترین اور ملائم ترین اون کے نمونے ملے۔ بعض شالیں جو میں خرید کر لایا ہندوستان کے بیوپاریوں نے ان کی ہمواری اور خوبصورتی کے پیشِ نظر اُن کی قیمت کا اندازہ پانچ سو گُنا تک لگایا اون پہلی دفعہ کاٹی جانے کے بعد بار بار اور احتیاط سے صاف کی جاتی ہے اور دُھنی جاتی ہے اور پھر اسے ہفتوں تک ایک دھوون میں ڈبو دیا جاتا ہے (جس کے ترکیبی عناصر کا صرف اس کے بنانے والوں کو ہی علم ہے) جو غالباً مختلف النوع پتوں اور چھلکوں کا عرق ہوتا ہے اس میں یہ نرم، لچکیلی اور کاتنے کے قابل ہوجاتی ہے۔ کاتنے کا کام مستورات کرتی ہیں جس کے بعد کھڈی کے لئے دھاگا تیار ہوجاتا ہے۔

کرمانی اپنی شالیں، نمدے اور بندوقیں خراسان، کابل، بلخ، بخارا اور شمالی صوبوں کو بھیجتے ہیں اور ان کے بدلے رال، گوند، ریوند چینی اور مجیٹھ وغیرہ اور بخارا کی کھالیں، سمور، ریشم، فولاد، تانبا اور چائے لیتے ہیں۔ آخری تینوں چیزیں تو وہ گھر میں استعمال کرتے ہیں اور بقایا ہند، سندھ، عرب اور بحیرہ قلزم کو بھیجتے ہیں۔ ان درآمد کردہ برآمدات کے علاوہ وہ پستہ، گلاب کے پتے اور پنکھڑیاں (شربت وغیرہ بنانے کے لئے)، گوند، کپاس، دریاں اور سونے چاندی کی سلاخیں بالخصوص ہند کو بھیجتے ہیں، جہاں سے وہ ٹین، سرمہ، لوہا، تانبا، فولاد، کالی مرچ اور دیگر مصالحہ جات، چھینٹ (ہندی و ولایتی دونوں) نیل، ململ، چائے، ساٹن، کمخواب، زری باف، ناریل، چینی اور شیشے کے ظروف اور بڑے عرض کی نفیس سیاہ بانات وغیرہ ہندوستان سے درآمد کرتے ہیں۔

سندھ سے وہ سفید کپڑا اور پگڑیوں کے لئے رنگدار لنگیاں منگواتے ہیں اور عرب اور بحیرہ قلزم سے قہوہ، سون مٹی، ہاتھی دانت، لوبان، غلام وغیرہ وغیرہ درآمد کرتے ہیں۔[1] ۱۸۱۰ء میں شہر کرمان کے سالانہ محاصل صرف پچیس ہزار تومان[2] تھے لیکن یوماً فیوماً اضافہ پذیر تھے۔ شاہ کی اجازت سے یہ سب شہزادے کے قبضے میں رہتے ہیں تاکہ وہ دربار داری اور شہر اور اس کے نواحیات کی حفاظتی فوج کے اخراجات برداشت کر سکے۔ یہ زیادہ تر بازار کے بھاری محصولات اور شالوں[3] اور بندوقوں پر ٹیکس سے وصول ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر کاروانسرائے میں آنے والے اونٹ یا گھوڑے کے لئے ایک روپیہ، ہر خچر کے لئے نیم روپیہ اور ہر گدھے وغیرہ کے لئے ایک چوتھائی روپیہ لیا جاتا ہے۔ صوبائی

---

۱ ایرانی شمال سے جو چائے لاتے ہیں وہ سائبیریا کے ذریعے آتی ہے۔

۲ ایک تومان آٹھ روپے یا ایک پاؤنڈ کے برابر ہے۔ ۱۶۱۰ء میں اسی ذریعے سے زیادہ ماہانہ رقم شاہ عباس اعظم کے خزانے میں بھیجی جاتی تھی۔

۳ شالوں پر ٹیکس پرانا نہیں اور اس سے ایک ایسا واقعہ منسوب ہے جو نہ صرف کرمان بلکہ ایران کی موجودہ حکومت کے فکر و عمل کا مظہر ہے۔ شالوں کی روز افزوں پیداوار دیکھ کر شہزادے نے حکم دیا کہ آئندہ جو شخص سرکاری مہر کے بغیر شال خریدے گا اس پر بھاری جرمانہ عائد ہوگا۔ مہر لگوانے کے لئے ایک دفتر کھولا گیا اور خریدار کے لئے ضروری قرار دیا گیا کہ وہ خریدنے سے پہلے اس پر مہر لگوائے۔ لوگ ماقبل حکم دور کے شال ویسے ہی اوڑھتے رہے کہ حکم پیچھے سے تو لاگو نہیں ہو سکتا۔ شہزادے کا مطلب اور تھا اور جب مقررہ مدت گزر گئی تو اس نے سارے شہر کی تلاشی کا حکم دیا اور ہر اس شخص کو جرمانہ کر دیا جس کے ہاں ایک بھی بے مہر شال ملی۔ حکمت عملی کے اس شوشے سے اس نے ایک لاکھ روپے سے بھی زیادہ بٹور لئے جن میں ان شالوں کی قیمت بھی شامل تھی جو سرکاری عمال نے قبضے میں لے کر بیچ دی تھیں۔

محاصل کا شاہی خزانے میں باقاعدہ حساب کتاب رکھا جاتا ہے اور میرے قیام کرمان کے دوران ایک وزیر کو اسی مقصد کے لئے طہران بلایا گیا۔ مجھے ان کی صحیح رقم کا اندازہ نہیں لیکن قیاس چاہتا ہے کہ بندرعباس کی آمدنی کے علاوہ یہ پچاس ہزار تومان سالانہ ہوں گے۔ یہ ٹیکس زیادہ تر زمینوں اور قصبوں سے وصول کئے جاتے ہیں۔ اتنے بڑے صوبے سے اتنی تھوڑی آمدنی حیران کُن ہے لیکن صوبہ قدرتی طور پر بنجر اور بہت کم آباد ہے۔ اس کی مجموعی آبادی کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اس صوبے کے مشرقی حصے کے قصبات پر میں پہلے لکھ چکا ہوں اور مغربی قصبات کا بیان آگے آجائے گا۔ شمال کی طرف کوئی قصبہ نہیں اور جنوب کی طرف صرف بندرعباس قابلِ ذکر ہے۔ یہ کرمان سے اٹھارہ منزل (یا دن) دُور ہے اور اگر ہر منزل میں اوسطاً آٹھ فرسخ ہوں تو کُل فاصلہ ساڑھے پانچ سو سے چھ سو میل تک ہوگا۔ گیمرون میں بے حد گرمی ہے۔ چونکہ یہ جزیرۂ ہرمز کا تجارتی مرکز تھا لیکن شاہ عباس نے اسے ۱۶۲۳ء میں پرتگیزوں سے چھینا تو اس نے پوری تجارت اس کی طرف منتقل کروادی اور اس کا نام بندرعباس رکھا۔ یہ خوب ترقی کرتا رہا لیکن ۳۰-۱۶۲۹ء میں شاہ عباس کی موت کے بعد اس کے جانشین اس کی حفاظت نہ کرسکے یا کرنا نہ چاہتے تھے، لہٰذا لارستان کے ساحلی لوگوں اور دیگر قزاقانہ قبائل نے اسے خوب تنگ کیا۔ جب انگریزی اور پرتگیزی کمپنیاں اپنے کارخانے اور گماشتے لے کر واپس چلی گئیں اور دیگر سوداگر بھی بے کس و بے بس حکومت کی وجہ سے اپنا سامان یہاں لانے کی جرأت نہ کرسکے تو یہ جگہ ادبار کی نذر ہوگئی۔

اب بھی مسقط، بعض ہندوستانی بندر، بحیرہ قلزم اور مشرقی ساحل افریقہ سے اس کی تجارت ہوتی ہے اور امام مسقط کا ایک دستہ بھی یہاں متعین ہے جو شاہ ایران کو آٹھ ہزار تومان (۳۲ ہزار روپے) سالانہ خراج ادا کرتا ہے جو بعض سالوں میں چنگی کی آمدنی سے زیادہ ہوتا ہے۔ قصبہ غلیظ اور بے ڈھب ہے، گلیاں تنگ، اندھیری اور کھنڈرات سے پٹی پڑی ہیں اور پچھلے چھ سال کے دوران تو قلعہ بندیاں بھی وقت کے رحم وکرم پر چھوڑ دی گئیں لیکن جوانمردی کے بیچ کے

خطرہ سے امام نے ان کی مرمت کروادی اور اب وہ کسی ایشیائی لشکر کا مقابلہ کرنے کی درمیانی سی اہلیت رکھتی ہیں۔

میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ کرمان اور بندر عباس کا درمیانی علاقہ زیادہ تر بنجر اور مضر صحت ہے اور اس میں صرف چند ٹوٹے پھوٹے گاؤں ہیں۔ پچھلے زمانے میں ہر منزل پر عباس اعظم کی بنائی ہوئی کاروانسرائے تھی لیکن اب وہ دستبرد زمانہ کی نذر ہو چکی ہیں اور ایرانی حکومت کی بڑھتی ہوئی عرص کے پیش نظر ان کی مرمت کا کوئی امکان نہیں۔ بندر عباس کی کل آبادی کوئی بیس ہزار ہے اور اس میں عرب ہندو ایرانی، ہندوستانی اور دیگر غیر ملکی شامل ہیں۔

کرمان کا صحرائی حصہ عرض بلد شمالی کے ۲۹۰۳۰ درجے میں زمن شیر کی شمالی سرحد سے لے کر عرض بلد شمالی کے ۳۴ درجے میں خراسانی پہاڑوں تک دو سو ستر میل لمبا ہے اور طول بلد مشرقی کے ۵۵۰۴۰ درجے میں شہر یزد سے لے کر طول بلد مشرقی کے ۶۰ درجے میں سلسلۂ کوہ (سیستان و کرمان کی حد فاصل) تک دو سو میل چوڑا ہے۔ اس علاقے کی زمین اتنی شور زدہ اور بنجر ہے کہ اس میں اسّی اسّی نوّے نوّے میل تک نہ گھاس اگتی ہے نہ کوئی سبزہ ہوتا ہے اور پانی کا تو یہاں سوال ہی نہیں۔ ۱۹۷۱ء میں ایران پر حملہ کرنے والی افغان فوج کو اس دشت بکراں میں بے حد مشکلات پیش آئیں۔ اس کا ایک تہائی حصہ اس کی نذر ہو گیا اور باقیماندہ بے سروسامان ہو کر زمن شیر پہنچ سکا۔ کرمان سے ہرات (خراسان) کو ایک راستہ یہیں سے گذرتا ہے اور قاصد اٹھارہ دن میں پہنچتے ہیں لیکن یہاں تباہ ہونے کا خطرہ اتنا قوی ہے کہ ایک آدمی نے کیپٹن کرسٹی کو خط پہنچانے کے لئے دو سو روپے مانگے جس نے مجھے خط لکھنے کے لئے ہدایت کی تھی۔

قصبہ خبیص اس کے عین وسط میں ۳۲،۲۰ درجے عرض بلد شمالی میں واقع ہے۔ اس کا محل وقوع سال بھر ہرا بھرا رہتا ہے اور اس میں بہت سے دیدہ افروز باغات ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے پناہ گاہ کے طور پر بسایا گیا یا پچھلے وقتوں میں ایران و سیستان کے درمیان

تجارت افزائی کے لئے تعمیر کیا گیا کیونکہ یہ ان دونوں علاقوں سے مساوی الفاصلہ ہے۔ یہ اس دور میں خوب خوشحال رہا اور حاکم سیستان کے ایک بنگلہ بیگ کی سکونت گاہ رہا لیکن اب یہ ایک اُجڑی پُجڑی جگہ ہے اور اس کے باشندے بدنام ڈاکو اور راہزن ہیں جو خراسان اور ایران کی شاہراہوں پر کاروانوں کو لوٹ کر گذارہ کرتے ہیں۔ جب ان کا پیچھا کیا جائے تو وہ صحرا کی ایسی پگڈنڈیوں سے گھروں کو بھاگ جاتے ہیں جو صرف انہی کو معلوم ہیں۔

یہ واقعی حیرت انگیز ہے کہ خبیس اور اس کے اردگرد تین چار میل تک پانی باافراط اور تازہ بتازہ ہے لیکن اس حلقے سے باہر صحرا ہر طرف پھیلا ہوا ہے اور کئی کئی دن کے سفر کے بعد ہی اسے عبور کیا جا سکتا ہے اور اس میں جھاڑی یا گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں۔

اب پھر میں بیانِ سفر کی طرف لوٹتا ہوں :

باب سوم

مبارک دن ـــ شیراز سے قاصد ـــ گاؤں رُباط ـــ درمیانی علاقہ ـــ قلعہ نگین ـــ طویل منزل ـــ قلعہ آغا میں آمد ـــ علاقہ ـــ بازار ـــ سردار ـــ اُس کے شکوک مصنف کے متعلق ـــ شائستگی ـــ قلعہ پا ـــ سڑک ـــ شہر یزد ـــ چوروں کا علاقہ ـــ حفاظتی اقدامات ـــ کوتل یا درّے ـــ قصبہ میئنم ـــ غاروں کا بنا ہُوا ـــ بیان ـــ باشندے ـــ راسخ العقیدہ مسلمان نہیں ـــ ان کے اصول ـــ رواداری ـــ دوسری جگہوں کی نسبت ایران میں زیادہ ـــ وجہ ـــ اہلِ میئنم کے عادات و اطوار ـــ پھر راستے پر ـــ علاقہ ـــ شاہراہِ بابک ـــ خوبصورت باغات ـــ پھلوں کی ناقابلِ یقین پیداوار ـــ قصبے کا نقشہ ـــ نائب گورنر کا صدر مقام ـــ رباط میں آمد ـــ بڑی سڑک ـــ زرخیز میدان ـــ تمباکو اور گلاب ـــ سرسنت ـــ سادات رباط ـــ معزّز لوگ ـــ مضحکہ خیز جھگڑا ـــ کُشتی ـــ گاؤں خرّہ ـــ غیر مزروعہ میدان ـــ گاؤں خُنسر ـــ سیّال نمک کا دریا ـــ اُس کا منظر اور میدان ـــ علاقہ بجد پُر منظر ـــ ایلیات ـــ خُنسر کی رومانوی وادی ـــ گاؤں نذر ـــ بازار ندارد ـــ پیش قدمی ـــ پڑاؤ ـــ خراب راستہ ـــ گھاٹی اُرسنجان ـــ وجہ تسمیہ ـــ قصبہ اُرسنجان ـــ باغات ـــ ندیاں ـــ گاؤں کُنجان ـــ دریائے بندامیر ـــ چو طرفہ اضلاع ـــ سرسبزی و زرخیزی ـــ سڑک ـــ انہار ـــ بہت گہرائی ـــ بندامیر کا پل

شکستہ حالت — دریا پر تبصرہ — اس سے ثابت ہونیوالا نتیجہ — مصنف شیراز پہنچتا ہے — وزیر کی توجہ — اس سے اور شہزادے سے ملاقات — مصنف کی وجوہات بیان سفر بند کرنے کے بارے میں — باغ جہان نما — مزار حافظ — شیراز سے روانگی — قصبہ زرگان — پرجی پولس — سرحد کی سڑک — صوبہ فارس کی حدود — قصبہ یزدخاست — رات کو بےحد سردی — اصفہان میں قیام — مصنف سے اس کا ہمسفر کیپٹن کرسٹی آملتا ہے — تاثرات بازدید — اصفہان کے محلات و نوادر — تصاویر — رنگ دار شیشہ مینا کاری — اصفہان کے بازار — وسیع — شیراز اور کرمان کے برابر — اصفہان سے روانگی — کاشان میں آمد — اس شہر اور اس کی پیداوار اور محل وقوع کا بیان — مصنف اور اس کے رفقاء کی تیز رفتاری — گاؤں میانہ — کافلن کوہ — دریائے قزل عزین — پل موثر مناظر — مراغہ میں جنرل ملکم سے ملاپ — کیپٹن کرسٹی کا تقرر ایران میں کس لئے — نوشکی سے جانے کے بعد اس کے راستہ کا خلاصہ — مشن مراغہ سے روانہ ہوتا ہے — سینا اور کرمان شاہ کے راستے بغداد میں آمد — دریائے دجلہ اور شط العرب پر سفر — مصنف کا توقف بصرہ میں — بمبئی کو واپسی —

---

۲۵ مئی

ہم نے صرف چھ میل سے سفر کی بسم اللہ کی اور کچھ کھنڈرات اور باغات کے پاس آکر ٹھہر گئے۔ میرے رفقاء کے عقیدہ کے مطابق دن بے حد مبارک تھا۔ میں نے اپنی آمد پر جو قاصد جنرل ملکم کے پاس بھیجا تھا وہ شہر سے تھوڑے فاصلے پر ملا۔ اس کے آورده خطوط سے مجھے پہلی اطلاع ملی کہ وہ ایرانی دربار میں جانے کے لئے شیراز سے روانہ ہو چکا تھا۔

۲۶ مئی

ہم رات ایک بجے روانہ ہوئے اور چالیس میل کا تکلیف دہ سفر کر کے دوپہر کو

گاؤں رباط میں ٹھہرے جہاں ایک بہت بڑی کاروانسرائے ہے جس میں پانچ چھ سو گھوڑے بھی ٹھہر سکتے ہیں۔ یہ اب ٹوٹ پھوٹ رہی ہے۔ اس سفر کی سمت جنوب سے جنوب مغرب اور شمال سے شمال مغرب کی طرف بدلتی رہی۔ یہ دس فرسخ یا فرسنگ ہے اور پورا راستہ ہموار اور بہترین ہے۔ کرمان سے تیس میل کے فاصلہ پر ہم ایک چھوٹے سے قلعہ بگین کے پاس سے گذرے جو لدے ہوئے جانوروں کی پہلی منزل ہے، لیکن ہمارے خچر ہلکے پھلکے تھے لہٰذا ہم دس میل مزید چلے۔

۲۷ مئی

ہم ۲۶ کی شام کو آٹھ بجے رباط سے روانہ ہوئے اور ۲۷ کی دوپہر کو قلعہ آغا (یا آقام) کے پاس پہنچے۔ فاصلہ ۳۶ میل تھا جس میں سے ۵۰ میل سے زیادہ ایک سخت ہموار میدان تھا جس میں کہیں کہیں جنگل تھا اور باقی فاصلہ پہاڑوں کے درمیان (جو یہاں قریب آجاتے ہیں) ایک زیر کاشت اور ہموار میدان تھا جس میں پانی کی افراط تھی۔ قلعہ آغا کسی وقت ایک مضبوط مقام تھا اور اس نے آغا محمد خان کی فوج کا سخت مقابلہ کیا جب وہ کرمان کے محاصرہ کے لئے یہاں سے گذرا۔ اب قلعہ کی مرمت ہوچکی ہے اور اس میں ایک معقول بازار ہے جس میں مسافر کی ہر مطلوبہ چیز میسر ہے۔ قصبہ کا کدخدا مجھے یوروپی سمجھ کر ملنے آیا اور مجھے ایرانی لباس میں دیکھ کر سخت حیران ہوا جو میں نے اب کاملاً اختیار کر لیا تھا۔ وہ کچھ عرصہ کمرے میں ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر پوچھا کہ میں کیسے آیا تھا۔ آخر تک اسے میرے زنگی ہونے پر شبہ رہا تاہم وہ نہایت شائستہ تھا اور مجھے انتہائی عمدہ چیری کی ایک طشتری بھجوائی جس کے بدلے میں میں نے اس کے نوکر کو کچھ رقم تحفتہً دی۔

۲۸ مئی

قلعہ آغا سے پاقلعہ[1] آئے جو ایک چٹانی ڈھلان کی چوٹی پر بنا ہوا ایک چھوٹا سا قلعہ

۱؎ مضبوط قلعہ

ہے۔ یہ منزل تیس میل سے زیادہ ہے جس میں سے پہلے پندرہ میل ایک زرخیز میدان سے
گذرے اور آخری پہاڑوں کے اُوپر یا ان کے درمیان جہاں سڑک خراب اور پیچدار تھی۔ یہ پہاڑ
شمال کی طرف شہر یزد کو جاتے ہیں جس کے لئے قلعہ آغا سے تین میل دور سڑک نکلتی ہے۔
ہماری اوسط سمت مغرب کے جنوب کی طرف تھی۔ اس راستے پر اونٹوں اور گھوڑوں کے
لئے کافی چارہ ہے لیکن اسے ایک مسلح قافلہ یا جماعت کے بغیر پار کرنا خطرناک ہے کیونکہ یہ ڈاکوؤں
کا مشہور اڈا ہے۔ میرے ساتھیوں کو ہر لمحہ ان کے حملہ کا خطرہ تھا اور ہم اندھیرا ہونے تک
چلتے رہے (صبح تین بجے روانہ ہو کر)، لیکن ہمارے پستول بھرے ہوئے اور فتیلے
روشن تھے۔

۲۹ مئی

ہم پا قلعہ سے دو بجے بعد از دوپہر چلے اور مشکل، چٹانی کوتلوں کے ایک سلسلہ کو
پار کرتے ہوئے ہم آٹھ میل کے فاصلے پر قصبہ منیان میں پہنچے جو پہاڑوں میں کھودی گئی تین چار
سو غاروں پر مشتمل ہے اور یہ ایک چوتھائی میل تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان زمین دوز رہائش گاہوں
میں سے کچھ ایک دوسرے کے اُوپر بنی ہوئی ہیں اور بالائی منزلوں میں جانے کے لئے ڈھلوان
راستے یا سیڑھیاں ہیں۔ لیکن عموماً یہ یک فرشی تھیں اور ان کے وسط میں ایک بڑا کمرہ تھا
اور پہلوؤں میں چھوٹے الحاق تھے۔ میں اپنے جانوروں کے لئے چارہ اور باجرہ خریدنے
کے بہانے کئی غاروں میں گیا اور انہیں غلیظ ترین حالت میں پایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہاں
آبادی زیادہ تھی کیونکہ کئی غار خالی پڑے تھے۔

منیان کے باشندے راسخ العقیدہ مسلمان نہیں بلکہ ایک فرقہ "علی اللّٰہی"[1] سے تعلق رکھتے
ہیں جن کے مذہب کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی فلاح و بہبود کی خاطر

---

[1] اس کا لفظی ترجمہ ممکن نہیں۔ اس کا مطلب ہے وہ لوگ جو علی کو اللہ سمجھتے ہیں۔

ازراہِ نوازش علیؑ کی صورت میں زمین پر جلوہ گر ہونا مناسب سمجھا۔ وہ ان کو ملہم سمجھتے ہیں اور قرآن حکیم کے قریباً تمام اصولوں کو آئمہ کرام[۱] کے اضافے گردانتے ہیں جنہوں نے اس کی کتابت کروائی تھی۔ یہ فرقہ دوسرے ایشیائی ممالک کی نسبت ایران میں زیادہ رواداری کا مستحق سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ حضرت علیؑ کی بہت عزت کرتے ہیں پھر بھی کبھی کبھار وہ موردِ عتاب بن جاتے ہیں اور ان کا ذکر نہایت نفرت و حقارت سے کیا جاتا ہے۔ وہ شبانی زندگی کے عادی ہیں اور بھیڑ بکریوں کے بڑے بڑے ریوڑ پالتے ہیں۔

۳۰ مئی

۲۶ میل مغرب کی طرف چلنے کے بعد (جن میں سے پہلے دس میل سلسلۂ کوہ کے تسلسل اور بقایا ایک زرخیز لیکن زیادہ تر غیر مزروعہ میدان میں گذرے) ہم گیارہ بجے صبح شہر بابک یا بابا بیگ آ گئے جو کسی وقت ایک خوبصورت شہر تھا لیکن اب ایک کھنڈر بن چکا ہے۔ ہر طرف سے شہر میں آنے والے راستوں پر دو رویہ نارنگی، لیموں، شہتوت، بادام، اخروٹ، چیری اور انار کے درخت کھڑے ہیں اور ان کی بہتات کے علاوہ انگور، سیب، خوبانی، ناشپاتی، شفتالو، سفرجل (یا بہی) کشمش، آلو بخارا، انجیر اور آڑو وغیرہ یہاں اتنے بافراط ہوتے ہیں کہ یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے مقامی لوگوں کی ایک کہاوت ہے کہ اگر اس علاقے کے سوا پورا ایران صحرا بن جائے تو بھی شہر بابک اس کو پھلوں کی کوئی کمی نہ آنے دے گا۔ باغات اب کافی اُجڑے بکھرے ہیں تاہم میری رائے میں ان کے پھل اب بھی حسن و ذائقہ میں شیرازی اور اصفہانی پھلوں کو مات کرتے ہیں۔

شہر کے چار دروازے ہیں جو ایک وسطی تجارت گاہ کی طرف جاتے ہیں اور اسے زاویہ ہائے قائمہ پر تقسیم کرتے ہیں۔ بڑی گلیوں اور تجارت گاہ کے ساتھ ساتھ گنبد ہیں لیکن

---

۱ پیغمبر کے فوری جانشین آئمہ کہلاتے ہیں مذہبی اعتبار سے۔

گلیوں کے گنبد گر چکے ہیں اور دوسرے بھی رُو بہ تنزّل ہیں۔ تجارت گاہ کا گنبد البتہ محفوظ ہے اور ایران میں سب سے بڑا ہے۔

شہر بابک کرمان، شیراز اور یزد سے مساوی الفاصلہ ہے اور چند سال پہلے تک موخّر الذکر دونوں شہروں کے درمیان سامانِ تجارت کا بیشتر حصّہ اسی راستے سے بندر عباس جاتا تھا۔ اس وقت اس کی چونگی بہت زیادہ تھی اور اب بھی ایک نائب گورنر یہاں رہتا ہے جو شہزادۂ کرمان کے ماتحت ہے۔

۳۱ مئی

شہر بابک سے ہم ایک چھوٹے سے دیوار بند گاؤں رباط میں آئے جو صوبہ کرمان کی مغربی حد پر واقع ہے۔ فاصلہ اٹھائیس میل ہے اور ایک بڑی سڑک ایک کشادہ میدان سے یہاں تک آتی ہے جس میں بہت سے دیہات ہیں اور تمباکو اور گلاب کی بہت کاشت ہوتی ہے۔ اس وقت گلاب جوبن پر تھے اور ہمارا راستہ معطّر و معنبر تھا۔ کاشت کار شگفتگی سے پہلے ہی بعض کو عرق کے لئے توڑ لیتے ہیں اور اس سے بھی پہلے غنچوں کو مربّہ جات کے لئے چُن لیتے ہیں۔ یہاں کا تمباکو دنیا میں نرم ترین اور بہترین سمجھا جاتا ہے۔ اسے عموماً غلطی سے شیرازی تمباکو کہتے ہیں حالانکہ شیراز میں پیدا ہونے والا تمباکو نہ اتنا نفیس ہوتا ہے نہ ایسا خوش ذائقہ۔ میرے ساتھیوں کو صوبہ کرمان چھوڑنے کا افسوس تھا، کیونکہ ہمارے پاس شہزادے کا پروانہ تھا جس کے تحت وہ اپنے اور اپنے جانوروں کے لئے سُرساتؔ کا تقاضا۔

ل سُرسات ایک قسم کا الاؤنس ہے جسے مسافر وغیرہ سرکاری حکم کے تحت اہلِ دیہہ و شہر پر عائد کر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ رقم مالئے سے منہا کر دی جاتی ہے لیکن کاشت کار اس پر انحصار نہیں کر سکتے اور اگر کر لیں تو بھی کدخدا اسے اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے۔ یہ فاسد نظام تکلیف دہ ہے اور جب مشن ایک ملک سے گذرے تو اس کے افراد اسے اپنا حق سمجھتے ہیں اور اگر نگرانی نہ ہو تو خوب متمتّع ہوتے ہیں۔ مَیں نے دیکھا کہ دیہاتیوں نے پروانہ کی تعمیل نہ کی تو ایک گروہ نے اپنے خچر فصل میں دھکیل دیئے۔

کرسکتے تھے اور وہ اسے نہایت باقاعدگی سے یکساں طور پر وصول کرتے تھے۔ رباط کے لوگ سادات ہیں اور محنتی اور خوش اخلاق ہیں اور دیگر سادات کی طرح اپنے ہم جنسوں سے گستاخی اور حقارت کا سلوک نہیں کرتے۔ یہاں کوئی کاروانسرائے یا مسافرگاہ نہیں، لہٰذا ہم مسجد میں ٹھہرے۔

ہمارے قیام کے دوران یہاں خچر بانوں اور ہمارے ایک ہمسفر (جو ایک فرضی نام کے تحت سفر کر رہا تھا) کے درمیان ایک مضحکہ خیز جھگڑا ہوا۔ ایک خچر بان کا کسی معمولی بات پر اس سے اختلاف ہوگیا تو طے یہ ہوا کہ کشتی کے ذریعے فیصلہ ہو جائے۔ کشتی مسجد میں ہونا قرار پائی جس کا فرش سوختہ ٹائیلوں کا بنا ہوا تھا۔ خچر بان نے بہت کوشش کی کہ وہ ہمارے بھیس بدلے ہوئے ساتھی کو چت گرا دے لیکن وہ ناکام ہوا اور ہمارے ساتھی نے موقعہ ملتے ہی اس اناڑی حریف کو کئی گز اُوپر ہوا میں اُچھال دیا اور وہ اس بُری طرح پتھر کی سلوں پر گرا کہ بے ہوش ہوگیا۔ اس کے ساتھی (جو ابھی تک تماشہ سے لطف اندوز ہو رہے تھے) فاتح کو سزا دینے کے لئے پہلے تو گالیوں کی بوچھاڑ کرتے رہے اور پھر ان میں سے تین نے اس پر حملہ کر دیا، لیکن ان کا بھی وہی حشر ہوا اور وہ مسجد کے مختلف کونوں میں پھینک دیئے گئے اور ان کے جوڑ قریباً اُتر گئے۔ اس کے بعد فاتح نے ان کے چھ ساتھیوں کو مقابلے کے لئے للکارا تو اُن میں مقابلے کا یارا نہ پایا۔[1]

---

[1] اس آدمی کا اصلی نام علی عسکر تھا اور اُس نے بعد میں بتایا کہ وہ رستم ایران تھا۔ اُس نے اپنے بھیس کی توجیہہ کے لئے یہ کہانی سنائی، جس کی تصدیق بعد میں کیپٹن کرسٹی نے یہ کہہ کر کی کہ اُس نے خود یہ کہانی یزد (پہلوان کا وطن) میں بھی سُنی:۔ کوئی دو سال پہلے شاہی پہلوان نے چیلنج دیا کہ کوئی ایرانی شاہ کے حضور اُس سے مقابلہ کرے اور علی عسکر اس کے مقابلے کے لئے دربار میں پہنچا۔ زورخانے میں ایک وسطی فوّارہ تھا۔ ابتدائی نوک جھونک کے بعد علی عسکر نے حریف کو

(باقی اگلے صفحہ پر)

یکم جون

ہم نے اِن چوبیس گھنٹوں میں دو منزلیں طے کیں۔ پہلی رباط سے کرّہ تک تیس میل اور ایک غیر مزروعہ میدان میں جہاں کہیں کہیں جنگل کے آثار تھے اور دوسری کرّہ سے خنسر کے بے آباد گاؤں تک جس کا فاصلہ چودہ میل تھا۔ رباط اور کرّہ کے درمیان ہم ایک سیّال شور کے دریا سے گذرے جو اِتنا ڈونگھا تھا کہ میرے گھوڑے کے گھٹنوں تک آگیا۔ اُس کے ہر طرف سینکڑوں گز تک میدان کی سطح پر سفید شور کی ایک موٹی تہہ جمی ہوئی تھی، گویا کہ منجمد برفباری ہوئی ہو اور یہ تہہ گھوڑوں کے سُموں کے نیچے چٹختی تھی۔ ایسے ہی ندی بھی اِسی قسم کے بڑے بڑے قطعوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ لیکن وہ اِتنے پیوستہ بھی نہ تھے کہ گھوڑے اور خچر اِسے عبور کر سکتے۔ کرّہ یا خرّہ ایک صاف ستھرا گاؤں ہے اور مسافروں کو یہاں کے بازار میں ہر چیز مل سکتی ہے۔

خرّہ سے خنسر تک کا علاقہ ناقابلِ تصوّر حد تک پُرمنظر اور رومانوی ہے۔ یہ پست اور سرسبز میدانی وادیوں پر مشتمل ہے۔ جنہیں چھوٹے چھوٹے سلسلہ ہائے کوہ کاٹتے اور

(بقیہ حاشیہ)

اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور اُس زور سے فوّارے پرٹے مارا کہ اُس کی ران ٹوٹ گئی اور اُسے اِس بُری طرح زخمی کیا کہ وہ چند ہفتوں میں چل بسا۔ شاہ نے علی عسکر کو جلاوطن کر دیا لیکن وہ چھپا رہا اور ۱۸۰۹ء کی خزاں میں، جب بادشاہ میدانِ سلطانیہ سے طہران واپس آرہا تھا، وہ اسے اِس شہر سے چار فرسخ یا قریباً سولہ میل پر ملا اور اُس کے گھوڑے کے عین رُو برُو رجعتِ قہقری کا کمال دکھانے لگا اور ساتھ ہی ساتھ دو بڑے بڑے ڈنڈے لگاتار اور زمین کی طرف دیکھے بغیر اپنے سر کے گرد گھمانے لگا۔ شاہ اِس مظاہرۂ قوّت پر اتنا خوش ہُوا کہ اُسے معاف کر دیا اور وہ آزادی سے گھومنے پھرنے لگا۔ لیکن مرحوم پہلوان کے رشتہ دار اُس کے درپے تھے لہٰذا وہ اُسے ڈھونڈتے ہوئے کرمان آئے جہاں سے وہ ہمارے ساتھ بھیس بدلے ہوئے سفر کر رہا تھا۔

جُدا کرتے ہیں اور جو اپنی چوٹیوں تک دیدہ افروز روئیدگی سے ڈھکے ہوئے تھے ۔ ایک پہاڑ میں ایک چٹان سے پچیس یا زیادہ گز تک ایک پگڈنڈی ہے جو اتنی تنگ ہے کہ ایک وقت میں ایک خچر ہی اُس پر سے گذر سکتا ہے ۔ ویسے سڑک معقول تھی اور ہر وادی میں ایلیاٹ (خانہ بدوش قبائل) سے چارہ مل سکتا تھا جو اُونی خیموں میں رہتے ہیں ۔ ہمیں غُنسر میں اُن کا ایک بڑا پڑاؤ ملا ۔ غُنسر بلا استثنیٰ ایران کا مقامِ حُسن ہے ۔ ایک نالہ گندم اور چاول کے کشت زاروں سے وادی کی نچلی طرف کو بہہ رہا تھا ۔ خیمے اخروٹ کے درختوں کے ایک بڑے جُھنڈ کے پاس پہاڑی کی پیشانی پر گڑے ہوئے تھے ۔ اخروٹ کے درخت وادی کے پُورے پہلو پر ایستادہ تھے ، بھیڑوں بکریوں کے ریوڑ چرواہے کے دروازے سے چند گز کے فاصلے پر اونچی ڈھلوانوں پر چر رہے تھے اور لوگوں کے مطمئن چہروں اور محنت شاقہ سے مجھے پہلی دفعہ احساس ہُوا کہ ایران میں پُراطمینان زندگی ممکن تھی !

۲ جون

غُنسر سے مُذر تک چودہ میل کا فاصلہ ہے ۔ علاقہ کل کی طرح پُربہار و تصویر خیز تھا ۔ مُذر ایک معمولی سا گاؤں ہے جہاں نہ بازار ہے نہ رسد ، گو ایلیاٹ نے اُس کے پاس ہی کافی زمین پر کاشت کی ہے ۔

۳ جون

ہم صبح تین بجے مُذر سے روانہ ہوئے اور غروب آفتاب پر ایک میدان میں اُترے کیونکہ دو فرسنگ تک کوئی گاؤں نہ تھا ۔ بیالیس میل فاصلہ طے کیا ۔ آج سارا دن پہاڑ دو رویہ ہمارے قریب رہے اور سڑک پتھریلی اور سنگلاخ تھی جو زیادہ تر ایک وادی سے گذری جو چوڑائی میں چار سو گز اور چار میل کے درمیان تھی ۔ اِس میں ناقابلِ عبور جنگل تھا لیکن پانی عنقا تھا ۔ اِس کے مغربی سرے پر اُرسنجان کی ایک گھاٹی ہے جو ہم سے اڑتیسویں

میل شمال میں واقع قصبہ کے نام پر مشہور ہے۔ یہ گھاٹی کہیں کہیں پچاس گز سے زیادہ چوڑی نہیں اور قریباً ایک فرسخ لمبی ہے۔ دو رویہ پہاڑ عموداً بہت بلندی تک اوپر اٹھتے ہیں اور اگر اس قدرتی استحکام میں مصنوعی قلعہ بندی کا اضافہ ہو جائے تو میرے خیال میں ایک چھوٹا سا دستہ بڑی سے بڑی فوج کا منہ موڑ سکتا ہے۔

قصبۂ ارسنجان میں حاکم (گورنر) رہتا ہے اور یہ وسیع باغات سے محصور ایک کشادہ جگہ ہے۔ یہ ایک ایسی وادی میں واقع ہے جس کے اردگرد کی پہاڑیاں چپے چپے تک زیرِ کاشت ہیں۔ یہاں بہت سی ندیاں رواں دواں ہیں اور ان میں سے ایک پر صرف نصف میل کے دوران دس بارہ پن چکیاں چلتی ہیں۔

۱۸ جون

آج صبح چار بجے ہم اپنے پڑاؤ سے روانہ ہوئے اور ایک زرخیز اور مزروعہ میدان پر بیس میل چلے۔ بارھویں میل پر ایک صاف ستھرا گاؤں کنجان ہے اور اس سے تین میل پہلے ہم ایک پل پر سے گذرے جو دریائے بند امیر[1] پر ہے جسے یہاں کے مقامی لوگ کلبر پکارتے ہیں۔ اس میدان میں چاول کی کاشت ناقابلِ تصور حد تک زیادہ ہے اور میرے ہمسفروں نے بتایا کہ یہ ایرانی سلطنت کے زرخیز ترین اور ارزاں ترین علاقے ہیں جس کا ثبوت یہ تھا کہ میں نے خود تیس دیہات و قصبات کا شمار کیا جو فصلوں سے محصور تھے اور ایک دوسرے سے مزروعہ زمینوں سے ہی منسلک تھے۔ پورا راستہ عمدہ تھا لیکن نہروں پر بہت سے پل بنائے گئے ہیں جو پورے میدان کو کاٹتی ہیں تاکہ

---

[1] دریائے بند امیر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ پچیسویں خلیفۂ عباسیہ القادر کے دور میں امیر عضد الدولہ نے آٹھ سو سال پہلے اس پر ایک بند بنوایا تھا تاکہ پانی ایک گذرگاہ میں رہے اور مرودشت کے میدان (جہاں پرسی پولس کے کھنڈرات ہیں) میں لا کر اس میں سے نہریں نکالی گئی ہیں۔

آب پاشی ہو سکے لیکن اگر یہ پُل خدانخواستہ ٹوٹ جائیں تو کم از کم عارضی طور پر آمدورفت مسدود ہو سکتی ہے۔ کچھ نہریں تیس چالیس فٹ گہری ہیں اور عموماً پانچ چھ فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں ہیں۔ بندامیر کا پُل بھی ایران کی دیگر ایسی تعمیرات کی طرح شکستہ حالت میں ہے اور جلد ہی گرنے والا ہے۔ جب میں نے اِسے پار کیا تو اس کے فرش میں بہت سے بڑے بڑے شگاف تھے جن کے اوپر کسی نے درختوں کے ٹہنے رکھے ہوئے تھے تاکہ رات کے مسافر خبردار رہیں۔ اس کی بارہ محرابیں ہیں اور دریا چاول کے کھیتوں اور ہری بھری فصلوں کے وسیع علاقوں کے درمیان سے گذرتا ہوا انتہائی دل نشیں منظر پیش کرتا ہے۔

سونمیانی پر اترنے سے لے کر اب تک میں نے ڈیڑھ ہزار میل سے زیادہ سفر کیا تھا جس میں سے تیرہ سو میل مشرق سے مغرب کی طرف ایک سیدھے خط میں تھا (جہاں تک راستوں نے اجازت دی) اور پہلی دفعہ مجھے یہاں ایک رواں دواں ندی ایسی ملی، جس کا پانی میرے گھٹنوں سے اوپر تک آیا۔ یہ درمیانی علاقوں کی غیر معمولی یبوست کا ایک حتمی ثبوت تھا اور کرۂ ارض پر اپنی نظیر آپ تھا، بالخصوص جب زمین، درجۂ حرارت اور سطح کے تنوّع کو ذہن میں رکھا جائے۔

کلبرے گذر کر ہم پانچ میل چلے اور پھر چند گھنٹے ٹھہر کر مزید چھ میل میدان پر سفر کیا۔ اب ہم ایک تنگ وادی میں داخل ہوئے جو دو بلند سلسلہ ہائے کوہ کے درمیان تھی اور ایک سیدھی مغربی سمت میں چونتیس میل تک میدانِ شیراز میں چلتی تھی۔ مجھے ۵ رجون کو کوئی نو بجے صبح شیراز پہنچنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ میں فوراً وزیرِ فارس محمد نبی خان کے محل میں گیا جس نے ایک خادم میرے ساتھ کیا تاکہ مجھے مدراس نیٹو انفنٹری کے لیفٹننٹ لٹل کے ہاں پہنچا دے۔ لیفٹننٹ موصوف مشن کی روانگی پر بریگیڈیئر جنرل میلکم کے ایک سیاسی معاون کی حیثیت سے شیراز ٹھہرا تاکہ حکومتِ فارس اور سفیر

کے مابین روابط کے امور کو نمٹا سکے۔ میری یہاں آمد کے کوئی دو گھنٹے بعد وزیر نے میرے استقبالیہ تحفہ کے طور پر مٹھائیوں اور پھلوں کی کئی طشتریاں بھجوائیں اور میری خیر و عافیت کے متعلق بھی استفسار فرمایا اور میں ایک دفعہ پھر ایک برطانوی افسر بن گیا۔

۱۶ جون کو میں وزیر سے ملنے گیا تو وہ بہت التفات اور تپاک سے پیش آیا۔ ۱۱ کو مجھے صوبہ فارس کے بیگلر بیگ اور حاکم شیراز، شہزادہ محمد علی میرزا سے متعارف کرایا گیا۔ وہ ایک نہایت وجیہہ نوجوان ہے، اس نے صدری پہن رکھی تھی جس پر قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس کے دربار کی نشست و برخاست اور آئین و آداب بھی اس کی ذاتی شان و شوکت کے عین مطابق تھے لیکن استقبالیہ عام انداز سے مختلف نہ تھا۔ میں کچھ عرصہ اُس سے گفتگو کرتا رہا جو عرض بیگی کے ذریعے ہوئی۔ قلیان لایا گیا تو اُس نے مجھے رخصت کیا۔

اب تک میں بلوچستان و ایران کی سیاحت کے متعلق وہ سب کچھ بیان کر چکا ہوں جس میں قارئین کے لئے جدت و ندرت کا کوئی رنگ ہے لہٰذا اب میں ہندوستان کو واپسی سے پہلے کے واقعات کا مختصر سا ذکر کرتے ہوئے اپنے اس بیان کو ختم کروں گا۔

مسٹر موریئر اور مدراس نیٹو انفنٹری کے لیفٹیننٹ میکڈانلڈ کنیئر[۱] نے حال ہی میں جو کتب لکھی ہیں اور دربار ایران میں آنے والے مختلف حالیہ وفود کے ادیب حضرات سے دنیا کو جن کتب کی جائز توقع ہے، یہ سب ایرانی سلطنت کی موجودہ کیفیت کو ہر نقطۂ نگاہ سے مکمل طور پر بیان کر سکیں گی اور یوں اس کے متعلق ہمیں ہمہ جہتی علم حاصل ہو سکے گا۔ گو میں نے

---

۱ موریئر کی کتاب "ٹریولز ان پرشیا" (ایران کی سیاحت) اور کنیئر کی "جیاگرافیکل میموائر آف دی پرشین ایمپائر" (سلطنت ایران کا جغرافیائی تذکرہ)۔

ایران کے باقی ماندہ قیام میں بھی اپنی تحقیق و جستجو حسبِ معمول جاری رکھی تاہم میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ذکر صرف کتاب کی ضخامت کو بڑھائے گا۔ مزید برآں دیگر معاصرین کے پاس اس فرض سے سبکدوش ہونے کے لئے زیادہ اور بہتر مواقع موجود ہیں۔

قیامِ شیراز کے دوران میں نے ہر قابلِ ذکر جگہ دیکھنے کے سنہری موقعہ سے خوب فائدہ اٹھایا۔ میں سب سے زیادہ باغِ جہاں نما اور مزارِ حافظ سے متاثر ہوا۔ اول الذکر کو وکیل کریم خان زند نے بنوایا تھا اور اس کے گرمائی مکانات سے ہم پورے شہر اور چوطرفہ علاقے کا مسحور کُن منظر دیکھ سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک کلاہِ فرنگی کہلاتا ہے کیونکہ اس کی شکل یورپی ہیٹ کے مشابہ ہے۔ مزارِ حافظ ایک بے رونق بلکہ میری رائے میں ایک بدنما سی عمارت ہے لیکن حافظ کی ایک نظم جس خوبصورت ترین ایرانی رسم الخط میں کندہ کی گئی ہے وہ اُسے دیکھنے کی تشویق پیدا کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے (واللہ اعلم) کہ اس کے موجود کلام کا بہترین اور قدیم نسخہ مزار کے اندر رکھا گیا ہے اور جب میں نے اسے دیکھنا چاہا تو بتایا گیا کہ اس تبرک کا محافظ موجود نہ تھا۔ مزار کا سفید سنگِ مرمر موسموں کے اثرات سے بدرنگ ہو چکا ہے اور اداسی و افسردگی کے اُس تاثر میں اضافہ کرتا ہے جو اس کے اردگرد کے درختانِ سرو پیدا کرتے ہیں۔

میں نے ۱۱ جون کو جناب جان کارمک کی رفاقت میں شیراز کو چھوڑا۔ جان کارمک مدراس کی حکومت کے ملازم تھے اور بریگیڈیئر جنرل میلکم کے مشن سے منسلک تھے۔ ہماری پہلی منزل زرگان تھی جو ایک بلند پہاڑ کے عین دامن میں ایک بہت خوبصورت قصبہ ہے۔ دوسری منزل میں ہم ایک باغ میں پہنچ گئے جو پرسی پولس کے مشہورِ عالم آثار سے ایک میل سے بھی کم فاصلے پر ہے۔ یہاں ہم دو دن ٹھہرے۔ دوسری منزل میں ہم دریائے بند امیر سے گذرے جس کا نُہ محرابی پل شکستہ حالت میں تھا۔ یہ یہاں نہ اتنا چوڑا ہے نہ گہرا، جتنا کہ کرمان کے راستے میں تھا۔ پرسی پولس سے ہم سرحدیا ٹھنڈی سڑک سے اصفہان روانہ

ہوئے جہاں ہم ۲۷ جون کو پہنچے۔ یہ فاصلہ دس منزلوں میں طے ہوا جن میں سے سات صوبہ فارس اور تین عراق میں تھیں۔ حدِّ فاصل قصبہ یزدخاست میں پانی کی ایک گہری نالی ہے اور قصبے کا ایک حصّہ تو گویا اس کی گذرگاہ کے اوپر معلق ہے۔ یہاں ایک نہایت عمدہ نئی کاروانسرائے ہے لیکن سڑک کی باقی کاروانسرائیں شکستہ و ریختہ ہیں۔ اگرچہ یہ ایران کا گرم ترین موسم تھا تاہم راتوں کو چلتے ہوئے ہمیں اکثر اتنی ٹھنڈک محسوس ہوتی تھی کہ چند میل تک پیدل چل کر ہم اپنے آپ کو گرم کرتے تھے۔

ہم آٹھ نو دن اصفہان میں رہے اور اسی اثنا میں کیپٹن کرسٹی بھی ہرات اور یزد سے ہمارے ساتھ آملے جس پر ہمیں دلی مسرّت ہوئی۔ اس بازدید سے جو سچی خوشی ہوئی وہ شاذ و نادر ہی انسانوں کے حصّہ میں آتی ہے اور یہ خوشی غیر متوقع ہونے کی وجہ سے دوبالا ہو گئی۔ کیپٹن کرسٹی جھٹ پٹے کے وقت شہر میں پہنچا اور نہ وہ کسی کو جانتا تھا اور نہ کوئی اسے جانتا تھا۔ وہ سیدھا گورنر کے محل میں گیا تاکہ رہائش کے لئے کوئی جگہ مل سکے۔ جگہ فوراً مل گئی اور اتفاقاً ایک نوکر نے بتایا کہ دو فرنگی چہل ستون (وہ محل جس میں مَیں اور ڈاکٹر کارمک ٹھہرے ہوئے تھے) میں ٹھہرے ہوئے تھے اور شاید وہ انہی کے ساتھ رہنا پسند کرے۔ چنانچہ وہ اس محل میں آگیا اور ایک قاصد کو بھیجا کہ وہ ہم میں سے کسی سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مَیں نیچے آیا لیکن اندھیرے کی وجہ سے اس کا ناک نقشہ نہ دیکھ سکا۔ وہ مجھے لباس کی وجہ سے ایرانی سمجھتا رہا۔ بہرحال چند منٹ گفتگو کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ بس پھر کیا تھا وہ لمحہ میری زندگی کا حاصل بن گیا!

ہر دن کا بیشتر حصّہ ہم محلات اور اس شہر لامحدود کے نوادر دیکھنے میں گذارتے۔ ایک دو محلات میں یورپی اور ایرانی مصوّروں کی بنائی ہوئی بعض بہت خوبصورت تصاویر ہیں۔ ایرانی مصوّروں کی تصویریں تاریخی موضوعات سے متعلق ہیں اور انسانی شبیہیں اصل کی بہترین نقل ہیں۔ ایک دو لڑائیوں کے مجموعوں کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے،

اور گو مجموعی طور پر تناظر کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ تاہم وہ پچھلی دو صدیوں میں ایران کے لباس اور اندازِ جنگ کا صحیح منظر پیش کرتی ہیں۔ اسی طرح ایک محل موجودہ انتظام الدولہ، محمد حسین خان کا بنایا ہوا ہے جو اُس نے پانچ چھ سال پہلے شاہ کو پیش کیا۔ یہ ایران کے موجودہ طرزِ تعمیر کا آئینہ دار ہے۔ اس کے دریچے رنگدار شیشہ اور میناکاری کے بہترین نمونے ہیں، اور قرآنی آیات اور شاہ کے لئے تعریفی ابیات کی صورت میں ترتیب دیئے گئے ہیں۔ اس محل کے نیچے سردابوں یعنی تہ خانوں کا ایک بڑا سلسلہ ہے جو گرمی میں رہائش کے لئے مخصوص ہیں۔

اصفہان کے بازار ایران میں وسیع ترین لیکن میں شیراز کے بازار وکیل اور کرمان کے بازار جدید اندازہ حسنِ تعمیر میں کسی سے کم نہیں سمجھتا۔ اصفہان میں شیشے کے کئی کارخانے ہیں اور قلیانوں کے بعض پیندے جو یہاں تیار کئے جاتے ہیں، کسی بھی انگریز کاریگر کو دنگ کر سکتے ہیں۔

مسٹر کارمک، کیپٹن کرسٹی اور میں نے ۹ جولائی کو اصفہان کو الوداع کہا اور ۱۴ کو شہر کاشان پہنچے۔ یہ شہر کھنڈرات کا ایک ڈھیر تھا لیکن پچھلے چند سالوں میں محمد حسین خان، انتظام الدولہ کی جدوجہد سے اب یہ ایران کا نہایت عروج پذیر شہر بن گیا ہے۔ اس کی خاص پیداوار تانبے کے ظروف، قالین اور رنگین اور پھولدار ریشمی پارچات ہیں اور بالخصوص آخری بے حد جاذبِ نظر ہوتے ہیں۔ میں نے بھی کچھ تھان خریدے جو رنگین ترین کشمیری شالوں کی نقل ہیں اور ریشم کی چمک دمک کے علاوہ انہی جیسے شوخ رنگ کے مالک ہیں۔ کاشان اُس عظیم شور صحرا کے جنوبی سرے پر واقع ہے جو شمال کی طرف مازندرانی پہاڑوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے اردگرد کی زمین ریتلی ہے اور اس میں بچھو اور تارنتو مکڑیاں اتنی زیادہ ہیں کہ کاشانی بچھو کا ڈنگ ضرب المثل بن چکا ہے۔

جس دن ہم کاشان پہنچے اُس دن یہ افواہ سنی کہ بریگیڈیئر جنرل ملکم عنقریب شاہ سے

رخصت لینے والے تھے تاکہ مشن ہندوستان واپس جا سکے۔ چنانچہ ہم نے بھی اُوجان جانے کی پوری کوشش کی جہاں ان دنوں اُردو یا شاہی خیمہ نصب تھا اور دس لمبی لمبی منزلیں طے کر کے گاؤں میانہ میں پہنچے جو کافلن کوہ (یا کوہِ شیراں) کے ایک درّے میں واقع ہے۔ اس پہاڑ کے دامن میں قزل عُزین (سنہری ندی) بہتا ہے جس کے اوپر مختلف جسامتوں کی آٹھ محرابوں کا ایک قدیم پُل ہے۔ یہ پُل بعید بلند ہے اور اس کی چوٹی سے منظر بہت دلفریب ہے۔ درّے پر چڑھتے ہیں تو کچھ گرے پڑے بُرج اور درو دیوار سڑک کی دائیں طرف واقع ہیں۔ یہ سڑک جزوی طور پر ایک ٹھوس سنگ بستہ راستہ ہے جسے شاہ عباس اول نے بنانا شروع کیا اور شاہ عباس اعظم نے مکمل کیا۔ قزل عُزین صوبجات عراق عجم اور آذربائیجان کے درمیان سرحد ہے۔

جس دن ہم میانہ پہنچے ہمیں ایک چپڑ (سوار قاصد) ملا جو خطوط لایا تھا۔ ان میں ہمیں ہدایت کی گئی تھی کہ ہم جنرل میلکم سے قریب ترین متقاطع راستے سے مراغہ میں ملیں جو بیس فرسخ تبریز کے جنوب مغرب میں تھا۔ لہٰذا ہم نے تبریز کی شاہراہ پکڑی اور تیسری منزل کے انجام پر ہم اپنے اُن بے شمار دوستوں سے آملے جن سے ہم سات ماہ قبل بمبئی میں جُدا ہوئے تھے۔ اس دوران کیپٹن کرسٹی نے اندازاً دو ہزار دو سو پچاس میل اور خاکسار نے دو ہزار چار سو بارہ میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔

کیپٹن کرسٹی کو دربارِ ایران میں شاہِ انگلستان کے سفیر نے ایران میں تعینات کر دیا تاکہ وہ معاہدہ کے تحت ایرانی فوج کی تنظیم نو کر سکے۔ لہٰذا اُس نے پانچ چھ دنوں میں نہایت عجلت سے اپنا سفرنامہ لکھا جب جنرل میلکم خاص طور پر اس کے اسی مقصد کی تکمیل کے لئے مراغہ ٹھہرے۔ مَیں نے نوشکی میں جُدا ہونے کے بعد اُن کی رپورتاژ کا اقتباس ایک ضمیمہ کی صورت میں اس سفرنامے سے منسلک کر دیا ہے۔ جو میرے اس دوست کی خوشگوار یاد کا ایک پُراحترام پرتو ہے۔ اگر وہ زندہ ہندوستان واپس آیا ہوتا

تو وہ غالباً اسے اضافہ و ترمیم کے ساتھ ایک کتاب کی شکل دے دیتا[1]۔

مشن ۸ر اگست کو مراغہ سے روانہ ہُوا اور سینا اور کرمان شاہ کے راستے ۱۰ر ستمبر کو بغداد پہنچا۔ یہاں سے کشتیوں کے ذریعے یہ دریائے دجلہ اور شط العرب کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بصرہ کو چلا جہاں میں سرکاری کاروبار کے سلسلہ میں قریباً تین ماہ ٹھہرا۔ اس کے بعد میں آنریبل کمپنی کے کروزر 'سائیک' میں سوار ہُوا اور تیرہ ماہ اور کچھ دنوں کی غیر حاضری کے بعد ۶ر فروری ۱۸۱۱ء کو بمبئی میں اُترا۔

---
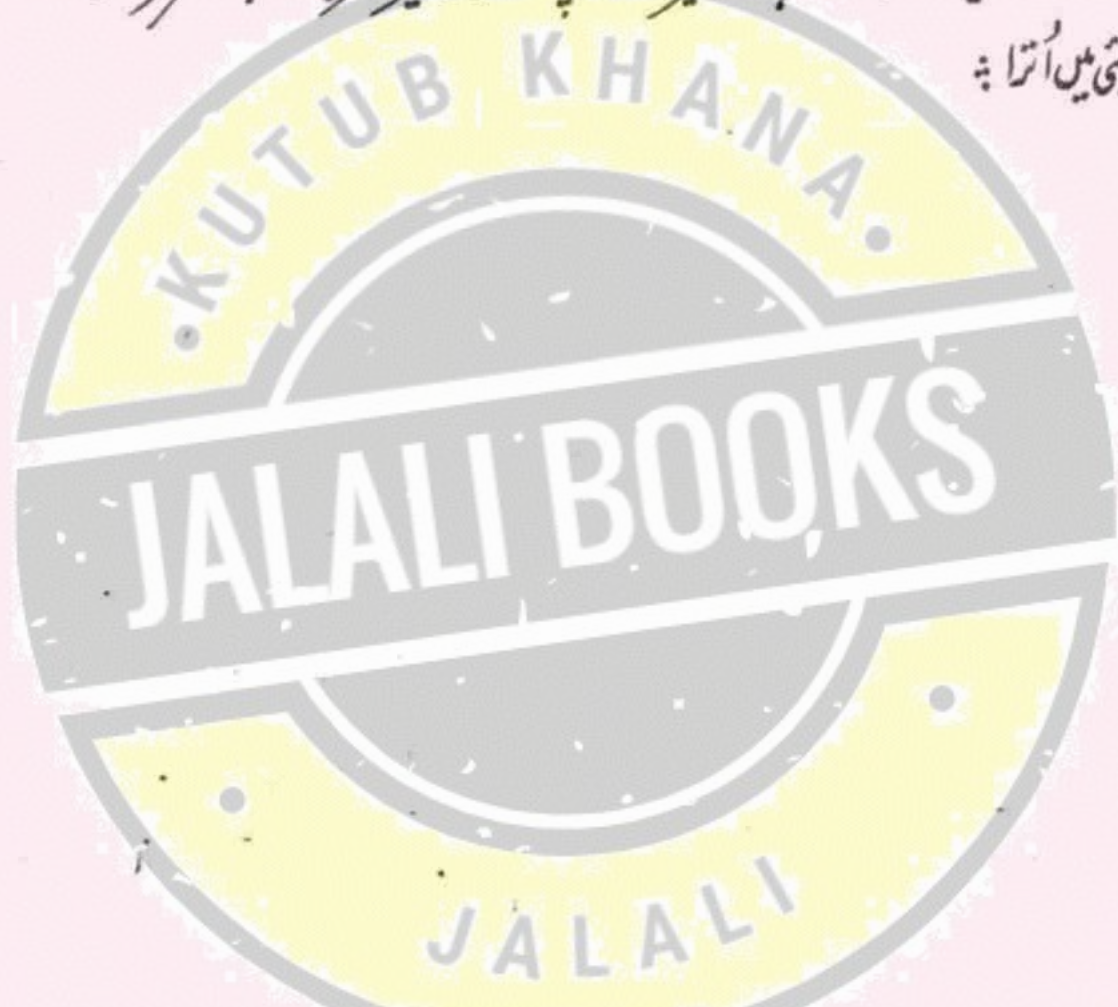
[1] افسوس کہ کیپٹن کرسٹی ۲۱ر اکتوبر ۱۸۱۲ء کی رات کو ایرانی کیمپ پر ایک رُوسی دستہ کے حملہ میں مارا گیا۔ شاید ہی کوئی اور افسر اتنا محبوب و محترم رہا ہو اور اسی لئے شاید ہی کسی اور افسر کی موت پر اتنا ہمہ گیر ماتم ہُوا ہو گا؛ وہ بلند ترین صلاحیتوں کا مالک تھا اور اُس کی مرگِ بے ہنگام کو نہ صرف اُس کے بے شمار دوستوں نے ناقابلِ تلافی نقصان سمجھا بلکہ خود اس کے ملک اور حکومت کے لئے بھی ایک سانحۂ عظیم تھی!

باب چہارم

بلوچستان — وجہ تسمیہ — وسعت — نصیر خان کے علاقے — نادر شاہ کا عطیہ — جغرافیائی خطے — حدود اربعہ — متنوع خط و خال — ان کی تشریح کا مجوزہ خاکہ — اس کی پہاڑی ماہیت کا ثبوت — براہوی پہاڑ — وجہ تسمیہ — ان کا بیان — ان کے ماخذ پر قیاس آرائی — ہندوکش یا ہندوستانی کوہ قاف — تخت سلیمان — مکران کے پہاڑ — ان کا بیان — ہزارہ پہاڑوں سے مربوط — ان کے ایک حصہ کے وحشی چرواہے — صوبہ لارستان — اسکے پہاڑ — راس ملائے مبارک وغیرہ — کوہستان — کیسے بنا — بشکرد — وجہ تسمیہ — باشندے — کوہ نوشادر — بلوچستانی پہاڑوں کی تقابلی جسامت — اس کی تفصیل — دشت بے دولت — کوہن وٹ — وتری پیمائش — سڑک کے پیچ و خم کا حق جواز — اس کی ضرورت کی مثال — کوہ براہوئی کی سطح سمندر سے بلندی — مقامی رائے — اس کا ثبوت — شہر قلات — اس کا بلند ترین مقام — سمندر سے اس کی عمودی بلندی پر مصنف کی قیاس آرائی — وجوہات — گھاٹیاں — قلات کا درجہ حرارت — براہوی سلسلہ کوہ اور پائرینیز کا مقابلہ — حالیہ تحقیقات ایشیائی پہاڑوں کو بلند ترین ثابت کرنے کی طرف مائل ہیں — مزید بحث کا التوا — مقصد نالوں پر بھی اس کا اطلاق۔

بلوچستان یا بلوچوں کا ملک روئے زمین کے اس حصّہ کو گھیرے ہوئے ہے جو ۵۰ ۲۴ تا ۴۰ ۳۰ عرضِ بلد شمالی اور ۵۵ ۵۸ تا ۳۰ ۶۷ طولِ بلد مشرقی کے درمیان واقع ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ایک دو صوبے مشرق و مغرب کی طرف اتنی دُور تک پھیلے ہوئے ہیں کہ ان کے صحیح حدود طول بلد متعین نہیں کیے جا سکتے جبتک میں انکو علیحدہ علیحدہ بیان نہ کروں۔

یہ سارا البسیط علاقہ کبھی وقت خان قلات کے والد، نصیر خان کی مملکت تھا جو اسے ایرانی فاتح نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں عطا کیا تھا اور اسے بیگلر بیگ بلوچستان کا لقب بھی دیا تھا۔ اسی عطیئے کی سند پر میں نے اس عمومی اصطلاح سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن چونکہ اس وقت سے ملک کے سیاسی حالات یکسر بدل گئے ہیں لہٰذا اسے بیان کرنے کے لئے جغرافیائی خطوں کا تعین ضروری ہے۔

بلوچستان (وسیع ترین معنوں میں) کے حدودِ اربعہ یہ ہیں:-

جنوب میں بحرِ ہند یا اریتھرئین سمندر، شمال میں سیستان اور ملک افغانستان، مغرب میں صوبجات لارستان و کرمان اور مشرق میں بمنے از سندھ اور علاقہ شکارپور جو امیر کابل کے قبضہ میں ہے۔ ان حدود کے اندر مندرجہ ذیل خطّے ہیں جو بالترتیب بیان کئے جائیں گے۔ ان کے بعد میں سندھ کے موجودہ حالات پر ایک مختصر تبصرہ قلمبند کروں گا جہاں کے حکمران اور کافی باشندے بلوچ ہیں۔

پہلا حصّہ: صوبجات جھالاوان و سراوان اور علاقہ قلات

دُوسرا حصّہ: صوبجات مکران و لس

تیسرا حصّہ: صوبہ کچھ گندادا اور علاقہ ہڑند داجل

چوتھا حصّہ: کوہستان یا صحرا کے مغرب کا بلوچ علاقہ

پانچواں حصّہ: صحرا

چھٹا حصہ : صوبہ سندھ

یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اتنے متنوع اور وسیع وبسیط علاقوں کو کسی ایک ہی عنوان کے تحت صحیح طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا لہٰذا میں یہاں صرف عظیم پہاڑوں، چو طرفہ سلطنتوں سے ان کے تعلق، ان کی مختلف شاخوں اور رخوں، ان کی تقابلی بلندی، لمبائی اور چوڑائی پر ہی ابتدائی بحث کروں گا اور صرف عمومی نوعیت کے دیگر حقائق بیان کروں گا تاکہ قارئین ان حصوں کی جدا جدا تفصیلی کیفیات کو آسانی سے سمجھ سکیں۔

میں نے بلوچستان کو صوبہ لاس سے سرحد افغانستان تک یعنی مشرقی طول بلد کے پینسٹھویں اور ستاسٹھویں درجوں کے درمیان اپنے سفر کے دوران ان مسلسل پہاڑی دیکھا۔ یہ عظیم الشان سلسلہ (جسے میں اس کے باسی براہوئیوں کی وجہ سے براہوی سلسلہ کوہ پکاروں گا) تمام دوسرے پہاڑوں کی قدیم اساس ہے لہٰذا اس تحقیقی مقالے میں خصوصی توجہ کا طالب ہے اور میں اس کی ساخت و تشکیل کے پیش نظر (اور عام انداز سے ہٹ کر) جنوب کی طرف سے اس کا بیان شروع کروں گا اور پھر ساحل سے اندرون ملک اس کی انتہاؤں تک اس کا جائزہ لوں گا۔

یہ شمالی عرض بلد ۲۵° اور مشرقی طول بلد ۵۸/۶۶° میں اس موادی (موز) پر یکلخت سمندر سے ایک نمایاں رفعت و عظمت کے ساتھ ابھرتا ہے جہاں سے یہ نوّے میل تک شمال مشرقی سمت میں چلتا ہے۔ وہاں سے اس کی ایک گھاٹی شمال سے مشرق کی طرف بڑھتی ہے جس کے دامن کو دریائے سندھ قلعہ سہوان پر چھوتا ہے۔ لیکن یہ جسامت میں ثانوی درجہ کی ہے اور محض اس لئے قابل ذکر ہے کہ یہ اس مجمع الجبال کا مشرقی ترین نقطہ ہے۔ اس بازو کی علیحدگی سے (۴۵/۲۵° تا ۳۰° عرض بلد) اصل سلسلہ عین شمال کی طرف چلتا ہے اور سندھ، کچھ گنداوا اور حصہ سیوستان کی مغربی حد بندی کرتا ہے جیسا کہ یہ پرانے وقتوں میں ہندوستان کی مغربی حد بندی کرتا تھا۔ اس کے بعد یہ ایک دفعہ پھر اپنا شمال مشرقی رخ اختیار کر لیتا ہے اور جسامت و رفعت میں اتنا تیزی سے گھٹتا ہے کہ چالیس میل کے دوران یہ ان پہاڑیوں کی پست سطح پر آ رہتا ہے

جو کاکڑ اور دیگر افغان قبائل کا مسکن ہیں اور یوں یہ ان میں مدغم ہو جاتا ہے۔

اگر میں اپنی تحقیقات آگے بڑھاتا یا براہوئی پہاڑوں کا جائزہ بالائی خطوں سے لیتا نہ کہ ساحل کی طرف سے تو بھی ان پہاڑیوں کے ماخذ کو معلوم کرنا ضروری ہوتا جن میں یہ آکر ضم ہوتے ہیں لیکن چونکہ اس میں ایسی طوالت ہوتی (جو جغرافیۂ بلوچستان سے بالکل غیر متعلق ہوتی) لہٰذا میں اس وجہ (اور دیگر وجوہات بھی) کی بنا پر دیدہ و دانستہ اس موضوع کو نہیں چھیڑ رہا۔

مغرب کی طرف براہوئی پہاڑ کہیں زیادہ پیچیدہ ہیں۔ سمندر سے نمودار ہوتے وقت ان کی چوڑائی ایک طرف سے دوسری طرف تک تیس میل سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ چوڑائی ان کی بلندی کے مقابلے پر حیرت انگیز طور پر کم ہے لیکن ۵۰′ ۲۵° عرض بلد سے یہ بتدریج شمال، شمال سے شمال مغرب، شمال مغرب اور مغرب سے شمال مغرب کی طرف ہوتے ہوتے طول بلد کے متعدد درجوں تک پھیلتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ کئی سلسلے پہلو بہ پہلو پھیلاتے چلے جاتے ہیں۔ جو سب کے سب اصل سے پست ہیں اور جن میں سے کچھ بلوچستان کے پورے مغربی طول کے پاس سے گذرتے ہیں اور ایرانی پہاڑوں سے جا ملتے ہیں جبکہ دوسرے جنوب کی طرف پھیلتے ہیں اور سمندر کو چھو لیتے ہیں یا اس سے چند میل کے فاصلے پر آرہتے ہیں اور پھر ساحل کے رخ پر چلتے ہیں یا اس کے قریبی پست اور بنجر میدان میں کھو جاتے ہیں جبکہ اصلی پہاڑ یا اس کا مغربی حصہ شمال سے شمال مغرب کی طرف شمالی عرض بلد کے اٹھائیسویں درجے تک پھیل جاتا ہے جہاں یہ مشرقی طول بلد کے چونسٹھویں درجے کے قریب ایک ریتلے صحرا کے جنوب مشرقی سرے سے ملتا ہے۔ پھر یہ قطب نما کے شمال مشرقی اور شمالی نقاط کے درمیان شمالی رخ اختیار کرتا ہوا شمالی عرض بلد کے تیسویں درجے میں نوشکی کی طرف آتا ہے اور یہاں سے زیادہ تر مشرق کی طرف چلتا

---

[1] آنریبل ایم الفنسٹن کی حالیہ کتاب 'دی جیاگرافیکل اینڈ ہسٹاریکل اکاؤنٹ آف افغانستان' میں ان پہاڑوں کے مکمل کوائف دیئے گئے ہیں۔

ہے حتیٰ کہ آخر کار مشرقی پہلو کی طرح افغان پہاڑیوں کی سطح پر آرہتا ہے اور ان میں ضم ہو کر اپنا امتیازی وجود کھو بیٹھتا ہے۔

لیکن ان پہاڑیوں میں بے شمار فلک بوس چوٹیاں ہیں جو عموماً شمال مشرق سے آتی ہیں اور طول بلد کے چھیاسٹھویں اور سترھویں درجوں کے درمیان صحرا کے سروں پر ختم ہو جاتی ہیں اور یہ سب بعید از امکان نہیں ہے لیکن براہوئی سلسلۂ کوہ (جس کی انتہائی حدود اب میں متعین کر چکا ہوں) کے ضمن میں اس اتحاد کے امکان کو خارج نہیں کیا جا سکتا جو اسے کوہ ہندوکش کے عظیم سلسلہ سے ملاتا ہو بلکہ اسی کی کسی جنوبی شاخ کی ترسیع ہو جیسا کہ ہزارہ یا پاروپامیسن سلسلہ کا ماخذ بھی یہی کوہ عظیم ہے اور مغرب کی طرف بحیرۂ کیسپین کی حدود تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی کی ایک شاخ کوہ سلیمان کہلاتی ہے جس کی وجہ تسمیہ اس کی مشہور چوٹی تخت سلیمان ہے جو اس کا بلند ترین مقام ہے۔ لیکن یہ دونوں (ہزارہ اور سلیمان) میرے خاکہ کی مقرر کردہ حدود سے باہر ہیں لہٰذا میں ان کا مزید ذکر نہیں کروں گا۔

جہاں اصل پہاڑ کا مغربی پہلو ریتلے صحرا کے پاس ختم ہوتا ہے اس سے چند فرسخ کے فاصلے کے اندر اندر ایک بے پناہ تودہ علیحدہ ہوتا ہے اور شاخ در شاخ ہو کر جنوب اور مغرب کی طرف پھیل جاتا ہے۔ ایک بہت موٹی اور بلند مغربی شاخ اس دشت بیکراں کے مزید پھیلاؤ کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے جسے میں نے بلوچستان کا پانچواں حصہ قرار دیا ہے۔ یہ دو ڈور جوں سے زیادہ ایک سیدھے مغربی خط میں اس کے جنوبی دامن کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور پھر اپنا راستہ یک لخت بدل کر (جس کی وجہ بعد میں بیان کی جائیگی) شمال مغرب کی طرف مڑتی ہے اور قریباً پچاس میل تک اسی سمت میں چلتی ہے اور پھر بتدریج مزید مغرب کی طرف مڑتی ہوئی اور مغرب کی طرف سے آنیوالے مختلف چھوٹے چھوٹے سلسلوں سے ملتی ہوئی یہ ایک ماسکہ پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ یہ سب یہاں شمالی عرض بلد کے اکیسویں درجے کے قریب مستحکم ہو کر ایک تنگ لیکن وقفے وقفے کے بعد ایک بہت بلند

سلسلہ میں بدل جاتی ہے جو طول بلد کے انسٹھویں اور ساٹھویں درجوں کے درمیان شمال کی طرف اتنا پھیل جاتا ہے کہ یہ کسی حد تک الگ الگ پہاڑیوں کے ذریعے ہزارہ (یا پارو پامی سن) پہاڑوں سے مربُوط معلوم ہوتا ہے جو صوبہ خراسان کے دارالحکومت ہرات کے مغرب کی طرف ہیں۔

یہ سلسلہ صوبہ سیستان اور صحرائے کرمان[1] کو ایک دُوسرے سے جُدا کرتا ہے اور اسی طرح شاہان ایران و کابل کے لیے نام دائرہ اختیار کی انتہائی وسعت کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ اپنے اردگرد کے خطّوں کی ویرانی و تہی دستی میں شریک ہے بے آب و گیاہ ہے اور اس میں صرف ایک قلیل التّعداد شبانی نسل آباد ہے جو اتنی وحشی اور تہذیب نا آشنا ہے کہ بلوچ بھی اسے بے تہذیب پکارتے ہیں۔

جسامت و امتیاز کے لحاظ سے اگلا سلسلہ مذکورہ بالا سلسلہ سے تقریباً ڈیڑھ درجہ جنوب کی طرف براہوئی پہاڑوں کے جنوب مغربی زاویے سے برامد ہوتا ہے اور دو سو بیس میل تک اسی سلسلہ کے متوازی چلتا ہے گو کہیں کہیں ان کے بازو باہم پیوست ہو جاتے ہیں اور انہیں ایک دُوسرے میں اتنا گڈ مڈ کر دیتے ہیں کہ اگر بسیط و بنجر میدان ان کے بیچ میں نہ آتے اور پھر ان دونوں میں کامل انفصال پیدا نہ کر دیتے تو یہ دونوں ایک ہی سلسلہ شمار ہو جاتے۔ مذکورہ یک جہتی فاصلے طے کرنے کے بعد یہ ایک زبردست اور قوی ہیکل مجمع الجبال سے ملتے ہیں جو ان کی مزید مغربی پیش رفت کو روک دیتا ہے اور مجبوراً ان میں سے ایک (جیسا کہ میں نے بیان کیا) شمال کی طرف بل کھاتا ہوا مُڑ جاتا ہے۔ دُوسرا جواب زیرِ غور ہے' دو حصّوں میں بٹ جاتا ہے اور ہر حصّہ ایک چھوٹا سا چکر کاٹتا ہے اور پھر دونوں آپس میں مل جاتے ہیں۔ پیوست ہو کر یہ جنوب کی طرف سے مغرب کو جاتا ہے اور بتدریج نشیب و فراز کے مطابق پھیلتا یا سکڑتا ہوا یہ

---

[1] دیکھئے اس صوبہ کا حال' باب شانزدہم' حصّہ اوّل۔

ایران کے صوبہ لارستان کے پہاڑی خطوں سے جا ملتا ہے جس میں یہ جذب ہو کر گم ہو جاتا ہے اس کی ابتدا اسے اس کی آخری گنبد گی تک اس کی بہت سی شاخیں جنوب کی طرف پھیلتی ہیں اور ساحل مکران پر راسوں کی شکل اختیار کر جاتی ہیں۔ ان میں سے راس عُربُو (یا عربہ سومنیانی سے پندرہ فرسخ کے اندر) اور راس مبارک (ہمارے بحری نقشوں کی مبارک) جو ایران کی حد پر ہیں، بلند ترین ہیں۔[1]

وہ پہاڑ، جن کا ماخذ مکران کے مغرب کی طرف ہے اپنے قدرتی رُخ کی طرف کرتی راہ نہ پا کر اپنے اصل پہاڑ کی طرف گھومتے ہیں اور ایک غلطاں وپیچاں ڈھیر کی صورت میں اس سے آملتے ہیں جسے بلوچ کوہستان پکارتے ہیں۔ مرحوم کیپٹن گرانٹ[2] کے مطابق اس علاقے کا مغربی ترین علاقہ بشکرد[3] کہلاتا ہے جو کرد بلوچوں کا مسکن ہونے کی وجہ سے یوں مشہور ہوا۔ اس کی بعض فلک بوس چوٹیاں سو میل سے زیادہ دور سمندر سے نظر آتی ہیں۔

۱؎ عرب بحر نوردوں کی راس المبارک یا راس مبارک کو ماہرین اشتقاق نے عجیب طرح بگاڑ دیا ہے۔ یہ کوہ مبارک کی وجہ سے اس طرح موسوم ہے جو کوئی نو میل اندرون ملک واقع ہے اور جنوب سے آنے والے جہازوں کو سب سے پہلے خشکی کی خوشخبری دیتا ہے۔ نائیبیر اسی کو ہم بارک لکھتا ہے اور اسے منتشر سمت پکارتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ علم ہجا و املا کو تو سمجھتا تھا لیکن علم الاشتقاق سے واقف نہ تھا۔ اس کی غلطی نے بعد میں آنے والوں کو گمراہ کیا اور انگریز افسر (جو اس ساحل پر آئے) اس کی اصلاح سے غافل رہے۔ دریائے سندھ سے شط العرب تک دس ایسی جگہیں ہیں جو ہمارے نقشوں کے تلفظ کے مطابق یہاں کے مقامی لوگوں کو سمجھ نہیں آسکتیں۔

۲؎ دیکھئے ۱۳ اپریل کی ڈائری (نوٹ)

۳؎ فارسی مصدر باشیدن یعنی رہنا اور کُرد نام قبیلہ کا مرکب۔

کوہستان کے تشکیلی تودوں کے اتصال سے پہلے وہ چٹانی پہاڑیوں کے بیشمار چھوٹے چھوٹے تنجھے ادھر ادھر بکھیرتے ہیں جو ناہموار اور اکثر گڈمڈ لکیروں کی صورت میں مکران کے اس حصہ میں پھیلے ہوئے ہیں جہاں سے میں گذرا تھا۔ یہ تدریجی اور غیر مرئی انداز میں ایک طرف کرمانی جنگلوں سے دبے ہوئے ہیں اور دوسری طرف کوہستانی پہاڑوں کے شمالی سلسلہ سے مغلوب و ملفوف ہوجاتے ہیں جو ایک خاص انداز اور مقام پر مجتمع ہوجاتے ہیں جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ انہی میں سے چند جنوب مغرب کی طرف مڑتے ہیں اور اس پہاڑی تسلسل کو جاری رکھتے ہیں جس میں بسیمان[1] چھوڑنے کے بعد گذرا اور جن میں کوہ نوشادر واقع ہے۔ یہ تمام ریتیلے صحرا کے سرے پر یکلخت ڈھلوان چٹانوں کی صورت میں ختم ہوجاتے ہیں اور بشکر دنہ کو تشیر سے جدا کرتے ہیں اور انتہا درجہ کے سنگلاخ ہیں۔

اب ہم ان پرشکوہ سلسلوں کی جسامت و رفعت کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ براہوی سلسلہ ان سب پر فائق ہے۔ شمالی عرض بلد کے اٹھائیسویں درجے میں اس کی انتہائی وسعت قریباً دو سو میل عرض پر محیط ہے اور نوشکی سے سیوستان کے پست اور زرخیز کشادہ میدان تک اس کے شمالی پہلو کے ساتھ ساتھ یہ شاید ایک سو تیس میل ہوگا لیکن اس پہاڑی دیوار کے قریباً وسط میں تیس میل کا ایک خلا ہے جو ایک چٹیل میدان نے پیدا کیا ہے اور جسے اس کی ازلی یبوست کی وجہ سے دشتِ بے دولت کہا جاتا ہے[2]۔ براہوئی سلسلہ سمندر کی طرف جاتے ہوئے اپنے آپ کو سمیٹ لیتا ہے اور صوبہ جھالاوان کے جنوبی سرے کوہن وٹ پر یہ شرقاً غرباً چالیس میل سے زیادہ نہیں اور اس کا یہی عرض راس مواری تک جاری رہتا ہے۔

طول بلکہ زیادہ صحیح طور پر وتر کے لحاظ سے اس کی سب سے زیادہ پیمائش جنوب اور جنوب مشرق

---

۱ دیکھئے ڈائری ۲۱ ، اپریل

۲ کبھی کبھار دشتِ بے دریغ یعنی ناقابل سکونت صحرا۔

سے شمال اور شمال مغرب کی طرف دو سو اسی میل سے زیادہ ہے اور اگر ہم اسی نہج میں سے عین شمال کی طرف ایک خط مستقیم کھینچیں تو یہ ایک سو نوے میل سے کم نہ ہوگا۔ یہاں میں صرف سیدھی سمتوں کا ذکر کر رہا ہوں اور سڑکوں کی عدم برابری اور خمیدگی کا کوئی لحاظ نہیں کر رہا جس کا جزوی سا تصور مندرجہ ذیل سے ہو سکے گا۔ نقشے پر بیلہ (لاس کا صدر مقام) سے قلات تک ناپا جائے تو یہ ایک سو ساٹھ میل معلوم نہیں ہوتا لیکن ان دونوں جگہوں کا درمیانی فاصلہ میرے اور کیپٹن کرسٹی کے صحیح ترین اندازے کے مطابق دو سو ترانوے میل کے لگ بھگ تھا۔

یہ سلسلہ قلات پر اپنی انتہائی بلندی کو پہنچتا ہے جہاں سے مقامی لوگوں کے مطابق وہ جس راستے پر بھی جائے مسافر کو بہرصورت نیچے اترنا ہوگا لیکن مجھے یہ علاقہ شہر کے دونوں طرف اتنا معمولی جھکتا ہوا معلوم ہوا کہ یہ غیر مرئی تھا۔ لہٰذا کسی اور طریقہ سے اس کی سطح کو جانچنا ہوگا اور چونکہ ندی نالوں کا منبع ہی سادہ ترین اور فیصلہ کن ترین ذریعہ ہے لہٰذا میں نے اسی اصول پر تحقیق کی اور پھر اپنی رائے قائم کی جو میری مذکورہ بالا رائے پر پوری اتری۔

وادیٔ قلات کی ندیاں شمال مشرق کی طرف بہتی ہیں لیکن نو میل جنوب میں کپوتو کے مقام پر وہ مخالف سمت اختیار کر لیتی ہیں۔ مغرب کی طرف مساوی بلندی اتنی مصدقہ ہے کہ میرے خیال میں قلات سے سات میل شمال مغرب کے گاؤں گودر سے صحرا کے سرے پر سراوانی پہاڑوں تک یہ ایک قطعی سطح مرتفع ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سارا علاقہ مسطح ہے بلکہ اس میں بلند ڈھلوان چٹانیں ہیں جن کی چوٹیاں اکثر ابر آلود رہتی ہیں لیکن وسیع معنوں میں ان سب کے دامن اتنے مساوی السطح ہیں کہ آب باراں کے ریلے ہر طرف اپنے راستے بنا لیتے ہیں سوائے قلات کی طرف کے جہاں یہ صرف مذکورہ گاؤں تک ہی پہنچ سکتے ہیں۔ شہر کے مشرق کی طرف بھی پچیس تیس میل تک یہی کیفیت رہتی ہے۔ اس کے بعد ڈھلان گھٹتے گھٹتے گنداوا کے میدان کے برابر آجاتی ہے۔ یہ مسلسل نہیں بلکہ غیر مسلسل ہے کیونکہ بلوچستان کے اکثر دشوار گذار تنگ یا گھاٹیاں انہی حصوں میں ہیں اور پہاڑی ندیوں کو ہر طرف سے روکتے ہیں جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ قلات سے ستر میل شمال مشرق میں واقع "سری کھود" نامی

منزل گاہ کے پانی کے بعد دیگرے تنگ گھاٹیوں میں سے لگ ہے زمین کے اُوپر اور گاہے نیچے سے گذرتے ہوئے بالآخر اسی ہموار علاقے میں پہنچ کر دم لیتے ہیں۔

چونکہ میرے پاس مقیاس الہوا اور دیگر آلات نہ تھے جو مجھے بڑا ہوئی سلسلۂ کوہ کے بلند ترین مقام کی حیثیت سے قلات کی عمودی بلندی ناپنے کا موقعہ دیتے لہٰذا میں اس ضمن میں اپنے تاثرات صرف تقابل حقائق کی بنا پر ہی بیان کر سکتا ہوں۔

اگرچہ اس شہر کے قرب و جوار میں یہ ترچھا پن غیر مرئی ہے جیساکہ اُوپر ذکر ہوا تاہم جنوب کی طرف یہ بہت واضح ہے بالخصوص ان جگہوں پر جو ڈھلوان گھاٹیاں ہوں اور ایک دن کی مسافت پر ہوں حتیٰ کہ ہم پچیس میل کے اندر رود بنجو پہنچ جائیں لہٰذا میں شہر سے سات میل شمال میں گرک تک ڈھلان کو ناقابل تمیز سمجھتا ہوں لیکن اس گاؤں سے نوشکی تک ہم نے چھ سے زیادہ بلند درّے عبور کئے جن کی شمال کی طرف اُترائی بلا امتیاز دو گنا تھی اور ایک دو مواقع پر تو جنوب کی طرف سے چڑھائی سے چار گنا تھی۔ صرف ان کے فرق کا مجموعہ ہی ایک بہت بڑے انحراف کے برابر ہوگا لیکن پھر بھی جب ہم ان کی تہوں پر پہنچ گئے اور صحرا نظر آنے لگا تو ہم نے اپنے آپ کو حیرت انگیز طور پر اس کی سطح سے بہت بلند اٹھتے ہوئے پایا۔ اصل میں ہم ساتویں لک کو پار کر رہے تھے جس کی اُترائی دوسروں کی نسبت بظاہر دو گنا تھی[1]۔ اس کے بعد بھی ہم ایک اٹھتے ہوئے میدان پر آئے جس کے پانی قریبی پہاڑوں میں بارش یا برف پگھلنے سے بڑھ جائیں تو وہ بہت زور شور سے مختلف مکرانی راستوں سے سمندر کی طرف لپکتے ہیں۔

قلات کا درجہ حرارت بھی اس کی حیران کُن بلندی کی تصدیق کرتا ہے لیکن چونکہ مجھے اس تذکرے کے آخر میں ان تمام خطّوں کے موسم پر ایک ضمیمہ لکھنا ہے لہٰذا میں فی الحال درجہ

---

[1] دیکھئے ڈائری ۹، مارچ، حصّہ اوّل۔

حرارت سے برآمدشدہ نتائج کا مختصراً ذکر کروں گا۔ گو قلات[1] اور اسکے نواحیات مشکل راس السرطان (۲۱ مارچ) سے ساڑھے پانچ درجے دُور ہیں۔ تاہم یہاں سردی شدید ترین ہوتی ہے اور اواخر نومبر سے لیکر فروری تک وادیوں میں بھی برف باری ہوتی ہے۔ چاول اور دیگر سبزیات، جو گرم آب وہوا کے طلب گار ہیں یہاں پیدا نہیں ہوسکتے اور گندم اور باجرہ جزائر برطانیہ سے پہلے نہیں پکتے ہیں۔ ان بہم متفق کوائف کے فلسفیانہ تجزیئے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ براہوئی پہاڑوں کی انتہائی بلندی یوروپ کی بعض مشہور اور بلند ترین چوٹیوں سے کم نہیں ہے[2]۔ اس رشک و شبہ اور حیرت و استعجاب کی بھی کوئی گنجائش نہیں اس لئے کہ حالیہ اکتشافات نے ہم پر واضح کر دیا ہے کہ ایشیا روئے زمین پر عظیم و جلیل ترین پہاڑوں کا مستقر ہے[3]۔

---

[1] قلات ۶َ - ۲۹ْ عرض بلد شمالی میں ہے۔

[2] ایسی بات پر قیاس آرائی بیہودہ ہے لیکن میں ایک محتاط جھجک کے ساتھ ایسا کروں گا اور پھر اس کی اغلب غلطی کے امکان کو بھی رد نہیں کروں گا۔ صحرا کے قریبی لک کا عینی مشاہدہ کر کے اور اس کی بظاہر لمبائی اور ڈھلوانیت کا ہندوستانی گھاٹوں سے مقابلہ کر کے (جن کی معتدبہ اونچائی مجھے معلوم ہے) میں اس کی چوٹی کو نچلے ریتلے میدان سے پانچ ہزار فٹ اُونچا قرار دوں گا۔ اگر ہم راہ اعتدال پر رہ کر اس کا آدھا بھی اس مقام اور شہر قلات کے درمیان چھ دروں میں جمع کر دیں اور صحرا کو اس کل کی بنیاد سمجھ لیں جو سطح سمندر سے پانچ سو فٹ بلند ہو تو مجموعی اُونچائی آٹھ ہزار فٹ نکلتی ہے جو پائیر نیز کے اُونچے سے اُونچے مقام سے $\frac{1}{8}$ زیادہ ہے۔

[3] بنگال آرمی کے مرحوم لیفٹیننٹ میکارٹنی (جو ۱۰-۱۸۰۹ کے کابل مشن کے ساتھ بطور پیمائش کار گئے) کے اندازے کے مُطابق کوہ ہندوکش بائیس ہزار فٹ سے زیادہ اونچا تھا اور اسی صیغۂ ملازمت کے لیفٹیننٹ ویب (جو ۱۸۰۷ میں دریائے گنگا کا منبع دریافت کرنے پر مامور ہوئے) کے مطابق (مبنی بر اوسطِ مشاہدات و شمار) کوہ ہمالیہ روہیل کھنڈ کے میدان سے اکیس ہزار فٹ اُونچا ہے۔
دیکھئے ایشیاٹک ریسرچز، جلد یازدہم، ص ۴۴۴، کلکتہ ایڈیشن۔

مَیں نہیں سمجھتا کہ حدودِ بلوچستان کے اندر دُوسرے پہاڑی سلسلے اپنی جسامت و رفعت کی بدولت تمہید کے اس تنقیدی جائزے میں شامل ہونے کے مستحق ہیں بالخصوص اس لئے بھی کہ ہر صُوبے پر علیٰحدہ علیٰحدہ تبصرے میں مجھے موقع مل جائے گا کہ میں اُن مشاہدہ گیر مقامات کا خصُوصی تذکرہ کردُوں جو ان کے ضمن میں نظر انداز ہو گئے ہوں۔ اسی طرح میں ندی نالوں پر بھی غیر اہم تبصرہ معرضِ التوا میں ڈالتا ہوں اور صرف یہ کہدینا کافی سمجھتا ہوں کہ ملک کے شمالی حصّوں میں کوئی آبِ رواں ایسا نہیں ہے جسے ہم نالے سے زیادہ درجہ دے سکیں اِلّا یہ کہ طُغیانی اُسے پُرشور اور ناقابلِ عبور دھارا بنادے اور وہ دریا کا مقام حاصل کرلے اور پھر بھی کوئی دریا ایسا نہیں ہے جو ایک باقاعدہ اور غیر شکستہ گذرگاہ سے سمندر تک پہنچے جیسا کہ وہ اپنے اپنے مخصوص خطّوں کے تحت زیرِ غور آئیں گے۔ اب میں اُنہی کے ذکر کی طرف آتا ہوں۔

باب پنجم

بلوچستان کا پہلا خطہ — صوبجات جھالاوان و سراوان اور علاقہ قلات — ان کی وسعت — پہلے کا حدود اربعہ — ٹھک یا ضلعے — بڑا قصبہ — دریا — سراوان — حدود اربعہ — اضلاع — تمن یا دیہات خیام — ضلع قلات — سراوان سے کیوں ممیز — خانہ زاد یا گھر بلو ملازم — جھالاوان اور سراوان کا مقابلہ — مؤخرالذکر کی غیر معمولی سنگلاخی — آبادی زیادہ — اغلب وجہ — قلات تینوں کا صدر مقام — اس کی تاریخ میں سارے بلوچستان کی تاریخ ہے — تفصیل کا مجوزہ نقشہ — قدیم بیانات — براہوئی پہاڑ دنیٰ نامعلوم اور نادر یافتہ کیفیت — یونانی — ان کے نظریات — انڈو سیتھیا — اس کی وسعت — مصنف کا اندازہ — سکندر اعظم — اس کے سفر کا مختصر خاکہ — ملک کی نوعیت اس کی مظہر ہے — کریٹے روس — اس کا سفر — اس نے یہ راستہ کیوں اختیار کیا — سکندر کی موت — بلوچستان طاقِ نسیاں میں — ہندو شہنشاہ — ایرانی خاندان — خراج گیری — رابطہ کیسے — خلفائے بغداد — اُن کا سندھ پر حملہ — مقاصد — راستہ — براہوئی پہاڑ ابھی تک کیوں نادریافتہ — محمود غزنوی — فتوحات — بیٹے — ان کی تقلید — اس کی وجوہات — ہندوؤں کا

سندھ سے اخراج — مصنف کا گمان — براہوئی پہاڑوں کی دشوار گذاری — حالیہ ثبوت — مطبوعہ نقشوں میں ندارد — تاریخی واقعات کا زبانی تحفظ — مقامیان بلوچستان کے ماخذ پہ مجوزہ بحث — مبنی بر قیاس — حفاظتی اقدامات — زبانیں — بلوچ افغان ماخذ کے منکر — ان کا استدلال اور عرب ماخذ کے دعوے — تسلیم نہیں کیے گئے — بلوچستان کی وجہ تسمیہ — سلجوقی — تاتار — ترکمان — بلوچ انہی سے ماخوذ — اس رائے کی وجوہات — مغلوں کا مختصر بیان اور ان کی سندھ میں آبادکاری — نیست و نابود — مصنف کی رائے — اس کی وجوہات — براہوئی — کہاں سے آئے — مقامی نظریہ — روایتی ماخذ — محمدؐ کی ملاقات — انکی جہالت — مذہب کا معمولی علم — ذریعۂ اکتساب — دہوار — ان کا مختصر حال — مصنف انہیں کسی وقت گبر یا قدیم ایرانی سمجھتا تھا — اس کی وجوہات کی تفصیل — بیان کرنے کا مقصد — ہندوؤں کا سندھ سے اخراج — کہاں آباد ہوئے — بالآخر براہوئیوں سے مغلوب ہو گئے۔

صوبجات جھالاوان و سراوان مع درمیانی ضلع قلات، جنہیں میں نے بلوچستان کا پہلا خطہ قرار دیا ہے۔ قطعی طور پر براہوئی سلسلہ کوہ کے دائرہ کے اندر ہیں۔ جب کہ ہم نے عرض بلد کے چھتیس درجے کے جنوب کے پہاڑی حصوں کو ایک طرف رکھ دیا ہے۔ لہٰذا ان کے حدود اربعہ کا بیان غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ بہت کچھ کہا جا چکا ہے لیکن میں اس لئے ایسا کر رہا ہوں کہ میں ان کی متعدد وسعتوں کو زیادہ قطعیت کے ساتھ متعین کر سکوں۔

جھالاوان جنوبی ترین اور عظیم ترین ہے۔ اس کے جنوب میں صوبہ لاس اور مکران کا کچھ حصہ ہے۔ شمال میں ضلع قلات اور سراوان ہے۔ مشرق میں سندھ کے بعض حصے اور کچھ گنداوا ہیں اور

مغرب میں مکران ہے۔ اس میں وڈ، خضدار، نال، پندران، زہری اور زیدی کے ٹھک یا اضلاع شامل ہیں۔ دو تین چھوٹے چھوٹے اضلاع بھی ہیں لیکن ان سب کی تفصیل میں جانا بیہودہ ہوگا۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک ٹھکری ہے جس کے اختیار پر خان قلات کی قدغن ہے جیسا کہ میں ابھی بیان کروں گا گو یہ اختیار خان سے ماخوذ نہیں ہے۔

زہری اس صوبے کا سب سے بڑا قصبہ ہے اور اس کے نام پر ایک ٹھک بھی ہے اور ایک براہوی قبیلہ بھی جس کا سردار قادر بخش ہے۔ اس میں دو تین ہزار گھر ہیں اور اس کے گرد ایک کچی دیوار ہے۔ اس صوبہ میں امدر ناچ سے بڑا کوئی نالہ نہیں جسے میں نے فروری میں دیکھا جب یہ تین گز سے زیادہ چوڑا نہ تھا اور خشک موسموں میں یہ دس انچ گہرا ہوتا ہے۔ یہ اکثر خشک ہوتا ہے لیکن اکثر پہاڑی ندیوں کی طرح اس کے پاٹ کو چند فٹ کھود کر پانی با افراط نکالا جا سکتا ہے اور کاشتکاری کے کام میں بھی لایا جا سکتا ہے۔

سراوان کے شمال میں افغان پہاڑیاں اور اسے قندھار سے جدا کرتا ہوا مشرقی صحرا ہے۔ جنوب میں جھالاوان اور قلات ہے۔ مشرق میں سیوستان اور کچھ گنداوا ہیں اور مغرب میں صحرا ہے۔ اس کے حصے نوشکی، گر، کوہک، پائین کوتل، سرد، کشتان خاران وغیرہ ہیں اور ان پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں سوائے اس عمومی تبصرہ کے جو میں نے جھالاوان پر کیا ہے۔ ان کے قصبے یا گاؤں دائمی نوعیت کے نہیں اور براہوئی تمن چراگاہوں کی تلاش میں ہمیشہ حرکت میں رہتے ہیں۔

ضلع قلات ہے تو سراوان کا حصہ لیکن اسے ممیز کرنے کا رواج ہو چلا ہے کیونکہ خوانین قلات نے یہاں کے خیلوں کے سرداروں سے پوچھے بغیر اس کے محاصل خانہ زادوں[1] کو عطا کرنے

---

[1] خانہ زاد گھر یلو غلام ہیں۔ یہ خانہ اور زائیدن کا مرکب ہے۔ غلاموں کے متعلق بلوچوں کے رسم و رواج باب چہارم حصہ اول میں ملیں گے۔ خانہ زاد او نچے طبقہ سے ہونے کی وجہ سے سرداروں کے مقرب اور راز دار ہوتے ہیں۔ ان کا کردار اور مرتبہ بہت معزز سمجھا جاتا ہے اور آزاد ہونے اور زمین حاصل کرنے کے بعد بھی وہ خانہ زاد ہی کہلاتے ہیں۔

کا حق غصب کر لیا ہے اور نتیجتہً وہ بلا سوچے سمجھے اس سے کنارہ کش ہو گئے ہیں اور خانہ زاد ہی اب اس میں کاشت کرتے ہیں اور پھلتے پھولتے ہیں۔

ان دونوں صوبوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مجھے ایک دوسرے سے قدرتی فوائد میں برتر معلوم ہوتا ہے۔ جھالاوان اگرچہ سراوان کی طرح پہاڑی ہے تاہم اس میں دو تین چھوٹے چھوٹے میدان یا وادیاں ہیں جیسے وڈھ، سوراب اور خضدار، لیکن سراوان میں ایک بھی ہموار جگہ ایسی نہیں جس کا محیط چند میلوں سے زیادہ ہو سوائے دشتِ بے دولت کے جس کا ذکر پچھلے باب میں ہو چکا ہے۔ جھالاوان کی آب و ہوا زیادہ معتدل ہے، بارش اکثر ہوتی ہے جو یہاں کی بنجر اور پتھریلی زمین کو زیادہ قابل کاشت اور پیداوار بنا دیتی ہے۔ اس کے باوجود سراوان کی آبادی جھالاوان سے دوگنی ہے اور اس میں ضلع قلات کی آبادی شامل نہیں ہے۔ اس کی وجہ شمالی علاقوں سے ایک ناقابل تشریح رغبت ہی ہو سکتی ہے۔

شہر قلات اب بھی قرون سابقہ کی طرح ان صوبوں کا دارالحکومت ہے۔ یہ کسی وقت بلوچستان پر بھی حاوی تھا اور بلوچوں میں واحد منظم حکومت کا مرکز ہونے کی وجہ سے اسکی موجودہ تاریخ دوسرے خطوں کی تاریخ سے متعلق بلکہ اس کی اہمیات کی بھی حامل ہے۔ لہٰذا میں کُل کو اس جزو میں بند کروں گا اور کچھ کو اگلے باب میں بیان کروں گا میرے پاس جو قلیل اور بے ربط مواد موجود ہے میں اسے واضح اور غیر مبہم انداز میں پیش کروں گا لیکن اس کوشش سے پہلے ان قدیم بیانات پر مختصر تبصرہ ضروری ہے جو ان خطوں سے متعلق ہیں۔

بلوچوں پر تحقیقات کے دوران مجھے رہ رہ کر خیال آتا رہا کہ قدیم نصف کرے میں (ماسوائے اندرون افریقہ) کوئی ایسا خطہ نہیں ہے جو اتنا عرصہ نادریافتہ رہا ہو اور جس کے متعلق اتنی غلط اور متضاد آرا قائم کی گئی ہوں جیسا کہ بلوچستان کا پہلا خطہ۔ یونانیوں سے ہمیں ہندوستان کی مغربی سرحدات کا اولین علم حاصل ہوا لیکن وہ یا تو اس علاقے سے بالکل نابلد تھے یا اسے اتنا جانکاہ ویرانہ سمجھتے تھے کہ اس پر بالکل چپ سادھ گئے۔ انہوں نے یہ دیکھا کہ یہ پہاڑی تھا

اور یہ سمجھا کہ یہاں ایسے مقامی لوگ رہتے تھے جن کے اطوار و کاروبار سیتھیوں سے ملتے جلتے تھے اور اسی لئے انہوں نے اسے انڈو سیتھیا پکارا اگو اس کا اطلاق صحیح معنوں میں براہوئی سلسلہ کے صرف جنوب مشرقی گوشوں پر ہوتا تھا جو صوبہ ملتان (قدیم ملی) کی حدود تک پھیلے ہوئے علاقے سے مل کر انڈو سیتھیا بنتا تھا حقیقت یہ ہے کہ مجھے تو اس میں بھی کلام ہے کہ اس میں بالائی حصے مقدونوی فتح کے بہت بعد تک بھی آباد تھے یا نہیں اور میں اپنی وجوہات اس کے بعد بیان کروں گا۔

سکندر خود دریائے سندھ پہ واقع پٹالہ (اسے ٹھٹہ کہا جاتا ہے) سے نکل کر اپنی فوج کے ساتھ عربطائی کے علاقے سے گذرا جو موجودہ صوبہ لاس کا ایک حصہ تھا اور یہاں اُس نے دریائے عربس (پورالی) کو پار کیا۔ اس چھوٹی سی ندی کے مغرب کی طرف وہ اوریطائی کی سرزمین سے گذرا اور پھر ایک سلسلۂ کوہ پار کر کے وہ صوبہ جیدروشیا (مکران) میں داخل ہوا۔ یہاں اُس کی فوج کا کافی حصہ تھکاوٹ بھوک اور پیاس کی نذر ہو گیا۔ یہ سفر بلاشک وشبہ براہوئی سلسلے کے جنوب کی طرف سے تھا اور اگر یونانی مورخین اتنی وضاحت و صراحت سے کام نہ بھی لیتے تو بھی علاقے کی خاصیت ہر سوال کو حل کرنے کیلئے کافی تھی جو اس ضمن میں پیدا ہوتا۔[1]

کریٹے روس کے ذمہ بھاری بھر کم سامان اور بیمار و مجروح سپاہیوں کو اراکوشیا اور ڈرنگیانا کے راستے لے جانا تھا لہٰذا وہ بہت شمال کی طرف سے گذرا کیونکہ وہ علاقے موجودہ قندھار اور سیستان کے صوبوں میں شامل ہیں جن کا کوئی حصہ بلوچستان کے عرض بلد میں نہیں۔ اس کے علاوہ ہم یہ حتمی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ چونکہ جرنیل کو مکرانی صحراؤں سے بچانا مقصود تھا لہٰذا وہ یقیناً کسی ایسے علاقے سے نہ گذرا ہو گا جس میں ناقابل رسائی چٹانیں اور گہری گھاٹیاں ہوں اور وہ ویسے ہی

---

[1] اگر سکندر برسات میں پورالی پہ آتا تو اسے ناقابل عبور پاتا۔ میری تیس جنوری کی ڈائری اس پر روشنی ڈالے گی اور اگر وہ ایک دفعہ صوبہ جھالاوان میں داخل ہو جاتا تو اس کی فوج باہر نکلنے کا جنوبی ترین راستہ خضدار (۶۶.۵۴ - ۲۷.۵۰ عرض بلد شمالی) سے پنجگور تک کا ہی پا سکتی تھی۔

مصائب سے دوچار ہو جنہیں سکندر (اور اُس کی فوج) نے لبیک کہا تھا۔

یُونانی حملے اور سکندر کی مرگ بے ہنگام پر سلطنت کی تقسیم کے بعد ہمیں ان علاقوں کا کوئی ذکر نہیں ملتا سوائے اس کے کہ ساڑھے نو سو سال کے عرصے سے بھی زیادہ تک ہمیں گبروں یا قدیم ایرانیوں کی بے ربط اور افسانوی روایات ملتی ہیں۔ ہندوستان کے ہند وشہنشاہ یکے بعد دیگرے اس طویل دَور میں ایران کے سلیوکسی، ارشکانی اور ساسانی شہنشاہوں کے باجگزار رہے اور یوں ان دونوں اقوام کے درمیان اکثر اور واضح رابطہ قائم رہا لیکن اس کا ذریعہ سمندر تھا یا خراسان کا شمالی راستہ لہٰذا یہ درمیانی علاقے (جو اس تحقیق کا موضوع ہیں) روشنی سے محروم رہے اور راہی اَو کین اور شاید با استحقاق گمنامی میں چلے گئے۔

سن ہجری (٦٦٧ء) کے باتوے سال بعد خلفائے بغداد نے کچھ تو تبلیغ اسلام کے جذبے سے اور کچھ کفار[1] سندھ کی اہانت آمیز کاروائی کا انتقام لینے کی خاطر ایک فوج اسی راستے سے بھیجی جہاں سے مقدونوی فاتح قریباً ایک ہزار سال پہلے بابل کو واپس گیا تھا۔ یہ فوج ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ چلی تاکہ پانی ملنے کا یقین رہے کیونکہ ریتیلے ساحل کو ایک دو فٹ کھود کر اسے بہ آسانی حاصل کیا جا سکتا ہے لہٰذا اندرونی علاقوں تک اس کی رسائی نہ ہو سکی اور میری معلومات کے مطابق خلفائے امیہ وعباسیہ کے ادوار میں انہیں دریافت کرنے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

---

[1] گجرات کے ایک قدیم تاریخی مسودہ میں میں نے دیکھا کہ شاہ ایران بہرام گور بھیس بدل کر گجرات آیا اور نیمروز (موجودہ سیستان) کے راستے فوج کے ساتھ واپس ہوا کیونکہ اُسے ہند میں شکار کرتے ہوئے پالیا گیا۔ یہ ہند وشہنشاہ راج دیو کے وقت اور چوتھی صدی عیسوی میں ہوا۔ اُس وقت سیستان زرخیز اور گنجان آباد تھا لیکن اب ایک ویران اور ریتیلا دشت ہے۔

[2] ہندوؤں کو مسلمان مورخین کفار کہتے ہیں۔

[3] دیکھئے پانچواں خطہ، باب دوازدہم ر

جب محمود غزنوی نے اپنے دورِ عروج میں فتح ہند کا بیڑہ اٹھایا تو اُس نے دریائے سندھ کے مغرب کی طرف کا سارا ہموار علاقہ لے لیا اور براہوی پہاڑوں کے دامن تک آ پہنچا۔ اُس کے بیٹے مسعُود نے مغرب کی طرف اپنا دائرہ فتوحات وسیع کیا اور مکران فتح کر لیا۔[۱] لیکن وہ اپنے وَالد کے منصوُبہ پر قائم رہا کہ بلند سلسلوں پر نہ چڑھا جائے۔ آئندہ فاتحین بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلے اور اگر کبھی وہ یہاں داخل ہُوئے تو بھی محض ایک اتفاقی چھاپہ ہوتا تاکہ وہ باغیوں کی سرکوبی کر سکیں اور مقصد یہاں کی مستقل فتح نہ ہوتا۔

اس کے دو وجوہات ہیں: ایک تو اس علاقے کی ناداری اور دوسرے اس کی دشوار گذاری ناداری تو یہاں کی ایسی قدیم تاریخی حقیقت تھی کہ اب تک سندھ کی بہترین تاریخ چچ نامہ کے مؤلف نے لکھا ہے کہ جو کفار (ہنود) قرآنی تعلیمات کو نہ مانتے تھے ان پہاڑوں میں دھکیل دیئے جاتے تھے تاکہ وہ بھوک اور سردی سے مر جائیں میرے خیال میں یہ اجاڑ علاقے اُس وقت تک غیر آباد تھے اور میں صوبجات جھالاوان وسراوان یا کم از کم ان کے بلند زین علاقوں کی اوّلین باقاعدہ بستیاں اسی دَور سے منسُوب کروں گا۔ جہاں تک دوسرے سبب غیر نفوذ پذیری کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں مَیں نے جو کچھ یہاں دیکھا ہے اس سے کافی ثبوت ملتے ہیں اور اگر مزید عینی شہادت کی ضرورت ہو تو بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں جن سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ ہندوستان و ایران کی حاکمیت کی خاطر تاتاری، پٹھان اور مغل فاتحین کے درمیان جو جنگیں ہوتی رہیں ان کے دوران یہ علاقے ایک عارضی پناہ گاہ بنے رہے۔ حتیٰ کہ ۱۸۰۶ء میں جب کابلی شہزادہ قیصر بلوچستان میں بے یار و مددگار بھاگ آیا تو بھی یہ قدرتی پہاڑی قلعے اتنے ناقابلِ تسخیر سمجھے گئے کہ اُس کا تعاقب خارج از امکان سمجھا گیا۔ آخر میں مَیں یہ کہہ سکتا ہوں

---

[۱] مسعود ابن محمود نے ایک مکرانی لشکر ان علاقوں کی تسخیر کے لئے ترتیب دیا لیکن سلجوقی تاتاروں کے اوّلین طلوع کی دھوم سے وہ اپنے ارادے سے باز رہا۔

کہ اس علاقے کی گمنامی مطلق قدیم و جدید نقشوں پر ایک نظر ڈالنے سے بھی عیاں ہو جاتی ہے کیونکہ ان میں سے کسی میں بھی اس کا کوئی نام نہیں سوائے بلوچی یا بلوچی کے جو یہاں کے مقامیوں کے صرف ایک طبقے کے نام کی غلط املا ہے اور میرے خیال میں براہوئیوں کی نسبت کم موزوں ہے (جو سب پہاڑوں کے باسی ہیں) کہ انہی کے نام پر ملک کا نام رکھ دیا جائے[1]۔

اَب ہم ایسے دَور میں آ گئے ہیں جس میں بلوچستان کے تاریخی واقعات کی ایک دھندلی سی یاد کم از کم زبانی طور پر ضرور محفوظ کر لی جاتی ہے لیکن ان زبانی و صدری روایات کو قابلِ فہم بنانے کے لئے یہ موزوں بلکہ ناگزیر ہے کہ میں مقامیوں کے مختلف طبقوں کے ماخذ پر کچھ کہہ دوں۔ اس بے کشش سرزمین میں ان کی ابتدائی ہجرت کی تواریخ و وجوہات پر کچھ روشنی ڈالوں اور اس طریقہ پر اظہارِ خیال کروں جس کے تحت انہوں نے زمین کا بٹوارہ کیا ہے۔ میرے قارئین اسے پڑھتے ہوئے دیکھیں گے کہ میرا تبصرہ زیادہ تر مبنی بر قیاس ہوگا کیونکہ ناخواندہ اور علم و تجسس سے بے بہرہ لوگوں سے ہم ایسی توقعات نہیں رکھ سکتے کہ وہ کم وحشی لوگوں کی طرح اپنے ماخذ کی کھوج لگائیں گے۔ میں نے پوری کوشش کی ہے کہ مجھے معتبر ترین ذرائع سے معلومات حاصل ہوں اور میں نے افسانہ و افسوں سے دامن بچایا ہے۔

---

[1] میجر رنیل نے مکران کو شمالی عرضِ بلد کے اتنے اونچے درجے تک اٹھا دیا ہے کہ جھالاوان اور سراوان بھی اسی میں شامل ہو گئے ہیں لیکن سندھ کے جنوبی حصوں اور اس کے مغربی علاقوں کے متعلق اس قابل اور عموماً صحیح جغرافیہ نگار کی معلومات پُر از اغلاط ہیں۔ میں شاید کہیں کہیں اُس سے اور موسیو ڈی اینول سے بھی اختلاف کروں گا لیکن میں ان کے علم اور دقتِ نظر پر تنقید کی نہ خواہش رکھتا ہوں نہ اہلیت۔ میرا مقصد صرف حقائق بتانا ہے جیسا کہ وہ مجھے نظر آئے۔ لوگ سکندر کے وقت سے بدلے ہوں گے لیکن روئے زمین تو نہیں بدلی اور میں نے جیسا اسے دیکھا ہے ویسا ہی بلا مدح خود اور باحقِ دید بلا کم و کاست بیان کروں گا۔

چونکہ بلوچی یا براہوئی تحریری زبانیں نہیں ہیں لہٰذا سب بیانات روایتی ہیں، اور ناقابلِ اعتبار۔ بلوچی بولنے والے اپنا ماخذ ایران کے اوّلین مسلمان حملہ آوروں سے منسوب کرتے ہیں اور وہ عربی النسل کہلائے جانے کے بہت فریفتہ ہیں۔ وہ اس عام نظریہ کو ٹھکرا دیتے ہیں کہ وہ افغانوں کے ہم نسل ہیں اور ایک سبب (جو وہ ہمیشہ بہ اصرار پیش کرتے ہیں) اُنکے اس انکار کو تقویت دیتا ہے یعنی وہ افغانوں کے ہمسائے ہونے کے باوجود ایک بالکل جُداگانہ زبان بولتے ہیں۔

لیکن میں اُن کا یہ دعویٰ کسی صورت میں تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں کہ وہ اسلام کے اوّلین مبلّغوں میں سے ہیں۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جسے ہر چھوٹا موٹا قبیلہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مغرب کی طرف سے آئے۔ بلوچی کی فارسی سے مشابہت بجائے خود اس کی شہادت ہے جسے اس حقیقت سے مزید تقویت ملتی ہے کہ بلوچی قوم کی اکثریت اب بھی مغربی سرحد پر آباد ہے جس کی وجہ سے بلوچستان کو اس کا نام ملا کیونکہ نادرشاہ نے یہ دیکھ کر کہ براہوئیوں سے زیادہ یہاں بلوچ تھے یہ نام اسے دیا اور نصیر خان کو بیگلر بیگ بنایا۔ یہ تسلیم کرلیا کہ یہ مغرب سے یہاں وارد ہوئے لیکن بڑا مسئلہ ہنوز حل طلب ہے۔ بلوچوں کو ہم مقامیان و فاتحین ایران میں سے کس کے ساتھ مربوط کریں گے؟ ترک یا تاتار زبانوں سے میری عدم واقفیت مجھے اس سوال کے ایک ممکنہ حل تک پہنچنے میں سدِّ راہ ہے لیکن چونکہ ان کے خدوخال، عادات و اطوار اور زبان عربوں سے کوئی مشابہت نہیں رکھتے لہٰذا میں ان کے عربی النسل ہونے کو سرے سے ٹھکرا دیتا ہوں۔

پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں سلجوقی تاتار پہلی دفعہ خراسان میں نمودار ہوئے اور دس سال کے قلیل عرصے میں ان کے سردار طغرل بیگ نے یہ علاقہ غزنویوں سے چھین لیا۔ یہ وراثتاً اس کے جانشین الپ ارسلان کو مل گیا اور سلجوقی سلطنت کا ایک حصّہ بنا رہا حتیٰ کہ طغرل بیگ کے شہنشاہ بننے کے کوئی ڈیڑھ سو سال بعد یہ نسل ختم ہوگئی۔ اسی دوران بلوچوں کا ذکر ہمیں ملتا ہے۔

عمومی اصطلاح کے طور پر بھی اور مخصوص قبائل کے اعتبار سے بھی۔ اس سے بھی فیصلہ کُن بات یہ ہے کہ ان کا ذکر انہی علاقوں میں ملتا ہے جہاں وہ اب آباد ہیں۔

یکے بعد دیگرے خونیں انقلابات کا سُراغ لگانا (جو قزاقوں کے ایک گروہ کو ختم کرکے دوسرے گروہ کو برسرِ اقتدار لے آتے تھے) میرے دائرہ کار میں نہیں ہے۔ ہمیں معتبر ترین یونانی اور ایشیائی مورخین سے پتہ چلتا ہے کہ جب یہ لشکر اپنے سالاروں کی موت یا شکست کی وجہ سے تتر بتر ہو جاتے تھے تو یہ وحشی لوگ ادھر ادھر پھرتے تھے تاکہ کسی مناسب جگہ پر متمکن ہو جائیں یا پھر کسی بلند اختر سردار کے ساتھ کرائے کے سپاہیوں کی حیثیت سے منسلک ہو جائیں۔ میرے خیال میں بلوچ ایسے ہی تھے اور وہ ترکمان حسب و نسب سے تعلق رکھتے ہیں[1] اور مختلف حالات اس کے مؤید ہیں۔ ان کے ادارے، اطوار، مذہب اور سب کچھ (ماسوائے زبان کے) وہی ہیں۔ رہا زبان کا اختلاف تو وہ فوراً سمجھ میں آجاتا ہے۔ سلاجقہ بہت دیر تک ایران میں آباد رہے جو اُس وقت ایشیا کا امیر ترین اور خوشحال ترین ملک سمجھا جاتا تھا۔ یہاں انہوں نے بول چال کی زبان اپنالی اور خوارزم شاہوں کے یہاں سے نکالنے کے بعد بھی یہ بولی اپنے ساتھ لے گئے۔ خوارزمیوں کو چنگیز خانی مغول نے مغلوب کر لیا۔ اس بولی میں صرف اتنی ہی تبدیلی ہوئی ہے جتنی کہ سرحدی اقوام کے رابطے سے متوقع ہو سکتی ہے۔

ممکن ہے میرے بعض قارئین بلوچوں کو منگول ثابت کرنا چاہیں۔ لہٰذا میں اُن کے ترکمان ہونے کے سلسلہ میں مزید دلائل دیتا ہوں اور اس مسئلہ کا تصفیہ اہل تر حضرات پر چھوڑتا ہوں۔ منگولوں کی تاریخ دوسروں کی نسبت زیادہ محفوظ ہے اور یہ پہلی دفعہ چنگیز خان کے تحت اُبھرے اور اُس نے یا اس کے جانشینوں نے تمام سابقہ خاندانوں کو ملیا میٹ کر دیا۔ خوارزم شاہوں

---

[1] میں سلاجقہ کو زیرِ نظر مقامی تواریخ کے مطابق ترکمان کہتا ہوں۔ وہ اور مغل تاتار نسل کے ہیں لیکن یہ دونو ہم قوم نہیں ہیں جیسے سپینی اور فرانسیسی یورپی ہونے کے باوجود ہم قوم نہیں ہیں۔

کی اٹل دشمنی نے ان کے لشکروں کو ایران سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ جہاں وہ عرصے سے آباد ہو چکے تھے۔ یہ مغرور سیستان اور اس کے آس پاس کے ممالک میں پناہ گزیں ہوئے۔ جن میں سندھ سیوستان اور براہوئی پہاڑ شامل ہیں۔ "مجموعۃ الواردات" میں سندھ اور سیوستان کی تاریخ کا خلاصہ موجود ہے اور اس میں مذکور ہے کہ دس ہزار مغل ۷۴۳ھ (۱۳۲۸ء) تک شہر ٹھٹھہ میں تھے اور ان کا حصہ شہر مغل واڑہ کہلاتا تھا اور یہ نام اب بھی قائم ہے۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ ۷۴۳ھ میں ایک مغل سردار جلو دا خان چھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ سیستان سے چلا اور دریائے سندھ کے مغربی میدانوں (شمالی عرض بلد کے چھبیسویں اور انتیسویں درجوں کے درمیان) پر ٹوٹ پڑا لیکن صوبیدار ملتان، اُچ و سندھ، نصرت خان نے اسے محاصرہ میں لیکر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ اُس نے شہنشاہ علاؤالدینؒ[1] کی وفاداری کا حلف اٹھا لیا، معاف کر دیا گیا اور اُسے اور اُس کے پیروؤں کو ایک جاگیر دے دی گئی۔

ان مثالوں سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ مغل ایک دور میں یہاں آباد تھے لیکن جب ہندوستان پر متواتر حملوں نے پٹھان خاندان کو ختم کر دیا اور موجودہ شہنشاہ کے آباؤ اجداد کو سلطنت مل گئی تو یہ مضطر اور صبر نا آشنا لیٹرے اس سازگار موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دفعہ پھر اپنے ہم وطنوں کے لشکروں میں شامل ہو گئے اور اپنے نو یافتہ مقبوضات کو چھوڑ چھاڑ کر ہندوستان کے میدان غنیمت میں چلے گئے۔ یہ جذبہ اتنا قوی تھا کہ اب ان کا شاید ہی یہاں کوئی نام و نشان ہو۔ رضاکارانہ ہجرت کے سوا ان کی آبادیوں کی کامل تباہی کا اگر کوئی اور سبب ہوتا تو غیر اغلب ہے کہ ہم عصر ایشیائی مورخین اس کو نظر انداز کر گئے ہوتے اور میرا انہی پہ انحصار ہے۔

بلوچوں کی اصل و نسل پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی وجہ سے میں اب بلوچستان کے دیگر قبائل کا سرسری جائزہ لوں گا۔ اگر میں صرف آبادی کی کثرت یا موجودہ سردارخیلوں کو ملحوظ نظر

---

[1] علاؤالدین اوّل۔ دیکھئے ڈو کا ہندوستان۔

رکھتا تو براہوئیوں کو اوّلیت ملنی چاہیے تھی لیکن ان کی تاریخ عجیب وغریب طور پر مبہم اور غیر دلچسپ ہے لہٰذا وہ قابل التفات نہیں۔ وہ تاتار اہل کوہ کی ایک قوم معلوم ہوتے ہیں جو کسی قدیم دور میں جنوبی ایشیا میں آباد ہوئے اور خیلوں (یا معاشروں) کی صورت میں خانہ بدوش زندگی گذارتے رہے اور صدیوں تک اپنے سرداروں اور قوانین کے تحت رہے حتیٰ کہ بالآخر قلات اور پورے بلوچستان میں ایک واقعہ کی بدولت متمکن ہوگئے جس کا ابھی بیان ہوگا۔

میں صرف ایک مفروضہ قائم کرسکتا ہوں۔ ویسے بھی میری تحقیق کے لیے یہ جاننا ضروری نہیں کہ وہ کس قسم کے ملک سے بلوچستان میں وارد ہوئے لیکن ان کے مشاغل اور طرز بود و باش کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اہل کوہ تھے۔ ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ ان کا نام بھی اس کا مظہر ہے جو بہ (پر) اور روہ (پہاڑی) کا مرکب ہے اور ایک بیتی زبان میں اب بھی مستعمل ہے ایسے استدلال پر انحصار نہیں کیا جاسکتا گو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ بلوچوں کو ایک حصّہ ملک میں ناہروئی کہا جاتا ہے جو سابقہ اشتقاق کے مطابق اہل میدان یا لفظی طور پر پہاڑی نہیں کے معنی دیتا ہے اور یہ نام براہوئیوں نے انہیں دیا کیونکہ وہ (بلوچ) کشادہ علاقوں اور پست وادیوں اور میدانوں کو ترجیح دیتے تھے۔

میں نے اس کتاب کے حصّہ اول میں براہوئی قوم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی قدیم تاریخ افسانوی روایات سے بھرپور ہے (باب چہارم حصّہ اوّل) میں ایک وقت یہ سوچتا تھا کہ ان تمام روایات کو یکے بعد دیگرے مجتمع کرلوں لیکن مجھے فوراً احساس ہوگیا کہ ان لگاتار لغویات کی چھان بین کرنا ایک بے سود کام تھا کیونکہ یہ کسی بھی صورت میں عقلی استدلال کی متحمّل نہیں۔ اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ اس ملک کے اصلی باشندے ہیں اور پیغمبر اسلام کے منظورِ نظر ہیں کیونکہ وہ بنفسِ نفیس ایک فاختہ پر سوار ان کے پاس آئے اور ان کی روحانی ہدایت و رہنمائی کے لیے متعدد پیران کے پاس چھوڑ گئے[1]۔ ان میں سے چالیس مکرّم و معظّم

---

[1] میں نے افغانوں کے متعلق بھی یہی روایت سُنی ہے لیکن ایسا غالباً اس لیے ہے کہ پیغمبر صاحب

معلمین قلات سے چھتّر میل شمال میں ایک پہاڑ پر مدفون ہیں اور اسی لئے اسے کوہ چہل تن کہتے ہیں اور مسلمان اور ہندو اسے زیارت سمجھتے ہیں۔

دُنیا سے الگ تھلگ اور پہاڑوں میں محصُور اکثر براہوئی ماقبل اسلام دَور کی کسی چیز کو نہیں سمجھتے سوائے اس کے کہ کائنات موجُود تھی۔ انہوں نے قرآن مجید سے اتنا ہی سیکھا ہے اور وہ بھی نہایت سطحی طور پر کیونکہ ٹھیٹ براہوئی تو اس کتاب مقدس کو پڑھ بھی نہیں سکتے لہٰذا وہ ان پڑھ فقیروں کی تشریحات پر اعتبار کرتے ہیں جو اسے ایک نفع بخش پیشہ سمجھ کر خیل بہ خیل شریعت کی تفسیر کرتے پھرتے ہیں۔ ایسا غیر یقینی اور غلط فہمیدہ مذہب بیکار قصّے کہانیوں کی راہ ہموار کرتا ہے اور اپنے آباؤ اجداد کے حیرت انگیز اور ناقابل یقین قصّوں کی طرف توہم آلود میلان ان لوگوں کو وحشت مطلق میں جکڑے رکھتا ہے!

دہواروں کے متعلق میں صرف چند لفظ لکھوں گا۔ میں نے انہیں ایک وقت گبر یا قدیم ایرانی سمجھا تھا جنہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا تھا تو وہ جاں نثاروں سے بھاگ اٹھے لیکن میری حالیہ تحقیقات نے یہ ثابت کیا کہ وہ ایشیا کے مختلف ممالک میں مختلف ناموں سے موجُود ہیں، وہ سب ایک ہی جیسی خالص فارسی بولتے ہیں، ایک ہی جیسے اطوار و کاروبار کے حامل ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے علم کے مطابق وہ ایک ہی قسم کی پابندیوں اور تحفظات کے تحت گذر اوقات کرتے ہیں جو اس کا قرائنی ثبوت ہے کہ وہ کسی وقت پناہ گزین ہو کر آئے تھے اور حکمران طبقہ سے ایک مخصوص معاہدہ کے بعد انہیں یہاں آباد ہونے دیا گیا۔

عرب قرآن کے علمبرداروں کی حیثیت سے ایران میں پہلی دفعہ اٹھارہ ہجری کے قریب (۶۴۰ء) نمودار ہوئے لیکن تیس یا اکتیس ہجری تک ہی وہ جنوب مشرقی صوبجات

بیرون ملک جاتے تھے تو وہ (بہت سے ممالک کا) چکّر کاٹتے تھے۔

ل دیکھیے حصّہ اوّل، باب چہارم، دہواروں کا بیان۔

کرمان، عراق عجم اور مکران میں نفوذ کر سکے۔ یہاں ان کی کوئی مزاحمت نہ ہوئی۔ کیونکہ آخری ایرانی بادشاہ یزدگرد (جو بعض کے مطابق بہت سال یزد میں رہا تھا اور بعض کے مطابق کرمان میں) کو اُس کی فوج نے چھوڑ دیا اور مسلمان مورخ کے الفاظ میں اُنہوں نے نورُ السّمٰوات کو اپنا لیا جو پیغمبر نے انہیں بھجوایا تھا، لہٰذا وہ سیستان کے راستے فرار ہو گیا لیکن آخر کار اسے اس کے بعض مُرتد، محکوموں نے مار دیا۔

اس کی موت کے بعد گبروں کا انتشار عالمگیر ہو گیا اور مسلمان عساکر نے مشرق کیطرف بڑھتے ہوئے انہیں آگے آگے دھکیلا حتیٰ کہ یہ فرقہ نیست و نابود ہو گیا ہے۔ اس دور کے بعد کی تواریخ میں مجھے گبروں کا ذکر نہیں ملا حتیٰ کہ مسعود غزنوی نے ۴۲۷ھ کے قریب بعض کو مکران و سیستان میں بکھرے ہوئے پایا جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایران میں واپس چلے گئے اور زیادہ تر یزد میں آباد ہیں[۲]۔

مندرجہ بالا دو نوبیرے میرے ان دلائل کا خلاصہ ہیں جن کی بنا پر میں نے دھوادوی کو گبروں کی اولاد سمجھا لیکن ان کی کثیر التعدادی اس امکان سے متصادم ہے پھر بھی میں نے اپنی رائے کا اظہار ضروری سمجھا تاکہ دوسروں کو مزید جستجو کیلئے اشارہ مل سکے۔

---

[۱] میں نے یہاں مجموعہ الواردات سے لفظی ترجمے دیا ہے کیونکہ یہ قدرے مبہم ہے۔ مؤلف مرآۃ الجنان اوز گنہ یدہ نامہ کا حوالہ دیتا ہے لیکن مورخ کی غیر جانبداری کی بجائے جنونی کی زہر آلودگی سے کام لیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ نو مسلم پناہ گزین اور شہدا میں ساری نسل شامل تھی۔ دوسری جگہوں پر وہ انتہائی مبہم ہے اور پارسیوں اور ہندوؤں کو بلا تمیز کافر اور گبر کہتا ہے۔ میں نے ان میں تخصیص کے لئے ایک نصف النہار فرض کر لیا ہے جو طول بلد کا پینسٹھواں درجہ ہے جیسا کہ میں بعد میں ثابت کروں گا کہ ہنود دریائے سندھ کے بہت مغرب میں بھی تھے۔

[۲] دیکھئے حصہ اوّل، ڈائری ۲۷ مارچ۔ آتشکدوں پر نوٹ۔

اب مقامیان بلوچستان میں صرف ہندو رہ گئے ہیں۔ اور میں صرف یہ کہوں گا کہ وہ براہوئی پہاڑوں کے بالائی حصے کے اوّلیں آباد کار رہے جب خلفائے عباسیہ کی افواج نے انہیں سندھ، لاس اور مکران سے نکالا۔ یہ موضوع چونکہ بلوچستان کے چھٹے خطہ سے متعلق ہے، لہٰذا قارئین اسے وہاں دیکھ لیں۔

ترانوے اور چورانوے ہجری کے اس اخراج کے بعد میرے پاس کئی صدیوں تک بلوچستان کی کوئی دستاویز نہیں ہے۔ مقامی کہتے ہیں کہ ہندو اپنے تاجرانہ پیشوں میں مشغول رہے اور ان کے راجے براہوئیوں پہ مہربان رہتے تھے اگر وہ ان کے قصبوں کے قریب آباد ہو جاتے تھے۔ براہوئی اور بلوچ بتدریج ملک میں پھیل گئے اور ہندو سلطنت کو انقلاب سے ختم کر دیا گیا اور گدی[1] موجودہ خان قلات کے آباؤ اجداد کو مل گئی۔ یہ انقلاب اور بعد کے واقعات بلوچستان کی موجودہ تاریخ ہیں جس کا جائزہ اگلے باب میں لوں گا۔

۱؎ گدی یا مسند = تخت جس پر ہندو یا دیگر حکمران بیٹھتے تھے۔

باب ششم

خوانین قلات کا نسب نامہ ــ موجودہ حکمران خاندان سے پہلے یہاں کی تاریخ ــ ہندو حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا ــ ہندو راجہ کی موت ــ براہوئی سرداروں کا حکومت پر قبضہ ــ بعد کے واقعات کے غیر یقینی احوال ــ نظام حکومت ــ عبداللہ خان ــ کچ گنداوا پر حملہ ــ کامیابی ــ نادر شاہ کا حملۂ ہند ــ قلات پر قبضہ ــ عبداللہ خان کی موت ــ اس کا جانشین ــ ظالمانہ اور عیاشانہ زندگی ــ جابرانہ قانون کی تمہید ــ نصیر خان بھائی کو تخت سے محروم کرتا ہے اور اسے مار دیتا ہے ــ بلوچستان کا بیگلر بیگ نامزد ہوتا ہے ــ حکومت کی اصلاح ــ اپنی سلطنت کا چکر لگاتا ہے ــ قلات کی قلعہ بندی ــ شاہی کابل کا قیام ــ نصیر خان کی حکمت عملی ــ وجوہات ــ نتائج ــ احمد شاہ ابدالی سے جنگ ــ محاصرۂ قلات ــ محاصرہ اٹھا لیا گیا ــ معاہدہ ــ نصیر خان کا واقعہ ــ اس کی نمایاں اور سرفروشانہ خدمات ــ تحائف کی صورت میں معاوضہ ــ بلوچستان میں خانہ جنگی ــ فرو ہو گئی ــ نصیر خان کی وفات ــ اس کا خاندان ــ اس کا کردار بحیثیت سپاہی ــ مدبر اور حکمران ــ مصنف کا اس پر تبصرہ ــ اس کا جانشین ــ ایک اور خانہ جنگی ــ

حریفوں میں مصالحت ۔۔۔ خلاف ورزی ۔۔۔ ایک کی شکست اور موت
۔۔۔ خاندانی تنازعات ۔۔۔ نتائج ۔۔۔ باجگذار سرداروں کی بیوفائی ۔۔۔
وجہ ۔۔۔ ۱۸۱۰ تک تاریخ کا اختتام ۔۔۔ باہمی چپقلش ۔۔۔ ان کے خونیں نتائج
۔۔۔ موجودہ خان کے پرامنگ منصوبے ۔۔۔ مصنف کا ان پر تبصرہ۔

مذکورہ انقلاب کے دور کا صحیح تعین ناممکن ہے لیکن میرا قیاس ہے کہ یہ دو صدیوں سے زیادہ نہیں ۔ میرا یہ قیاس اس بات پر مبنی ہے کہ موجودہ حکمران خاندان نے اتنے ہی وقت سے زمام کار سنبھالی ہے۔ اس کا شجرہ نسب یوں ہے ۔

۱۔ قمبر، والد
۲۔ سمبر، والد
۳۔ محمد خان، والد
۴۔ عبداللہ خان ، والد
۵۔ حاجی محمد خان ، برادر
۶۔ نصیر خان ، والد
۷۔ محمود خان ، موجودہ حکمران

اور چونکہ پہلے چھ سردار (ماسوائے حاجی محمد خان) عالم ضعیفی میں فوت ہوتے یا مارے گئے ۔ لہٰذا ہم ان کی زندگیوں کا اندازہ ڈیڑھ سو سال بلکہ اس سے زیادہ کا لگا سکتے ہیں۔
اس خاندان کے برسر اقتدار آنے سے پہلے قلات پر صدیوں سے ایک ہندو خاندان حکومت کرتا تھا اور آخری راجہ کا نام سیوا تھا یا اس خاندان کے حکمران گدی نشین ہونے کے بعد یہی لقب اختیار کرتے تھے ۔ مؤخر الذکر زیادہ قرین قیاس ہے اس لئے کہ قلات اب بھی اکثر قلات سیوا کہلاتا ہے جس کی اغلب وجہ فرد کی بجائے حکمرانوں کا ایک سلسلہ ہے۔

الا یہ کہ کوئی فرد نصیر خان کی طرح عظیم اوصاف و صفات کا حامل یا ان کی وجہ سے ممتاز رہا ہو۔

سیوا خود زیادہ تر قلات میں رہتا تھا اور اس کا اکلوتا بیٹا سنگین بطور نائب زہری میں قیام پذیر تھا۔ ان دونوں کی حکومت عادلانہ تھی اور وہ اپنی مملکت میں سوداگروں اور دیگر نوواردوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ملتان، شکارپور اور بالائی سندھ کے مغربی حصّوں کے قزاقوں کا ایک گروہ ایک افغان سرغنہ کے تحت اور ایک رند بلوچ قبیلہ، مزاری (جو اب بھی تاخت و تاراج کے لئے مشہور ہے) کی حمایت کے ساتھ ہمارے علاقے پر بار بار یورشیں کرتا رہتا تھا بلکہ اب تو قلات بھی ان کے نرغے میں آگیا تھا (جو ابھی ایک بے ترتیب سا گاؤں تھا) لہٰذا سیوا کو مجبوراً پہاڑی چرواہوں اور ان کے سردار کو مدد کے لئے بلانا پڑا۔

یہ سردار قمبر[1] تھا جو شجرۂ نسب میں سرفہرست ہے۔ اس کے آباؤ اجداد اصل میں حبشی بتائے جاتے تھے اور وہ خود ایک مشہور پیر کی اولاد سمجھا جاتا تھا جس نے اپنے دور میں بہت سی کرامات دکھائی تھیں۔ اس سے قمبر اور اس کے حامیوں کو ملک میں ایک خاص وقار و افتخار حاصل ہوگیا جو حامیوں کی مختصر تعداد اور خود قمبر کی حقیر موروثی جائیداد (جو نگجو رمکران میں تھی) کے لئے حاصل کرنا ناممکن تھا۔

جھالاوان اور سراوان کے پہاڑوں پر پہلی دفعہ چڑھنے کے بعد سیوا نے اپنے ان مددگاروں کو حقیر سا وظیفہ دیا جو بمشکل ان کی گذر اوقات کے لئے کافی ہوتا تھا لیکن چند سالوں میں ڈاکوؤں کی سرکوبی یا ان کا قلع قمع کرکے یہ لوگ ملک کا فوجی قبیلہ بن گئے اور پھر اس کے مالک بن بیٹھے۔ قمبر نے راجہ کو تخت سے اتار دیا اور سربراہِ مملکت بن کر ہندوؤں کو مسلمان بننے پر مجبور کردیا یا مذہبی جذبے کے تحت موت کے گھاٹ اتار دیا۔

سیوا چند لوگوں کے ساتھ زہری چلا گیا جہاں اس کا بیٹا سنگین ابھی برسرِاقتدار تھا لیکن ان کے

---

[1] بلوچی میں قمبر کا معنی حبشی ہے اور اسی سے قمبرانی قبیلہ کا نام ہے جس سے محمود خان کا تعلق ہے۔

تیے دشمن دیگر قبائل کو حلیف بنا بنا کر یوماً فیوماً زور پکڑتے گئے اور بالآخر انہیں اس پناہ گاہ سے بھی نکال دیا اور وہ شکار پور، بھکر اور ملتان چلے گئے اور اپنے ہم مذہبوں میں جذب ہو گئے۔

بتایا جاتا ہے کہ سیوا اس بغاوت کے آخر میں مر گیا اور سنگین نے قیدی ہو کر اپنا مذہب ترک کر کے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بہت سے پیرو بھی مسلمان ہو گئے لیکن ان کا قبیلہ گوروانی[لے] اب بھی ان کے سابقہ مذہب کی یاد دلاتا ہے۔ یہ لوگ اب کچھ گنداوا میں آباد ہیں اور پہاڑی بلوچوں کے مقابلے پر بہت محنتی مشہور ہیں جیسے لاس کے نُمری۔

قمبر کے مسند نشین ہونے کے بعد بھی تاریخ بلوچستان ہندو دور کی طرح تاریکی میں رہی اور ایسے لوگوں پر مزید تحقیق کیسے ہو جن کے پاس تحریری دستاویزات ہی نہیں ہیں۔ اس کے جانشینوں نے بتدریج رہزنی کے پیچاریوں سے عناد ترک کر دیا اور حوصلہ افزائی کے ذریعے بہت سوں کو اپنے زیرِ سایہ رہنے اور تجارت کرنے پر آمادہ کر لیا۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے پوری کوشش کی کہ خانہ بدوش گڈریوں کو قبائل میں منظم کر دیں اور اس کے لئے انہوں نے زمین کے بڑے بڑے قطعے انہیں دیئے جن پر کوئی محصول یا دیگر شرائط نہ تھیں۔ سوائے اس کے کہ وہ قمبرانیوں کو حاکمِ اعلیٰ تسلیم کر لیں اور بوقتِ ضرورت انہیں حسبِ استطاعت مقررہ تعداد میں سپاہی مہیا کر دیں۔

یہ امن پسندانہ نظام تمام زبانی روایات کے مطابق (کیونکہ اور کوئی ماخذ ہے ہی نہیں) قمبر کے چوتھے جانشین عبد اللہ خان تک قائم رہا۔ وہ ایک بیباک اور پُر امنگ سپاہی تھا اور اُس نے کچھ گنداوا فتح کرنے کا سوچا جس پر طوائف الملوک حکومت کرتے تھے اور انہی شرائط پر نوابین سندھ کے باجگزار تھے۔ چنانچہ ایک بڑی فوج تیار کی گئی۔ جنگ کے پانسے پلٹتے رہے اور بالآخر قمبرانی اس زرخیز میدان اور اس کے صدر مقام گنداوا پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قابض ہو گئے۔

[لے] گوروانی یعنی گورو (ہندو پیشوا) کے بالکے یا مرید۔

اسی مقابلے کے دوران مشہور ایرانی فاتح نادر شاہ (یورپ میں تماس قلی خان کے نام سے مشہور) ہندوستان پر حملہ کیلئے آیا اور قندھار (درّانی دارالحکومت، قلات سے قریباً تین سو میل شمال مغرب میں) سے متعدد دستے اپنے جہاں دیدہ سالاروں کے تحت بلوچستان بھیجے جنہوں نے یہاں اُس کا اقتدار قائم کیا اور عبداللہ خان کے دو بیٹے بطور یرغمال شاہی خرگاہ میں روانہ کر دیئے اور عبداللہ خان کو اس کی حکومت پر برقرار رہنے دیا گیا لیکن اس کے تھوڑا ہی عرصہ بعد عبداللہ خان حاکم سندھ سے لڑتا ہوا خانپور (کچھ گنداوا) میں مارا گیا۔ لیکن فتح براہوئیوں کی ہوئی اور سندھی مقابلے کی تاب نہ لاکر لوٹ مار کرتے اور دیہات و قصبات کو آگ لگاتے ہوئے واپس چلے گئے۔

عبداللہ خان کی موت کے بعد اُس کا بڑا بیٹا حاجی محمد خان (جو چادر نادر شاہی میں یرغمال تھا) خلعت وغیرہ لیکر قلات آیا اور سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی۔ لیکن جلد ہی ظاہر ہوگیا کہ وہ اپنے والد کا وقار قائم نہ رکھ سکتا تھا۔ سندھیوں نے یہ دیکھ کر فوراً ایک فوج کچھ گنداوا میں داخل کر دی لیکن بلوچ اور دیگر باشندے جو پچھلے سال ان کے ظلم و ستم اور غارت گری سے مشتعل تھے، ایک جماعت کی حیثیت سے اُٹھے اور ان کو سندھ کے پار مار بھگایا۔

دریں اثنا حاجی محمد خان نے اپنے آپکو ظلم و تعیش کی نذر کر دیا۔ اُس نے اپنے والد کے دَور کے ملکی محصولات بازار کو تین گنا کر دیا اور حکم دیا کہ کوئی ہندو محل کے آس پاس نہ رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب اپنی دکانوں سے نکال دیئے گئے اور جب انہوں نے احتجاج کیا یا فرار ہوگئے تو اُس نے اُنکی جائیداد ضبط کر لی۔ غرضیکہ یہ لوگ ہر قسم کے ظلم و ستم کا نشانہ بنائے گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے غیر انسانی اور متروک رسم کی تجدید کر دی جس کے تحت خان کو بحیثیت حاکم اعلیٰ یہ اختیار تھا کہ وہ شادی کی پہلی رات برہنہ دُلہن سے ہم بستری کرے بلکہ وہ تو اس قانون کو مسلمان رعیت پر بھی لاگو کرنا چاہتا تھا۔[۱]

---

[۱] یہ قانون قمبر نے قلات پر قبضہ کے فوراً بعد نافذ کیا تھا تاکہ ہندوؤں کو ڈرایا دھمکایا جائے ورنہ کوئی اور مقصد نہ تھا۔

لوگ دو سال سے زیادہ اس جور و جفا کو سہتے رہے اور اس عرصے میں قلات خالی ہو گیا اور سرداروں نے دربار میں آنا بند کر دیا بلکہ حاجی محمد خان کے احکامات کو بھی نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ اتنے میں نادر شاہ سندھ میں سے ہوتا ہوا قلات سے کوئی ستر اسی میل کے فاصلے سے گذرا اور عبداللہ خان کے دوسرے بیٹے نصیر خان کو خلعت اور دیگر نشانات شاہی کے ساتھ قلات روانہ کیا۔ یہ شہزادہ دہلی تک فاتح کے ساتھ گیا تھا اور ہر موقعہ پر اس نے ایسی شجاعت و فراست کا ثبوت دیا تھا کہ نادر نے ایک عام اجتماع میں اس سے کہا کہ وہ اپنے بھائی کو تخت سے اتار دے اور ملک کو دوبارہ سلامتی اور خوشحالی کے راستے پر چلائے۔ نصیر خان قلات آیا تو یہاں کے تھوڑے سے باشندوں اور صوبے کی پوری آبادی نے اس کا پرتپاک استقبال کیا۔ اس نے اپنے بھائی کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ بالآخر وہ تنہائی میں ایک دن اس کے کمرے میں داخل ہوا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔[1] حاجیوں نے معمولی سی مزاحمت بھی نہ کی اور جونہی ظالم مر گیا انہوں نے نصیر خان کو اپنا خان تسلیم کر لیا۔ وہ فوراً مسند نشین ہوا اور چاروں طرف لوگوں نے خوشی سے چراغاں کیا۔ اس نے ان تمام حالات سے نادر شاہ کو مطلع کر دیا جو اس وقت قندھار میں تھا۔ نادر شاہ بہت خوش ہوا اور فوراً ایک فرمان کے ذریعے نصیر خان کو ان تمام علاقوں کا بیگلر بیگ نامزد کر دیا جو پہلے پانچوں مذکورہ خطوں میں شامل ہیں۔

نصیر خان نے اپنے دور کا آغاز ایسے کاموں سے کیا جن سے اس کی رعایا اس سے وفادار اور عقیدت مند ہو گئی۔ اس نے ان محصولات کا زیادہ حصہ منسوخ کر دیا جو اس کے بھائی نے عاید

---

[1] اس واقعہ کی دو روایتیں ہیں۔ ایک تو یہی جو بیان ہوئی۔ دوسری یہ ہے کہ نصیر خان نے شاہی محافظوں کو اپنے ساتھ لیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ اس کے بھائی کو مار دیں۔ یہ بظاہر اغلب معلوم ہوتا ہے لیکن نصیر خان عمر بھر اس واقعہ پر افسوس کرتا رہا اور کہتا رہا کہ صرف ملک اور اہل ملک کی فلاح و بہبود کی خاطر اسے یہ تکلیف دہ کام کرنا پڑا۔

کیے تھے اور انہیں موجودہ معتدل شرح پر مقرر کیا۔ گھوڑے اور دیگر جانور ہر قسم کے محصول سے مبرا قرار دے
دیے گئے۔ اُس نے بر سرِ عام مذہبی مناظرات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا خواہ یہ دونو مسلمان فرقوں
کے درمیان ہوں یا ہندوؤں اور ان میں سے کسی ایک کے درمیان۔ ہندوؤں کو اُس نے شکار پور
اور دُوسرے قصبوں سے بُلایا اور اُن کی سرپرستی کی تاکہ حکومت کو فائدہ ہو۔ اُس نے قلات میں انہیں
نہ صرف آزادیٔ مذہب عطا کی بلکہ انہیں پُرانا حق دیا کہ وہ اپنے برہمنوں کے رکھ رکھاؤ اور
مندر کی دیکھ بھال کے لئے ایک چوتھائی رُوپیہ بازار میں آنیوالے ہر لدے ہوئے اونٹ سے
وصول کر سکتے تھے۔ یہ حق انہیں پہلی دفعہ قمبر کے جانشین نے دیا تھا۔

اس کے بعد اس نے سرداروں کو حکم دیا کہ وہ اپنی اپنی فوج کی مقررہ تعداد لائیں اور جب
ایک بڑا لشکر جمع ہو گیا تو وہ قلات سے خضدار اور پنجگور ہوتا ہوا کیچ آیا جو مکران کا صدر مقام تھا۔
یہاں کچھ عرصہ ٹھہر کر وہ مغربی ترین سرحدی قصبے کسر قند میں گیا اور پھر شمال کی طرف سے چکر کاٹتا ہوا
وہ دزک اور خاران کے راستے واپس قلات آیا۔ اس سفر میں اُس نے مختلف اضلاع و علاقہ
جات کے اندرونی انتظام کو دیکھا اور اسے مستحکم کر دیا۔ واپسی پر اُس نے قلات شہر کو مضبوط
کیا۔ موجودہ قلعہ بندیاں بنوائیں، کابل اور ایران سے نہال منگوا کر وادی میں بہت سے
پھلوں کے باغات لگوائے اور وہ مستحق لوگوں کو دیئے اور بہترین اناج یا پھل وغیرہ اگانے پر
انعامات دینے کا طریقہ جاری کیا۔ اسیطرح وہ کچ گنداوا آیا اور یہاں کے بلوچ اور دیگر سرداروں سے
حلف وفاداری لیا اور فیصلہ کیا کہ سردی کا ایک حصہ وہ یہاں گذارا کرے گا۔ یہ رسم اس کے
بیٹے نے جاری رکھی ہے۔

۱۷۴۷ میں نادر شاہ کی موت کے بعد نصیر خان نے شاہ کابل، احمد شاہ ابدالی کو اپنا
حاکم اعلیٰ تسلیم کر لیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہمسائیگی کے پیشِ نظر یہ مفید ہوگا اور جنگ کا خطرہ نہ
رہے گا۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو اس کا باجگزار نہ سمجھتا تھا بلکہ نادر شاہ کی وراثت میں ثانوی
حصہ دار گردانتا تھا۔ ۱۷۵۸ میں اُس نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تو احمد شاہ نے اپنے ایک وزیر

کے تحت ایک لشکر بھیجا تاکہ اس آزادی پسندی کی سزا دے سکے۔ خان نے پھر اپنا قبائلی لشکر بلایا اور افغان فوج قلات سے ستر میل شمال میں ڑنگ آباد میں شکست فاش دے دی۔ یہ خبر سُن کر شاہ کابل خود کمک لے کر آیا اور خان کو تین میل کے فاصلے پر مستونگ میں ایک معرکے میں شکست دی۔ وہ پورے نظم و ضبط کے ساتھ قلات واپس آیا جہاں اُس نے پُرزور مزاحمت کی تیاری کی ہوئی تھی۔ فاتح بھی اُس کے تعاقب میں آیا اور اپنی ساری فوج سے محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ بعض دُرّانی سرداروں کی سازشوں سے طویل ہو گیا اور جب دھاوے اور شبخون کی تین کوششیں ناکام ہو گئیں تو شاہ نے مصالحت کی پیش کش کی جو اس معاہدہ پر منتج ہوئی۔ "شاہ کی شادی نصیر خان کی عمزاد سے قرار پائی تاکہ آئندہ دوستی رہے۔ خان خراج نہیں دے گا لیکن بوقت ضرورت فوج مہیا کرے گا اور اُس کے اخراجات برداشت کریگا اور اس کے بدلے میں نصف اخراجات کے مساوی اسے نقد الاؤنس ملے گا۔" خان نے صاف طور پر یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ اور اس کے جانشین کابل کی کسی خانہ جنگی میں ملوث نہ ہوں گے[1] اور وہ اس پر کاربند رہے۔ اس کے بعد شاہ اپنی نئی دُلہن اور اُس کے بعض رشتہ داروں کے ساتھ (جن میں خان کی والدہ اور دُلہن کا بھائی بہرام خان بھی شامل تھے) قندھار واپس چلا گیا۔

نصیر خان کی مسافیاتی مہارت کا ایک قصّہ مشہور ہے کہ اُس نے ایک دن احمد شاہ کو اپنے خیمے کے سامنے بچھی ہوئی دری پر نماز پڑھتے دیکھا تو اُس نے فوراً قلعہ کی ایک توپ کو

---

[1] جب میں اور کیپٹن کرسٹی ۱۸۱۰ میں قلات میں تھے تو شاہ محمود (تخت کابل کا ایک دعویدار) نے محمود خان کو لکھا کہ وہ شجاع الملک کے خلاف اس کی مدد کرے۔ خان نے جواب دیا کہ وہ شاہ کابل کی سلطنت سے حملہ آوروں کو نکالنے کے لئے مدد دینے پر تیار تھا اور بیرون ملک فوجی کاروائی کے لئے بھی اپنا لشکر دینے پر رضامند تھا لیکن اس مطالبہ کے لئے اس کے والد کا احمد شاہ سے معاہدہ ہی تو [illegible] فیصل اور [illegible]

بھرا اور اس کے گولے سے عین اس جگہ کو نشانہ بنایا جہاں شاہ نے ابھی ابھی سجدہ کیا تھا۔ شاہ نے فوراً مذاکرات کا پیغام بھجوایا اور بعد میں خان کی نشانہ بازی کی بیحد تعریف کی۔ گویا اس واقعہ نے محاصرہ کو بھی مختصر کر دیا۔

۶۲ - ۱۷۶۱ء میں نصیر خان کو ہندوستان پر دوسری مہم کے سلسلہ میں بلایا۔ چنانچہ وہ اپنا لشکر لیکر لاہور اس سے جا ملا اور سکھوں اور افغانوں کے درمیان جو لڑائی ہوئی اور جس میں سکھوں کو بہت بڑی شکست ہوئی وہ موجود رہا۔ خان قلات واپس آ گیا لیکن شاہ دہلی کیطرف بڑھا، تاکہ اسے مرہٹہ فوج کے حملہ کے خطرہ سے محفوظ کر سکے جو جنگ[1] پانی پت میں بچ گئی تھی۔

۱۷۶۹ء میں سب ایرانی سرداروں نے اتحاد قائم کر لیا کہ وہ افغانوں کے مغربی مقبوضات پر حملہ کریں تو نصیر خان نے پھر احمد شاہ کا ساتھ دیا۔ شہزادہ تیمور اور کچھ تجربہ کار جرنیلوں کو بھیجا گیا کہ وہ مشہد کے قریب ایرانیوں سے جنگ آزما ہوں اور جب ایرانیوں کا پلڑا بھاری ہونے لگا تو اس وقت نصیر خان تین ہزار بلوچی سوار لیکر اس جوش سے حملہ آور ہوا کہ ایرانیوں کو بھاگتے ہی بنی۔

ایک ایسا ہی واقعہ اس مہم کے دوران طبس میں ہوا اور بادشاہ نے ازراہِ تشکر اور زریں خدمات کے بدلے اسے قلات کے شمالی علاقے شال اور مستونگ اور سندھ کے مشرقی کنارے پر ہڑند و داجل ہمیشہ کے لئے بمعہ کلی اختیارات عطا کر دیئے۔ ان شاہانہ عطیات کے بدلے خان نے رضاکارانہ طور پر وعدہ کیا کہ وہ صوبہ کشمیر کی حفاظت کے لئے ایک ہزار سپاہی سالانہ بطور امدادی فوج بھیجے گا۔

ان واقعات کے کچھ سال بعد بہرام خان کابل سے آیا جہاں وہ اپنی شادی شدہ بہن کے

---

[1] جنگ پانی پت جنوری ۱۷۶۱ء میں لڑی گئی۔ اس کا بہترین اور مفصل ذکر ایشیاٹک ریسرچز، لندن، پانچواں ایڈیشن، ص ۹۱ پر ملے گا۔ جلد سوم۔

ساتھ احمد شاہ کی معیت میں چلا گیا تھا اور اپنے منصب سے زیادہ مالیہ لینے کے لئے جوڑ توڑ کرنے لگا اور بالآخر نصیر خان[1] سے آدھی حکومت کا مطالبہ کر دیا۔ طرفین میدان جنگ میں اُترے تاکہ تلوار فیصلہ کر سکے۔

بہرام خان کو کئی معرکوں میں شکست ہوئی اور بالآخر وہ قلات کے قریب کوھک کے مقام پر بدترین شکست سے دوچار ہوا۔ وہ کابل چلا گیا اور نصیر خان کے حین حیات دوبارہ بلوچستان نہ آیا۔ نصیر خان ایک نہایت شاندار اور خوشحال دور گذار کر عالم ضعیفی میں ماہ جون ۱۷۹۵ میں فوت ہوا۔ اُس نے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں چھوڑے۔ اُس وقت موجودہ خان قلات محمود خان (اُس کا بڑا بیٹا) صرف چودہ سال کا لڑکا تھا۔

اگر ہم نصیر خان کے کردار کا بحیثیت سپاہی، مدبر اور حکمران جائزہ لیں اور ذہن میں اُن لوگوں کو رکھیں جن کے درمیان وہ مصروف کار رہا تو ہم اس میں ان مراتب و فرائض کے مطابق خوبیوں کا ایک غیر معمولی امتزاج پاتے ہیں۔ اُس نے اپنی زندگی بھائی کے قتل پر پیدا ہونیوالی نفرت کے سائے میں شروع کی لیکن جب کبھی اسے اس فعل پر سوچنے کا موقع ملتا تو اسے اتنی اذیت ہوتی کہ اس کے دشمن بھی اس پر رحم کھاتے اور اُس کے زندگی بھر کے رویے سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ اُس نے محض بہبودی ملک کی خاطر اپنے بھائی کو قربان کرنا اپنا فرض سمجھا تھا۔ اُسے دولت کی کوئی حرص نہ تھی کیونکہ وہ میدان جنگ میں اپنے خادموں سے بہتر طرز زندگی کا مالک نہ تھا اور دولت کو خاطر میں نہ لاتا تھا سوائے اس کے کہ اسے

---

[1] نصیر خان نے دھوکے سے طبسی فوج کو ایک کمین گاہ میں کھینچ لیا اور ان کی بدنظمی سے فائدہ اٹھا کر یک لخت رسالے سے حملہ کر دیا۔ سراسیمہ ایرانی فوج قریباً تباہ ہو گئی۔ طبس ہرات سے تین سو بیس میل دور ہے۔ دیکھئے ضمیمہ، کیپٹن کرسٹی کا جرنل، مورخہ ۷، جون۔

وہ جوہر قابل کی پرورش اور اپنی رعایا کی فلاح کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ وہ شاذ و نادر ہی نقدی بطور تحفہ دیتا تھا کیونکہ اس کے خیال میں یہ انسان کو کاہل اور مفت خور بناتی تھی لیکن جب کوئی کاریگر اپنی صناعی کا کوئی نمونہ اسے پیش کرتا تو وہ اسے اس کی دس یا بارہ گنا قیمت کے پارچات اور دیگر اشیائے ضرورت دینے کا حکم دیتا۔ ایک مدبر کی حیثیت سے اُس نے ایک وسیع سلطنت کو چند ماہ میں اپنے اقتدار کیلئے ساز گار بنا لیا جو اسے ایک ظالم فاتح سے ملی تھی۔ اس کی ہمہ گیر گرفت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ دُور افتادہ ترین اضلاع بھی اُس کے احکامات پر عمل کرنے میں مستعد رہتے تھے۔ جیسے قریبی اضلاع۔ ایک حکمران کی حیثیت سے اُس کا انصاف اور فرض شناسی اتنے نمایاں تھے کہ اُس کا نام ملک کے طول و عرض میں ایک ضرب المثل بنا رہا اور بنا ہوا ہے۔ القصہ نصیر خان اگر کسی بہتر قوم پر حکمران ہوتا یا کسی ایسی قوم پر جس سے اہل یوروپ زیادہ آشنا ہوتے تو وہ اپنی زندگی میں ایشیائی حکمرانوں کے درمیان ایک مظہر فطرت سمجھا جاتا۔ وہ وسیع المشرب، بہادر، عدل پسند اور عفو پرور تھا۔ کلفت و صعوبت میں صابر و شاکر تھا اور اپنے قول کا اتنا دھنی تھا کہ اُس نے کبھی اپنے معمولی سے معمولی وعدے سے بھی انحراف نہ کیا۔

اس جلیل القدر حکمران کی وفات پر (جس کے کردار کا ادھورا سا خاکہ میں نے دیا ہے) اُس کے عمزاد بہرام خان نے ایک دفعہ پھر حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور کمسن محمود خان کے وزرا کو ایک معاہدہ کے ذریعہ گنداوا کا شہر اور صوبہ اس کے حوالے کرنا پڑا جس کے تحت اُس نے بھی وعدہ کیا کہ وہ ریاست کے باقیماندہ حصوں میں کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔ لیکن وہ صرف تھوڑا ہی عرصہ اس پر کاربند رہا اور پھر سندھیوں وغیرہ پر مشتمل بھاڑے کی ایک فوج جمع کر لی۔ محمود خان نے شاہ کابل، زمان شاہ کو مدد کے لئے لکھا تو اُس نے اپنا ایک امیر مصالحت کیلئے بھجوا دیا لیکن بہرام خان تو پوری سلطنت کی تحویل پر مصر رہا لہٰذا اعلانِ جنگ ہوا۔ بہت سے ابتدائی معرکوں میں باغی امیر بالادست رہا اور پھر دو نوخوانین کے

تحت کچھ گنداوا کے مقام دہان درہ (ڈھاڈر = درے کا منہ) پر ٹکرائیں۔ بہرام خان کی فوج کو شکست فاش ہوئی کیونکہ کئی قبائل نے کاروائی کے دوران اُس کا ساتھ چھوڑ دیا، وہ خود بھی زخمی ہوکر سندھ کے دارالحکومت، حیدرآباد کو بھاگ گیا۔ امیران سندھ نے اسے زمان شاہ کے ڈر سے پناہ نہ دی۔ چنانچہ وہ بہاول پور[1] کیطرف چلا گیا لیکن اس شہر سے ایک سو بیس میل دُور ایک گاؤں یعنی ٹانڈہ قلندر شاہ میں تھکاوٹ کی وجہ سے چل بسا۔

اُس کے علاوہ محمود خان کو بہرام خان کی سوتیلی بہن کا مقابلہ کرنا پڑا جس نے بہرام کی موت کا سنتے ہی اُس کی اکلوتی لڑکی کو ساتھ لیا اور لاڑکانہ چلی گئی اور میر غلام علی تالپور کو پیغام بھیجا کہ وہ محمود خان کو بیدخل کرنے اور اُس کے چھوٹے بھائی کو تخت نشین کرانے میں مدد دے۔ جس کے بدلے بہرام خان کی بیٹی سے اُس کی شادی کر دی جائے گی۔ اس دوتیہ کے محرکات واضح نہیں ہیں لیکن غالباً کوئی نجی جھگڑا برسرِ کار تھا۔ میر غلام علی نے یہ شرائط منظور کرلیں اور وہ لاڑکانہ آیا اور شادی رچائی لیکن وہ عروس نو کا مالک ہوتے ہی منحرف ہوگیا اور اعلان کیا کہ وہ قلات کے اندرونی معاملات میں دخیل نہ ہوگا۔ محمود خان نے قمبرانی خاتون سے سندھی امیر کی شادی کے عزم کا سُنا تو وہ بہت مشتعل ہوا لیکن چونکہ سانگ بندی[2] ہو چکی تھی اور اسے بلاجنگ و جدل توڑا نہ جاسکتا تھا جس کے لئے وہ تیار نہ تھا لہٰذا وہ صرف شاہ کابل کو یہ لکھ سکا کہ اُس خاندانی توہین کا بدلہ وہ لازماً تالپوروں[3] سے لے گا۔ امیران سندھ نے قلات کے ان باہمی

---

[1] بہاولپور دریائے گھرو کے مشرقی طرف ہے۔ ۲۹° - ۲۵ عرض بلد شمالی اور ۵۹ - ۷۱ طول بلد مشرقی۔
یہ بہاول خان داؤد پوترا کے علاقوں کا صدر مقام ہے۔

[2] سانگ کے لئے دیکھئے باب چہارم، حصہ اوّل، رسومات شادی۔

[3] تالپور بہت پست قبیلہ ہیں اس لئے محمود خان اتنا سیخ پا ہوا۔ دیکھئے صوبہ سندھ کا حال، چھٹا خطہ، باب دوازدہم۔

جھگڑوں سے فائدہ اُٹھایا اور کراچی بندرگاہ پر قبضہ جمالیا جو نصیر خان کے دور سے بلوچی حکومت کے قبضہ میں تھی۔ دوسرے صوبوں اور ضلعوں کے گورنر اور حاکم بھی اپنے خان کی کمزوری بھانپ گئے، خراج بند کر دیا اور اسے صرف برائے نام حاکم سمجھنے لگے اور اُس وقت سے خان قلات کی حکومت صرف پہلے اور تیسرے خطہ تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

یہ ہے تاریخ بلوچستان کا خاکہ ابتدائی ایام سے ۱۸۱۰ تک۔ ۱۸۱۰ سے باہمی چپقلشوں سے اور بھی خونین نتائج برامد ہوئے ہیں اور نصیر خان کے تین بیٹوں میں سے بڑا ہی اب زندہ ہے۔ منجھلا میر مصطفےٰ خان، ایک شکار کے دوران چھوٹے بھائی سے ۱۸۱۱ میں مارا گیا جس نے بعد میں لشکر اکٹھا کر کے ہڑند داجل کے زرخیز علاقے پر قبضہ کر لیا۔ محمود ایک نرم مزاج اور کاہل الوجود انسان ہے اور اُس نے اس برادر کش کو اپنا وفادار بنانے کی کوشش کی اور غیر مشروط معافی تک کا وعدہ کیا لیکن وہ اڑا رہا۔ لہٰذا نومبر ۱۸۱۲ء میں سردار زہری، قادر بخش کے تحت اس کی سرکوبی کے لئے ایک فوج بھیجی گئی۔ ہڑند داجل کے ایک گاؤں، مونی میں لڑائی ہوئی اور رحیم (؟) برانی خان بمعہ چالیس خانہ زادگان مارے گئے۔ اس کے لشکر نے اس کے گرتے ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ اب محمود خان اپنے والد کی سلطنت کے احیاء کے فکر میں ہے لیکن ملکی حالات اور اُس کی سستی و بے فیصلگی کے پیش نظر میرے خیال میں اُس کا کامیاب ہونا محال ہے اور اگر مغربی بلوچ اُس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں تو مجھے یقین واثق ہے کہ وہ اپنی موجودہ مختصر سی سلطنت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

باب ہفتم

طرزِ حکومت — کمی بیشی کا احتمال — نصیر خان کی مطلق العنانی — درشتی کو زم کرنے کا مدبرانہ طریقہ — قبائل اپنے سردار چُنتے ہیں — جنگ — معاہدات — خان قلات کے اختیار میں — سردار پابندی پر مجبور — سرحدی تنازعات — خان کی صوابدید پر — کس طرح طے پاتے ہیں — سرداران خیل پر قابو کس طرح رکھا جاتا ہے — باجگزار سرداروں کی بمعہ مقررہ فوج حاضری لازمی ہے — فوج کے اعلام ممیّزہ اور اس کی تقسیم — خان قلات یا اس کے نمائندے کی عزت — قدیم مجموعہ قوانین — ناکافی ہونے کی وجہ — نصیر خان کا مجموعہ قوانین — قتل کے قوانین — چوری — دن دہاڑے چوری — دکان سے چوری — زناکاری — اغوا — چھوٹے چھوٹے جرائم — خان عدالت مرافعہ — قانون اپیل کے فوائد اور مفید اثرات — قانون قتل پر پابندیوں کی مشکلات — بلوچ فوج کی طاقت — مبالغہ آمیز — اغلب تعداد — خان قلات کے محاصل — محصولات — خراج — اس کی مختلف شرحیں — محصول اندازوں کا حصہ — ہندو دلال — کس لئے ملازم رکھے جاتے ہیں — قلات کا سکہ — تجارت،

قلات اور بلوچستان کی حکومت کی عمومی معنویت آسانی سے بیان نہیں ہو سکتی، اور سرداروں کے نظریات یا وقوع پذیر ہونے والے انقلابات کے ساتھ ساتھ یہ ہمیشہ کمی بیشی کا شکار ہو سکتی ہے۔ نصیر خان کے دورِ عروج میں یہ ایک مطلق العنان حکومت تھی کیونکہ کوئی اس کے احکامات و قوانین کو نہ منسوخ کر سکتا تھا اور نہ ان پر تنقید کر سکتا تھا لیکن وہ اپنے اس اقتدار مطلق میں یوں تعدیل و توازن پیدا کر دیتا تھا کہ قبائلی سرداروں کو خود ان کے قبائل کے داخلی معاملات میں اتنی مراعات دیتا تھا کہ سلطنت ایک عسکری ذو نافیہ بلکہ اتحادیہ معلوم ہوتی تھی۔

قبائل اپنے اپنے سردار خود چنتے ہیں لیکن یہ ایک دفعہ کا انتخاب ہی عموماً موروثی بن جاتا ہے۔ خان قلات کو اس انتخاب کو منظور یا نامنظور کرنے کا اختیار ہے لیکن یہ برائے نام ہے اور میں نے نصیر خان کے دور کی ایک مثال بھی ایسی نہیں سنی جس میں اس نے لوگوں کے انتخاب کو ٹھکرایا ہو اور ظاہر ہے کہ اس کے بیٹے کے دور میں ان انتخابات کی دوبارہ تصدیق کی کوئی ضرورت نہیں۔

شہر کیچ (مکران کا صدر مقام) اور قصبہ گنداوا (کچھ گنداوا کا صدر مقام) کو مجبوراً نصیر خان کے حاکم یا گورنر قبول کرنے پڑے گو یہ مقامات مختلف قبائل کے مسکن تھے۔ لوگوں نے انہیں اپنے پیدائشی حقوق کی پامالی سمجھا اور حاکموں کا اختیار بہ در قائم کرنا پڑا۔ نصیر خان کے مرتے ہی لوگوں انہیں نکال باہر کیا۔ محمود خان نے گنداوا پر تو دوبارہ ایک حاکم مسلط کر دیا لیکن کیچ اُس وقت سے صرف برائے نام ہی اسے تسلیم کرتا ہے۔

جنگ یا معاہدات کرنے کا اختیار صرف خان کو تھا کیونکہ یہ پورے بلوچستان کے مسائل تھے اور سرداروں کو طوعاً و کرہاً اس کی مدد کرنا پڑتی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ معاہدات کی ان دفعات پر عمل کرنے اور کروانے کے پابند تھے جو کسی مخصوص قبیلے سے متعلق ہوتی تھیں خواہ یہ ان کے اپنے ذاتی یا قبائلی مفاد کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ البتہ اگر فلاح عامہ کسی مخصوص قبیلہ سے ایسے ایثار کی متقاضی ہوتی تھی تو خان قلات اس کے مساوی یا موزوں معاوضہ کا عموماً بندوبست

کر دیتا تھا۔ خان کو یہ بھی اختیار تھا کہ وہ تمام زمینی ملکیت کی حدود مقرر کر دے اور اگر ان کی حد بندی پہ کوئی اختلاف ہوتا تھا (خواہ افراد خواہ قبائل کے درمیان) تو صرف خان ہی بحیثیت آقائے زمین اس کا فیصلہ کرنے کا مجاز تھا۔ فیصلہ کے لئے وہ سخت ترین تفتیش کرتا تھا۔ طرفین کے گواہوں کو خوب چھانتا پھٹکتا تھا (کیونکہ اس کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی ذریعۂ ثبوت نہ ہوتا تھا) اور پھر اپنا فیصلہ دیتا تھا جو قطعی اور واجب التعمیل ہوتا۔

جب اس کے پاس کوئی قبائلی اپنے سردار کے خلاف شکایت لیکر آتا تو اسے اختیار تھا کہ وہ خود جانچ پڑتال کر کے فیصلہ دے یا پھر اس قبیلے کے سردار کے پاس بھیج دے۔ جس سے کسی خیل کے مدعی اور مدعا علیہ کا تعلق ہوتا تھا۔ ویسے وہ عموماً دوسرا طریقہ اختیار نہ کرتا تھا کیونکہ اگر کوئی فریق سردار کے فیصلے سے غیر مطمئن ہوتا تھا تو وہ خان کو اپیل کر سکتا تھا۔ نتیجتہً سردار کو کوئی مقدمہ بھیجنے کا صرف یہی فائدہ ہوتا تھا کہ اس سے پورا مقدمہ مع بیک نظر دربار عالیہ کے سامنے آجاتا تھا۔

خان کی سیادت مطلق کا ایک اور ثبوت یہ تھا کہ وہ ہر سردار کو اپنے مقررہ لشکر کے ساتھ اصالتاً پیش ہونے کا حکم دے سکتا تھا۔ جب اجتماعی فوج لام پر جاتی تھی تو اس کے تین حصے ہوتے تھے جن میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا علم تھا۔ کچھ گنداوا، قلات اور نوشکی کا لشکر محمود خان یا اس کے نائب کی کمان میں ہوتا ہے اور اس کے بیرق (علم) کا رنگ سرخ ہے۔ سراوانی لشکر رئیس خان کے تحت ہوتا ہے اور اس کا جھنڈا سبز دوشاخہ ہے۔ قادر بخش خان زہری اور ولی محمد خان مینگل صوبجات جھالاوان و لاس کے لشکروں کے سالار ہیں اور ان کا جھنڈا زرد ہے۔ اگر ان میں سے کوئی حصہ کٹ جائے تو سالار نقارے بجاتے ہیں اور اگر سراوان وجھالاوان کی فوجیں اکٹھی لڑ رہی ہوں تو ان کے مختلف جرنیل بھی اپنے اپنے حصوں میں یہی کارروائی کرتے ہیں لیکن جونہی قلات کی فوجیں ان سے آملیں تو نقارہ نوازی کا امتیاز صرف انہی کو حاصل ہوتا ہے، خواہ خان ان کی قیادت کر رہا ہو یا اس کا نائب۔

کسی اوّلین قمبرانی حکمران نے انصاف کے لئے قواعد و ضوابط کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا جس کے تحت قیام انصاف کا فرض سربراہ مملکت پر عاید کر دیا گیا لیکن جب نصیر خان کے وقت سلطنت بہت وسیع ہو گئی تو یہ قوانین ناکافی ثابت ہوئے۔ لہٰذا اس دُور اندیش فرمانروا نے اس کمی کو دُور کیا اور اب اسی کے ساختہ قوانین پر عمل ہو رہا ہے۔ قتل کے مقدمات کا فیصلہ خان خود کرتا ہے اور کوئی اور سردار اس کا مجاز نہیں۔ سوائے اس کے کہ اسے خصوصی اختیار دیا جائے۔ اس کا قانون درج ذیل ہے :-

اگر ایک شخص کسی دُوسرے کو مار دے اور مقتول کے ورثا رضامند ہوں تو اس کا فیصلہ قید اور بھاری جرمانہ کی صورت اختیار کرتا ہے لیکن اگر ورثا آمادہ نہ ہوں تو خون کا بدلہ خون کا فیصلہ ہوتا ہے لیکن چونکہ خان خود سزائے موت دینے سے بچتا ہے اس لئے وہ عموماً قاتل کو مقتول کے ورثا کے حوالے کر دیتا ہے کہ وہ خود جو چاہیں سلوک کریں۔ اس طریقے سے عموماً اس کی جان بچ جاتی ہے کیونکہ اسے بیگاری غلام بنا لیا جاتا ہے۔ اس قانون کی ایک خوبی بلاشک و شبہ ایسی ہے جو اس کے محرک احساسات اور حکمت عملی کی مظہر ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر مقتول غیر ملکی ہو تو اس کے قتل کے تمام شرکا کو فوراً تختۂ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ قتل کے بعد شبینہ چوری اور ڈاکہ کے جرائم کی سزائیں بہت سخت ہیں اور جب ان میں سے کوئی بھی ثابت ہو جائے تو موت یقینی سزا ہوتی ہے۔ دن دہاڑے چوری اور چھوٹے جرائم (جیسے دکان لوٹنا یا جیب کترنا وغیرہ) پر مال مسروقہ کے مطابق کوڑے مارے جاتے ہیں یا قید کی سزا بھگتنا ہوتی ہے۔

ایک آدمی کو اگر معلوم ہو جائے کہ اس کی بیوی سیاہ کاری کی مرتکب ہوئی ہے تو دونوں کو قتل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ دو معتبر گواہ پیش کر سکے ورنہ وہ خود قتل کا مرتکب سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ چار معتبر عینی گواہ پیش کر سکے جو اس کی بیوی کی سیاہ کاری کے شاہد ہوں تو وہ اسے اور اس کے بدکار ساتھی کو ٹھکانے لگا سکتا ہے خواہ وہ خود عینی گواہ نہ ہو۔ واقعہ کی اطلاع خان کو دی جاتی ہے جو ملّاؤں کے ذریعہ اس کا معائنہ کرتا ہے اور اگر ثبوت صحیح ہوں تو فیصلہ ہو

جاتا ہے لیکن اگر خفیف سا شک بھی شہادت کے سلسلہ میں پایا جائے تو منتقم انسان کو قتل کیلئے عبرتناک سزا دی جاتی ہے اور گواہ ملزموں کے خاندان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں یہ مفید قانون انتقام اور بہتان تراشی دونوں کو روکتا ہے۔ اگر ایک آدمی کسی لڑکی کو بہلا پھسلا لیتا ہے اور اگر اس کا باپ اس کے حاملہ ہونے سے پہلے باخبر ہو جاتا ہے تو وہ فریقین کی موت کا تقاضا کر سکتا ہے اور خان کو والدین اختیار کی حمایت میں بھی سزا دینا پڑتی ہے لیکن ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا اور ایسے واقعات کا فیصلہ عموماً شادیوں کے ذریعہ کر لیا جاتا ہے۔

معمولی جھگڑوں، چوریوں یا ہر قسم کے نجی تنازعات کے فیصلے خود اسی خیل کے سردار کر دیتے ہیں۔ اگر کسی کو اعتراض ہو تو سردار قبیلہ کے پاس اپیل ہو سکتی ہے اور اگر یہاں بھی اطمینان نہ ہو تو خان کو اپیل کی جا سکتی ہے لیکن چونکہ وہ اکثر فیصلۂ اوّل کو ہی برقرار رکھتا ہے لہٰذا تعویق و تکلیف کے پیش نظر کوئی اس کے ہاں اپیل نہیں کرتا۔ یہ رضا کارانہ احساس ہی سرداروں کے بیشتر قانونی اختیار و استیلا کی بنیاد ہے اور اس سے نہ صرف خان کثرتِ کار سے بچ رہتا ہے بلکہ تنازعات بھی زیادہ آسانی و انصاف سے اپنی اپنی سطح پر طے ہوتے رہتے ہیں اور نہ رعایا کی آزادی پہ کوئی حرف آتا ہے اور نہ ہی ابتدائی خیلوں کے سربراہ قانون کی گرفت سے آزاد رہ سکتے ہیں۔

صرف اسی حالت میں مجرم کو خان کے سابقہ فیصلہ یا اختیار کے بغیر تختۂ دار پر لٹکایا جا سکتا ہے جب ایک مسافر کی گھات میں رہ کر اسے قتل کر دیا جائے۔ ایسے موقعہ پر قریب ترین سردار قانون پر عمل کرواتا ہے اور خان کو مطلع کر دیتا ہے۔ قبائل اور خیلوں کے تنازعات ہمیشہ قمبرانی سرداروں کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں جن میں محمود خان اور اس کے رشتہ دار شامل ہیں۔

بلوچی فوج کے رجسٹر میں میں نے ڈھائی لاکھ سپاہیوں کا اندراج دیکھا لیکن یہ اس وقت تیار کیا گیا جب احمد شاہ نے دھمکی دی کہ اگر نصیر خان خراج نہ دیگا تو وہ حملہ کر دیگا۔

یہ تعداد اسے اس کے فرمان کے جواب میں بھیجی گئی لہٰذا غالباً یہ مبالغہ آمیز تھی گو اب بھی باغی صوبوں اور علاقوں کے بغیر اس کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار مندرج ہے۔ میرے خیال میں انتہائی ہنگامی صورتحال میں محمود خان اس تعداد کے نصف سے زیادہ جمع نہیں کر سکتا۔ اس کے موجودہ مالیات ساڑھے تین لاکھ روپے سالانہ ہیں جن کا کافی حصہ بصورت پیداوار لیا جاتا ہے۔ نصیر خان کے وقت یہ تیس لاکھ روپے سالانہ سے زیادہ تھے لیکن مکران[1] لاس، پنجگور، دزک، خاران وغیرہ بھی اُس وقت خراج دیتے تھے اور کراچی بندرگاہ کی آمدنی اس کے علاوہ تھی۔

قلات میں جو محصول لگائے جاتے ہیں وہ انتہائی معتدل ہیں۔ ہر قسم کے لدے ہوئے اونٹ کے لئے حکومت شہر میں داخل ہونے پر پانچ روپے لیتی ہے اور ہندو ایک چوتھائی روپیہ۔ تمام اشیائے فروختنی پر ایک بازار ٹیکس ہے جو ان کی قیمت کے ڈیڑھ فیصدی سے بھی کم ہے۔ بلوچ علاقوں میں گھوڑوں یا مویشیوں پر کوئی لگان نہیں۔ چاہی کاریزاتی زمینوں کی پیداوار کا ½ لیا جاتا ہے تاکہ انہیں ٹھیک ٹھاک رکھا جا سکے۔ بارانی زمین سے موسم کے مطابق ⅓ سے ¼ تک پیداوار وصول کی جاتی ہے۔ چشموں پر محصول ان سے بھی زیادہ ہے اور قلات کے بعض باغات میں تو یہ ⅕ بھی ہے۔ یہ سارا خان کے خزانہ میں نہیں آتا بلکہ اس کا کچھ حصہ تو محصول اندوز مقدم وغیرہ رکھ لیتے ہیں جب جنس کی صورت میں مالیہ خان کے اخراجات سے زیادہ ہو (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) تو فاضل ایک ہندو دلال کو دے دیا جاتا ہے جو اسے ملکی پیداوار کے بدلے غیر ملکی مصنوعات یا پیداوار مہیا کرتا ہے۔[2]

قلات کا سکہ کریم خانی روپیہ ہے جو اڑتالیس تانبے کے پیسوں کے برابر ہوتا ہے۔ سونے کی

---

[1] محمود خان سے لیکر نیچے تک ہر درجہ و حیثیت کے سردار کا یہی وطیرہ ہے حتیٰ کہ نوشکی خیل کا دار، عیدل خان بھی اپنے ہندو دلال کے ذریعے کاروبار کرتا ہے۔

اشرفی چھ روپوں کے برابر ہے اور پانچ، چار زمان شاہیوں کے مساوی ہیں۔ قلات کی برآمدات بہت کم ہیں لیکن یہ کسی وقت ہندوستان، خراسان، کابل اور قندھار کے درمیان تجارت کی ایک شاہراہ تھا جسے تاجر کم محصولات کی وجہ سے ترجیح دیتے تھے۔

اس کی درآمدات لوہا، ٹین، سیسہ، فولاد، تانبا، نیل، پان کا پتہ، قرمز، چینی، مصالحے ریشم، کمخاب، زری، چھینٹ اور ہندوستان کے دیگر کھردرے اونی پارچات ہیں۔ پھل وغیرہ کابل اور خراسان سے آتا ہے اور فولاد اور تانبا کبھی کبھار سیستان سے۔ کھجور پنجگور اور جنوبی مکران، اور سفید کپڑا، چھینٹ، لنگی، پگڑی اور نمک وہ سندھ، ملتان اور شکارپور سے لیتے ہیں۔

میں آب و ہوا، زمین اور بلوچستان کی تاریخ طبعی پر تبصرہ اس تذکرہ کے آخر میں ایک عام باب میں کروں گا اور اب اس کے مختلف خطوں کے مطالعہ کی طرف آتا ہوں۔

باب ہشتم

بلوچستان کا دوسرا خطہ ــــ صوبجات مکران ولاس ــــ حدود اربعہ ــــ طول ــــ عرض ــــ سطح ــــ بلند ترین پہاڑ ــــ ہنگلاخ مندر ــــ مکران کی تقسیم ــــ کچھ ــــ وجہ تسمیہ ــــ صوبہ لاس ــــ اس کی وسعت ــــ حدود اربعہ ــــ ملک یا گھاٹیاں ــــ دریا ــــ پورالی (قدیم عربس) ــــ حب ــــ وٹ ــــ سنگنی ــــ ان کا بیان ــــ سطح ــــ سردار ــــ آمدنی ــــ کہاں سے ــــ قلات کا باجگزار ــــ فوج ــــ بلوچوں کا خوف ــــ لاس کے دیہات و قصبات ــــ درآمد برآمد ــــ صوبہ مکران ــــ اضلاع ــــ خطہ نامعلوم ــــ کیپٹن گرانٹ کے انکشافات ــــ مصنف کا راستہ ــــ حالیہ تحقیقات ــــ دریا ــــ ان کے متعلق غلط نظریات ــــ ان کا عمومی بیان ــــ مشرق سے مغرب تک جزئیات ــــ دریا ــــ اغور ــــ مکلبو ــــ بھوسل ــــ رمرا ــــ ھدک ــــ دست یا دشتی ــــ اس کا طول عظیم ــــ اس کے مختلف نام ــــ قیاس آرائی ــــ مزید تفصیلات ــــ نگار ــــ نیم کخور ــــ گیانی ــــ ہترہ ــــ نبت اور سدگی ــــ کیچ صدر مقام ــــ محل وقوع ــــ طول و عرض ــــ تجارتی موزونیت ــــ رو بہ انحطاط ــــ وجہ ــــ بغاوت کی گرفت میں ــــ آخری حاکم مار دیا گیا ــــ آمدنی ــــ جنوبی علاقہ ــــ اس کی خاصیت ــــ پنجگور یا پنجر ــــ عمدہ علاقہ ــــ کھجوروں کے لئے مشہور ــــ سردار ــــ

آمدنی ــ مچھ ــ اس کی حیثیت ــ سنگلاخ علاقہ ــ آبادی ــ نازک نسل ــ ان کے سردار اور اطوار ــ کرقیند ــ ایک ہموار علاقہ ــ قلعہ ــ مقامیوں کے حفاظتی اقدامات، ــ کیوں ضروری ــ ہمیشہ موثر نہیں ــ بشکرد ــ پہاڑی علاقہ ــ اس کے باشندے ــ کہاں سے آئے ــ دزک ــ سب ــ کلپرکن اور حبلک ــ مکران کی مجموعی آبادی ــ غیر مصدقہ ــ مصنف کی رائے مقامیان ساحلی کی بابت ــ بلوچوں اور براہوئیوں سے مقابلہ ــ عیاشانہ زندگیاں ــ عورتیں ــ بدنما ــ متروک ــ نتائج ــ ان کی بدکاریاں نظر انداز ــ قوانین ــ نامعلوم ــ زراعت اور حملے کا خوف ــ تجارت ــ کون کرتے ہیں۔

دوسرا خطہ (حصہ)

بلوچستان کا دوسرا خطہ صوبجات مکران و لاس پر مشتمل ہے۔ اس کے شمال میں جھالاوان کا کچھ حصہ، ریتلا صحرا اور کوہستان، جنوب میں بحر ہند، مغرب میں صوبہ لارستان اور مشرق میں سندھ ہے۔ اس کی انتہائی لمبائی اسے سندھ سے جدا کرنے والے سلسلۂ کوہ سے مغربی حدود تک ساڑھے پانچسو میل سے زیادہ ہے اور اس کا زیادہ سے زیادہ عرض ساحل سمندر سے گاؤں حبلک (۳۴٫۲۸° شمالی عرض بلد میں) تک قریباً دو سو بیس میل ہے۔ یہ خطہ پہلے کے مقابلے پر کم پہاڑی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے عظیم سلسلہ ہائے کوہ اس میں ایستادہ ہیں اور آر پار جاتے ہیں ــ خوش قسمتی سے یہ زمین کو سیراب کرنے میں معاون ہیں جو ویسے بیحد چٹیل ہے۔ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ مکران کے میدان جہاں بھی دس بارہ میل چوڑے ہیں وہ صرف دامان کوہ لیں تو کچھ سرسبز ہیں اور بقایا خالص دشت ہیں۔ مکران کے بلند ترین پہاڑ مغرب کے ضلع بشکرد میں ہیں جہاں سے وہ مشرق کی طرف بڑھ کر براہوئی پہاڑوں کے ایک جنوبی بازو سے ملتے ہیں اور دونوں کا

ملاپ کوہستان بنتا ہے[1]۔ بلندی کے لحاظ سے دُوسرے نمبر پر وہ چھوٹا سا سلسلہ کوہ ہے جو براہوی پہاڑوں کے جنوب مغربی زاویے سے ساحل کے عین جنوب کی طرف پھوٹتا اور پھیلتا ہے اور راس بناتا ہے جسے اہل یورپ عربہ اور مقامی عربو کہتے ہیں۔ اس کی چوٹی پر ہنگلاج کا ہندو مندر ہے جو سمندر سے نظر آتا ہے اور کالی دیوی (قسمت کی دیوی) سے منسوب ہے جہاں ہزاروں یاتری سالانہ آتے ہیں۔

براہوی پہاڑوں کی دو شاخیں مکران کے بیشتر حصے سے شرقاً غرباً گذرتی ہیں۔ انہی سے ایک، اس کے شمالی اور جنوبی حصے کو جدا کرتی ہے اور دوسری ان دونوں کو صحرا سے جدا کرتی ہے۔ شمالی کو مقامی وشتی[2] یا جھ (نخل خرما) کہتے ہیں اور وادی یہاں کھجور کے پھلنے پھولنے کی ہے۔ مغرب کی طرف ایک بڑا سلسلہ ساحل سمندر کے عین قریب تک جھکتا ہے (گو پہاڑ اتنے قریب نہیں ہیں) اور راس مبارک اور راس جسک وجود پذیر ہوتی ہیں جو مکران کی مغربی حد سمجھی جاتی ہیں۔

صُوبہ لس بیلا اس زیادہ مناسب طور پہ مکران کا ہی مشرقی حصّہ کہلا سکتا ہے لیکن چونکہ یہ بالکل آزاد ہے اور ہمیشہ ایک علیحدہ علاقہ سمجھا جاتا ہے لہٰذا میں نے بھی اسے الگ ہی شمار کیا ہے جدگالی میں لاس کا معنی وادی یا میدان ہے اور یہ قریباً نوّے میل لمبا اور پچاس میل چوڑا ہے۔ اس کے شمال میں جھالاوان، جنوب میں خلیج سونمیانی اور مشرق و مغرب میں پہاڑ ہیں جو اسے سندھ اور مکران سے جدا کرتے ہیں۔ لہٰذا اس کے تین طرف پہاڑ ہیں جن سے

---

[1] مقامی لوگ لشکرد کو حصّہ کوہستان کہتے ہیں اور کردوں کو کبھی مکرانی نہیں کہتے لیکن چونکہ یہ اس خط متوازی کے جنوب میں ہے جو میں نے کوہستان کے جنوب کی حد بندی کے لئے کھینچا ہے اور جو لازماً مکران میں ہے لہٰذا میں اسے اسی خطہ میں شامل کرتا ہوں۔

[2] دشتی فارسی اصطلاح 'خوش آمدی' کا مترادف ہے۔

گذرنے کے لئے پانچ لک ہیں جن میں سے دو مکران، دو سندھ اور ایک جھالاوان کو جاتا ہے۔ پہلے دونوں کو لک ہنگلاج اور لک بیلہ کہتے ہیں۔ لک ہنگلاج مندر کے پاس سے گذرنے کی وجہ سے اسی کے نام سے مشہور ہوا اور دوسرا بیلہ سے پانچ میل کے فاصلہ پر شروع ہوتا ہے۔ سندھ کو جانے والے دونوں لک کراچی اور حیدرآباد کے نام سے ہی مشہور ہیں۔ قلات کی طرف جانے والا کوہن وٹ یا پہاڑی رستہ کہلاتا ہے اور یہ جھالاوان کے اونچے سلسلہ سے گذرتا ہے۔

لاس بیلے دو دریا ہیں۔ پورالی اور ہب۔ پورالی کو قدیم جغرافیہ میں عربس کہتے تھے۔ یہ بیلہ کے شمال مشرقی پہاڑوں سے ابھرتا ہے اور سلسلہ جھالاوان کے دامن کے ساتھ ساتھ بہتا ہوا جنوب کی طرف بل کھاتا ہے اور بیلہ کے پاس سے گذرتا ہوا خلیج سونمیانی میں جا گرتا ہے۔ سنگھم کوئی دو میل گاؤں کے جنوب مغرب میں ہے۔ اس کا پانی لیاری تک بہت عمدہ ہے جو سونمیانی سے بیس میل شمال اور شمال مشرق میں ہے جہاں اس سے سمندر مل جاتا ہے اور اس پر چھوٹی کشتیاں چل سکتی ہیں اور گہری جگہوں میں خوب مچھلیاں ملتی ہیں۔ خشک موسم میں بیلے کے قریب یہ صرف پندرہ تا بیس گز چوڑا اور ایک دو فٹ گہرا ہوتا ہے لیکن برسات میں یہ ایک ... میل سے زیادہ چوڑا اور ناقابل عبور ہو جاتا ہے۔ ہب ایک چھوٹی سی ندی ہے جو لاس اور سندھ کو جدا کرنے والے پہاڑوں سے نکلتی ہے اور پھر عین مغرب میں بہہ کر سمندر میں گرتی ہے۔ ان کے علاوہ دو تین نالے ہیں جیسے وٹا، سنگنی وغیرہ جو مختلف پہاڑوں سے نکلتے ہیں اور پورالی سے مل جاتے ہیں۔ یہ اکثر خشک ہوتے ہیں اور صرف برسات میں پرآب ہوتے ہیں۔

لاس کی سطح ہموار ہے جیسا کہ اس کے نام سے بھی ظاہر ہے اور یہ عموماً بنجر ہے سوائے اس کے کہ ندیوں کے آس پاس کے علاقے سرسبز ہیں، اور وہاں اناج اور گنا وغیرہ خوب ہوتے ہیں۔ اس چھوٹی سی ریاست کا حکمران جام میر محمد خان ہے جس کی سالانہ آمدنی پچاس ہزار روپے ہے جو زیادہ تر بیلہ کے بازار کے محصولات اور سونمیانی اور عربو (جو کہ مکران کی پشت پر واقع ہے) بنادر کی چونگی سے آتی ہے۔ وہ ایک وقت اس کا بیشتر حصہ بطور خراج نصیر خان کو دیتا تھا

لیکن پھر اس کی ایک بیٹی سے شادی ہونے کے بعد اس سے مبرا قرار دیا گیا اور اب صرف ساڑھے چار ہزار بے قاعدہ سپاہی مہیّا کرنے کے بدلے وہ حکومت کرتا ہے ۔ یہ تعداد اُس کی صلاحیّت سے زیادہ ہے لیکن اس کے علاقوں پر کئی پابندیاں عاید ہیں (جن کی تفصیل پہلے دی جاچکی ہے) جن کے ذمّہ دار بلوچستان کے دیگر سردار ہیں اور اُس کی رعایا کا کوئی بھی آدمی اس کے خلاف خان سے اپیل کرسکتا ہے اور میرے خیال میں وہ خان کے کسی حکم پر تنقید نہیں کرسکتا اور نہ سرگردانی۔ اس کا علاقہ اتنا کشادہ ہے کہ زہنجو، مینگل اور دیگر براہوئی قبائل اس پر جب چاہیں حملہ کرسکتے ہیں اور محمود خان کے اذن پر تو وہ فوراً کود پڑتے ہیں لہٰذا وہ انتہائی خوف اور تسلّط کے گرداب میں رہتا ہے۔

اس کا صدر مقام بیلہ ہے جس کا بیان حصّہ اوّل میں آچکا ہے۔ اس کے بعد لیاری کا گاؤں ہے جو سونمیانی سے بیس میل شمال، شمال مشرق میں ہے۔ یہ پورالی کے کنارے پر آباد ہے اور اس میں سولہ سو سے اٹھارہ سو تک گھر ہیں۔ بازار کے محصولات اور چونگی کے لئے یہاں ایک داروغہ رہتا ہے۔ اوتھل (ڈائری ۲۰ جنوری حصّہ اوّل) تیسرے نمبر کا مقام ہے اور مجموعی طور پر سارے صوبے میں دائمی دیہات بارہ سے زیادہ نہیں ہیں۔ لوگ جھونپڑیوں یا خیموں میں رہتے ہیں جو حسب منشا گاڑے اور اکھاڑے جاسکتے ہیں۔

اس علاقے کی برآمدات ڈھیر وال غلّہ، چند اُونی چیزیں اور عام دریاں ہیں۔ یہ عموماً مکران اور ساحل عرب کو بھیجی جاتی ہیں اور ان کے بدلے کھجوریں، بادام اور کافر غلام لائے جاتے ہیں جو یہاں بہت قیمتی سمجھے جاتے ہیں اور باہر کا سارا مشقت کا کام کرتے ہیں۔ بمبئی سے اس کی درآمدات لوہا، فولاد، ٹین، چینی، پان کے پتّے اور ناریل ہیں اور سندھ سے سفید گاڑھا، چھینٹیں، لنگیاں اور تھوڑی خام کپاس لاتے ہیں جو خرگی کپڑا بننے میں کام دیتی ہے جو غریب لوگوں کے کام آتا ہے۔ بڑے عرض کی نفیس سیاہ بانات اور دیگر یورپی مصنوعات بہت پسند کی جاتی ہیں لیکن لوگوں کی غریبی اور ان کی کم فروخت درآمد کی اجازت نہیں دیتی۔

صوبہ مکران کی طرف لوٹتے ہوئے میں ابتدا میں اس کے اضلاع کا شمار کروں گا لیکن چونکہ ان میں سے بہت سے غیر آباد یا انتہائی بنجر ہیں لہٰذا میں اپنی توجہ زیادہ تر اس کے زرخیز حصوں پر مبذول رکھوں گا۔ مکران کے بڑے بڑے اندرونی اضلاع کیچ، پنجگور، مچھ، دزک، کسر قنت بشکرد، سِب، جلک، کلپرکن اور کوہک ہیں اور ساحل سمندر پر عربو، کلاج، چوبار، تیزاد گواک ہیں۔

یہ پورا علاقہ اہل یوروپ کے لئے نامعلوم تھا اور صرف ساحل سمندر کا پتہ تھا لیکن ۱۸۰۹ کے اواخر میں بنگال نیٹو انفنٹری کے کیپٹن گرانٹ کو بریگیڈیئر جنرل میلکم نے یہاں بھیجا اور اُس نے اس کے جنوب مغربی حصوں میں چکر کاٹا۔ میں خود قلات سے بمپور اس کے شمالی اضلاع سے گذرا اور یوں مجھے ہندوستان واپسی تک اتنا ذخیرہ معلومات حاصل ہو گیا کہ اب میں زیادہ اعتماد سے اس صوبے کے متعلق لکھ سکتا ہوں۔

چونکہ میں نے مکرانی پہاڑوں کا پہلے ذکر کر دیا ہے لہٰذا یہاں مزید نہ لکھوں گا۔ اس کے ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ دریاؤں کے بڑے بڑے دہانے ہیں لہٰذا یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ملک کے اندرونی حصوں میں بہت سی ندیاں تھیں لیکن حالت بالکل اس کے الٹ ہے۔ پورے صوبہ میں بمشکل ایک آدھ نالہ ہی ایسا ہے جو سارا سال بہتا ہے اور ایک بھی ایسا نہیں جو بلا روک ٹوک منبع سے سمندر تک جاتا ہو۔ ان کی گذرگاہیں سمندر کے پاس چوڑی اور گہری ہیں لیکن پہاڑوں کے پاس یہ بہت تنگ اور پیچیدہ نالیوں میں بدل جاتی ہیں جو سال کا بیشتر حصّہ خشک رہتی ہیں اور برسات کے موسم میں پُر زور نالے بن جاتی ہیں اور چند گھنٹوں میں آبِ باراں کو بہالے جاتی ہیں۔ ان کی گذرگاہیں ترس، ببول اور دیگر جھاڑیوں کے گھنے اور غیر نفوذ پذیر جنگل ہیں جہاں اُونٹ اور بکریاں چرتے ہیں اور جو مختلف وحشی جانوروں کی آماجگاہ ہیں۔ ان دریائی گذرگاہوں کے حتی المقدور واضح بیان کے لئے میں مشرقی ترین سے شروع کر کے انہیں ان کے پیچ وخم میں دکھاتے ہوئے مغرب کی طرف چلوں گا۔

اس سلسلۂ کوہ پر چڑھتے ہیں جو لاکس کو مکران سے جُدا کرتا ہے تو ہم اغور ندی پر آتے ہیں جو ہنگلاج مندر کے نیچے سے بہتی ہے اور پھر کئے بعد دیگرے تنگ پاٹوں میں چکر کاٹتی ہوئی سمندر میں جا گرتی ہے۔ مندر کے پاس ہی اس کے پاٹ میں ایک مشہور کنواں ہے جو اپنی گہرائی کی وجہ سے "انیل کا کنڈ" (عمق بے پایاں) کہلاتا ہے۔ ایک واقفکار نے مجھے بتایا کہ اُس نے سینکڑوں گز رسا اس میں پھینکا لیکن پانی تک نہ پہنچ سکا۔ مقامی لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اسے مندر کی مُربّی دیوی نے کھودا۔ مندر کا پانی بہت عمدہ ہے اور بہت سی بیماریوں کے لئے مفید ہے۔ دو منزل آگے ہمیں ملکو ندی ملتی ہے جس کا منبع سمندر سے پینتالیس میل دُور ہے اور جس میں دو تین نالے بھی آملتے ہیں۔ اس سے چالیس میل مغرب میں بھوسل، ٹمرا اور سدک نالے ہیں جن میں سے پہلے دو پہاڑیوں سے بیس یا تیس میل کا فاصلہ طے کرتے ہیں اور آخری قریباً اسّی میل۔ سدک سے کوئی ایک میل کے اندر گاؤں پسنی ہے جہاں کسی وقت تجارت ہوتی تھی اور دریا اتنا گہرا تھا کہ دس بارہ میل تک ڈونگے اس میں چل سکتے تھے اور ایندھن اور کشتیوں کے لئے خمدار لکڑی کاٹ سکتے تھے لیکن عرب بحری ڈاکوؤں نے اسے ۱۸۰۹ میں جلا دیا اور ہندو وہاں سے چلے گئے ہیں۔ اس کے بعد دست ندی ستر میل سے زیادہ فاصلے پر ہے اور اس عرصے میں صرف ایک چھوٹا سا نالہ ہے۔ دست عظیم ترین ندی ہے اور کم پانی پر اس کی گہرائی ساحل کے ایک سو گز فاصلے کے اندر کوئی بیس انچ اور چوڑائی دس سے تیس گز تک ہوتی ہے اور جب مد کی لہر ہو تو سمندر ایک دو میل تک اوپر چڑھ آتا ہے اور اس وقت اُسے دیکھنے والا آدمی اسے ایک بڑا دریا قرار دیگا۔ سمندر میں گرنے کی جگہ اس کی حقیر گہرائی اور چوڑائی کے باوجود دست (یا دستی) کے ہم مختلف ناموں کے تحت اُس کی نشاندہی کر سکتے ہیں، جو ساحل سے ایک سیدھے خط میں چھ اور سات درجوں کے درمیانی فاصلوں پر محیط ہیں اور میرے مطالعے و نظریات کے مطابق اُس کا پانی شمال سے سمندر تک۔ کم و بیش ایک ہزار میل تک بہتا ہے۔

ریگزار میں سے سفر کرتے ہوئے (دیکھئے حصہ اول، ڈائری یکم اپریل) میں ایک بدور نامی پاٹ سے گذرا جو کم از کم ایک چوتھائی میل چوڑا تھا اور مجھے بتایا گیا کہ یہ مختلف جگہ کا ٹتا ہوا گرم سیل تک پھیلا ہوا تھا جو سیستان میں دریائے ہلمند کا ساحلی علاقہ ہے میرے راستے کے جنوب کی طرف یہ پہاڑوں سے نکلتا ہے اور مشرق کی طرف مڑکر ضلع پنجگور کو سیراب کرتا ہے جس سے تین میل شمال میں اس کے پاٹ سے ایک پر آب اور دائمی ندی پھوٹتی ہے۔ اس کے بعد یہ کئی گھاٹیوں اور وادیوں سے ہوتا ہوا صدر مقام کیچ کے پاس سے گذرتا ہے جہاں سے اسے ملیدانی دریا کہتے ہیں اور تھوڑا جنوب کی طرف جاکر یہ بھگوار کہلاتا ہے اور پھر کچھ اور فاصلہ طے کرکے یہ دست یا دشتی کہلاتا ہے اور اسی نام کے تحت سمندر میں جاگرتا ہے۔

ان سب باتوں کی بناء پر میں یہ سوچتا ہوں کہ دشتی (خواہ اس کا کوئی نام ہو) کسی وقت مکران کا بہت ہی بڑا دریا تھا جس کا پانی یا تو کسی اور گذرگاہ کی نذر ہوگیا ہے یا اس کا سوتا ہی خشک ہوگیا ہے۔

دشتی کے مغرب میں نگار، ہم خود، گیانی، ہترہ، سینت، سدگی اور دیگر نالے ہیں جو سمندر میں گرتے ہیں۔ وہ بعض اوقات پہاڑوں میں بارش کے بعد اتنے عریض و عمیق ہوجاتے ہیں کہ پار نہیں کیے جاسکتے لیکن عموماً وہ خشک ہوتے ہیں۔

صدر مقام کیچ اور اس کا ہم نام ضلع دست ندی سے خوب سیراب و شاداب ہوتے ہیں۔

ا دریائے لوہڑہ (جو ضلع شوراوک میں بہتا ہے) کا پانی نوشکی کے شمال مشرق میں ریت میں دب جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ بدور میں پھر ظاہر ہوتا ہے لیکن مجھے اس پاٹ کو دیکھنے اور معلومات حاصل کرنے کے بعد خیال ہوا کہ یہ ہلمند کی کوئی شاخ ہے جس نے پاٹ کے ڈوبنے پر دھار اکھو دیا ہے کیپٹن گرسی نے اس کے دو طرفہ ڈھلوان چٹانوں کو بیان کیا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ کسی وقت دشت کا ہم سطح تھا اور اب ایسا نہیں ہے۔ دیکھئے ضمیمہ ڈائری ۳۰ مارچ۔

قلعۂ کیچ ایک اُونچی ڈھلان پر بنا ہُوا ہے اور دریا اس کے نیچے سے بہتا ہے اور اس قدرتی استحکام سے مقامی اسے ناقابلِ تسخیر سمجھتے ہیں۔ قصبۂ امن کروہ کی تین اطراف کو گھیرے ہوئے ہے جس پر قلعہ ایستادہ ہے اور کسی وقت اس میں تین ہزار مکانات تھے لیکن نصیر خان کی موت کے بعد سے جو تجارت قندھار، قلات، شکارپور، خضدار، بیلہ اور ساحلی قصبات گوادر اور چوبار سے ہوتی تھی بند ہوگئی ہے اور ہندو اور دیگر سرمایہ دار لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں اور قصبہ تنزل پذیر ہو چکا ہے۔ ۱۸۱۰ میں کیچ کا حاکم عبداللہ خان بزنجو براہوئی تھا جو محمود خان کو برائے نام حاکمِ اعلیٰ تو مانتا تھا لیکن خراج نہ دیتا تھا اور اب تو معلوم ہوا ہے کہ وہ یہ نمائشی احترام بھی نہیں کرتا۔ اُس کے پیشرو کو قریباً سات سال پہلے میر مصطفےٰ خان نے انتہائی دغابازی سے قتل کر دیا تھا کیونکہ وہ خان (اس کا بھائی) کے احکامات کی رتی بھر بھی پرواہ نہ کرتا تھا لہٰذا اسے قلات بلایا گیا۔ اُس نے انکار کر دیا لیکن کچھ مذاکرات اور امرائے قلات کی قسمیہ یقین دہانی بابت جان کی امان کے بعد پنجگور میں ملاقات رکھی گئی۔ حاکم وقت مقررہ پر حاضر ہُوا اور پھر واپس نہ آیا کیونکہ اسے میر مصطفےٰ خان کے سپاہیوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

کیچ کی آمدنی بہت معمولی ہے اور حاکم جو کبھی چار پانچ ہزار مسلح سپاہیوں کا کفیل ہوتا تھا۔ اب چار پانچ سو عرب سپاہی بھی نہیں رکھ سکتا۔

کیچ کے جنوب کا علاقہ ایک بے آب و گیاہ دشت ہے۔ گو کہیں کہیں بہت کھجور پیدا ہوتی ہے تاہم یہ نخلِ خرما کی خاصیت ہے کہ وہ بنجر ترین علاقوں میں ہوتا ہے۔

کیچ سے کوئی نو دن کے سفر پر شمال، شمال مشرق کی طرف پنجگور یا پنجر کا چھوٹا سا زرخیز علاقہ ہے۔ یہ پہاڑوں کے درمیان ایک وادی ہے جس میں بارہ تیرہ مخیّم (خیمہ دار) گاؤں میں۔ دریائے بدور سے انہیں پانی فراوان ملتا ہے اور یہ خوب آباد و شاد ہیں اور یہاں کی کھجوریں مکران میں بہترین سمجھی جاتی ہیں (کھجور کی کاشت کے لئے دیکھئے باب ہفتم) سردار پنجگور محمود خان قلات کا ایک بھتیجا رحمت اللہ خان ہے لیکن اس کے باوجود وہ بھی کیچ والوں کی

طرح آزاد ہو چکا ہے۔ اس کی آمدنی بیس ہزار روپے سالانہ بتائی جاتی ہے جو میرے خیال میں
مبالغہ آمیز ہے۔

مچھ وہ علاقہ ہے جو پنجگور کے مغرب میں اور اس کے خط متوازی پر ہے اور اس ریگزار
کی جنوبی سرحد ہے جہاں سے میں گذرا تھا۔ یہ بے حد پتھریلا اور پہاڑی علاقہ ہے لیکن اس کی
بعض وادیوں میں اتنا اناج ہو جاتا ہے جو خانہ بدوش چرواہوں کے لئے کافی ہوتا ہے۔ یہاں
اپریل، مئی اور جون کے سوا پانی افراط سے ملتا ہے اور پھر بارشیں ہو جائیں تو چشمے اور
ندی نالے رواں ہو جاتے ہیں لیکن اگر بارش نہ ہو تو لوگ جنوب کی طرف چلے جاتے ہیں۔ وہ
یہاں کھجور اگاتے ہیں اور اونٹ، بھیڑیں اور بکریاں پالتے ہیں۔ وہ مکرانیوں کی نسبت کوتاہ قد
اور نازک تر لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ وہ تفنگ، تلوار اور ڈھال سے لڑتے ہیں اور ہر گاؤں کا
اپنا اپنا معتبر ہے جو اپنے لوگوں کے تنازعات کا فیصلہ کرتا رہتا ہے۔

کسر قند ایک پچیس میل لمبا میدان ہے جو قریباً اتنا ہی چوڑا ہے اور اس کے بیچ میں
سے ایک چھوٹا سا دریا بہتا ہے۔ قلعہ گاؤں کی حفاظت کرتا ہے جو اسی کے ارد گرد بنا ہوا ہے۔
مزروعہ زمینیں بھی برجوں کی حفاظت میں ہیں جو ہر چار پانچ سو گز کے فاصلے پر بنے ہوئے ہیں اور
تفنگچی پکائی کے موسم میں وہاں پہرہ دیتے رہتے ہیں۔ یہ حفاظتی تدابیر ضروری ہیں کیونکہ
یہ علاقہ کوہستان اور دمبور کے ناہر دتیوں کے قریب ہے۔ پھر بھی یہ لٹیرے کبھی کبھار ان زمینوں
پر ہاتھ صاف کر ہی جاتے ہیں۔

بشکرد کے متعلق صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ پہاڑوں کا ایک مسلسل اور سنگلاخ
ڈھیر ہے جن میں کرد بلوچوں کے جانور چر سکتے ہیں اور وہ خود اناج وغیرہ کے لئے میدانی
علاقوں کے دست نگر ہیں۔ یہ لوگ کرد قبیلہ ہیں جو لارستان سے یہاں آئے تھے اور یقیناً ان
لوگوں کے وارث ہیں جنہوں نے چند صدیاں پہلے یہ صوبہ فتح کیا[1] اور یہاں اپنی بستی قائم کی۔ وہ

---

[1] کنیئر کی پرشین امپائر، ص ۸۳

بالائی علاقوں کا رجحان قائم رکھے ہوئے ہیں اور اب ان میں سے بہت سے کوہستان میں آباد ہو گئے ہیں۔ اضلاع دزک، سب، کلپرکن اور جلک کا کچھ ذکر حصہ اول میں آچکا ہے اور مزید تفصیل بے سود ہے[1] خواہ وہ ان کے متعلق ہو یا ساحل علاقوں کے متعلق جو محض ہموار اور چٹیل میدان ہیں جو دامان کوہ تک پھیلے ہوئے ہیں اور روئیدگی کے شائبہ سے بھی عاری ہیں۔

مکران کی آبادی خانہ بدوش قبائل پر مشتمل ہونے کی وجہ سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے لہٰذا اس کی تعداد کا اندازہ لگانا بیکار ہے۔ ساحل سمندر کے لوگ مجھے اس کے شمالی علاقوں کی نسبت بڑے اعضاء و جوارح اور سیاہ رنگ جلد کے معلوم ہوئے جس کی وجہ شاید مسقط اور عرب کا فروں کے ساتھ ان کی باہمی شادیاں ہیں لیکن اس کے باوجود میں نے جتنے مکرانی دیکھے وہ سب بلوچوں براہوئیوں کے مقابلے پر سختی اور نازک لوگ تھے اور کئی بیماریوں کا شکار تھے۔

ہو سکتا ہے یہ آب و ہوا کا اثر ہو یا ان کی نفس پرستانہ زندگیوں کا اثر ہو جن کے لئے دونوں اصناف بدنام ہیں۔ وہ ایک منشی چیز بھی بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں جو خمیر (خمیر کردہ) کھجوروں سے بنائی جاتی ہے اور انتہائی مضر رساں ہے۔

مکران کی عورتیں عموماً بہت بدنام ہوتی ہیں اور بیوفائی میں ضرب المثل ہیں وہ اپنے شہوانی جذبات کی تسکین پر کسی حد بندی کی قائل نہیں اور نتیجتہً وہ چھوٹی سی عمر میں درماندگی اور قبل از وقت ضعیفی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ مردوں کی زندگی بھی زیادہ نہیں ہوتی۔ وہ اپنی بیویوں کی عیش کوشی کو خاطر میں نہیں لاتے اور پتہ چل جانے پر ایک دو بھیڑوں کی پیشکش شوہر کے غصے کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔

نصیر خان نے بلوچستان کے لئے مجموعۂ قوانین تیار کیا تھا وہ یہاں بھی چند ترمیمات کے ساتھ

---

[1] دیکھئے بیان ۶، ۷، ۸ اور ۹ اپریل۔

گاؤں کلوگن ضلع جلک میں واقع ہے۔

اُس نے نافذ کیا لیکن یہ قوانین اُس کی موت کے ساتھ ہی دفن ہو گئے اور اب یہاں مطلق نراج اور قتل و غارت کا دَور دَورہ ہے۔ ہر علاقے کا اپنا اپنا طریقۂ انتقام ہے اور سیاح یا سوداگر ایک جگہ سے دُوسری جگہ تبھی جا سکتے ہیں جب ان کے ساتھ کافی مضبوط مسلح حفاظتی دستے ہوں۔ مکرانی بنادر سے واحد برآمد کھجوریں ہیں جو بمبئی بھیجی جاتی ہیں یا جزیرہ نمائے ہند کو روانہ کی جاتی ہیں اور ان کے بدلے وہی اشیا لائی جاتی ہیں جن کا بیان صوبہ لسس میں ہو چکا ہے۔ ان کی تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے جو درآمدات کو تبادلے کی بنا پر مکرانیوں کو دیتے ہیں۔

باب نہم

بلوچستان کا تیسرا خطہ — صوبہ کچھ گنداوا اور ضلع ہٹرندداجل — قوانین رسم ورواج اور محصولات قلات کے مطابق — کچھ گنداوا کا حدود اربعہ — وسعت — دریا — ناڑی اور کوہی — صدر مقام — طول وعرض اور قلعہ بندیاں — ڈھاڈر — بھاگ اور لہڑی کے قصبے — دیہات کی بے شمار تعداد — آبادی — جٹ — عادات — طرز زندگی — ہندو — واحد تاجر لوگ — ضلع ہٹرندداجل — حدود اربعہ — صدر مقام — حاکم — اس کے لامحدود اختیارات — ضلع کی وسعت — زرخیزی — وافر آمدنی — آب وہوا — آمدورفت — بلوچستان کا چوتھا خطہ — کوہستان — وجہ تسمیہ — حدود اربعہ — پہاڑ اور ان کی پیداوار — کوہ نوشادر — صوری طور پر آتش فشانی — کوہستان کے دریا — بمپور دریا — دریائے کیکین — کوہستان کے اضلاع — میدانی — کوہی یا پہاڑی — دیہات وقصبات — تمنات — مقامیان کوہستان — حکومت — قریباً نامعلوم — معاشرتی حالات — سزاؤں سے فرار کیسے — اسکی ضرورت — کوہستان کی تجارت — بلوچستان کا پانچواں خطہ — وسعت — حدود اربعہ — ڈائری کی طرف اشارہ — جغرافیہ بلوچستان پر قطعی رائے

—— صوبہ سیستان —— اس کی خاصیت —— صدر مقام —— سردار —— آمدنی —— قوت —— دریائے ہلمند —— ایک جھیل کی شکل —— اس کی وسعت —— پانی —— مکھیاں —— حفاظتی تدابیر —— مقامیانِ سیستان —— ان کی زبان —— پوشاک اور مذہب —— ضلع گرم سیل —— زرخیزی —— باشندے —— اس کے افعال قبیحہ —— ضلع کی آمدنی —— اضلاع فنیچی —— شال اور مستونگ —— دونو آخری پھلوں کے لئے مشہور —— آبادی —— ایک عجیب وغریب حقیقت —— ضلع شوراوک —— اس کا محل وقوع —— آمدنی —— حکومت۔

تیسرا خطہ

صوبہ کچھ گنداوا اور ضلع ہرنہ وابل کو میں نے بلوچستان کا تیسرا خطہ قرار دیا ہے اور چونکہ یہ حصّہ محمود خان کے اقتدار کو ایسے ہی غیر مشروط طور پر تسلیم کرتا ہے جیسے ضلع قلات، لہٰذا میں نے قوانین، رسم ورواج اور محصولات کے سلسلہ میں جو کچھ باب سوم میں لکھا ہے وہی یہاں بھی منطبق ہوتا ہے اور مجھے اب قارئین کو صرف اس کے جغرافیائی کوائف ہی بتانے ہیں۔

کچھ گنداوا کا حدود اربعہ یہ ہے: شمال میں سیوستان، جنوب میں سندھ، مغرب میں براہوئی پہاڑ اور مشرق میں ایک صحرائی علاقہ جو اس کے اور دریائے سندھ کے درمیان ہے۔ اس کی انتہائی لمبائی شمالاً جنوباً کوئی ایک سو بیس میل ہے اور چوڑائی کا قابل رہائش اور زرخیز حصّہ ساٹھ میل سے کچھ زیادہ ہے۔

کچھ گنداوا میں دو دریا ہیں۔ ناڑی اور کوسی۔ ناڑی سبی کے شمال مغربی پہاڑوں سے نکلتا ہے اور مٹھڑی، ایری، حاجی، بدھا، بھاگ، نصیر آباد، بلال، منجھو، کندو او۔ تمبو کے پاس سے گذرتا ہوا بالآخر ریت اور ناقابل گذر جنگل میں گم ہوجاتا ہے۔ جب بارش

خوب ہو یا پہاڑوں پر برف پگھلے تو اس میں بہت پانی ہوتا ہے ورنہ یہ کئی ماہ تک خشک پڑا رہتا ہے۔ کوہی وادئ بولان سے آتا ہے جو دشتِ بے دولت اور کچھ گنداوا کے درمیان شاہراہ ہے اور دہان درہ[1] پر آکر دو شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک شاخ دیہات کوہی، خانپور، میسہور اور مھگائی کے ساتھ ساتھ بل کھاتی ہے اور آخری گاؤں کے پاس بند باندھ کر کاشتکاری کے کام میں لائی جاتی ہے۔ دوسری شاخ ڈھاڈر کے پاس سے گذر کر ناڑی میں گر جاتی ہے جو گاؤں اری سے چار میل کے فاصلے پر ہے۔ ان دونوں دریاؤں میں سے بہت سی نالیاں بنائی گئی ہیں تاکہ زمینوں کو سیراب کیا جا سکے اور کئی چھوٹے چھوٹے بند بھی باندھے گئے ہیں۔

اس صوبے کا صدر مقام گنداوا ہے جو قلات جتنا بڑا تو نہیں لیکن زیادہ باسلیقہ بنا ہوا ہے اور اچھی حالت میں ہے۔ خان قلات کا یہاں ایک محل ہے اور وہ ہر سردی میں اپنے خاندان، بڑے بڑے سرداروں اور جھالاوان اور سراوان کے لوگوں کے ساتھ یہاں آجاتا ہے تاکہ انتہائی سردی سے بچ سکے۔ قصبہ کے گرد ایک اونچی کچی فصیل ہے جسے جٹ یا کاشت کار ٹھیک ٹھاک رکھتے ہیں۔ اس کے تین دروازے ہیں، تلات، کراچی اور شکارپور کا جو ان مقامات کی طرف رُخ کی بنا پر نامزد کیے گئے ہیں۔

دُوسرا قصبہ ڈھاڈر ہے اور پھر مھاگ اور لہڑی لیکن یہ چھوٹے چھوٹے ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں ایک ہزار تا ڈیڑھ ہزار گھر ہیں۔ ان کے گرد بھی کچی دیواریں ہیں جن میں سو اضلاع دار بُرج بنے ہوئے ہیں۔ اس میدان میں بیشمار گاؤں ہیں اور وہ ہر سال اضافہ پذیر ہیں۔

کچھ گنداوا کی بیشتر آبادی جٹ ہے جن کے اطوار، ناک نقشہ اور رسم و رواج سے

---

[1] دہان درہ = درہ یا وادی کا مُنہ - یہ ایک پڑاؤ ہے اور اس کا اور کوئی نام نہیں ہے۔ میں نے انگریزی ترجمہ کی بجائے ہوبہو برقرار رکھا ہے۔

پتہ چلتا ہے کہ وہ اصلی ہندوؤں کی اولاد ہیں جنہوں نے بالجبر یا بہ طیب خاطر اسلام قبول کر لیا ہے۔ وہ قلاتی دہواروں کی طرح دیہات میں رہتے ہیں اور کچھ پابندیوں اور معافیوں کے تحت بلوچ براہوئی سرداروں کی ملحقہ زمینیں کاشت کرتے ہیں جو محمود خان نے انہیں بطور جاگیر دے رکھی ہیں۔ اکثر بلوچ اور سب براہوئی، جن کی یہاں زمینیں ہیں، صرف سردی کے مہینوں میں یہاں رہتے ہیں اور بہار کی آمد آمد پر وہ پہاڑوں کو واپس چلے جاتے ہیں اور جٹ کاشت کاری کرتے رہتے ہیں اور اُن کا حصہ وہاں بھیج دیتے ہیں یا یہیں جمع رکھتے ہیں۔ گنداوا میں کچھ ہندو بھی ہیں اور چھوٹے چھوٹے قصبوں اور گاؤں میں بھی اور وہ تبادلے کے طریقہ پر کاشتکاروں سے تجارت کرتے ہیں اور غلہ وغیرہ ساحل سمندر پر بھیجتے ہیں تاکہ مکران اور دُوسری جگہوں کو بھیجا جا سکے۔

ہڑند داجل کے شمال میں ڈیرہ غازی خان، جنوب میں گورچانی اور دیگر رند بلوچی پہاڑیاں مغرب میں ضلع تھل چوٹیالی اور آزاد افغان قبائل اور مشرق میں دریائے سندھ ہے۔

اس ضلع کا بڑا قصبہ ہڑند ہے اور دُوسرا داجل۔ ہڑند میں محمود خان کا ایک حاکم رہتا ہے جسے فاصلے کی وجہ سے لوگوں پر کلی قانونی اختیارات دے دیئے گئے ہیں حتے کہ زندگی اور موت کا فیصلہ بھی اسی پر ہے۔ ۱۸۱۰ میں اُلفت خان قبرانی حاکم تھا جو محمود خان کا عمزاد تھا لیکن وہ محمود خان کے چھوٹے بھائی محمد رحیم خان کا مقابلہ نہ کر سکا جب اس نے ۱۸۱۱ میں ہڑند داجل پر قبضہ کر لیا اور یوں محروم و فرار ہو گیا[۱]۔

یہ ضلع لمبائی چوڑائی میں پچاس پچاس میل سے زیادہ نہیں ہے لیکن یہاں زمین اتنی زرخیز ہے کہ خان قلات کو محض اسی لئے اتنی آمدنی ہوتی ہے جتنی کل سراوان سے نہیں۔ آبادی سرتاسر جاٹوں کی ہے اور صرف چند افغان یا اتفاقیہ آباد کار ان کے علاوہ ہیں۔ آب و ہوا گرمی میں کچھ گنداوا سے ٹھنڈی ہے[۲] اور سردی میں معتدل اور خوشگوار ہوتی ہے۔ دریائے سندھ پر کشتیوں

---

[۱] دیکھئے باب سوم   [۲] دیکھئے باب ہفتم

کے ذریعے ملتان اور اٹک تک اور حیدر آباد اور ٹھٹھہ تک آمد و رفت کی خوب ریل پیل رہتی ہے۔

چوتھا خطہ

بلوچستان کے جس مغربی حصے کو بلوچ کوہستان کہتے ہیں اُس کے شمال، مشرق اور مغرب میں صرف ریگزار ہیں ماسوائے ایک تنگ سلسلۂ کوہ کے جو اس کی شمالی انتہا سے آگے کو بڑھا ہُوا ہے جیسا کہ باب اوّل میں بیان ہُوا جنوب کی طرف البتّہ مکران کے کئی اضلاع ہیں اور اصل میں اسے بھی اسی کا ایک حصّہ ہونا چاہیے لیکن چونکہ آبادی اطوار اور زبان کے لحاظ سے دونوں کی مختلف ہے لہٰذا میں نے اسے علیحدہ شمار کرنا ہی موزوں سمجھا۔

اس کے بڑے پہاڑ سرحد یا سرد پہاڑ کہلاتے ہیں جو شمالی عرض بلد کے اٹھائیسویں اور تیسویں درجوں کے درمیان ہیں اور اسّی نوّے میل کے فاصلے سے سب سے اونچے دکھائی دیتے ہیں ان میں معدنیاتی پیداوار کثرت سے ہے۔ بہت سی جگہوں پر نمک سیال کے نالے ہیں اور پانی کے ایسے گڑھے جن کی جھاگ رال یا نفت کی مانند ہے جیسی بحیرہ کیسپئن کے قریب ہوتی ہے۔ یہاں لوہا، تانبا اور دیگر دھاتیں بھی ہیں جنہیں مقامی لوگ ضروریات کے مطابق کھودتے رہتے ہیں۔ کوہ نوشادر جسے میں نے بسمان میں دیکھا اور جس کا خصوصی ذکر میں نے ۲۰ اپریل کی ڈائری میں کیا ــــــ تحت الزمین آگ کی علامات کا مظہر ہے۔ پہاڑ کے ایک پہلو زمین اور پتھر بالکل سیاہ ہیں اور بعض اوقات بالائی تہہ اتنی گرم اور خشک ہوتی ہے کہ چھوتے ہی ریزہ ریزہ ہوجاتی ہے اور اس کے مقابل پہلو پر گرم پانی کے چشمے ہیں اور نوشادر اور گندھک وغیرہ بھی رستے ہیں۔

یہاں کوئی دریا نہیں۔ البتّہ لمبور کے قریب ایک نالہ ہے جسے یہاں کے لوگ دریا کہتے ہیں لیکن میں اپریل ۱۸۱۰ میں یہاں گیا تو یہ بند ہوچکا تھا اور اگر خشک سالی دو ماہ اور رہتی تو یہ سرے سے خشک ہوجاتا۔ اس کا پانی مغربی ریگزار میں کھو جاتا ہے۔ مشرق سے آنیوالی بہت سی ندیاں ملتی ہیں تو دریائے کیسکین وجود میں آتا ہے۔ ۱۸ اپریل ۱۸۱۰ کو یہ بالکل خشک تھا

جب میں اس سے گذرا۔ اس کے شمال کی طرف کے نالے اور سرحد پہاڑوں سے نکلنے والے نالے مغرب کی طرف صحرائے کرمان میں کھو جاتے ہیں جیسے کسکین صحرائے بمپور میں گم ہو جاتا ہے۔

کوہستان کے دو بڑے اضلاع میدانی اور کوہکی ہیں میدانی میں ہفتر[1]، پوہرو، بمپور اور بسمان کے قصبے ہیں اور گداوئں کے تمن ان کے علاوہ ہیں۔ کوہکی میں صرف گداوئں کے تمنات ہیں۔ دونو کے باشندے اپنے اپنے علاقے کی تخصیص کے لئے الگ الگ اصطلاحات استعمال کرتے ہیں لیکن چونکہ یہ ہر خیل کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں لہذا ان کو گنوانا بے سود ہو گا۔ کوہستان میں خالصتاً بلوچ آباد ہیں جو کسی دوسری قوم سے خلط ملط نہیں ہوئے۔ ہندو یا دوسرے غیر ملکی بھی یہاں ان کے ماتحت رہنا گوارا نہیں کرتے۔ یہاں زیادہ سے زیادہ آٹھ دس اہم قبیلے ہیں۔ آبادی کم ہے کیونکہ زمین بہت کم زرخیز ہے اور لوگ مغرب میں ایران اور شرق میں کچھ گنداوا کو چلے گئے ہیں۔

طرز حکومت اور قوانین معاشرہ کا یہاں وجود نہیں اور اگر ہے تو کوئی ان کو خاطر میں نہیں لاتا۔ یہاں سردار ان قبائل سیاہ و سفید کے مالک ہیں اور چونکہ یہ عہدہ موروثی ہے لہذا ان کے بیٹے بھی انہی کے نظریات و تعصبات اور اصول و اطوار اپنائے ہیں اور یوں یہ نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بات سردار اور قبائل دونو پر صادق آتی ہے اور کوہستان چھوٹی چھوٹی جمہوریتوں کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے جہاں ہر شخص اپنا انتقام لینے میں آزاد ہے اور مجموعی فلاح کے لئے رائے دے سکتا ہے۔ خیالات و اعمال کے لحاظ سے کوئی اونچ نیچ نہیں اور گو سرداروں کی رائے زیادہ وقیع سمجھی جاتی ہے اور اکثر زیر عمل آتی ہے تاہم یہ محض اس لئے ہے کہ وہ حالات اور موضوعات زیر بحث (ہمسایہ علاقوں میں حملہ وغیرہ) کو دوسروں کی نسبت بہتر سمجھتے ہیں۔ ایسی

---

[1] جیسے سرحد بمعنی سرد علاقہ، سررود بمعنی دریائی علاقہ، پشت کوہی بمعنی پہاڑ کی پشت پر وغیرہ وغیرہ۔

قسم کے جذبے کے تحت وہ اپنے سرداروں کو ثالث مانتے ہیں اور ان کے فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں لیکن یہ معمولی تنازعات کی بات ہے ورنہ بڑے تنازعات میں ہر شخص اپنا منصف خود ہے گو وہ ہمیشہ ایسے فعل سے احتراز کرتا ہے جو اس کے خاندان یا پورے خیل کی بدنامی کا باعث ہو لیکن اگر جرم کرے تو اپنے علاقہ سے کسی دوسری جگہ بھاگ جاتا ہے تاکہ وہ نشانۂ تضحیک نہ بنے۔ جس علاقے میں ہر شخص ایک پیدائشی ڈاکو ہو اور جہاں جان و مال کی حفاظت کے لئے کوئی قانون نہ ہو وہاں جزوی واجبی سزائیں کیا کام دیں گی اور اگر جرائم کے مطابق سزائیں فی الواقع دی بھی جائیں تو یہاں رہیگا کون ؟ صوبہ خالی ہو جائیگا۔

یہاں سے کھجوریں وغیرہ مکران بھیجی جاتی ہیں جہاں ہند و انہیں خرید لیتے ہیں اور وساور کو بھیج دیتے ہیں۔ ان کے بدلے کچھ بیرونی مصنوعات لے آتے ہیں لیکن زیادہ تر چاندی کا روپیہ ہی لاتے ہیں جو یہاں کا واحد رائج الوقت سکہ ہے۔

پانچواں خطہ

یہ خطہ صحیح معنوں میں بلوچستان کا ریگزار ہے اور میرے خیال میں یہ قریباً تین سو میل لمبا اور دو سو میل سے زیادہ چوڑا ہے۔ شمال میں اسے دریائے ہلمند ایسے ہی ریتلے صحرا سے جدا کرتا ہے جو بعض جگہوں پر پارو پامی سن پہاڑ کے دامن تک پھیلا ہوا ہے۔ مغرب میں یہ ایک تنگ اور پست سلسلۂ کوہ کے سوا صحرائے کرمان سے پیوست ہے۔ اگر ہم ان دو نام نہاد حدود کو ایک طرف رکھ دیں تو شمالاً جنوباً اس کی مطلق وسعت قریباً پانچسو میل ہوگی اور شرقاً غرباً ایک وتری سمت میں چھ سو میل سے زیادہ ہوگی۔ اس کے مشرق کی طرف صوبہ سراوان اور افغانستان کے پہاڑ ہیں اور جنوب کی طرف کمرانی پہاڑ ہیں۔ میں نے اپنی ڈائری میں ان صحراؤں کی اتنی تفصیل دی ہے کہ مزید لکھنا فضول ہے لہٰذا میں ان علاقوں کے متعلق کچھ کہوں گا جو بلوچستان سے ملحق ہیں۔ میرے راستے کے شمال میں تھے اور جن پر میں نے اب تک کچھ نہیں لکھا۔ ان میں سے

ا علاقہ سیستان ہے جس میں سے کیپٹن کرسٹی نے سفر کیا اور اسے عین میری شنید کے مطابق

پایا یعنی ایک مسطح ریتلا علاقہ جس میں کہیں کہیں جنگل ہے۔

دار الحکومت دوشک یا جلال آباد ہے جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ شاہ سیستان بہرام خان (جو اپنی حقیر آمدنی کے مطابق شاہانہ انداز سے رہتا ہے) کے بیٹے کے نام پر مشہور ہوا ہے۔ اس کا ملک اضلاع میں تقسیم ہے اور ہر ضلع کا حاکم مقرر ہوتا ہے جو قریباً شاہ کا مساوی الاختیار ہوتا ہے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان میں سے بہت سوں نے تو پچھلے سالوں سے خراج دینا بھی بند کر دیا ہے۔

دریائے ہلمند سیستان میں سے بہتا ہے اور دوشک کے مغرب کی طرف ایک گھوڑ سوار کے دو دن کے فاصلے پر ایک جھیل بن جاتا ہے جو بعض موسموں میں کناروں سے اچھل کر اسی نوّے میل لمبی اور تیس چالیس میل چوڑی ہو جاتی ہے حالانکہ اس کی عام لمبائی تیس اور چوڑائی بارہ میل سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس کے وسط میں ایک جزیرہ ہے جس کا پانی تلخ ہے اور کنارے جھاڑیوں اور گھاس پھوس سے ڈھکے ہوئے ہیں جن میں لاتعداد مکھیاں ہوتی ہیں اور وہ اپریل تا اکتوبر سارے صوبہ کو گھیرے رکھتی ہیں۔ گھوڑوں اور اونٹوں کو ان سے بچانے کے لئے روئی دار سوتی کپڑوں سے ڈھانپا جاتا ہے جو ان کے سُموں تک کو ڈھک دیتے ہیں۔ سیستانی ایرانیوں جیسا لباس پہنتے ہیں اور بول چال کی وہی زبان بولتے ہیں۔ وہ تمام شیعہ مسلمان ہیں اور افغانوں سے کشیدہ ترین تعلقات رکھتے ہیں۔

گرم سیل دریائے ہلمند کے جنوبی کنارے پر ایک تنگ علاقہ ہے اور نوشکی کے شمال مغرب میں پانچ دن کی مسافت پر ہے اور عین صحرا کے کنارے پر ہے۔ یہ کسی دریا کا خشک پاٹ معلوم ہوتا ہے اور اس میں گندم، چاول اور دیگر اناج خوب ہوتے ہیں۔ یہاں کے باشندے قتل و غارت میں بدنام ہیں اور ہمسایہ ممالک کے مفرور ہیں اور یہاں آباد ہونا پسند کرتے ہیں کیونکہ زمین کی زرخیزی اور ہلمند کے فاضل پانی کی وجہ سے وہ تھوڑی محنت سے فصل اُگا لیتے ہیں۔ یہ ضلع پہلے چار ہزار روپے سالانہ شاہ کابل کو دیتا تھا لیکن اب کچھ عرصے سے باغی ہے۔

خونچی گرم سیل سے ملحق ایک ویسا ہی مختصر ضلع ہے۔ اس کے ہمنام گاؤں میں ایک دستہ فوج رہتا تھا جو شاہ کابل کے ایک طرفدار کی کمان میں ہوتا تھا لیکن اب نہیں رہتا۔

قلات کے شمال میں شال اور مستونگ کے اضلاع ہیں جو احمد شاہ نے نصیر خان کو اس کی ہندوستان میں خدمات کے بدلے دیئے تھے۔ یہ دونو علاقے کثیر اور بہترین پھل کے علاوہ مجیٹھ اور خوشبودار چاول کے لئے مشہور ہیں۔ آبادی براہوئیوں، افغانوں اور دہواروں سے مرکب ہے جو قرنہا قرن سے پہلو بہ پہلو رہنے کے باوجود خلط ملط نہیں ہوئے اور اپنی اپنی زبانیں بولتے ہیں مستونگ کے مشرق میں ضلع شوراوک ہے جو حکومت کابل کا جنوبی ترین حصہ ہے اور اس کا ایک گماشتہ یہاں مالیہ لینے کے لئے رہتا ہے (جو معمول ہوتا ہے) اور شاہ کابل اور محمود خان کی رعایا کے درمیان جھگڑوں میں مصالحت کے سلسلہ میں بھی معاون ہوتا ہے۔

باب دہم

بلوچستان کی عمومی آب و ہوا اور سطح زمین ــــ پہلے خطہ کے موسم ــــ درجہ حرارت
ــــ موسمی بارشیں اور ہوائیں ــــ صحت بخشی ــــ دوسرے خطہ بلوچستان کے موسم ــــ
تمیز کیسے ہوتی ہے ــــ ان کا تسلسل ــــ درجہ حرارت ــــ ہوائیں ــــ صوبہ مکران
کی غیر صحت بخشی ــــ لاس ایک استثنا ــــ کوہستان یا چوتھا خطہ ــــ اس کی
آب و ہوا پہلے کی مانند ــــ معتدل اور جان پرور ــــ موسم ــــ بارش ــــ
کچھ گنداوا یا تیسرا خطہ ــــ آب و ہوا ــــ زمین عام طور پر پتھریلی ــــ کچھ گنداوا
ایک استثنا ــــ اس سلطنت کی معدنی پیداوار ــــ کچا لوہا صاف کرنیکا طریقہ
ــــ پھل ــــ اناج ــــ مجیٹھ ــــ کپاس ــــ نیل ــــ زرعی تبصرہ ــــ مجیٹھ کی کاشت
ــــ قیمت ــــ اوش پوست یا اونٹ گھاس ــــ کاشت ــــ کچھ گنداوا
ــــ لاس اور مکران کا تیز رو سبزہ ــــ کھجور ــــ کاشت کی رفتار ــــ پھل محفوظ
کرنے کے مختلف طریقے ــــ پھلوں کی قسمیں ــــ مقامی اسے بیش بہا کہتے ہیں
ــــ بلوچستان کی عمارتی لکڑی ــــ گھریلو اور جنگلی جانور ــــ کیڑے مکوڑے اور
حشرات الارض ــــ مچھلی ــــ گھوڑا ــــ گدھا ــــ خچر ــــ سیاہ جانور ــــ بھیڑ
ــــ بکری ــــ اونٹ ــــ سانڈنی ــــ چرواہوں کے کتے ــــ شکاری کتے
ــــ جنگلی کتے ــــ شیر ببر ــــ شیر ــــ لگڑ بگڑ ــــ بھیڑیا ــــ گدھا ــــ
باز اور عقاب۔

ایک وقت میرا ارادہ تھا کہ میں ہر خطہ کے تحت اس کی آب و ہوا اور ماہیت زمین کا ذکر کرتا رہوں لیکن پھر احساس ہوا کہ ایسا کرنے سے بہت سی باتوں کی تکرار ہوگی لہٰذا ان کے لیئے ایک الگ باب مخصوص کر دیا۔ پھر بھی مختلف صوبوں کے مختلف النوع حالات اور آب و ہوائی اور زمینی تغیرات مجھے مجبور کریں گے کہ میں صحیح ترتیز کے لیئے انکی طرف رجوع کرتا رہوں۔

جھالا وان اور سراوان کے پہاڑی صوبوں کے موسم یورپی ممالک کی مانند ہیں جو بہار، گرمی، خزاں اور سردی میں منقسم ہیں۔ بہار عموماً فروری کے وسط میں یا آخر میں شروع ہوتی ہے اور دو ماہ یا اس سے زیادہ تک جاری رہتی ہے (جو موسم کی پیش رسی یا دیر رسی پر منحصر ہے) گرمی اوائل اگست تک چلتی ہے اور پھر خزاں آجاتی ہے حتیٰ کہ سردی کی آمد یا برفباری (جو عموماً اکتوبر میں ہوتی ہے) اس کا کوس رحلت بجادیتی ہے۔ لہٰذا سردی عموماً سال کا طویل ترین حصّہ ہوتی ہے۔ گرمی کبھی ناخوشگوار حد تک زیادہ نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ آخری چند روز سخت ہوتے ہیں لیکن سردی بہت شدید ہوتی ہے اور ایک شمال مشرقی ہوا بلا توقف اور بعض اوقات بہت زور سے چلتی ہے اور اکثر ایام بہار میں بھی جاری رہتی ہے۔ برف باری، ژالہ باری اور طوفانی بارشیں بھی ہوتی ہیں اور یورپ کے برعکس سخت ترین سردی بھی انہی ہواؤں کے جوبن کے دوران ہوتی ہے جو ان صوبوں کی واحد موسمی

لے اہالیان بلوچستان میں سے کوئی بھی اس سے آگاہ نہیں کہ موسموں کے آغاز کے لئے کوئی اٹل اصول وضع کیا جا سکتا ہے۔ ان کے خیال میں یہ آغاز موسم کی حالت پر منحصر ہے جو ایک ایسا طریقہ شمار ہے کہ دو نسال محض اتفاقیہ طور پر ایک دوسرے کے ہم پلہ ہو جائیں۔ فروری ۱۸۱۱ میں قلات کے قرب وجوار میں پندرہ دن تک برف گرتی رہی اور آئندہ اوائل اکتوبر میں ہی کہر پڑنے لگی۔ گویا سردی کو نکال کر باقی تینوں موسم (جو بلوچوں کے نظریئے سے ہم آہنگ ہیں) سات ماہ اور چند دن سے زیادہ نہ تھے۔

ہوائیں معلوم ہوتی ہیں۔

کیپٹن کرسٹی اور میں ۹ فروری سے ۶ مارچ ۱۸۱۰ تک قلات میں تھے اور ہمارے قیام کے اواخر میں مقامی لوگ ہر روز بارش کے منتظر رہتے تھے جو ان کے خیال میں بہار کی نقیب تھی اور تین ہفتے یا ایک ماہ تک جاری رہتی تھی۔ یہاں کی یہی واحد سالانہ بارش ہے لیکن اس کے علاوہ ستمبر اکتوبر کے مہینے بلکہ پورا موسم سرما بوندا باندی کا عرصہ ہوتا ہے اور شاذ و نادر ہی چار پانچ دن بارش یا اولوں کے بغیر گذرتے ہیں سوائے ان دنوں کے جب کہر آلود موسم ہو اور ہوائیں اور جانفزا ہو۔ ان علاقوں کی صحت افزائی موسموں سے متعین ہوتی ہے۔ گرمی اور خزاں نشاط آگیں سمجھے جاتے ہیں لیکن سردی اور بہار میں دھند، بارش، برف اور ٹھنڈک غربا کے لئے کئی بیماریوں کا سبب بنتے ہیں کیونکہ ان کے پاس اپنے آپ کو اس آب و ہوا کے اثرات سے بچنے کے وسائل نہیں ہیں جو بیک وقت متغیر اور انگلستان سے شدید تر ہوتی ہے۔

مکران اور لاسں میں بھی موسم چار ہی ہیں لیکن وہ مذکورہ صوبوں کی طرح واضح طور پر ممیز نہیں کئے جا سکتے کیونکہ یہ دو مرطوب، ایک گرم اور ایک سرد موسم پر مشتمل ہوتے ہیں اور سردی کا موسم بہت معتدل ہوتا ہے بالخصوص ساحل سمندر پر۔ مرطوب موسم فروری یا مارچ اور جون، جولائی اور اگست کا کچھ حصہ ہوتے ہیں۔ پہلا موسم شمال مغرب کا پیدا کردہ ہے اور دو یا تین ہفتے تک رہتا ہے لیکن دوسرا پُر زور اور مغربی مون سون کا نتیجہ ہوتا ہے۔ موسم گرما مارچ میں شروع ہو کر (ماسوائے جنوب مغربی مون سون کے وقفہ کے) اکتوبر تک جاری رہتا ہے اور اس میں کبھی کبھار گرمی اتنی جان لیوا ہوتی ہے کہ لوگ ان دنوں میں باہر نکلنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتے جو "خرمایز" (کھجور پکنا) کے دن کہلاتے ہیں اور اگست میں ہوتے ہیں۔ نومبر، دسمبر، جنوری اور فروری کے مہینے سرد موسم کہلاتے ہیں لیکن اس وقت بھی یہاں اتنی گرمی

ہوتی ہے جتنی بالائی جھالاوان و سراوان میں کبھی نہیں ہوتی[1] - اس وقت شمال مغربی ہوائیں چلتی ہیں جو اواخر سرما میں تیز تر ہو جاتی ہیں - باقی آٹھ مہینوں میں مسلسل گرم ہوائیں چلتی ہیں اور گو وہ جانفرسا تو نہیں ہوتیں تاہم وہ روئیدگی کا نام ونشان بھی نہیں چھوڑتیں اور جھٹ پٹے کے بعد جلد کو ایک درد انگیز طریقے سے جھلساتی ہیں - مکران کی آب وہوا کو ہمسایہ ممالک کے لوگ خاص طور پر صحت بخش قرار دیتے ہیں سوائے ساحلی علاقہ کے یہاں نسیم بحری اسے معتدل بنادیتی ہے - یورپ کی جسمانی ساخت کے لئے یہ ساحلی آب وہوا بھی انتہائی نقصان دہ سمجھی جاتی ہے - جیساکہ مرحوم کیپٹن گرانٹ کے واقعہ سے ثابت ہوا - وہ بریگیڈیئر جنرل ملکم کے حکم کے تحت یہاں کوئی تین ماہ رہا اور انتہائی شکستہ صحت لیکر واپس ہوا (گو یہ واحد مثال ہے جو سننے میں آئی) لاس اس خطہ کی صحت بخشی سے مستثنے ہے اور یہ ایک غیر معمولی حقیقت ہے کہ جو سلسلہ کوہ اسے مکران سے جدا کرتا ہے ان دونوں حصوں کے باشندوں کے درمیان بھی عادات واطوار، رسم و رواج، اور شکل وشباہت میں ایک واضح حد فاصل قائم کرتا ہے - کوہستان ریگزار کے مغرب کی طرف ہے اور آب وہوا میں سراوان وجھالاوان سے مشابہ ہے جو کسی حد تک ان سے زیادہ معتدل اور زیادہ صحت بخش ہے - یہاں کے موسم مکران کی طرح میں، لیکن جون اور جولائی کی بارشیں یہاں کبھی ہوتی ہیں کبھی نہیں اور کبھی اتنی کہ فصلیں بہہ جاتی ہیں - ۱۸۰۹ میں ایسا ہی ہوا اور قحط پڑ گیا جبکہ سراوان میں خشک سالی اپنے جلو میں قحط لے آئی -

کچھ گنداوا میں گرمی میں آب وہوا بلا کی گرم ہوتی ہے اور سردی میں بھی اتنی گرم ہوتی ہے کہ سراوان وجھالاوان کے تمام سردار اور صاحب استطاعت باشندے یہاں آجاتے ہیں -

---

[1] جب دو صوبے آپس میں ملحق ہوں جیسے جھالاوان اور لاس تو وہ ہر ایک کی آب وہوا کے سود وزیاں میں شریک ہوتے ہیں پس جھالاوان کے جنوبی حصے فلاں کی طرح سرد نہیں ہوتے اور لاس کے ملحقہ حصے ساحلی علاقوں کی نسبت زیادہ ٹھنڈے ہوتے ہیں -

بلوچستان کی سطح پر مفصل تبصرہ بے سود ہے کیونکہ یہ تنوع یا دلچسپی سے عاری ہوگا۔ یہ عموماً انتہا درجے کی پتھریلی ہے اور صوبجات سراوان، جھالاوان، لاس اور مکران میں تو یہ ہر عام ناظر پر عیاں ہو جاتی ہے سوائے اس کے کہ لاس اور مکران کے ساحل پر یہ ریتلی اور خشک ہے۔ ان کے پہاڑ زیادہ تر سیاہ یا بھوری چٹانوں کے ہیں جو بہت سخت نوعیت کی ہیں اور ان کے میدانوں اور وادیوں کی مٹی میں خزف ریزے اور سنگ پارے اتنے ملے ہوئے ہوتے ہیں کہ اصل مٹی کا پتہ بھی نہیں چلتا لیکن اس کے باوجود یہاں گندم اور جوار ہوتی ہے اور جہاں کاشت نہ کی جائے وہاں گھاس فراواں اور قد آدم ہو جاتی ہے۔ کوہستان کی زمین متنوع ہے۔ وادیوں میں عموماً سیاہ اور چکنی ہوتی ہے بعض اونچے سے اونچے پہاڑوں پر چوٹی تک مٹی عمدہ ہوتی ہے اور بعض پہاڑ محض سیاہ چٹانوں کا ڈھیر ہیں۔ بالکل بے آب و گیاہ! کچھ گنداوا کی زمین زرخیز اور چکنی ہے اور اتنی پیداوار کہ اگر صحیح کاشت ہو تو سارا بلوچستان کھائے اور بچائے! پھر بھی یہاں سے بہت سا اناج باہر جاتا ہے اور کپاس، نیل اور تیل کی برآمد الگ ہے۔ باد سموم (دیکھئے ۲ راپریل حصہ اول) یہاں گرمی کے مہینوں میں چلتی ہے اور بہت سے لوگوں کی جان لے لیتی ہے!

سونا، چاندی، سیسہ، لوہا، تانبا، ٹین، سرمہ، کبریت (گندھک) پھٹکڑی، نوشادر اور بہت سی قسموں کے معدنیاتی نمک اور شورہ بلوچستان کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ قیمتی دھاتیں قصبہ نال کے قریب لوہے اور سیسے کی کانوں میں کام کرتے ہوئے صرف دریافت ہوتی ہیں جو قلات سے کوئی ڈیڑھ سو میل جنوب جنوب مغرب میں واقع ہے دیگر مذکورہ بالا معدنیات بکثرت ملتی ہیں۔ مغرب کی طرف چٹانی نمک بہت عام ہے اور شورہ اپنی اصلی حالت میں کھود کر نکالا جاتا ہے۔ قلات اور کچھ گنداوا کی شاہراہ پر پہاڑیوں کے ایک سلسلے سے بالکل سرخ نمک نکالا جاتا ہے جو بہت زیادہ مسہل ہوتا ہے گندھک اور پھٹکڑی بھی یہاں سے برآمد ہوتے ہیں۔

میں نے نوشکی کے مغربی پہاڑوں میں بہت سا سفید اور بھورا سنگ مرمر بھی دیکھا لیکن بلوچی اس کی کوئی قدر نہیں کرتے۔ اِن کا آہن گدازی کا طریقہ بہت سادہ ہے اور اگر اس میں کچھ مٹی کا احتمال رہتا ہے تاہم اپنی کاریگری کی بدولت یہ قابل ذکر ہے۔ جب ایک عمل کے لئے اچھا خاصا خام لوہا اکٹھا ہو جائے تو اُسے خشک لکڑی کے ایک ڈھیر پہ رکھ دیا جاتا ہے۔ ڈھیر کو آگ لگا دی جاتی ہے اور تازہ ایندھن اس میں لگاتے رہتے ہیں حتیٰ کہ لوہا پگھل کر تہ پہ ایک ڈھیر بن جاتا ہے۔ اس کے بعد اسے خس وخاشاک سے صاف کر دیا جاتا ہے اور یہ اپنی اصلی حالت سے زیادہ شفاف نکل آتا ہے۔ دوسرے مرحلے میں اسے ایک آتش پذیر بھٹی میں ڈالا جاتا ہے جو ٹائیلوں یا بیچ پتھے ہوئے ملے جلے گارے سے بنائی جاتی ہے۔ اس کی آگ کے تحت خام لوہا دوسری دفعہ پگھلتا ہے اور اس کا سارا میل اور فضلہ اتار دیا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد اسے سیال شکل میں اٹھا لیا جاتا ہے اور چکنی مٹی کے کھوکھلے سانچوں میں انڈھیل دیا جاتا ہے اور اسی حالت میں یہ قلات کی منڈی میں بیچ دیا جاتا ہے جو اسی قسم کی یوروپی دھات سے آدھی قیمت پہ مل جاتا ہے۔ بلوچ خام سونے اور چاندی کو صاف کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتے اور اصلی حالت میں ہندوؤں کے پاس بیچ ڈالتے ہیں جو محصول سے بچنے کے لئے اسے خفیہ طور پہ پنجاب کے شہروں کو بھیج دیتے ہیں۔

قلات کے باغات میں انواع و اقسام کے پھلوں کے پودے ہیں جن میں سے بہترین نصیر خان کے دور حکومت میں کابل سے لائے گئے۔ وہ پھلوں کی پرورش اور کاشت پر بیحد توجہ دیتا تھا اور اس نے بہترین پیداوار کے لئے انعامات رکھ کر اپنے لوگوں میں ایک جذبہ مسابقت پیدا کر دیا تھا۔ مندرجہ ذیل پھل اپنے قدرتی موسم میں قلات کے بازار میں بہت مناسب قیمت پہ بکتے ہیں اور یہ اُسی کی مساعئ جمیلہ کی کامیابی کے آئینہ دار ہیں :-

خرمانی، آڑو، مختلف قسموں کے انگور، بادام، پستہ، کئی قسموں کے سیب، ناشپاتی، آلو بخارا، کشمش، چیری، سفرجل، انجیر، انار، شہتوت، کیلے،

امرود، خربوزے[1] وغیرہ۔

قلات کے شمال میں واقع شال اور مستونگ میں اتنی نفیس قسم کے بادام ہوتے ہیں کہ ایک خشک کپڑے میں ملنے سے ان کے مغز نکل آتے ہیں۔ ہر قسم کے اناج[2] بلوچستان میں اگائے جاتے ہیں اور سبزیوں[3] کی بھی خوب بھرمار ہے۔ مجیٹھ، کپاس اور نیل بھی یہاں ہوتے ہیں بالخصوص قلات کے شمال اور مشرق میں اور یہاں کا نیل بنگالی نیل سے بہتر سمجھا جاتا ہے اور زیادہ قیمت پاتا ہے۔

سراوان اور جھالاوان کے بالائی حصوں اور شال اور مستونگ میں گندم اگست یا ستمبر میں بوئی جاتی ہے اور آئندہ جون میں کاٹی جاتی ہے۔ جو ایک ماہ بعد بوتے ہیں اور کچھ پہلے کاٹتے ہیں گویا یہ فصل تقریباً آٹھ ماہ لیتی ہے مکئی تین چار ماہ میں پک جاتی ہے بشرطیکہ یہ پوری گرمی میں بوئی جائے اور محفوظ جگہ پر ہو۔ یہاں نیل نہیں ہوتا اور چاول صرف ان پست وادیوں میں جہاں پانی خوب ہو۔ مجیٹھ تین سال سے پہلے کام کا نہیں ہوتا اور چونکہ یہ محنت طلب ہے لہٰذا اس کی کاشت کا بیان بلوچوں کے نظام زراعت پر روشنی ڈالے گا۔

---

[1] ہر قسم کے خربوزوں، تربوزوں اور سرودوں کی کاشت ہوتی ہے اور بعض تربوز تو اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ایک آدمی بمشکل ایک اٹھا سکے۔ بلوچ ایک دو پھولوں کے سوا سب کو تنوں سے علیحدہ کر دیتے ہیں اور پھر کھاد ڈالتے ہیں اور پودے کو زمین کے اوپر یا اس میں ڈھکا ہوا رکھتے ہیں جس سے یہ میٹھا اور رسیلا ہو جاتا ہے۔ خربوزہ بھی ایسے ہی تیار کیا جاتا ہے۔

[2] بلوچستان میں بوئے جانے والے اناج درج ذیل ہیں:۔

چاول، گندم، جو، باجرہ، جوار، مونگ، مکئی، دال، آرٹو، مٹر، تل، چنا۔

[3] قلات میں یہ سبزیاں دستیاب ہوتی ہیں:۔ شلجم، گاجر، کرم کلہ، سلاد، پھول گوبھی، مٹر، باقلا، لوبیا، مولیاں، پیاز، لہسن، اجمود، بینگن، ککڑی، کھیرا وغیرہ۔

زمین تیار کر کے اسے چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں بانٹتے ہیں اور پھر بیج ڈال کر انہیں پانی سے بھر دیتے ہیں۔ اس کے بعد کیاریوں کو مٹی اور بہترین کھاد سے پُر کر دیتے ہیں۔ پودا نو دس دن میں اُگ آتا ہے اور پہلی گرمی کے دوران اس کے ڈنٹھل تین چار فٹ اونچے ہو جاتے ہیں۔ یہ ستمبر میں کاٹ لئے جاتے ہیں اور جانوروں کے لئے چارہ کا کام دیتے ہیں۔ اس کے بعد زمین کو بار بار پانی اور کھاد دیئے جاتے ہیں حتیٰ کہ بہار آجاتی ہے اور پودے پھر پھوٹتے ہیں۔ بیج کے لئے جتنے درکار ہوں انہیں علیحدہ کر لیا جاتا ہے کیونکہ یہ دوسرا سال اس مقصد کے لئے بہترین سمجھا جاتا ہے۔ باقی ہر ماہ یا چھ ہفتہ بعد کاٹ لئے جاتے ہیں جس سے ہریاول جڑوں میں چلی جاتی ہے اور ان کی جسامت بڑھاتی ہے۔ بیج کے لئے چنا ہوا ہر ڈنٹھل اپنی چوٹی پر ایک پھول پیدا کرتا ہے۔ غنچہ بنتا ہے تو اس میں سے دو بیج نکلتے ہیں۔ یہ پک جائے تو چن لیتے ہیں اور علیحدہ رکھ لئے جاتے ہیں۔ تنے پہلے سال کی طرح کاٹ لئے جاتے ہیں اور پھر زمین کو طاقتور بنانے کے ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ تیسری گرمی میں پہلے دونو سالوں کی طرح ڈنٹھل تراش دیئے جاتے ہیں اور ستمبر میں جڑیں اکھیڑ لی جاتی ہیں جو بالکل سیدھی اور بلا شاخ و ورق ہوتی ہیں اور تین تا پانچ فٹ لمبی لیکن بہت پتلی ہوتی ہیں۔ یہ فوراً چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لی جاتی ہیں اور سکھائی جاتی ہیں اور پھر کوئی دس روپے پاؤنڈ کے حساب سے بازار میں بیچ دی جاتی ہیں۔ اوش پوسٹ یا اونٹ گھاس ایک خاص قسم کی گھاس ہے جس کی ڈنڈی ایک دو فٹ اونچی ہوتی ہے اور جس کے پتے آئرستانی شمراک گھاس جیسے ہوتے ہیں۔ یہ آغاز بہار سے انجام خزاں تک ہر ماہ دو دفعہ کاشت ہو سکتی ہے۔ سردی میں مرجھا جاتی ہے اور اس کے آخر میں اسے پھر پانی اور کھاد دیتے ہیں۔ یہ پودا چھ سات سال تک چلتا ہے اور اس کے بعد اس کی جڑیں نکال لی جاتی ہیں اور زمین کو دو تین موسموں کے لئے خالی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مختلف اناجوں کا چھلکا مویشیوں کی اہم خوراک ہے اور اسے اوش پوسٹ کے ساتھ کاٹ کر کھلاتے ہیں۔ مکران

اور لاس کے جنوبی صوبوں میں دو مرطوب موسموں کی وجہ سے گھاس کی دو سالانہ فصلیں ہو سکتی ہیں۔

کچھ گنداوا، لاس اور کچھ مکران کے کھلے اور پست میدانوں میں فصلیں بہت جلد پک جاتی ہیں۔ گندم چھ ماہ اور جو پانچ ماہ سے بھی کم مدت میں کاٹ لئے جاتے ہیں۔ باقی اناج بھی دو سے پانچ ماہ لیتے ہیں اور کپاس اور نیل بھی اسی نسبت سے پکتے ہیں۔ یہ قابل ذکر ہے کہ کچھ گنداوا میں پانی کی فراوانی اور زمین کی زرخیزی کے باوجود وہاں چاول اُگایا نہیں جا سکتا۔ مکران میں کھجور کی کاشت پر بہت محنت کی جاتی ہے اور چونکہ اس کا طریقہ غیر معمولی ہے اور حتمی طور پر نر اور مادہ درختوں کے وجود کو ثابت کرتا ہے (جو ایک متنازعہ فیہ مسئلہ بنا رہتا ہے) لہٰذا میں اسے یہاں بیان کر دوں گا اور یہ شنفید نہیں بلکہ بار بار کی دید کا نتیجہ ہے۔ نر اور مادہ درخت عموماً فروری کے آخر یا اوائل مارچ میں پھوٹنا شروع کرتے ہیں۔ پھول تنے سے پھوٹتا ہے، چوٹی کے پتوں یا شاخوں کے درمیان اور خوشہ گندم سے مشابہ لیکن اس سے بڑا اور بالکل سفید ہوتا ہے۔ نر پھول میٹھا اور خوش ذائقہ ہوتا ہے لیکن مادہ پھول تلخ اور بدذائقہ ہوتا ہے۔ جب درختوں پر پھول آجاتے ہیں تو فالتو اور زائد شاخیں کاٹ دی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ مادہ پھول بھی علیحدہ کر دیئے جاتے ہیں ورنہ پھل اپنی تکمیل تک نہ پہنچ سکے گا۔ اس کے بعد نر پھول کا ایک ڈنٹھل مادہ درخت کی چوٹی کے بیچ دان میں سوراخ کرکے اس میں ڈال دیا جاتا ہے اور پھر کھجوریں بڑھتی رہتی ہیں حتٰی کہ خرمایز (کھجور پکنا) کے دن آجاتے ہیں جو انتہائی گرمی کے دن ہوتے ہیں۔ شاذ و نادر ہی تین ہفتے سے زیادہ ہوتے ہیں اور عموماً اگست یا ستمبر میں آتے ہیں۔ اس عمل کے بغیر مادہ پھول کھجوروں کی شکل تو اختیار کر لیتے ہیں لیکن پک نہیں سکتے۔ نر پھول بلوچوں کے لئے روٹی کا کام دیتے ہیں اور وہ اسے سبزی یا بھون کر کھا لیتے ہیں۔ ایک نر درخت سینکڑوں مادہ درختوں کو بار آور کر سکتا ہے کیونکہ زردانہ کا معمولی سا ریزہ بھی کارگر ہوتا ہے اور مجھے یقین دلایا گیا کہ اسی کو بوقت ضرورت ایک درخت سے ہٹا کر دوسرے مادہ درخت میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جب خرمایز، گذر جائے تو

کھجوریں نوچ لی جاتی ہیں اور مالک کے خیال کے مطابق تقسیم کر لی جاتی ہیں۔ کچھ چٹائیوں پر دھوپ میں سکھائی جاتی ہیں اور کچھ کی گٹھلیاں نکال کر اسی طریقے سے سکھا لیتے ہیں اور پھر انہیں بکری کے بالوں سے بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی قطاروں سے لٹکا دیتے ہیں جنہیں مرطوب حالت میں رکھنا مقصود ہو انہیں فوراً کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی ٹوکریوں میں بند کر دیتے ہیں اور ان میں سکرین کی بہتات خود انہیں خراب ہونے سے بچا لیتی ہے، درختوں اور پھلوں کی بے شمار قسمیں ہیں کیونکہ ایک کا دوسرے سے پیوند ایک تیسری اور نئی قسم پیدا کر دیتا ہے۔ کھجور کی کاشت کا ماہر وہی ہوتا ہے جو ہر درخت کو دیکھتے ہی اس کی قسم، اس کا نام اور اس کے پھل کی نوعیت بتا سکے۔ بلوچستان میں سب سے زیادہ قابل قدر کھجوریں لر، بیو، مجاوتی اور شنگس قند ہیں۔ مقامی لوگ نخل خرما کو بجا طور پر عظیم ترین نعمت سمجھتے ہیں جس کی قدر و قیمت ایک کنکریلی اور بنجر زمین میں پھلنے پھولنے سے دوبالا ہو جاتی ہے حالانکہ یہ زمین اور کسی کام کی نہیں ہوتی۔

بلوچوں کے پاس بہترین عمارتی لکڑی اپرٹس اور تمر ہندی (املی) درختوں کی ہوتی ہے جو بہت سخت اور پائیدار ہوتے ہیں۔ اپڑس ساگوان سے بلحاظ ساخت، وزن اور شکل اتنا ملتا جلتا ہے کہ کیپٹن کرسٹی اور ہین نے اسے ساگوان ہی سمجھا۔ یہ دونو درخت بہت قد آور ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ببول، لائی اور شہتوت بھی عمارتوں میں کام آتے ہیں۔ مغرب کی طرف لوگ کھجور کا درخت بھی اسی مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ نیم، پیپل، سنتو، چنار، آم، اخروٹ اور جمبیر بھی مختلف حصوں میں ہوتے ہیں لیکن شاہ بلوط، آلش اور سرو وغیرہ یہاں بالکل نہیں ہوتے۔

بلوچستان کے پالتو جانور گھوڑے، خچر، گدھے، اونٹ، سانڈنیاں، بھینسیں، سیاہ مویشی، بھیڑیں، بکریاں، کتے، بلیاں، مرغے، مرغیاں اور کبوتر وغیرہ ہیں، ان کے یہاں ہنس، فیل مرغ اور بطخ نہیں ہوتے، جنگلی جانوروں میں شیر ببر، شیر، چیتے، لگڑ بگڑ، بھیڑیئے، گیدڑ، جنگلی بلے، جنگلی کتے۔ لومڑ، خرگوش، نیولے، پہاڑی بکرے، بارہ سینگے، گوزن، ہرن، (سرخ اور دیگر) اور جنگلی گدھے وغیرہ ہوتے ہیں۔ پردار جانوروں یعنی طیور میں یہاں باز،

چیل، گدھ، مینا[1]، کوّے، عقاب، جنگلی ہنس اور بطخ، لم ڈھینگ، بگلے، تغدار، پہاڑی کبوتر، بٹیر، تیتر وغیرہ بھی پرندے ہوتے ہیں جو یورپ یا ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ کیڑے مکوڑے اور زہریلے جانور اتنے عام نہیں جتنے ہندوستان میں اور تازہ مچھلی سوائے ساحل سمندر کے اور کہیں نہیں جہاں کے لوگوں کا گذارہ ہی زیادہ تر اسی پر ہے۔

بلوچستانی گھوڑے مضبوط، جسیم اور بڑے لیکن انتہا درجے کے اڑیل ہوتے ہیں۔ ان میں سے جو ہندوستان میں لائے جاتے ہیں وہ زیادہ تر قلات کے جنوب اور کچھ گنداوا میں پروردہ ہوتے ہیں۔ اس جانور کی مکرانی اور لاسی نسل چھوٹی اور کم حوصلہ ہے۔ صحرا کے مغرب میں بلوچ زیادہ تر خراسانی گھوڑے رکھتے ہیں اور جن سرداروں کے پاس بانجھ گھوڑیاں ہوتی ہیں وہ ان میں عربی یا ایرانی گھوڑوں سے ملاتے ہیں جس سے پُردم، اصیل اور خوشنما گھوڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اس علاقے کے گدھے یا خچر میں کوئی خاص قابل ذکر بات نہیں اور نہ ہی سیاہ مویشیوں، بھیڑوں اور بکریوں میں۔ بھیڑیں عموماً ایرانی دُنبہ (چکی دار) قسم کی ہوتی ہیں اور بکریاں سخت اور کالے بالوں والی ہوتی ہیں جو انہیں سردی اور برف سے بچاتے ہیں۔ بلوچ اُونٹ اور سانڈنی کی سب سے زیادہ قدر کرتے ہیں۔ اُونٹ دو کوہانی نسل کا ہے اور صرف باربرداری کے لئے مفید ہے کیونکہ یہ بھاری بھر کم قد و قامت کا ہے اور اس کی ہڈیاں خوب بڑی بڑی، کھال جھبری اور طاقت حیران کن ہوتی ہے۔ سانڈنی یا ایک کوہان والے اُونٹ کو یہ کئی دن تک برق رفتاری سے سفر کرنے کی تربیت دیتے ہیں اور بھوک پیاس سے بے نیازی انہیں چھاپوں کے لئے خاص طور پر کارآمد بنا دیتی ہے۔ یہ گھوڑوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اُونٹ پست علاقوں میں نہیں ہوتا اور بالائی علاقوں میں

---

[1] میں نے قلات کے سوا ایشیا بھر میں مینا کہیں نہیں دیکھی۔ ایران اور کابلی پہاڑوں میں بھی نہیں اور یہ ایک معمہ ہے کہ یہ صرف علاقہ قلات میں ہی کیوں محدود ہے۔

بھی اس سے کبھی کبھار ہی کام لیا جاتا ہے یا اسے پالا جاتا ہے۔

سانڈنیاں جس آب وہوا میں رہتی ہیں اسی کے مطابق شکل وصورت کی مالک ہوتی ہیں۔ مکران اور لاس میں وہ دبلی پتلی ہلکے رنگ کی اور عموماً حسن توازن کا نمونہ ہوتی ہیں لیکن قلات اور اس کے شمال میں وہ بھاری بھرکم، بجد سیاہ، اڑیل اور دونسلی ہوتی ہیں۔ مؤخر الذکر بہترین ہیں اور میری شنید کے مطابق سردی گرمی میں صابر وشاکر ہوتی ہیں۔

چرواہوں کے کتے اور شکاری کتے بہت قابل قدر سمجھے جاتے ہیں اور بلوچ انہیں ایسے لاڈ پیار سے پالتے ہیں جیسے انگلستان کے شکاری اپنے شکاری کتوں کو پالتے ہیں۔ چرواہوں کے کتے بہت بڑے اور طاقتور ہیں اور غصے میں ہوں تو بہت وحشت ناک ہوتے ہیں ورنہ عام طور پر وہ بجد فرمانبردار ہیں۔

جنگلی کتا البتہ بہت خطرناک ہوتا ہے اور ایک غیر مسلح شخص کو اسے ہرگز نہیں چھیڑنا چاہیے۔ یہ عموماً بیس تیس کے گروہ میں شکار کرتے ہیں اور ایک بیل کو آن کی آن میں چیر ڈالتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ اتنے ڈرپوک ہیں کہ گھنے جنگلوں میں چھپے رہتے ہیں لہٰذا ان سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

شیر ببر اور شیر بلوچستان کے پہاڑوں میں شاذونادر ہی پائے گئے ہیں اور میرے خیال میں اُن کا اصل بسیرا دریائے سندھ کے کناروں کے جنگلات میں ہو سکتا ہے یا سندھ اور گجرات کے درمیان صحرائے بسیط میں۔

لگڑ بگڑ، بھیڑیئے اور گیدڑ یہاں بہت زیادہ ہیں اور ریوڑوں کا بہت نقصان کرتے ہیں لیکن لگڑ بگڑ کے سوا انسان پر کوئی حملہ نہیں کرتا سوائے اس کے کہ وہ فاقہ زدہ ہو یا برافروختہ کر دیا جائے۔

عقاب صرف جھالاوان اور سراوان میں نظر آتے ہیں۔ باز پہ دری مغرب کی

طرف کے بعض بلوچ سرداروں کا پسندیدہ مشغلہ ہے اور وہ ان پرندوں کو نہایت احتیاط سے تعداد، جنگلی پرندے اور سیاہ تیتر پکڑنا سکھلاتے ہیں۔

لے جنگلی پرندے عام خرمن شکار پرندوں کی ایک وحشی نسل ہیں لیکن کافی چھوٹے ہوتے ہیں۔ اور جاوا کے اصیل مرغ سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ شکاری پرندے ہیں اور ایک چھوٹا سا باز ایک جوان مرغ پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔

باب یازدہم

چھٹا خط — صوبۂ سندھ — امیرانِ سندھ کے پاس مشن بھیجنے کا سبب — سفیر اور اس کے ہمرکاب — تیاریاں — بمبئی سے روانگی — بندرگاہ کراچی میں آمد — گورنر کی ملاقات — اس کی شکل وشباہت اور پوشاک — اُس کا مقصد — اُس کی دُوسری ملاقات — سفیر سے معذرت — دورانِ ملاقات اُس کا خوف — اس کے خدّام کی ناشائستگی — سفیر کا اُترنا — قلعہ کراچی میں سرکاری ملازمین کا داخلہ ممنوع — اس موضوع پر تبادلۂ خیال — امیروں کا گستاخانہ رویّہ — اسے دبانے کے اقدامات — افواہیں — سفیر سے مذاکرات کے لئے ایک نمائندہ کا تقرر — اُسکی گفتگو — جواب — انگریزی جہازوں کو کراچی بندر چھوڑ دینے کا حکم — طریقہ سندھ میں فارسی روزمرّہ کے ضمن میں بیہودہ دعوے — گورنر کے آدمیوں کا ناروا برتاؤ — اُس کی تاویل — سفیر پر دھونس جمانے کی کوشش — اُس کے مصمّم حیلے — سندھی حکومت کا حسد — گورنر کی بدتمیزی — صورتحال پر تبصرہ — امیروں کی طرف سے دُوسرا مراسلہ — اُن کی گستاخی اور لن ترانی — وہ مشن کی دربار میں آمد سے متعلق شرط واپس لیتے ہیں — کراچی چھوڑنے کی تیاریاں — ایک سندھی امیر کی خست اور

بے ایمانی ۔ اُس کی بدتمیزی ۔ جہاز روک کر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ناکام رہتے ہیں۔

چھٹا خطّہ

۱۸۰۸ میں شاہ ایران کے پاس مشن بھیجنے کے جو محرکات[1] تھے اُنہی کے تحت ہندوستان کی حکومتِ عالیہ نے امیرانِ سندھ کی طرف ویسا ہی مشن روانہ کیا اور عزت مآب گورنر جنرل نے بمبئی سول سروس کے جناب نکولس ہینکی سمتھ (جو اُس وقت بوشہر میں ریذیڈنٹ تھا) کو بطور سفیر نامزد کیا۔ اُس کے ساتھ یہ عملہ بھی مقرر کیا گیا:۔

۱۔ بنگال سول سروس کا ہنری ایلیس ۔ معاون اوّل

۲۔ بمبئی نیٹو انفنٹری کا لیفٹیننٹ ڈرابرٹ ٹیلر اور میں ۔ معاون دوم وسوم

۳۔ کیپٹن چارلس کرسٹی ۔ حفاظتی دستے کا کمانڈر

۴۔ ولیم ہال ۔ سرجن اور

۵۔ بمبئی میرین (بیڑہ) کا کیپٹن ولیم میکس فیلڈ ——— بحری پیمائش کار

اوائل ۱۸۰۹ میں بمبئی میں شایانِ شان تیاریاں کی گئیں اور میر یا جہاز کو سفیر اور اُس کے عملہ کو کراچی بندرگاہ پہنچانے کے لئے کرایہ پر لیا گیا جہاں اُس کی خدمت کے لئے آنریبل کمپنی کا جہاز پرنس آف ویلز، کیپٹن ایلین اور تین بادبانی جہاز مقرر کئے گئے ۔ سفیر رسمی سلامیوں کے بعد ۲۷ اپریل کی صبح کو میر یا پر سوار ہوا اور یہ سب جہاز اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

۹ مئی کو طلوعِ آفتاب پر رہنما جہاز پرنس آف ویلز نے خشکی کا اشارہ بشارت دیا جو راس مواری سے اندر کی طرف اُٹھتے ہوئے بلند پہاڑ ثابت ہوئے ۔ دس بجے صبح کراچی بندر

---

[1] دیکھئے "تمہید" حصہ اوّل

کا مغربی حصہ تین فرسنگ دُور تھا۔ یہ ایک چٹانی راس ہے جس کے اُوپر ایک قلعہ ہے جو ایک مربع مکان معلوم ہوتا ہے۔ بندرگاہ کے اندر بہت سی اُونچی چٹانیں اس پست زمین پر ایسے نمودار ہوئیں (جو خشکی سے ملاتی ہے) گویا وہ بادبانی جہاز ہوں۔ دوپہر کے وقت ہم لنگر انداز ہوئے اور کیپٹن میکسویل ساحل پر اُترا تاکہ کراچی کے گورنر کو مشن کی آمد کا بتا دے اور جہاز رانوں کا مطالبہ کرے جو جہازوں کو فوراً روک پر پہنچا دیں کیونکہ جنوب مغربی ہوا تیز چل رہی تھی اور پتہ دے رہی تھی کہ جنوب مغربی مونسون کا آغاز تھا۔ گورنر نے جہازوں کو بندرگاہ کے اندر لانے پر کچھ پس و پیش کی لیکن اس کے اعتراضات کو ٹھکرا دیا گیا اور دس تاریخ کو جہاز آگے پہنچ گئے۔ قلعہ سے گورنر نے پر میریا کو دو توپوں کی سلامی دی گئی اور اس نے بھی جواباً اتنی ہی سلامی دی۔ اس کے لنگر انداز ہونے کے کوئی ایک گھنٹہ بعد گورنر متعدد تفنگچیوں کی معیت میں مسٹر سمتھ سے ملنے کے لئے آیا اور کچھ بھیڑیں اور سبزیاں بطور تحفہ لایا۔ وہ نہ فارسی بول سکتا تھا نہ ہندوستانی لیکن اُس نے اپنے ترجمان کے ذریعے جہازوں اور اُس کے مسافروں کے متعلق بہت سے سوالات پوچھے اور آدھ گھنٹہ ٹھہرنے کے بعد وہ بخوشی واپس چلا گیا۔ وہ ایک ٹھنگنا سا پست قد انسان تھا جس نے ویسا ہی لباس پہن رکھا تھا اور نوکروں سے اس کے لباس کا فرق صرف اتنا تھا کہ اس نے ایک بھاری بھرکم پگڑ پہن رکھا تھا۔ آئندہ دو دن مشن کے جہاز سے اُترنے کے سلسلہ میں مذاکرات پر ضائع ہوگئے۔ گورنر اس مدت کو طول دینا چاہتا تھا تاکہ امیروں سے ہدایات لے سکے۔ ۱۲ کو وہ پھر مسٹر سمتھ سے ملنے آیا جس نے اُسے ان فروگذاشتوں پر خوب آڑے ہاتھوں لیا جو گورنر جنرل اور امیروں کے درمیان خط و کتابت میں طرزِ تخاطب اور القابات وغیرہ کے سلسلہ میں ہوئی تھیں۔ اس پر گورنر نے معذرت پیش کی کہ وہ خود فارسی زبان سے نابلد تھا لیکن اگر سفیر کی منشا ہو تو وہ دبیر کو سزائے موت دے سکتا تھا یا اسے بصارت سے محروم کر سکتا تھا۔ لیکن اسے ان متشددانہ اقدامات سے روک دیا گیا اور آئندہ لحاظ مراتب میں احتیاط کا

حکم دینے کے لئے کہہ دیا گیا۔

گورنر اس ملاقات میں بہت گھبرایا ہوا تھا اور جب اس کی کشتی جہاز کے برابر آئی تو وہ کافی ہچکچاتا رہا کہ وہ جہاز پر آئے یا نہیں۔ اس کے خدام اس کی کوئی عزت نہ کرتے تھے اور جب مسٹر سمتھ اور وہ کیبن میں چلے گئے تو ان میں سے ایک فوراً عرشے سے اٹھا اور اس کرسی پر براجمان ہو گیا جس پر نواب (گورنر کا سرکاری خطاب) بیٹھا ہوا تھا اور دوسرا مسٹر سمتھ کی کرسی پر بیٹھنے ہی والا تھا کہ اسے روک دیا گیا۔

۱۳ اور ۱۴ کو مشن کے خیمے اور سرکاری گودام اتار دیئے گئے اور خیمے اس جگہ نصب کر دیئے گئے جو گورنر نے بتائی تھی۔ کچھ شرفا ساحل پر گئے تو انہیں معلوم ہوا کہ ہماری آمد پر بہت ہراس پھیلا ہوا تھا اور حکم جاری کر دیا گیا تھا کہ ہمارا کوئی آدمی قلعہ کراچی میں داخل نہ ہو اور آٹھ میل سے بھی کم فاصلے پر ایک بڑا دستہ فوج ایک ممتاز ترین سردار کے تحت متعین کر دیا گیا تھا تاکہ ہماری نقل و حرکت کی نگرانی کرے!

حقیقت یہ تھی کہ گورنر کا پورا اندازہ دہشت اور منافقت کا مجموعہ تھا اور وہ معمولی سے معمولی معلومات بھی ہمیں حاصل نہ ہونے دینا چاہتا تھا۔ مختصراً اس کا رویہ ایسا تھا گویا ہم اعلانیہ مخالفانہ عزائم سے آئے تھے۔ ۱۶ مئی کو سفیر دونوں جہازوں کی پندرہ توپوں کی سلامی کے بعد نیچے اترا۔ ساحل پر حفاظتی دستے اور مشن کے شرفا نے اس کا پرتپاک استقبال کیا اور مقامی لوگوں کے ایک بڑے مجمع نے تالیاں بجائیں جن میں مشرقی رواج کے مطابق نقدی تقسیم کی گئی تھی۔ بعد از دوپہر نواب نے ایک ایلچی کے ذریعے پیغام بھجوایا کہ وہ تسلیمات بجالانے کے لئے حاضر ہونا چاہتا تھا لیکن چونکہ ہمارے حملہ کے لئے قلعہ میں داخلہ ہنوز بند تھا لہٰذا اسے مطلع کر دیا گیا کہ باریابی نہ ہو سکے گی۔ مسٹر ایلس خود اس انکار کا سبب سمجھانے کے لئے گورنر کے پاس گیا۔ وہ اس سے فصیل کے باہر ایک مکان میں ملا۔ گورنر نے یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ ممانعت سب غیر ملکیوں کے ساتھ روا رکھی جاتی تھی اور افسوس

کا اظہار کیا کہ یہ ہمارے لئے تکلیف دہ تھی اور مزید کہا کہ مسٹر سمتھ اسے ملے یا نہ ملے لیکن وہ روزانہ بلاناغہ اس کے خیمہ میں جائیگا اور یہ کہ وہ اپنے آقا امیروں کے احکامات کا پابند تھا اور جب حیدر آباد سے کوئی مہماندار[1] آئے گا تاکہ ہمیں دربار میں لے جائے تو ہمیں خود بخود اس ممانعت کی سمجھ آجائے گی۔ چند دن بعد امیروں سے ایک خط موصول ہوا جس میں سفیروں کو مطلع کر دیا گیا تھا کہ دوسرا کاری افسر اس کے ساتھ مذاکرات کیلئے مقرر کئے جائیں گے اور جو کچھ وہ کہیں اسے سرا سر حکومت کا عندیہ سمجھنا ہو گا۔ چونکہ اسلوب زبان و بیان سے گستاخی اور فوقیت ٹپکتی تھی جیسے مشن گربہ کشتن روز اول کے مصداق شروع میں ہی دبا دینا چاہتا تھا[2] لہٰذا خط واپس کر دیا گیا اور ساتھ ہی ایک شائستہ مراسلہ روانہ کیا گیا کہ چونکہ یہ خط نہ صرف ان کے خود ساختہ تفوق کے غیر ضروری اظہار کا غماز تھا بلکہ حکومت عالیہ کی سرفرازی کے عدم اعتراف کا بھی مظہر تھا لہٰذا اس کے مندرجات پر کسی قسم کی توجہ دینا ناممکن تھا۔ اب ہر روز مختلف نوعیتوں کی خبریں ہمیں پہنچنے لگیں۔ ایک خبر ملتی کہ مشن سندھی رسالہ کی حفاظت میں دارالحکومت کو جا رہا تھا جہاں اس کا تزک و احتشام سے سواگت کیا جائیگا۔ دوسری خبر ملتی کہ سفیر کو مخصوص افسروں کے ساتھ گفت و شنید کیلئے بلایا جائیگا اور تیسری خبر ملتی کہ ہمیں ایک فوجی دستہ زبردستی جہازوں میں بٹھا کر واپس

---

[1] مہماندار وہ افسر تھا جو سفرا کی نگہداشت کرتا تھا اور انہیں ملکی مصنوعات مہیا کرتا تھا۔ وہ عموماً اختیارات کا ناجائز استعمال کرتا تھا اور انہیں جبر و استحصال کا ذریعہ بنا لیتا تھا۔

[2] حکومت بمبئی نے پچھلے سال ایک سفیر سندھ بھیجا تھا اور اس کے ساتھ شایان شان سلوک نہ کیا گیا لہٰذا اگورنر جنرل کے سفیر کو واضح تریں ہدایات تھیں کہ وہ اس کا اعادہ نہ ہونے دے۔ اور سندھی حکومت کی فرد گذاشت کو فوراً درست کروائے اور اس کے احساس برتری کو توڑے!

ہندوستان جانے پر مجبور کر دے گا جو کراچی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ان تمام افواہوں میں ایک مشترک بھی اور وہ یہ کہ امیر اُن کے علاقوں پر ہمارے عزائم سے سخت خوفزدہ تھے اور کراچی کے دفاع اور اس کے دستہ کیلئے ساعت بہ ساعت آنیوالی کمک ان کے اس خوف وہراس کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

امیروں کے نام اس مراسلہ کے چند دن بعد سفیر کو اخوند محمد بقاخان کی طرف سے ایک دوستانہ خط موصول ہوا جو چند ماہ پہلے سندھی حکومت کے نمائندہ کی حیثیت سے بمبئی گیا تھا۔ اُس نے جلد از جلد پہنچنے اور ملنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اسی قاصد نے اس خبر کی بھی تصدیق کر دی کہ ٹھٹھہ کے قریب تین ہزار فوج جمع کر لی گئی تھی اور وہ غالباً ہماری طرف بڑھنے والی تھی تاکہ ہم اخوند کی شرائط ماننے پر مجبور کئے جاسکیں۔

اخوند ۲۳ رمئی کو کراچی پہنچا اور اگلی صبح برطانوی کیمپ میں آیا اور سفیر سے بہت طویل ملاقات کی۔ اُس نے کراچی بندر میں دو مسلح جہازوں کی موجودگی پر امیروں کے خدشات پر سیر حاصل تبصرہ کیا اور پھر کہا کہ مشن کے حیدر آباد جانے کی ناگزیر شرط یہ تھی کہ یہ دونو جہاز بمبئی واپس چلے جائیں یا کم از کم سندھ کی سمندری حدود سے نکل جائیں۔

دیگر سیاسی نوعیت کے معاملات بھی زیر بحث آئے اور آخر میں سفیر نے یہ مثبت اعلان کیا کہ وہ دار الحکومت جانے کی بجائے جہاز میں واپس جانے کو ترجیح دیگا اور گو موسم سخت خراب ہو چکا تھا (جنوب مغربی مونسون زور شور سے چل رہی تھی اور ایک غضبناک طوفان برپا تھا) پھر بھی وہ خطرہ مول لیکر کلکتہ جاکر سارے حالات گورنر جنرل کے حضور پیش کر دیگا۔ البتہ اخوند کو جو اختیار سفیر سے مذاکرات کے متعلق دیا گیا تھا قابل قبول نہ تھا کیونکہ سفیر مذاکرات صرف امیروں کے ساتھ کر سکتا تھا جن کے پاس اسے بھیجا گیا تھا۔ ۲۶ مئی کو گورنر نے سفیر کے پاس زبانی پیغام بھیجا کہ وہ جہازوں کو فوراً بندر سے نکلنے کا حکم دے گا لیکن گورنر اور اخوند دونو نہایت شاطرانہ طور پر اسے تحریر میں لانے سے گریز کر رہے تھے!

آخر کار گورنر نے اتفاق کر لیا کہ وہ اس سلسلہ میں امیروں کی سرکاری ہدایات مشن کے کسی معتبر کو دکھا دیگا لیکن جب مسٹر ایلس اور کیپٹن کرسٹی ملاقات گاہ میں گئے تو اُس نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ اس کے آقاؤں نے اسے ایسا کرنے کا اختیار نہ دیا تھا۔ ان پریشان کن حالات میں مسٹر سمتھ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نواب یا اخوند سے مزید رابطہ نہ رکھے گا بلکہ امیروں کو براہِ راست خط لکھے گا اور پھر اس کے جواب کے مطابق اپنا آئندہ لائحہ عمل تیار کریگا۔ ساتھ ہی ساتھ اُس نے ان دونو افسروں کو بھی یہ بتا دیا اور درخواست کی کہ اخوند برطانوی کیمپ میں ٹھہرے تاکہ مجوزہ خط سُن سکے پیشتر اس کے کہ یہ حیدرآباد بھیجا جائے۔ چنانچہ وہ آیا اور تحریرِ خط کے دوران ایک طویل گفتگو چھڑ گئی جس میں اُس نے سفیر کو قائل کرنے کی پوری کوشش کی کہ مشن کے ساتھ نہایت دوستانہ سلوک کیا گیا تھا جس کا ثبوت یہ تھا کہ اُنہیں یہاں اُترنے اور برطانوی جھنڈا لگانے دیا گیا ورنہ "اگر تم بلا اجازت بندرگاہ میں داخل ہو گئے ہوتے تو قلعہ کی توپیں تمہارے جہازوں کو غرق کر دیتیں۔" اس لن ترانی کا جواب یہ دیا گیا کہ اگر نوبت یہاں تک آتی تو دیکھ لیا جاتا کہ انگریزی توپیں بہترین ثابت ہوتیں یا سندھی توپیں اور اس کا نتیجہ تو بالکل اظہر من الشمس تھا۔

اس کے بعد اخوند نے امیروں کی خط و کتابت میں قابلِ شکایت حصّہ کا جواز یہ کہہ کر پیش کیا کہ فارسی زبان کا روزمرّہ سندھی میں مروّج ہی ایسے تھا اور بار بار قسمیں کھا کر کہا کہ "ملازمت" کا مطلب ایک دوستانہ ملاقات تھا۔ سفیر کے خطوط میں لفظ "مودّت" انتہائے بے ادبی تھی اور لفظ "حضور" بیس سال سے امیروں کا خطاب تھا اور صرف اسی وقت بدلا جا سکتا تھا جب ہر سندھی کو ختم کر دیا جائے۔ مسٹر سمتھ نے اسے یاد دلایا کہ اُس سے سندھ کے مخصوص محاورے کی واقفیت کی توقع رکھنا عبث تھا اور بفرضِ محال اگر وہ واقف بھی ہو تو وہ اُسے اختیار نہ کر سکتا تھا اور یہ کہ اُس نے پہلے دونو اور دیگر الفاظ ان کے مسلّمہ معانی میں استعمال کئے تھے اور "حضور" صرف آزاد حکمران کو زیب

دیا تھا نہ کہ سندھ جیسی باجگزار حکومت کو۔ اس پر اخوند نے دخل دیا کہ خراج تو پچھلے چند سالوں سے برائے نام ساہی تھا اور اُسے سابقہ خطوط کے جوابات نہ ملنے کی وجہ اسی قسم کی عبارات تھیں۔ اس کے بعد امیروں کو لکھا جانے والا خط باآواز بلند ایک منشی نے پڑھ کر سنایا اور اخوند نے پھر مختلف الفاظ مستعملہ پر ویسے ہی مضحکہ خیز اعتراضات کیے اور رخصت لیکر چلا گیا۔

وہ تمام سندھی (جو ہماری ملازمت میں آگئے تھے) آج صبح قلعہ کراچی سے بمعہ اہل وعیال نکال دیئے گئے۔ ان میں سے ایک سفیر کے لئے کچھ اشیائے خورد نوش لا رہا تھا۔ اُسے پکڑ لیا گیا اور سندھی کیمپ کے وسط میں ایک چوبی کھمبے سے باندھ دیا گیا۔ سندھی کیمپ اب ہمارے خیموں کو قریباً گھیر چکا تھا لیکن چونکہ ہمارے خیموں کے گرد قناتیں لگی ہوئی تھیں لہذا ہمیں تکلیف نہ ہوتی تھی۔ فوراً ایک تنبیہہ نواب کو بھیجی گئی جس پہ اُس نے اس آدمی کی رہائی کا حکم دیدیا اور اس فعل پر اپنے عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ لیکن چند ہی گھنٹے بعد اُس کے آدمیوں نے اور بھی زیادہ گستاخی کا کام کیا۔ انہوں نے ان دیسی ملاحوں کو پیٹا جو ہمارے دونو جہازوں کے عملہ کے لئے پانی بھر رہے تھے اور سارا پانی بھی گرا دیا۔ ایک اور تہدیدی پیغام بھیجا گیا لیکن اُس نے جو جواب بھیجا اس نے جلتی پہ تیل کا کام کیا اور تصدیق ہوگئی کہ سب کچھ نواب کی ہدایت پر کیا گیا گو اُس نے توجیہہ یہ کی کہ ملاحوں کو صرف پانی ضائع کرنے سے روکا گیا تھا اور آئندہ وعدہ کیا کہ ایسا واقعہ نہ ہوگا۔ شام کو اخوند ہمارے خیمہ میں آیا۔ اُس کے ساتھ موسیٰ خان نامی ایک شخص بھی تھا۔ اُس نے سفیر سے کہا کہ وہ یہ کہنے کے لئے آیا تھا کہ امیروں کی خواہش تھی کہ جہاز بندرگاہ خالی کر دیں اور اس کے بعد مشن بڑے شوق سے حیدرآباد آجائے۔ سفیر نے اخوند کو یاد دلایا کہ اُس نے اس موضوع پر اپنے جذبات کا اظہار کر دیا تھا اور مزید گفت گو بیہودہ تھی۔ اس ملاقات میں موسیٰ خان بالکل بوجھ بھکڑ معلوم ہوا اور اپنے خیالات کے لئے اخوند کی داد کا بار بار طالب رہا۔ وہ ایک سادہ سفید قمیص نیلی

ریشمی شلوار اور روئی دار ٹوپی میں ملبوس تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دُوسرے سے وہ سارا وقت اپنی داڑھی کھجاتا رہا اور مونچھوں کو تاؤ دیتا رہا۔ اُن کے ساتھ جو لوگ آئے تھے وہ بے حجابانہ خیمے میں گھس آئے اور کاؤچوں پر بیٹھنے والے تھے کہ اُنہیں حکماً دریوں پر بٹھا دیا گیا۔

ہم جب سے یہاں پہنچے تھے اُس وقت سے اس بُری طرح زیرِ نگرانی تھے کہ اپنے پڑاؤ کی حدود سے باہر نکلنا ناخوشگوار ہو گیا تھا اور اب تو نواب کی روز افزوں بدتمیزی اور اخوند بقا خان کی قدرتی یا مصنوعی ضعیف العقلی کی وجہ سے حالات اتنے نامساعد ہوتے جا رہے تھے کہ سرکاری املاک کا قیمتی حصّہ دوبارہ جہازوں میں رکھ دینا ہی مناسب سمجھا گیا چنانچہ گورنر سے کشتیوں کی درخواست کی گئی لیکن کشتیاں تو رہیں ایک طرف اُس نے تو اس پختہ عزم کا اظہار کیا کہ وہ ایک چیز بھی جہاز پر نہ جانے دیگا اور مزید اعلان کر کے اس کے امکان کا بھی خاتمہ کر دیا کہ جو کشتی بان ہمارے کام آئیں گے۔ امیر اُن سے خفا ہو جائیں گے؛ یُوں ہم عملاً آزاد قیدی بن گئے کیونکہ جہازوں سے ہمارا رابطہ کشتیوں کے ذریعہ سے ہی تھا اور ہر دفعہ کوئی کشتی گھاٹ پر آتی تو تین چار مسلح آدمی اس کے گرد آ جاتے تاکہ کوئی چیز جہازوں تک نہ پہنچائی جا سکے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر رات ہمارے پڑاؤ کے ہر کونے پر ایک محافظ متعین کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ ہماری نقل و حرکت دیکھتا رہے۔ یہ ایک کھلی توہین تھی۔ لہٰذا ایک چوبدار کو پیغام دے کر بھیجا گیا کہ اسے فوراً بند کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کا خاطر خواہ اثر ہُوا۔ ہندو اور قصبے کے دیگر لوگ جو کبھی کبھار ہمارے پڑاؤ میں آ جایا کرتے تھے اب آنا بند ہو گئے اور ہماری ملازمت میں آنیوالے سندھیوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا تاکہ وہ ملازمت ترک کر دیں لیکن چونکہ سفیر نے انہیں یقین دلایا کہ وہ امیروں سے ملاقات کے دوران ان بلاجواز دھمکیوں کا مسئلہ بھی اٹھائیگا لہٰذا وہ اپنے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔

سفیر کے مراسلہ کے کوئی ایک ہفتہ بعد امیروں کا جواب موصول ہُوا جس میں اُنہوں نے

سابقہ سال کے حکومت بمبئی کے فرستادہ مشن اور موجودہ مشن کے سلسلہ میں اپنے رویہ کا طویل جائزہ لیا اور مسٹر سمتھ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ اُس کے مشن کے ساتھ خصوصی احترام والتفات سے کام لیا جا رہا تھا۔ خط کا انداز بڑے درجے کا تحکمانہ تھا اور اس میں ایک بات تو ایسی تھی جو انہیں ہرگز ایک ایسے شخص کو نہیں لکھنی چاہیئے تھی جس نے پروانۂ حضور (شاہی فرمان) واپس کر دیا تھا۔ انہوں نے جہازوں کی واپسی کا حکم یہ سوال لکھ کر منسوخ کر دیا کہ اگر برطانیہ کے بیس جنگی جہاز کراچی بندر میں آ جائیں تو بھی ان کے لئے اس کی کیا اہمیت تھی؟

سیاسی مصلحتوں کی بنا پر سفیر نے اس خط کے غیر معمولی انداز پر چشم پوشی ہی بہتر سمجھی یا کم از کم اسے ثانوی حیثیت دی اور اسے فوراً واپس کر دیا اور چونکہ ایران سندھ نے جہازوں کے سلسلہ میں اپنی شرط کو واپس لے لیا تھا لہذا اُس نے اسے برطانوی حکومت کے وقار کے خلاف نہ سمجھا اور چند دنوں میں حیدرآباد روانگی کے لئے اپنے عزم کا اعلان کر دیا۔ اب ہم گھوڑے حاصل کرنے کے لئے بیقرار تھے لیکن جونہی ہماری ضرورت کا شہرہ ہوا ان کی قیمتیں چڑھ گئیں حتیٰ کہ ایک درمیانے درجے کا خچر جو ایک ہفتہ پہلے اسی یا نوے روپے پر مل جاتا تھا اب بمشکل ہی دوگنا قیمت پر ملتا تھا۔ ان کی خرید کے سلسلہ میں ایسے واقعات ہوئے جو سندھی فوج کے سرداروں کے عمومی کردار کو واضح کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک بہادر خان نامی نے فروخت کے لئے تین گھوڑے بھیجے اور ساتھ ہی ایک تحریری یادداشت بھیجی کہ وہ صرف سفیر کی خوشنودی کے لئے ایسا کر رہا تھا ورنہ وہ گھوڑے بیچنے کے لئے تیار نہ تھا۔ ان کی قیمت کھینچ تان کر کے ایک ہزار روپے لگائی گئی جو مالک کے غیر عامی مرتبہ کے پیش نظر ایک چوبدار کے ذریعے بمعہ پیغام تشکر و امتنان روانہ کر دی گئی۔ کوئی دو گھنٹے بعد چوبدار پانچ روپے واپس لایا کہ خان انہیں بدلوانا چاہتا تھا کیونکہ یہ قیمت میں چار پانچ پیسے کم تھے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ساری رقم بارہ سے بھی زیادہ دفعہ گنی گئی اور ہر روپے کو بغور دیکھا گیا۔ چنانچہ فوراً سونے کی ایک مُہر (اشرفی = پندرہ روپے) روانہ کر دی گئی تاکہ سردار کمی کو وصول کرے لیکن ہمیں

تعجب ہُوا کہ اُس نے وہ پوری رکھ لی اور جواباً کہلا بھیجا کہ وہ پوری ادائیگی مہُروں میں ہی چاہتا تھا اور یہ کہ اُس نے مہُر اِس لئے رکھ لی تھی کہ مزید ناقص رُوپوں کی کمی پوُری ہو سکے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ آدمی واقعی بڑے درجہ کا تھا اور امیروں کا چاہیتا تھا۔ وہ اس دھوکے کے کچھ عرصہ بعد سفیر کو پڑاؤ پر ملنے بھی آیا اور وہ اپنے اس پست رویّہ پر معمولی سا بھی شرمندہ نہ تھا!

موسم چند دنوں سے معتدل تھا اور پرنس آف ویلز کا کمانڈر سوچتا تھا کہ جہاز سفر کر سکتے تھے لہٰذا انہیں بمبئی جانے کا حکم دیدیا گیا کیونکہ کراچی میں ان کا طویل قیام بلاضرورت تھا۔ چنانچہ انہوں نے ۷ رجون کو روک پار کرنے کی کوشش کی لیکن میریا کے گمراہ ہونے کا خطرہ پیدا ہوگیا اور کیپٹن ایلن نے رائے دی کہ جہاز اُس وقت تک ہندوستان کا سفر نہ کر سکتے تھے جبتک مونسون ختم نہ ہو جائے اور شمالی ہوا نہ چلنے لگے جو فوری طور پر قرین قیاس نہ تھا!

باب دوازدہم

کراچی کا قصبہ — اس کا محل وقوع — بندرگاہ — روک — حفاظت کیسے کی جاتی ہے — تجویز — کراچی کی قلعہ بندیاں — بالکل بے قاعدہ — مکانات کی تعداد اور آبادی — چونگی — وصولی کا طریقہ — اس کی تدریجی ترقی کی وجہ — سندھ کی درآمد برآمد — کراچی کے قرب وجوار کی سطح — شکار کی فراوانی — مشن کراچی سے روانہ ہوتا ہے — ٹھٹھہ پہنچتا ہے — درمیانی علاقہ — کنوئیں — کس نے کھودے — گارہ اور گجہ گاؤں — دریائی گذرگاہیں — ان کے نام — برسات میں قابل جہاز رانی — بھمبور کے آثار قدیمہ — ان کے متعلق غلط قیاسات — ٹھٹھہ کے مقابر — ان کا بیان — تاریخ — قابل ذکر کنواں — ٹھٹھہ کا پہلا منظر — مؤثر — مغالطہ دہ — اونچا پتھر بند رستہ — اس شہر میں مشن کا داخلہ — امیروں کا خط — جمیعٹی یا سرکاری کشتی — ٹھٹھہ میں قیام — سندھی افسر — ولی محمد خان کے کارنامے — اس پر بحث مباحثہ — نتیجہ — ولی محمد خان کی سفیر سے ملاقات — سفیر کی جوابی ملاقات — اس معزز کی عظمت — شکل وشباہت — لباس — اطوار — قبیلہ — وسیع المشربی — ٹھٹھہ کسی وقت سندھ کا دار الحکومت — اس کی موجودہ ویرانی — وجہ — موجودہ وسعت

——اس کے اوّلین تذکرے — یونانیوں کا پٹالہ — غیر یقینی — اس کے حکمرانوں کی پالیسی — اس کا زوال — محدود — مصنوعات — دکانیں — بازار — طرزِ تعمیر — بادگیر — حکومت — چونگی کی وصولی کا طریقہ — عرض بلد اور طول بلد — قرب وجوار کی سطح — جولائی ۱۸۰۹ میں موسم کی کیفیت — مشن ٹھٹھہ سے حیدر آباد روانہ ہوتا ہے۔

کراچی کا قلعہ بند قصبہ ۵۲.۲۴° عرض بلد شمالی اور ۶۷.۱۰° طول بلد مشرقی میں واقع ہے اور صوبہ سندھ کے جنوب مشرقی سرے پر ہے اور اب چند سالوں سے اس کی اہم ترین بندرگاہ بن گیا ہے۔ اس کی بندرگاہ' جسے گاہے ماہے خور علی کہہ کر ممیز کیا جاتا ہے (= بندرگاہ علی۔ دیکھئے باب دوازدہم حصّہ دوم) بہت محدود ہے اور اس کے دہانے پر روک ہونے کی وجہ سے ان جہازوں کے لئے اس میں داخل ہونا دور اندیشی نہیں جو سولہ فٹ سے زیادہ پانی میں چلتے ہوں گو وہ ایک دفعہ اس روک کو پار کر جائیں تو انہیں دوسری طرف گہرا اور ہموار پانی مل جاتا ہے۔

۱۷۹۷ کا بنا ہوا ایک قلعہ خلیج کی مغربی طرف کے خشکی کے حصّہ پر ایستادہ ہے اور اس میں داخلہ کو روکنے کے لئے نہایت مناسب ہے اور اگر اس پر اچھی توپیں نصب ہوں اور انہیں صحیح طور پر چلایا جائے تو میرے خیال میں کوئی جہاز بلا خوف وخطر اس میں نہیں آ سکتا، یا کم از کم مؤثر طور پر نہیں آ سکتا کیونکہ اس کی توپوں کے دہانے بہت اوپر اٹھانے پڑیں گے تاکہ ان کے گولے پہاڑی سے نہ ٹکرائیں اور یوں دس میں سے نو اوپر سے گذر جائیں گے اور دوسری طرف سمندر میں جا گریں گے۔ اس سے وہ بھی قلعہ کی گولہ باری سے تو محفوظ رہ سکتا ہے لیکن چونکہ وہ پہاڑی کے بالکل نیچے ہوگا لہٰذا اس کے عرشوں کو تفنگچیوں سے خالی کرنا ہوگا جو چٹان کی آڑ دوں سے محفوظ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ایسی صورتِ حال میں واحد طریقہ یہ ہوگا کہ فوج کو

کچھ فاصلے پر اتار دیا جائے اور پھر اسے سیڑھی لگا کر قبضے میں لیا جائے۔ قصبے کی قلعہ بندیاں
بہت کمزور اور بے قاعدہ ہیں اور کہیں کہیں پانچ چھ فٹ سے زیادہ بلند نہیں اور یہ اتنی
خستہ وشکستہ ہیں کہ ایک گھوڑ سوار نہایت آسانی سے ان کے اوپر چڑھ سکتا ہے البتہ
بعض جگہوں پر وہ خوب بلند اور اچھی حالت میں ہیں۔ سب کہگل کی بنی ہوئی ہیں جو مٹی، بھوسہ اور
قریبی دلدلوں میں اُگنے والے لمبے بلدار گھاس بھوس کا امتزاج ہوتی ہے۔ البتہ دہانۂ
بندر سے بہنے والی کھاڑی کی طرف انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر قلعہ بندی کو پتھر اور گارے
سے کافی اونچا بنا دیا ہے۔ امیران سندھ کے حکم پر ۱۸۱۳ میں اندرون فصیل مکانات کی تعداد
تین ہزار دو سو پچاس تھی۔ ان کے علاوہ قلعہ کے آس پاس کچھ بکھری ہوئی جھونپڑیاں تھیں جو
اس خانہ شماری میں شامل نہیں تھیں۔ اُس وقت عارضی قیام کنندگان کے سوا آبادی تیرہ
ہزار نفوس تک بڑھ گئی تھی جو ۱۸۰۹ میں قیام مشن کے وقت سے ڈیڑھ گنا سے بھی زیادہ تھی۔
باشندوں کی اکثریت ہندو ہے جو بہت وسیع پیمانے پر تجارت کرتے ہیں باوجود اس کے کہ
ان پر بہت بھاری محصولات اور چونگی عاید ہیں جو ان کا اپنا ہی ایک قبیلہ نافذ کرتا ہے جس
کے سپرد کراچی کے محاصل ہیں۔ یہ ایک تخریبی پالیسی ہے جو ملک بھر میں رائج ہے۔ ۱۸۰۹ میں
کراچی سے سرکاری خزانے کو جو آمدنی ہوئی وہ ننانوے ہزار روپے (۱۲،۳۷۵ پاؤنڈ) سالانہ
تھی اور اجارہ دار کے کوئی بارہ ہزار اس کے علاوہ تھے جو وہ اپنی کارگذاری کے لیے لیتا
ہے۔ اوّل الذکر ابتک ایک لاکھ تئیس ہزار ہو چکی ہے اور موجودہ اجارہ دار کوئی بیس ہزار
کما لیتا ہے۔ یہ اس جگہ کی تدریجی ترقی کا بیّن ثبوت ہے جو اسے اس کے سازگار
محل وقوع کی وجہ سے حاصل ہو رہی ہے کیونکہ یہ ہندوستان اور مملکتِ کابل، ایرانی
خراسان، بلخ، بخارا وغیرہ کے قریباً وسط میں ہے۔ محمود خان قلات کے غیر مستحکم اور کاہش
پذیر اقتدار نے بھی اس کے دشمن سندھیوں کی آمدنی بڑھانے میں حصہ لیا ہے کیونکہ شمالی
سوداگروں نے اُس کے علاقوں میں عدم تحفظ کی وجہ سے، جائز محصولات کے باوجود سندھ کا

راستہ اختیار کر لیا ہے۔

سندھ کی برآمدات کراچی سے ہی باہر جاتی ہیں اور یہی انہیں شمار کرنے کا مناسب موقع ہے۔ ملکی پیداوار کی برآمدات شورہ، نمک، چاول، کپاس، گھی، تیل، تیل کے بیج، مچھلی کے پر، رنگنے کا چھلکا، القلی، سادہ سفید سوتی کپڑا (کیلی کو = کالی کٹ کا) اور مندوں پر مشتمل ہیں اور شمالی صوبوں اور سلطنتوں کی برآمدات رال، زعفران، گھوڑے، چمڑا، کھالیں، مجیٹھ، مشک نافہ، پھٹکڑی، مختلف قسم کی ادویات، کشمیری شالوں، خشک میوہ، جواہرات، لاجورد، اور فیروزہ اور دیگر قیمتی ہیروں اور گوند وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ہندوستان سے درآمدات لوہا، ٹین، فولاد، سیسہ، تانبا، ہاتھی دانت، چائے، چینی، ہر قسم کے مصالحہ جات، چھینٹ، بانات، شیشہ، چینی کے برتن، ناریل، نیل، چھالیہ، ململ، زری کا کپڑا، ڈھالیں وغیرہ وغیرہ ہیں جو زیادہ تر مذکورہ برآمدات کے بدلے آتی ہیں۔ خراسان، مکران، ایران اور عرب سے سندھی تلواریں، ریشم، دریاں، کھجوریں، عرق گلاب، مربہ جات، تمباکو، قہوہ اور قلیان لیتے ہیں۔

کراچی کے قریب دیوار کی سطح ہموار ہے (قلعہ کے شمالی، مشرقی اور جنوبی پہلوؤں پر) اور شمال اور مشرق میں آٹھ دس میل اور جنوب میں سمندر تک پھیلی ہوئی ہے چونکہ سندھ میں مشن کی آمد سے پہلے تین موسموں سے خشک سالی رہی تھی لہٰذا زمین جلی ہوئی تھی اور اس پر روئیدگی کا نشان تک نہ تھا سوائے اس کے کہ چھوٹی چھوٹی مرجھائی ہوئی جھاڑیاں میدان کے سینے سے لپٹی ہوئی سسک رہی تھیں لیکن میں نے ایک دو کنوئیں دیکھے جن کے گرد ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ تھے اور باشندوں نے ہمیں یقین دلایا کہ موسلا دھار بارش کے اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر پوری زمین گھاس کی زربفتی چادر اوڑھ لے گی۔ یہ میدان سواری کے لئے بہترین ہے اس لئے کہ اس کی زمین میں نہ پتھر ہیں نہ دراڑیں۔ اسی لئے ہم اپنے شکاری کتے لیکر اکثر باہر نکل جاتے تھے لیکن ہمیں صرف ایک دفعہ ایک گیدڑ نظر آیا جس کے پیچھے ہم نے گھوڑے ڈالے لیکن وہ بھی

ایک کنوئیں میں کود کر ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ آگے اندر کی طرف گیدڑ، لومڑ، جنگلی سور، ہرن اور دیگر جانور بہت تھے لیکن ہم آگے نہ جا سکے۔

مشن نے ۱۰ جون کو کراچی چھوڑا اور پانچ منزلوں کے بعد شہر ٹھٹھہ پہنچا جو کسی وقت سندھ کا دارالسلطنت تھا لیکن اب رُو بہ انحطاط تھا۔ کراچی اور ٹھٹھہ کا درمیانی علاقہ صحرا تھا، عُریاں اور ریتیلا، بے آب و گیاہ اور نظر سوز جہاں ببول، لائی اور دھودل کے سوا (اور وہ بھی کہیں کہیں) کچھ نہ تھا۔ پہلی دو منزلوں پر ٹانڈے یا سرائیں ہیں جو اپنے بانیوں کے نام سے مشہور ہیں اور اپنے ہم وطنوں کے لئے مقام شکر ہیں بالخصوص اس لئے کہ یہاں بہت گہرے کنوئیں کھدے ہوئے ہیں جہاں بے پناہ گرمی میں پیاسا مسافر ٹھنڈا لذیذ پانی حاصل کر سکتا ہے۔ ہمارا اگلا پڑاؤ گارہ اور گجہ کے گاؤں تھے۔ گجہ ایک چھوٹی سی ندی کے پاس ہے جو دریائے سندھ سے منسلک ہے۔ اس راستے میں ہم نے بہت سے دریائی پاٹ عبور کئے جیسے بگھان، گنگارا، کرگی، پیپل اور کراکی جو پچاس سے پانچ سوگز تک چوڑے تھے اور بالکل خشک تھے گو موسم برسات میں وہ قابل کشتی رانی بتائے گئے۔ گھارا گاؤں کے چار میل کے اندر بھمبور شہر کے کھنڈرات ہیں جو کسی وقت ایک بڑا شہر تھا۔ یہ ایک بہت بڑے پیالہ نما نشیب میں عرض بلد ۴۴-۴۶ ۲۴ اور طول بلد ۵۰-۶۷ مشرقی میں واقع ہے۔ اس کی اطراف سبزے کی وجہ سے نظر افروز اور بڑے بڑے پھیلے ہوئے درختوں سے آراستہ ہیں۔ اس ڈھیری کے شمالی دامن میں سب سے سرداروں کے مقابر ہیں جو یہاں سندھ کی حکومت پر قبضہ کرنے کے لئے ایک لڑائی میں مارے گئے تھے۔ بھمبور کو اب تک قدیم شہر برہمن آباد سمجھا جاتا رہا ہے لیکن تواریخ میں اس شہر کے محل وقوع کے متعلق جو کچھ میں نے پڑھا ہے اس کے مطابق یہ قیاس غلط معلوم ہوتا ہے۔

ٹھٹھہ سے تین میل کے فاصلے پر کراچی کی طرف ایک پہاڑی ہے جسے مکلی کہتے ہیں یہ مقبروں سے پٹی پڑی ہے اور اس پُر بہار شہر کی واحد یادگار ہے۔ میں ان میں سے ایک کا بیان کروں گا جو دستبرد زمانہ سے نسبتاً محفوظ رہا ہے۔ یہ ایک فصیل بند رقبے میں بنا ہوا ہے

جس کے پتھر بہت نفاست سے کندہ کیے گئے تھے۔ عمارت بجائے خود پچاسی فٹ مربع
تھی اور اس کے پاس ایک پچھتر فٹ اونچا قبہ تھا جسے دو بالکونیوں یا برآمدوں نے چھپا رکھا تھا
جن کے اگلے حصوں کو ستون سہارا دیتے تھے۔ ساری عمارت اور بیرونی دیوار زرد پتھر کے
بنے ہوئے تھے اور اندر گنبد کے وسط کے عین نیچے سیاہ پتھر کی ایک ڈھیری تھی جس پر
مدفون لوگوں کے نام درج تھے۔ آخری ترین نام جو ہم پڑھ سکے کوئی ڈیڑھ صدی پہلے کندہ
کیا گیا تھا۔ ایک امیر نے کچھ آدمی بھیجے تھے جو سنگین دروازہ داخلہ کو گنبد کے اندر لے گئے
جس پر عمارت کا دور تعمیر درج تھا۔[۱] کئی مقبرے اسی پتھر کے بنے ہوئے تھے اور بعض دوسرے
خوبصورت سبز ارغوانی اور نیلے رنگوں کی منقش ٹائیلوں سے آراستہ تھے لیکن ان مقابر پر
خوبصورت ترین چیز جو ہمارے مشاہدے میں آئی وہ پتھر کے دروازوں پر کندہ قرآنی آیات
تھیں۔ اس پہاڑی کے جنوبی طرف کی ایک ٹھوس چٹان میں ایک کنواں کھودا گیا ہے
جس کے اردگرد ایک طاق ہے جو سطح سے کوئی چودہ فٹ نیچے ہے اور آپ سیڑھیوں سے
اس میں اتر سکتے ہیں۔ اس کنوئیں کا پانی مخصوص دوا کا ذائقہ رکھتا ہے اور عام طور پر
استعمال کے ناقابل ہے۔

اس پہاڑی کی چوٹی سے (جس میں یہ کھدائی کی گئی ہے) ٹھٹھہ بہت بڑا شہر معلوم
ہوتا ہے۔ مکانات مٹی رنگے معلوم ہوتے ہیں اور گری ہوئی دیواروں اور مسجدوں کے ڈھیر
اتنی دور سے رہائش گاہوں کے حصے معلوم ہوتے ہیں لیکن جب آپ شہر میں پہنچ جائیں
تو فریب نظر ختم ہو جاتا ہے اور دائیں بائیں بے آباد اور تباہ شدہ مکانات کی لمبی گلیوں کے
سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ سڑک کے آخری دو میل سات آٹھ فٹ اونچے سنگ بست راستے
کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں جو پرانے زمانے میں شہر اور پہاڑی کے درمیان اُس وقت رابطے کا

۱؎ اسے میرزا عیسیٰ ترخان نے بنوایا تھا۔ دیکھئے باب دوازدہم

کام دیتا تھا جب دریائے سندھ کی سالانہ طغیانی شہر ٹھٹھہ کو گھیر لیتی تھی۔ چند سالوں سے ایسا نہیں ہوا جس کے وجوہات میں بیان کرنے کی کوشش کروں گا جب میں اس دریا کا ذکر کروں گا۔ کنارے کا پشتہ بھی شہر کی طرح ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔

۱۶ر جون کو صبح سات بجے ان مضافات میں داخل ہوئے جہاں لوگوں کا ایک بہت بڑا مجمع ہمارے پیچھے پیچھے چلا' اونچے اونچے مشن کی کامیابی کی دعائیں مانگتا ہوا اور خوب زور شور سے تالیاں پیٹتا ہوا۔ ہمیں کھنڈرات سے گذرتے ہوئے کافی وقت لگا۔ شہر کے آباد حصے میں بھی کافی فاصلہ کے بعد ہم آنز ہیل کمپنی کی فیکٹری (یہاں کئی سالوں سے ایک ریذیڈنسی تھی) میں پہنچے اور اتر کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

ابھی ہم سڑک پر ہی تھے کہ امیروں کا دوسرا خط سفیر کو موصول ہوا کہ ایک جمیٹی (سرکاری کشتی) اسے اور اس کے عملہ کو حیدر آباد لے جانے کے لئے بھیجی جا رہی تھی اور وہ چند دنوں میں ٹھٹھہ آجائے گی۔ یہ پہلے ہی فیصلہ ہو چکا تھا کہ کسی عذر معقول پر عملے کے معززین یہاں علیحدہ ہو جائیں اور دو مختلف راستوں سے دربار میں پہنچیں تاکہ ایسی تنگ ظرف حکومت کے تحت اس کے علاقے کا زیادہ سے زیادہ جغرافیائی علم حاصل کیا جا سکے لہٰذا یہ شائستہ فعل کچھ ناخوشگوار ہی معلوم ہوا لیکن یہ اس کے برعکس ثابت ہوا اور ہمارا منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا کیونکہ کشتی اتنی مختصر تھی کہ آدھا عملہ بھی اس میں نہ سما سکا۔ مسٹر ایلیس کیپٹن میکس فیلڈ اور میں بمشکل اس میں جگہ پا سکے اور سفیر اور باقی افسر بری راستے سے روانہ ہوئے۔

ٹھٹھہ میں دوران قیام ہمیں اتنی فرصت ملی کہ اس کا کونہ کونہ چھان مارا اور نواحیات میں ہمارے شکاری خرگوش اور تیتر کے فراواں شکار سے دل بہلاتے رہے۔ ہمارا وقت محض انہی تفریحات میں ہی نہیں گذرا بلکہ بعض سندھی افسروں کا رویہ بھی ہمارے سفیر کو دندان شکن جواب پر مجبور کرتا رہا اور ایک دفعہ تو کلکتہ واپس چلے جانے کا فیصلہ بھی ہوتے ہوتے

رہ گیا۔ ٹھٹھہ میں قیام پذیر ہونے کے تھوڑا ہی عرصہ بعد ایک معزز انسان ولی محمد خان کسی سرکاری کام پر شہر میں آیا تو اگلے ہی دن ایک دستہ فوج کے ذریعے ان تمام سندھیوں کو گرفتار کروالیا جو ہماری ملازمت میں آچکے تھے۔

مسٹر ایلیس فوراً سفیر کے حکم پر اس سے ملنے گیا اور اس غیر دوستانہ اور بلاجواز کاروائی پہ اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ بس پھر کیا تھا خوب گرما گرم گفتگو ہوئی اور خان نے مسٹر ایلیس سے پوچھا کہ ہم انگریز لوگ کون تھے اور کیا ہم اپنے آپ کو ملک کا آقا سمجھتے تھے؟

اُس نے مزید کہا کہ وہ سندھی رعایا کے ساتھ جو سلوک چاہے کرے گا، اُنہیں کوڑے لگوائے گا۔ اُن کے کان کٹوائے گا اور اُنہیں مار دے گا بلکہ اگر ضروری سمجھا تو ٹھٹھہ کو نذر آتش کر دے گا۔

مسٹر ایلیس نے خان کو بتایا کہ یہ سب زور خطابت بے سُود تھا اور اگر ہماری ملازمت میں سندھیوں کے بارے میں کوئی اعتراض تھا تو سفیر اس کا مداوا کرتا لیکن چونکہ ایسا کوئی اعتراض نہیں کیا گیا لہٰذا ان لوگوں کو حراست میں لے لینا خان کا نہایت غیر دوستانہ اور ناشائستہ اقدام تھا۔

اس پر خان نے مسٹر ایلیس سے پوچھا کہ کیا وہ یہ سب کچھ سفیر کے ایما پر کہہ رہا تھا یا محض اپنے جوش جوانی کے تحت؟ مسٹر ایلیس نے جواب دیا کہ وہ سفیر کے حکم پر آیا تھا کہ اس واقعہ پر اُسے لتاڑے لیکن اسے طرز بیان پہ کوئی ہدایت نہیں دی گئی تھی کیونکہ یہ تو اسکے مقابل دلائل کے انداز اور رنگ پر منحصر تھا لیکن وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس نوعیت کے واقعہ میں حق کو باطل سے تمیز کرنا اظہر من الشمس تھا۔

پھر خان نے اپنے خطابات و اختیارات پر ایک طویل لیکچر دیا اور دعویٰ کیا کہ شاہ کابل کے ساتھ اہم ترین مذاکرات میں اُسے ہی چُنا گیا تھا اور وہ اپنا مقصد حاصل کر کے رہا لہٰذا وہ خود اور اُس کی آرا واجب الاحترام تھے لیکن مسٹر ایلیس اپنی نوجوانی اور ناتجربہ کاری

کی وجہ سے ان باتوں کو پوری طرح نہ سمجھ رہا تھا۔

مسٹر ایلیس نے جواباً کہا کہ بزرگی لازماً عمر سے پیدا نہ ہوتی تھی اور اپنے مراتب کے شمار سے وہ اس کی قوت فیصلہ پر اثر انداز نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہی وہ اس واقعہ کی صحت و عدم صحت کے بارے میں اُس کے خیالات کو بدل سکتا تھا۔

اس کے بعد خان نے کہا کہ سفیر کو اسے ملنا چاہیئے اور اسے اپنے مشن کے اصلی اغراض و مقاصد سے آگاہ کرنا چاہیئے اور اشارۃً یہ بھی کہا کہ اگر کسی نے مناسب طریقے پر درخواست کی تو وہ اپنا اثر و رسوخ بھی ان کے حصول کے لیئے استعمال کرنے پر تیار تھا۔

مسٹر ایلیس نے جواب دیا کہ برطانوی سفیر کو کسی بیساکھی کی ضرورت نہ تھی اور وہ امیروں کے سوا کسی سے مشن کے مقاصد پر بات تک نہ کرے گا۔ رہا اُس کے ملنے کا سوال تو یہ خان کا فرض تھا کہ وہ پہلے اُس سے شرف باریابی حاصل کرے۔ اس کے بعد یہ گفتگو ختم ہو گئی اور مسٹر ایلیس واپس فیکٹری میں آگیا۔

جن سندھیوں کو ہماری ملازمت میں آنے کی وجہ سے گرفتار کیا گیا تھا انہیں غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔ ولی محمد خان اس کے بعد سفیر سے ملنے بھی آیا اور سفیر بھی اگلے دن اُس سے ملنے گیا۔ ان دونو ملاقاتوں میں انداز تحریر و تخاطب پر خوب گرما گرم بحث ہوتی رہی جو امیروں سے روا رکھا گیا تھا لیکن اس کی تفصیلات پہلے ہی بیان ہو چکی ہیں اور صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس تکرار میں مشن نے اپنے نقطۂ نظر سے سرِ مُو انحراف نہ کیا اور ولی محمد خان سفیر کے ساتھ ذاتی دوستی جتلاتا ہوُا اور برطانوی حکومت کے مفادات کے لیئے نیک تمناؤں کا اظہار کرتا ہوا چند دن بعد ٹھٹھہ سے روانہ ہو گیا۔ اس معزز انسان کا رکھ رکھاؤ اور وضع قطع کم از کم سندھ میں اپنی نظیر آپ معلوم ہوتا تھا۔ جب وہ فیکٹری میں آتا تھا تو اُس کے ساتھ کئی سردار ہوتے تھے جو اس کا بیحد احترام کرتے تھے۔ وہ ایک سفید چوغہ پہنے ہوئے ہوتا تھا۔ اُس کی کمر میں ایک زرد وزنگی کا پٹکا ہوتا تھا اور

وہ سَر پر ایک نفیس ساخت کی لنگی بطور پگڑی باندھتا تھا۔ اُس کی تلوار ایک مُلازم اٹھاتا تھا اور جُونہی وہ کمرے میں داخل ہوتا تو وہ اُسے تھما دیتا تھا اُس کے اطوار پُر وقار اور دلفریب تھے۔ وہ ایک طویل القامت اور خوش وضع انسان تھا اور اُسے دیکھتے ہی اُس کے عالی مرتبہ کا احساس ہوتا تھا۔ بعد میں ہمیں معلُوم ہُوا کہ وہ قبیلہ گورچانی کے لغاری بلوچوں سے تعلّق رکھتا تھا جو بیج گنداوا کی شمالی پہاڑیوں میں مقیم ہیں اور رندوں سے برآمد ہُوئے ہیں۔ جب ہمارا سفیر اُس سے ملنے گیا تو اُس کے ساتھ دو سو سے زیادہ جلو دار بھی تھے اور اُس نے ان سب کی مٹھائی، شربت اور عرق گلاب سے تواضع کی اور معمولی سے معمولی چیز سے بھی شاہان ٹھاٹھ باٹھ کا اظہار کرتا رہا۔

میں نے پہلے لکھا ہے کہ ٹھٹھ کسی وقت سندھ کا دارالحکومت تھا لیکن جب موجُودہ حکمرانوں نے قلعہ حیدرآباد بنا لیا اور دربار وہاں منتقل کر لیا تو اُس کی آبادی اتنی تیزی سے گھٹی کہ اب تو شہر کا ایک تہائی حصّہ بھی آباد نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ اب بھی ایک بڑی جگہ ہے جو تقریباً چھ میل کے احاطہ میں پھیلی ہُوئی ہے اور دونوطرف کھنڈرات بہت دُور دُور تک نظر آتے ہیں۔

میں نے اس شہر کے بانی کے متعلّق بہت چھان بین کی لیکن بے سُود۔ اس کا اوّلین ذکر ہمیں ۹۲ھ (۷۱۱ء) میں ملتا ہے جب یہ قلعہ بند تھا اور اُس نے خلفائے عباسیہ کے لشکروں کی کچھ مزاحمت کی۔ اس کا محلِ وقوع عموماً یونانیوں کا پٹالہ بتایا جاتا ہے (دیکھئے بلب دواز دہم، حصّہ دوم) لیکن سندھ کے زیریں علاقے اتنا حیران کن طور پر بدل چکے ہیں کہ ایسے نظریات محض مبنی بر قیاس ہی ہو سکتے ہیں۔ جب سندھی حکمران عربوں کے تسلّط سے آزاد ہوئے تو انہوں نے ٹھٹھہ کو اپنا صدر مقام بنایا اور یہ جلد ہی ایشیا کا ایک عظیم ترین شہر بن گیا اور جزیرہ نمائے ہند اور شمالی اور مغربی ایشیا کے درمیان تجارت کا سب سے بڑا مرکز بنا۔ اس میں انہوں نے خوبصورت ترین باغات اور عمارات بنوائیں اور تجارت کو

فروغ دینے کے لئے چار میل مشرق میں بہتے ہوئے دریائے سندھ سے نہریں نکالیں۔ تاکہ سامان تجارت سوداگروں کے گھروں تک پہنچ سکے اور وہیں سے لادا جا سکے۔ ان حکمرانوں کے آر ائشی کارنامے تو اب قریباً محو ہو چکے ہیں اور صرف ایک نالی رہ گئی ہے جو کوڑا کرکٹ سے بھری ہوتی ہے اور اسے نہر کے نام سے بھی کوئی نسبت نہیں رہی۔

میرے خیال میں اس شہر کی عظمت و خوشحالی اس وقت سے رُو بہ انحطاط ہوئی جب صُوبہ سندھ شہنشاہان ہند کا باجگزار بنا لیکن اسے بھی صرف اس کی اصلی دولت و عظمت کے مقابلہ پر دیکھنا چاہیئے ورنہ نادر شاہ جب دہلی سے واپسی پر یہاں سے گذرا (۱۷۴۲ء) تو یہاں کیلیکو اور لنگیوں کے بُننے والے چالیس ہزار تھے اور ان کے علاوہ بیس ہزار دیگر کاریگر اور صنعت کار تھے۔ رُوپے کا لین دین کرنے والے، مہاجن، دکاندار اور غلہ فروش ان کے علاوہ تھے اور ساٹھ ہزار تھے[1]۔ جبکہ اس وقت کل آبادی زیادہ سے زیادہ بیس ہزار بتائی جاتی ہے اور اس کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ رُوپے کے بھی برابر نہیں جو مذکورہ نادر شاہی دور کی ایک ماہ کی آمدنی سے بھی کم ہے[2]۔

---

[1] اس مقامی اندازے میں شاید مبالغہ کا احتمال ہے۔ شاید اس لئے کہ کیپٹن ہیملٹن کی شہادت موجود ہے جو ۱۶۹۹ میں ٹھٹھہ آیا اور شہر کی بے پناہ آبادی کا ذکر کیا مجھے اس کی روداد سفر نہ مل سکی لہٰذا اس کی جلد یا صفحہ کا حوالہ نہیں دے سکتا لیکن ایک دوست نے اس کے جو اقتباسات بھیجے ہیں ان کے مطابق صرف قلعہ میں پچاس ہزار آدمی اور گھوڑے سما سکتے تھے۔ ایک جگہ ذکر کیا ہے کہ خشک سالی کی وجہ سے طاعون پھیل گئی اور کوئی اسی ہزار سُوت اور ریشم (یا کیلیکو اور لنگی) بافندے ختم ہو گئے۔

[2] نادر شاہ کا ایک عجیب و غریب قصہ سندھ کے قدرتی ذرائع اور ٹھٹھہ کے متعلق میرے بیان کردہ تاثرات پر روشنی ڈالے گا۔ جب وہ شہر میں پہنچا تو اس نے گورنر، میر نور محمد کو طلب کیا۔ وہ اپنی پگڑی گردن میں ڈالے اور منہ میں گھاس لئے اور پاؤں ڈھک کر (آداب نیازمندی کے

اب ٹھٹھہ کی مصنوعات میں صرف چند سفید کپڑے اور رنگین لُنگیاں رہ گئی ہیں اور ایک بڑے تجارتی شہر کی گہماگہمی کی بجائے گلیاں ویران ہیں اور چند کھلی ہوئی دکانیں بھی حیرت معلوم ہوتی ہیں اور پورا بازار نکبت و ناداری کے سائے کی گرفت میں معلوم ہوتا ہے۔ یہاں کے مکانات کا نقشہ مجھے کسی اور ملک میں نظر نہیں آیا۔ ان کی دیواریں اندر سے کھوکھلی ہیں۔ ان کے اندر لکڑی کے ایک چھوٹے سے ڈھانچے کے بیرونی سروں سے چھوٹی چھوٹی چھڑیاں آرپار گذاری گئی ہیں جو آٹھ سے سولہ انچ تک لمبی ہیں اور وتر کے بل پر رکھی گئی ہیں حتیٰ کہ وہ دورویہ ایک مضبوط ڈھانچہ بن جاتی ہیں اور مٹی یا گارے سے لپائی کے بعد ایک ٹھوس دیوار کا منظر پیش کرتی ہیں۔ اس اصول پر بنی ہوئی بعض عمارات تین چار منزلہ ہیں اور ان کے اوپر بھاری بھر کم مسطح چھتیں ہیں جو ان کی محکمی کا ثبوت ہیں لیکن میرے خیال میں وہ دیرپا نہیں ہو سکتیں اس لئے کہ جونہی دو تین لکڑیاں دیواروں میں کمزور ہو جائیں تو ساری عمارت گر سکتی ہے۔ بہت سے بہتر مکانات بھی لکڑی کے ڈھانچے پر اینٹ اور گارے سے بنے ہوئے ہیں اور ان سب میں گورنر کے محل سے لے کر مزدور کی جھونپڑی تک بادگیر لگے ہوئے ہیں جو

طور پر) آیا اور تخت کے سامنے سجدہ ریز ہوا تو نادر شاہ نے زور سے پوچھا کیا تمہارے پاس سونے کا بھرا ہوا کنواں ہے؟" اُس نے اختصار سے عاجزانہ جواب دیا کہ "ایک نہیں بلکہ دو"! نادر نے پھر پوچھا "کیا تمہارے پاس ایسا ان سندھ کا لعل ہے"؟ میر نے وہی جواب دہرایا۔ نادر نے اپنا رومال پھینکا اور پوچھا کہ اسے دیکھ کر اسے کیا نظر آرہا تھا؟ اس نے جواب دیا کچھ نہیں بلکہ فرج اور آلحہ۔ پھر نادر نے کہا "اپنا سونا اور لعل لاؤ"" گورنر نے ایک قُلی منگایا ایک بڑی ٹوکری جس میں غلہ اور آٹا کے لئے الگ الگ خانے ہوں۔ اسے بھر کر دائیں ہاتھ پہ رکھا اور پھر بائیں پر گھی کی ایک مشکیزہ رکھی اور شاہ سے کہا "میں ایک کاشت کار ہوں اور یہی میرا سونا اور لعل ہیں" بادشاہ نے خوش ہو کر خلعت دی اور اس کے بعد میر نور محمد نے سولہ دن تک نادر شاہ اور اس کی پانچ لاکھ سے زیادہ فرج کی خاطر مدارات کی اور کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی!

بحد حبس کے موسم میں بھی ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوا کے روشندان ہیں۔ اُس وقت دیگر ہر روزن اور موکھا بند کر دیا جاتا ہے تاکہ گرم ہوا اور گرد اندر نہ آسکے۔ ٹھٹھ کے گورنر کو نواب کا لقب دیا جاتا ہے جو ۱۸۰۹ میں امیروں کا ایک عمزاد تھا لیکن اس کی تقرری میں کوئی کام نہیں ہوتا کیونکہ یہاں کوئی مستقل فوج نہیں اور چونگی کا ٹھیکے دار ایک ہندو ہے جو اپنے کام کے لئے اپنا حصہ لیتا ہے۔ اس شہر کا عرض بلد ۲۴°-۴۴ شمالی اور طویل بلد ۱۷-۶۸° مشرقی ہے جو کیپٹن میکس فیلڈ کے متعدد مشاہدات کی اوسط پر مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے اردگرد کا علاقہ مکمل طور پر میدان ہے سوائے مکلی کی پہاڑیوں کے جن پر مقابر بنے ہوئے ہیں اور پہلے بیان ہو چکے ہیں اور یہ پہاڑیاں سمندر سے پندرہ بیس میل ورے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان پہاڑیوں پر اور اس میدان میں بھی زیادہ تر مس اور حنا کے گھنے جنگلات ہیں۔

اب بارشیں خوب زور شور سے شروع ہوگئی تھیں اور گلیاں نالے بن جاتی تھیں لہٰذا ہم صبح اور شام کو سیر اور گھوڑ سواری کے لئے نہ نکل سکتے تھے۔ اس بارش سے پہلے گرمی بہت زیادہ ہوگئی تھی اور فیکٹری کے سب سے ٹھنڈے کمرے میں بھی درجہ حرارت ۹۴ سے ۱۰۲ تک ہوتا ہے لیکن وسط جولائی میں موسم کچھ خنک ہوگیا اور ہم اکثر زوردار شمالی ہوا کے چلنے سے حیران ہوتے تھے۔ ایسی ہی ہوا میں ہمارے جہازوں نے کراچی بندر کی روک کو پار کیا اور وہ بہت جلد بمبئی پہنچ گئے۔ اسی ماہ کے آخر میں مشن ٹھٹھ سے حیدرآباد چلا گیا۔ مسٹر ایلس، کیپٹن میکس فیلڈ اور میں دریائی راستے سے پہنچے اور اس کے کئی دن بعد سفیر اور اس کا عملہ آئے کیونکہ سفیر کی ناسازیٔ طبع کی وجہ سے انہیں راستے میں رُکنا پڑا تھا۔

باب سیزدہم

دریائے سندھ ــــ اس کے متعلق مفروضہ ــــ حال ہی میں غلط ثابت ہوگیا ــــ اس کی ضروری تفصیل ــــ اس کا منبع ــــ گذرگاہ ــــ معاون دریا ــــ پنجند ــــ وجہ تسمیہ ــــ سندھ کے مختلف نام ــــ جہاں یہ سندھ میں داخل ہوتا ہے ــــ قمبر گنڈھی یا دریائے لاڑکانہ ــــ جھیل ــــ زرخیز علاقہ کے اردگرد ــــ خیرپور یا دریائے ڈرلی ــــ ریت سے بھرتا جارہا ہے ــــ دریائے پھلیلی ــــ اس کا منبع اور گذرگاہ جب یہ سندھ سے دوبارہ ملتا ہے ــــ دریائے گونی ــــ پہلے سمندر میں گرتا ہے ــــ اس کا بند ــــ کب ــــ کس لئے ــــ لُونی یا دریائے نمک ــــ گونی کی چوڑائی اور گہرائی ــــ مقامی دعوے ــــ سندھ کی مزید گذرگاہ کی تفصیل ــــ اس کا ایک ہی دہانہ ہے ــــ کھاڑیاں دہانے نہیں ہیں ــــ سندھ کی روئیں ــــ سمندر ــــ اس کی اصلی گہرائی اور چوڑائی کا گوشوارہ ــــ روک ندارد ــــ چوڑی تہہ والی کشتیاں ــــ اس ساخت کے فوائد ــــ سندھ کی سطح کا عام بیان ــــ امیروں کو شکار کا جنون ــــ اس کے نتائج ــــ مشن کی کارگذاری کا تسلسل ــــ سفیر حیدرآباد پہنچتا ہے ــــ امیروں کا سلام وپیام ــــ ان کی مقدمہ بازی ــــ انسداد ــــ سندھی کا جرم ــــ اس کے اعادہ کو روکنے کے اقدامات ــــ برطانوی پڑاؤ ــــ اس کا بیان ــــ مسخرے

—— مداری —— فقیر —فقیروں کا استقلال اور مضحکہ خیز دھمکیاں —— سفیر کی پہلی باریابی پر رسومات پر بحث —— امیروں کی خود بینی اور بلا جواز تجویز —— سفیر کا رویہ اس موقعہ پر — آخری انتظامات — سندھی حکومت کی صحیح تصویر کھینچتا ہے — معمولی معمولی رسومات پر بہت توجہ کی ضرورت —— سفیر اور اس کے عملہ کا تعارف امیروں سے —— اس کی تفصیل —— دربار میں انتشار —— وجہ اغلب —مصنّف کی رائے —جواہرات کی نمائش —تینوں حکمرانوں کا مقام و مرتبہ —ان کی شکل و شباہت —— لباس —بھاری بھرکم پگڑی —— اگست ۱۸۰۹ کے حیدر آباد کا موسم —— تکلیف دہ گرمی۔

۱

پیشتر اس کے کہ میں اپنے جرنل سے مشن کی مزید کارگذاری کا اس کی بمبئی واپسی تک ذکر کروں — میں یہاں کیپٹن میکس فیلڈ اور اپنے مشاہدات دوبارہ دریائے سندھ کا ذکر کروں گا اور اس کے ملحقہ اضلاع کا بھی اور ان معلومات کا بھی جو میں نے دیگر ذرائع سے حاصل کی۔[1] اس مشہور دریا کے متعلق کسی وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ ایک براہِ راست سیدھے خط میں سمندر تک بہتا تھا لیکن جغرافیہ ایشیا پر حالیہ تحقیقات نے اس غلطی کو دور کر دیا ہے اور ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر ایسی روشنی ڈالی ہے جس کی پُر امید علم دوستوں کو بھی توقع نہ تھی۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ دریا شمالی عرض بلد کے پینتیسویں اور چھتیسویں درجوں کے درمیان سے اُبھرتا ہے اور چھ سات درجے مغرب سے جنوب کی طرف چلتا ہے اور اُن برف پوش پہاڑوں سے گذرتا ہے جو کشمیر اور تبت صغیر کو جدا کرتے ہیں۔ طول بلد کے بہتّرویں درجے کے قریب

---

[1] میں ان ذرائع کا بعد میں ذکر کروں گا جو کابل اور سندھ کے جائزوں سے علیحدہ ہوں گے۔

یہ یکلخت جنوب کی طرف مُڑتا ہے کیونکہ کاشغر کے پہاڑ حائل ہو جاتے ہیں اور پھر یہ ۵۵-۳۳ شمالی عرض بلد میں واقع قلعہ اٹک تک اپنا راستہ جنوب اور جنوب مغرب کے درمیان بدلتا رہتا ہے۔ اٹک کے شمال میں اسے ابوسین (اباسین، دریاؤں کا باپ) کہا جاتا ہے اور پھر اسے رود اٹک کہتے ہیں حتیٰ کہ یہ پنجند سے مل جاتا ہے جو پنجاب کے صوبوں کو سیراب کرتے ہیں[1]۔ یہیں یہ سندھ میں داخل ہوتا ہے اور اس کے بعد اسے محض دریائے سندھ کہا جاتا ہے اور دریا عموماً بمعنی سمندر لیا جاتا ہے جو اس کی جسامت کے پیش نظر استعارہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

پنجند سے ملنے کے بعد مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ جنوب، جنوب مغرب کی طرف بہتا ہے اور ایک سو ساٹھ میل تک اس میں کوئی پیچ و خم نہیں اور یہ سکھر، روہڑی اور بھکر (دریا کے وسط میں ایک جزیرے پر واقع) کے پاس سے گذرتا ہے۔ ان مقامات سے سترہ میل جنوب میں ایک شاخ اس کی مغرب کو جاتی ہے اور ایک چکر کاٹ کر قصبہ سہوان میں پچاس میل کے چکر کے بعد اصل دریا میں آملتی ہے۔ اس شاخ کے دو نام ہیں۔ قمبر گنڈی اور دریائے لاڑکانہ۔ قمبر گنڈی اس لئے کہ یہ اس نام کے قصبہ کے پاس سے گذرتی ہے اور ایک جگہ پر تو دس بارہ میل لمبی جھیل بن جاتی ہے جو براہوی پہاڑوں کے عین دامن میں واقع ہے اور

---

[1] پنجاب کے پانچ دریا مغرب سے مشرق تک بہاٹ یا جہلم (قدیم ہائی ڈسپیس) چناب (قدیم آپ کے سائینیس)۔ راوی (قدیم ہائیڈرا اوٹس) — یہ تینوں ملتان سے ستر میل شمال مشرق میں مل جاتے ہیں اور وسطی دریا یعنی چناب کہلاتے ہیں — بیاس اور ستلج ہیں۔ یہ دونوں مل کر قدیم جغرافیہ کا ہائی فیس ہیں۔ یہ کبھی ستلج لیکن آج کل زیادہ تر گرّہ یا گرا کہلاتے ہیں۔ یہ عرض بلد ۱۰-۲۹ شمال اور ۲۸-۷۱ سے مشرقی طول بلد میں چناب سے مل جاتے ہیں اور پنجند کہلاتے ہیں جہاں سندھ سے مل جاتے ہیں۔

جس کے کناروں پر ناقابلِ عبور جنگلات اور نے زار ہیں جن میں شیر اور دیگر وحشی جانور رہتے ہیں۔
ضلع حیندو کی اسی شاخ سے سیراب و شاداب ہوتا ہے اور امیروں کے علاقے میں زرخیز ترین
حصہ ہے۔ اس سے انہیں آٹھ لاکھ روپے سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ مشرق کی طرف بھکر اور سہوان
کے تقریباً وسط میں دریائے سندھ سے ایک معاون دریا، خیرپور آملتا ہے جو اسی نام کے
قصبہ کی وجہ سے مشہور ہے اور جس میں موسم برسات میں درمیانے بوجھ کی کشتیاں چل سکتی ہیں۔
مجھے بتایا گیا ہے کہ اس کا اصل نام دُرلی ہے جو میرے خیال میں اس کے ضلع دریلی میں سے
گذرنے کی وجہ سے ہے جہاں اس میں دو اور نالے ملتے ہیں۔ ایک صحرا کے کنارے
کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف بہتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے لیکن اس کی اصل گذرگاہ اب
ریت میں گم ہو چکی ہے اور دریائے خیرپور کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے۔

دوسری شاخ قلعہ سہوان کے عین مقابل ہے جہاں دریا ایک درمیانہ درجے کا جزیرہ بناتا
ہے جو خشک موسم میں چراگاہ کا کام دیتا ہے لیکن پانی چڑھنے پر ڈوب جاتا ہے۔ اس شاخ
سے کچھ چھوٹی شاخیں پھوٹتی ہیں اور تیس چالیس میل کے علاقے کو سیراب کرتی ہیں جبکہ
اصل شاخ خوب پُر آب ہوتی ہے گو یہ اکثر خشک رہتی ہیں۔ اس کے بعد ہم شاخ پھیلی
کی طرف آتے ہیں جو اس جزیرے کو گھیرے ہوئے ہے جس پر حیدرآباد بنا ہوا ہے۔ یہ
سب سے بڑی ندی ہے۔ اور وجہ ظاہر ہے کیونکہ دریائے سندھ اس کی علیحدگی سے
ذرا اوپر پہاڑیوں کے سرے کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور مغربی کنارے پر مسدود ہونے
کی وجہ سے اتنا تیز رفتار ہو جاتا ہے کہ مشرق میں راستہ ملتے ہی یہ اپنا فاضل اور اضافہ یافتہ
پانی اس میں پھینک دیتا ہے۔

پھیلی حیدرآباد سے دس میل جنوب مغرب میں اپنے اصل دھارے سے آملتی
ہے، گو پانی کے پیچ و تاب سے یہ فاصلہ دو گنا سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ اپنے مشرق
ترین مقام پر یہ گونی کو علیحدہ کرتی ہے جو کسی وقت سندھ کے دہانۂ عظیم سے ایک دھ

مشرق کی طرف سمندر میں گرتی تھی لیکن ۱۷۹۹ء میں مرحوم میر فتح علی نے علی بندر کے آر پار ایک بند بندھوا دیا جہاں اس کے وسط میں ایک جزیرہ تھا اور اب ایک طرف تازہ پانی اس سے ٹکراتا ہے اور دوسری طرف مد کی لہر اس سے ٹکراتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس رفاہی کام (جو حکمران خاندان کا واحد کارنامہ ہے) کی تعمیر سے پہلے آب شور بارہ میل تک اوپر آجاتا تھا اور موسم بہار کی عمدہ فصلوں کو اجاڑ دیتا تھا جو اب چوطرفہ علاقہ میں پیدا ہوتی ہیں۔

بند سے نیچے دریا کو لُونی یا نمکین کہتے ہیں بمقابلہ گُونی یا گُنی بمعنی پُرتاثیر یا نفع رساں۔ پھلیلی کی عام چوڑائی دو سو سے چار سو گز ہے اور گہرائی دو سو چھ فیدام (: چھ فٹ) تک ہے۔ گنی بہت تنگ اور پُرخطر ہے اور مقامی لوگ کہتے ہیں کہ یہ ہر موسم میں خشک ہو رہا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ سال میں صرف چار ماہ تک حیدرآباد اور علی بندر کے درمیان کچھ وزنی کشتیاں چل سکتی ہیں جبکہ چند سال پہلے یہ دریائی آمد و رفت سال بھر جاری رہتی تھی اور بہت سا تجارتی سامان اسی گذرگاہ سے صوبے کے مشرقی حصوں میں پہنچتا تھا[1]۔

پھلیلی کے دریائے سندھ میں دوبارہ آملنے کے بعد دریا تھوڑا سا جنوب کے مشرق کی طرف بل کھاتا ہے لیکن جلد ہی اپنے جنوبی، جنوب مغربی رُخ پر واپس آجاتا ہے۔ اور ٹھٹھ کے بعد مزید مغرب کی طرف ہو کر یکمشت بحر ہند میں داخل ہو جاتا ہے۔

---

[1] جب حکومت بمبئی کا فرستادہ مشن بہ سندھ ستمبر ۱۸۰۸ میں واپس ہوا تو کشتیاں کئی میل تک گنی کے کیچڑ میں گھسیٹنا پڑیں۔ ہمارے بھاری سامان کا کچھ حصہ بھی اسی راستے سے کیچ پہنچا لیکن چونکہ یہ ایک ماہ قبل ہوا لہٰذا ہمارے لوگوں کو ایسی کوئی مشکل پیش نہ آئی۔

میں یکمشت اس لئے کہہ رہا ہوں کہ کوئی اٹھارہ میل سمندر سے دور کچھ ندیاں علیحدہ ضرور ہوتی ہیں اور اِدھر اُدھر گھوم گھام کر اس میں آملتی ہیں لیکن وہ صرف کھاڑیاں ہی ہیں جو دریا یا مد کی کیفیت کیمطابق خالی یا مملو ہوتی ہیں اور ان پر گھنے جنگل ہیں۔

دریائے سندھ کے دھارے کی تیزی موسموں کے مُطابق گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں خواہ وہ خشک ہوں یا تر، اور جن علاقوں سے یہ گذرتا ہے وہ بھی اسے متاثر کرتے ہیں۔

میرے خیال میں ٹھٹھہ کے اُوپر یہ رفتار عموماً ڈھائی اور چار میل کے درمیان فی گھنٹہ ہے۔ اس سے نیچے اس پر مد وجزر کا اثر ہوتا ہے جو اُسے بعض اوقات گیارہ بارہ میل تک بڑھا دیتا ہے لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جب سیلاب اور موسم بہار کا جوار بھاٹا ایک ہی وقت پر آئیں۔

اس دریا کی گہرائی کے متعلق بھی یہی باتیں صادق آتی ہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی صحیح ہیں لہٰذا میں نے ایک طویل پیراگراف لکھنے کی بجائے اس کی مختلف حالتوں کا جدول بنا دیا ہے جو اس مسئلہ کو واضح کر دے گا۔

جدول
اگلے
صفحات
پر
ملاحظہ
فرمائیں

دریائے سندھ کی گہرائی اور چوڑائی کا جدول

عرض بلد	مقامات	گہرائی خشک موسم	گہرائی تر موسم	چوڑائی خشک موسم
× ۵۵َ - ۳۳ْ شمال	اٹک	—	—	۲۶۰ گز
× ۷َ - ۳۳ْ شمال	کالا باغ	—	—	۳۸۰ گز
× ۵۲َ - ۳۱ْ شمال	ڈیرہ غازی خان	۲ فیدام	—	۱۰۰۰ گز
× ۲۸َ - ۳۱ْ شمال	کہیری	"	—	۱۲۰۰ گز
۵۴َ - ۲۹ْ شمال	ڈیرہ غازی خان	۳	۷ فیدام	۱۰۰۰ گز
۲۰َ - ۲۹ْ شمال	راجن پور	۳	"	۱۴۰۰ گز
۲۷َ - ۲۸ْ شمال	پنجبند	۸	۱۶	۲۲۰۰ گز

کیفیت

O

جب کابل مشن نے ۱۲ جون ۱۸۰۹ کو سندھ کو اٹک پر پار کیا تو گہرائی رَو کی تیزی کی وجہ سے معلوم نہ ہوسکی جو یہاں ۴۰ فٹ

× کابل مشن کے اندازے

٢٧°-١٣ شمال	بھکر	٥"	١٠"	١٦٠٠ گز
٢٦°-٩ "		٣"	٦"	٩٠٠ گز
× ٢٥°-٢٢ "	حیدرآباد	٥"	٨"	٢٠٠٠ گز
× ٢٥°-٩ "	ہیلی دریا	٥"	١٠"	٢٢٠٠ گز
× ٢٤°-٤٤ "	ٹھٹھہ	٤"	٦"	١٨٠٠ گز
× ٢٤°-٤٠ "	پیرپٹ	٧"	١٨"	٧٠٠ گز
٢٤°-٣٢ "	لاہوری بندر	١١"	١٦"	٤ میل
٢٤°-٢٩ "	دھراجے بندر	١٣"	١٦"	٩ "
٢٤°-٨ "	انتہائے زمین	١٣"	١٦"	١٢ "

اُونچے کناروں میں محدود ہے اور جنہیں سیلاب پالیتا ہے۔ کالا باغ میں دھارا سُست، ہموار اور انتہائی گہرا ہے۔ میں نے چوڑائی خشک موسم کی ہی لی ہے۔ کیونکہ تنگ ترین جگہیں اکثر سیلاب میں عریض ترین معلوم ہوتی ہیں

× سندھ مشن کے اندازے۔ بقایا مقامی اندازے جو میں نے بصد خواری حاصل کئے۔

اسیطرح میں نے اس کی گذر گاہ کی اصلی چوڑائی بھی اس جدول میں شامل کر دی ہے، اور اب مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ مقامی لوگ کہتے ہیں کہ دہانۂ دریا پر نہ کوئی روک ہے اور نہ ہی لاہوری بندر کی طرح کوئی اُونچی رکاوٹ جو جنگی جہازوں کی ایک پوری قطار کو روکنے کی اہل ہو بشرطیکہ وہ کسی ماہر و مشاق جہاز ران کے زیر سرکردگی ہو۔ پانی کی اتنی گہرائی کے باوجود (جو جدول سے ظاہر ہے) سندھ، پنجاب اور افغانستان کے درمیان ساری تجارت چوڑی تہہ والی کشتیوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ ایک کشتی ایک سے لے کر تین سو ٹن تک وزن لے جا سکتی ہے لیکن یہ اس طرح بنی ہوئی ہوتی ہیں کہ چند فٹ پانی میں بھی چل سکتی ہیں[۱]۔ اس ساخت کی وجہ سے مخالف سمت میں جاتے ہوئے یہ کنارے کے پاس رہ سکتی ہے جہاں رَو مدھم بلکہ غیر مرئی ہوتی ہے اور جنوب کی طرف واپسی پر بھی یہ فائدہ انہیں حاصل رہتا ہے۔ ان کشتیوں کا ایک بڑا مربع بادبان ہوتا ہے جو ہوا کے سامنے جاتے ہوئے مستول کی پشت کی طرف بلند کر دیا جاتا ہے لیکن وہ اس کی مدد سے کشتی کو کھینچنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ مخالف سمت میں عموماً اسے خود ہی کھینچتے ہیں۔

دریا کے مشرق کی طرف کا صوبہ سندھ اپنی شمالی ترین حد سے ساحل سمندر تک ایک کامل میدان ہے سوائے دو تین پست پہاڑیوں کے جو گنجہ پہاڑیاں کہلاتی ہیں اور اس جزیرے پر واقع ہیں جس پر حیدر آباد ہے۔ دریا کے مغربی کنارے پر سہوان کے عرض بلد ۲۶° سے سطح زمین متنوع ہے۔ کچھ علاقے پہاڑی ہیں، کچھ ہموار اور کچھ میں پست

---

[۱] اب دریائے سندھ پر تجارت برائے نام ہے۔ میران سندھ کی جابرانہ اور تنگ دلانہ پالیسی نے اسے کچل دیا ہے اور شمالی ممالک کے انتشار نے اسے خطرناک بنا دیا ہے۔ اب تو صرف چند کشتیاں اناج، شورہ، نمک اور ایندھن لیکر ادھر ادھر آتی جاتی ہیں۔

پہاڑیوں کے سلسلے ہیں حتیٰ کہ ہم سمندر تک پہنچ جاتے ہیں۔

سہوان کے شمال میں میدان سیوستان کی پہاڑیوں تک پھیلا ہوا ہے۔ سندھ کے موجودہ حکمران شکار کے دھنی ہونے کی وجہ سے اپنے اس جذبے کی تسکین کے لئے اپنی مملکت کی رونق اور اپنی رعایا کے مفادات کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے اور انہوں نے دریائی کناروں کے ساتھ ساتھ کے بہترین علاقے شکار کے لئے محفوظ کر رکھے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بیس سال پہلے جو علاقے کاشت کے لحاظ سے سرفہرست تھے اب بیکار درختوں اور جھاڑیوں کے ناقابل عبور جنگلات بنے ہوئے ہیں۔

سفیر کے حیدرآباد پہنچنے کے بعد صبح کو ہر امیر نے ایک ایک رسمی وفد ہمارے پڑاؤ میں بھیجا جو قلعہ سے کوئی ایک میل جنوب مشرق میں دریائے پھلیلی پر لگایا گیا تھا۔ مقصد آمد پر مبارکباد اور مزاج پرسی تھا لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ وفد کے سب ارکان (جو سلام و پیام بھی لائے تھے اور شیرینی کی طشتریاں بھی) خدمتگاروں (ذاتی ملازمین ادنیٰ دیوان جیسے ایران کے پیش خدمت) سے بڑے درجے کے نہ تھے تو یہ مناسب نہ سمجھا گیا کہ مسٹر سمتھ بذات خود ان کا استقبال کریں چنانچہ مسٹر اطیس نے یہ فرض انجام دیا۔ اس پر انہیں مایوسی تو بہت ہوئی لیکن ہر ایک اپنا اپنا تحفہ لیکر مطمئن ہو گیا اور خوشی خوشی واپس گیا۔ لیکن امیروں نے اس موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور ایک دیوان مشتاق رام نامی کے ذریعے ایک طویل خطبہ دلوایا کہ سفیر کا رویہ ایسا ہونا چاہیئے کہ اس سے ظواہر احترام بخوبی واضح ہوں جس پر امیر اتنے بضد تھے اور یہ کہ سفیر نے جواباً مزاج پرسی کیوں نہ کی؟ اسے جواب دیا گیا کہ اسے نظر انداز نہیں کیا گیا لیکن جو منشی سلام و پیام لیکر گیا اُسے کسی نے قلعہ میں ہی داخل نہ ہونے دیا گیا اور مجبوراً اُس نے ایک آدمی مسٹر سمتھ کے پاس بھیجا کہ وہ سلام پہنچانے کے لئے کیا اقدامات کرے۔ اس پر اس شریف انسان نے تکلف برطرف رکھتے ہوئے یہ کہلا بھیجا کہ وہ حکومت کے کسی بھی عامل کو یہ پیغام پہنچادے

جو اسے امیروں کے گوش گذار کرے۔

دیوان کو مزید بتایا گیا کہ سفیر کے حیدرآباد آنے سے قبل مسٹر ایلس نے کئی بار سرکاری موضوعات پر امیروں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن منشی کو قلعہ میں داخل نہ ہونے دیا گیا اور اسے جواب کے لئے بازار میں ٹھہرنا پڑا لہٰذا اگر کوئی فروگذاشت ہُوئی تھی تو وہ حکومت سندھ کی طرف سے ہی ہوئی تھی۔ اگر بڑے درجے اور مقام کا منشی ان کے حضور میں نہایت اہم زبانی پیغامات کے باوجود نہ پہنچ سکتا تھا تو سفیر کے رُوبرو خدمتگاروں کی عدم باریابی پر امیروں کے مایُوس ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

ایک سخت لڑائی ہمارے آدمیوں اور سندھیوں کے درمیان ہوتے ہوتے رہ گئی جب ایک سندھی نے ایک سنتری کے پاس سے بزور گذرنے کی کوشش کی اور روکنے پر اُسے مارا اور اُس کی ٹوپی گرادی۔ مُجرم کو پکڑنے کی تگ و دو کی گئی لیکن وہ مجمع میں گم ہوگیا اور سفیر نے اس واقعہ کے اعادہ کو روکنے کے لئے (جس کے نتائج بعید خطرناک ہوسکتے تھے اگر سپاہی نے تحمّل سے کام نہ لیا ہوتا) محض یہ اقدام کیا کہ آئندہ سنتری قناتوں کے اندر ہی متعین ہوں۔ اسوقت ہمارا پڑاؤ کسی میلہ کے وسط میں معلوم ہوتا تھا کیونکہ ہر پیشہ و قماش کے بلیشمار لوگ دن رات اس کے گرد منڈلاتے رہتے تھے، اور بھانڈ، مداری، ریچھ والے اور فقیر ہمیں اپنی اپنی راگنیاں سناتے رہتے تھے۔ فقیر تو نرسنگھے اور ڈھول بھی بجاتے تھے۔ ان میں سے اکثر اپنے پیشہ میں بیحد ثابت قدم تھے اور سفیر کے خیمے سے قریب ترین فاصلے پر اپنے اڈے جاتے تھے جہاں وہ کئی کئی دن تک اپنے تقاضوں کے ڈھنڈورا پیٹتے تھے اور مایوس ہو کر کبھی کبھار مشن کو پیغمبر کے انتقام اور امیروں کے غضب سے بھی ڈراتے تھے تاکہ ہم ان کی جھولی بھر دیں۔ دوسرے اُس وقت حملہ کرتے جب ہم عموماً شام کو صاف موسم میں سوار ہوکر باہر نکلتے۔ پھر وہ سفیر کے گھوڑے کے آگے دوڑتے جاتے اور قسمیں کھاتے جاتے کہ اگر ہم اُنہیں نہال کردیں امیروں سے ہماری سفارش کریں گے لیکن اگر ہم اُن کی اس پیشکش کو ٹھکرادیں

تو ہمیں فوراً ہندوستان چلے جانا چاہیئے کیونکہ ان کی خوشنودی کے بغیر یہاں کچھ ممکن نہ تھا۔ پہلے پہل تو یہ چھُٹ بھیّے (جن میں ایشیا کی ہر قوم کے لوگ تھے) ہمیں اپنے شور سے سخت پریشان کرتے تھے لیکن ہم جلد ہی اس کے عادی ہوگئے اور ان کے نعرے اور پھٹکاریں ہمارے لئے تفنن طبع کا ایک ذریعہ بن گئیں۔

سفیر کے حیدرآباد پہنچنے کے دوسرے دن اس کی پہلی باریابی کی رسمی تقریبات کا تعارف کرایا گیا اور جیسا کہ ہمیں ڈر تھا امیروں کی تجاویز نے ایسے مذاکرات کا دروازہ کھول دیا جس سے آخری انتظامات میں قریباً ایک ہفتہ کی تاخیر ہوگئی اور ایک دو دفعہ تو ہمیں شرف ملاقات کے بغیر ہی سندھ چھوڑ دینے کا سوچنے پر مجبور کر دیا۔

یہ تو پتہ چل گیا تھا کہ مسند زمین سے کافی اونچی تھی لہٰذا سفیر نے مطالبہ کیا کہ اسے بیٹھنے کے لئے کرسی دی جائے اور مشن کے داخلہ پر تینوں امیر اٹھ کھڑے ہوں لیکن امیر نہ صرف کھڑے ہونے سے انکار کرتے تھے بلکہ اُلٹا یہ مطالبہ کرتے تھے کہ ہم دربار میں داخل ہونے سے پہلے غیر مسلح ہوں اور اس بلاجواز تجویز کی دلیل یہ تھی کہ راجہ جے پور کے دو وکیلوں نے ایک ایسے ہی موقع پر ایک امیر پر قاتلانہ حملہ کی کوشش کی تھی جو پہلی سے بھی بڑی توہین تھی۔

مسٹر سمتھ نے کھلے لفظوں میں یہ مطالبہ لانے والے شخص کو بتا دیا کہ وہ یہ توہین آمیز مطالبہ ماننے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا لیکن اگر بفرض محال وہ یہ مان لے تو بھی وہ اپنے عملہ کو اس پر مجبور نہ کر سکتا تھا لہٰذا وہ ایسی صورت میں اپنی حکومت کا وقار خطرے میں ڈالنے کی بجائے فوراً سندھی مملکت سے رخصت ہونا بہتر سمجھے گا۔

لے اس کا پول بھی جلد ہی کھل گیا اور کرسی کی شرط واپس لے لی گئی کیونکہ امیر صرف فرش یعنی روئی دار گدے پر بیٹھتے تھے جس سے وہ زمین سے دو انچ بھی اونچے نہ ہوتے تھے۔

بالآخر ولی محمد خان (جو ٹھٹھہ میں ہم سے ملا تھا) کو بیچ میں ڈالا گیا اور اُسے ہم سے ہر قسم کی شرائط طے کرنے کا کلی اختیار دے دیا گیا لیکن مذکورہ موضوع کا ذکر چھڑتے ہی اس نے سفیر کو اتنا مصمم پایا کہ وہ یہ بات ہی ترک کر گیا اور دیگر جزئیات مذکورہ پر متوجہ ہو گیا۔

جب خان مشن کی آمد پہ امیروں کے قیام کے خلاف اپنے دلائل کا سارا اسلحہ ختم کر چکا تو وہ نہایت ہوشیاری سے اپنے اس خود ساختہ مینار عظمت سے زینہ بہ زینہ نیچے اُترنے لگا۔ وہ یہاں سے شروع ہوا کہ امیر ایسی حرکت کریں گے گویا وہ اُٹھنے والے ہوں لیکن بالآخر یہ فیصلہ ہو گیا کہ وہ سفیر کے نمودار ہونے پہ کھڑے ہوں گے اور اس وقت تک کھڑے رہیں گے جبتک وہ ان کے دائیں طرف آکر بیٹھ نہ جائے اور ہمارے رخصت ہونے پر بھی وہ ایسی ہی تعظیم کریں گے۔

اس مباحثے کا نتیجہ حکومت سندھ پہ ایک صحیح ترین تبصرہ ہے بلکہ ان تمام ایشیائی حکومتوں پر جو اپنی پالیسی کی کامیابی انہی پابندیوں میں سمجھتے ہیں جو وہ خود پرستانہ تقریبات کے سلسلہ میں غیر ملکیوں پر عاید کر سکتے ہیں حالانکہ ہر صاحب مرتبہ کا مقصد تو یہ ہونا چاہیے کہ وہ انہیں واضح ترین اور اٹل اقدامات کے ذریعے انہیں ختم کر دے ورنہ اسے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ نہ صرف ان کی وجہ سے اپنے ہی دربار میں نشانہ تضحیک بن جائے گا بلکہ اس کے آئندہ مذاکرات بھی ریاکارانہ داؤ پیچ سے متاثر و مفلوج ہوں گے جو اس کے لئے بے سود اور توہین آمیز ثابت ہوں گے۔

جس شام ہمارے طریقۂ استقبال پر فیصلہ ہو گیا ہمیں اخوند محمد بقا خان نے امیروں سے متعارف کرایا۔ وہ ہمیں دربار میں لیجانے کے لئے ہمارے پڑاؤ میں آیا اور کئی دفعہ سفیر اور اس کے عملے کے مرتبہ و مقام کو فرداً فرداً دہرایا۔ ڈھلان جس کے مشرقی پہلو پر قلعہ حیدرآباد ایستادہ ہے، مکانوں کی چھتیں بلکہ قلعہ بندیوں تک، مردوں عورتوں سے

ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے جو تالیاں بجا بجا کر ہمیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ قلعہ کے پہلے دروازے سے ہم داخل ہوئے تو راستہ ایک ڈھلوان چڑھائی تھا جس کے دورویہ تفنگچی کھڑے ہوئے تھے حتیٰ کہ ہم دوسرے مینار کے پاس آگئے جس کے نیچے ایک پیچدار راستہ تھا۔ محل تک تمام گلیاں مسلح آدمیوں سے ایسے بھری ہوئی تھیں کہ ہم بصد مشکل گھسوں کر اپنے گھوڑوں تلے مسلنے سے بچے۔ آخر کار وہ جگہ آگئی جہاں ہمیں اُترنا تھا اور وہاں ولی محمد خان اور دیگر ارکان دولت نے ہمیں خوش آمدید کہا اور ہمارے آگے آگے ایک بڑے کشادہ چبوترے کی طرف چلے جس کے آخری کونے پر تینوں امیر نشستہ تھے۔ چبوترے پر خوبصورت ترین ایرانی قالین بچھے ہوئے تھے لہٰذا ہم نے اپنے جوتے اتارے اور جونہی سفیر نے امیروں کی طرف پہلا قدم اٹھایا تو وہ سب کے سب اُٹھ کر کھڑے ہوگئے حتیٰ کہ سفیر اپنی مقررہ جگہ پر پہنچ گیا جو دوسری نشستوں سے اپنے کڑھے ہوئے کپڑے کی وجہ سے ممتاز تھی۔

جونہی ہم بیٹھ گئے تو ایسی افراتفری پھیلی کہ ناقابل بیان ہے۔ اس کی وجہ شاید ہمارے عزائم پر بے اعتمادی تھی کیونکہ خدمت گار، تفنگچی اور شمشیر باز سب یہاں گھس آئے اور ہمیں قریباً محصور کر لیا، اُن میں سے جو آگے تھے انہوں نے تو اپنے پاؤں بھی ہماری تلواروں کی نیاموں اور ہمارے کوٹوں کے لہنگوں پر رکھ دیئے جو ہمارے بیٹھنے کے انداز کی وجہ سے قالینوں پر رکھے ہوئے تھے لیکن آیا یہ کوئی سوچا سمجھا منصوبہ تھا یا محض اتفاق، یہ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن بعد کی ملاقاتیں مجھے اول الذکر توجیہہ کی طرف زیادہ کھینچتی ہیں حکمرانوں نے فرداً فرداً مزاج پرسی کی کیونکہ یہ صرف رسمی باریابی تھی۔ ہمیں آئے ہوئے آدھ گھنٹہ گذر چکا تو امیر کلاں نے ہمیں رخصت کا اشارہ دیا۔ ہندوستانی درباروں میں پان سپاری اور عطر کے ذریعے اشارۂ رخصت دیا جاتا ہے اور ایران میں قلیان اور قہوہ کے ذریعے لیکن یہاں کوئی ایسی رسم نہ تھی

امیروں کی تلواریں اور خنجر مرصع تھے ۔ ان کی کمر کی پیٹیوں پر بھی غیر معمولی جسامت
کے ہیرے موتی جڑے ہوئے تھے اور وہ خود بھی بیشمار جواہرات پہنے ہوئے تھے ۔ وہ
عمر کے مطابق نشستہ تھے ۔ بڑا وسط میں تھا ، منجھلا دائیں طرف اور چھوٹا بائیں
طرف ۔ وہ ایک ندے پر بیٹھے تھے جو پورے دائرے میں پھیلا ہوا تھا ۔ اور
اس کے اوپر ان کے لئے ایک ریشمی گدا رکھا ہوا تھا جو کوئی ایک انچ موٹا تھا اور
جس کے اوپر سونے اور چاندی کے پھولوں سے کڑھی ہوئی ململ پڑی تھی ۔ ان کی پشت
پر ایسے ہی کاڑھے ہوئے تین تکیے تھے جو اپنے جواہرات کی چمک دمک سے دربار
کو منور و مؤثر بنا رہے تھے ۔ اکثر امرا و وزرا بھی اپنے بہترین رنگ ڈھنگ میں
تھے اور پورا منظر اتنا شاندار اور نظر فریب تھا کہ ہمیں حیدر آباد کے دربار سے اس کی
قطعاً توقع نہ تھی !

ذاتی طور پر امیر توندل متوسط قد کے انسان ہیں ۔ بڑا میر غلام علی[1] بیالیس سال
سے زیادہ کا معلوم نہ ہوتا تھا اور اس کے دونو بھائی ، میر مراد علی اور میر کرم علی اس
سے کئی کئی سال چھوٹے ہیں ۔

چھوٹا میر کرم علی ایک دل خوش کن شادہ چہرے مہرے کا مالک ہے ، ہنس مکھ ہے
اور حسن طبیعت کا آئینہ دار ہے جو اس کے بڑے بھائیوں کو نصیب نہیں ہیں جو سرد
مزاج اور عفو نا آشنا بتلائے جاتے ہیں لیکن ظالم نہیں ہیں ۔

لباس کے آرائشی حصوں کے سوا تینوں بھائی ایک ہی طرح ملبوس تھے اور نفیس
ململیں چوغے پہنے ہوئے تھے اور کمر کے گرد نہایت بیش قیمت لنگیاں باندھے ہوئے
تھے ۔ ان کی پگڑیاں باریک شفاف جالی کی بنی ہوئی تھیں ۔ میں نے اتنا طویل سرپوش کبھی

---

[1] میر غلام علی اب فوت ہو چکا ہے ۔ دیکھئے باب دوازدہم نوٹ ۔

نہ دیکھا تھا۔ یہ قطر میں دو سے ڈھائی فٹ ہوں گی لیکن یہ اس خوبصورتی سے باندھی گئی تھیں کہ بھاری یا ناموزوں معلوم نہ دیتی تھیں[1]۔

قیام حیدرآباد کے دوران موسلا دھار بارشیں ہوئیں۔ دریائے پھلیلی میں طغیانی آگئی اور اگر ہم نے خندقیں نہ کھودی ہوتیں تو ہمارا پڑاؤ ڈوب گیا ہوتا۔ ان کی وجہ سے پانی نہروں میں جا گرا۔ ان کے بعد بے پناہ حبس ہوا اور ہمارے کئی آدمی بیمار پڑ گئے۔ لیکن ورزش اور دیگر حفاظتی اقدامات نے افسروں کو عموماً اچھی صحت میں رکھا گو بے پناہ گرمی پریشان کرتی رہی۔ درجہ حرارت شاذ و نادر ہی ۱۰۲ سے نیچے گرا اور راتوں کا جان لیوا حبس تو میں نے ہندوستان بھر میں نہ دیکھا تھا۔

---

[1] اکابر سندھ کی بڑی بڑی پگڑیوں کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں سے بعض اسی اسی گز سے بھی طویل تر ہوتی ہیں اور یہ آٹھ سے بارہ انچ تک چوڑی ہوتی ہیں۔

باب چہار دہم

قلعہ حیدر آباد ــــ عرض بلد اور طول بلد ــ محل وقوع ــــ دریائے سندھ اور پھلیلی سے اس کا فاصلہ ــ کب تعمیر ہوا ــ کس نے بنوایا ــ اندازاً بہت مستحکم ــ قلعہ بندیاں ــ بے قاعدہ شکل ــ ان کا بیان ــ زدیں ــ دروازہ ــــ خندق ــــ توپ ــــ پٹہ یا مضافات ــ آبادی ــــ مصنوعات ــ امیروں کو تحائف ــ بعض لینے سے انکار ــــ سفیر کے اقدامات موقعہ پر ــ اس کا اچھا اثر ــــ جوابی تحائف ــ امیروں سے دوسری ملاقات ــــ اس کے آداب ــــ تلواروں پر ان کی حیرانی ــــ اس کی افادیت ــــ ہیرے جواہرات ــــ سفیر کی خلوت میں ملاقات ــ مذاکرات کا آغاز ــ ان کا آخری نتیجہ ــــ امیروں کی طرف سے ایک سفیر برائے گورنر جنرل کا تقرر ــ مشن حیدر آباد سے بمبئی روانہ ہوتا ہے ــ گاؤں کڈین میں آمد ــــ صحرائے لکھپت بندر (کچھ) کو جاتے ہیں ــــ محمد خان کا ٹنڈا ــ اس کا بیان ــ اس کا سردار ــ آمدنی ــــ علاقہ ترقی پذیر ــــ حیدر آباد اور کڈین کا درمیانی علاقہ ــــ بمبئی میں آمد ــــ سندھ کی عام آبادی ــــ مختلف طبقے ــــ ہندو ــ جٹ ــ بلوچ ــــ سندھی کردار ــــ برائیاں ــــ معذرت ــ خوبیاں ــــ کہاں سے ــــ ان کا مذہب ــــ رنگ ــــ قد و قامت ــــ خط و خال ــ مستورات ــــ

بہت خوبصورت ۔ شکل و صورت بہت موثر ۔ مردوں کا لباس ۔ عورتوں کا ۔

جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے حیدرآباد اس جزیرے کی مشرقی طرف پر واقع ہے جو سندھ اور پھلیلی کے دھاروں سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ یہ عرض بلد ۲۲ . ۲۵° شمالی اور طول بلد ۱۸ . ۶۸° میں ہے۔ سندھ قلعہ سے چار میل جنوب مغرب میں بہتا ہے اور پھلیلی اس ڈھلان کے دامن سے ایک ہزار قدم کے فاصلے پر ہے جس پر یہ بنا ہوا ہے لیکن اس کی ایک کھاڑی میں کشتیاں قلعہ بندیوں سے چند گز کے فاصلے تک پہنچ سکتی ہیں بشرطیکہ دریا بھرپور ہو۔ یہ قلعہ موجودہ امیروں کے بڑے بھائی میر فتح علی نے بنوایا تھا اور سندھی اسے ناقابل تسخیر سمجھتے ہیں لیکن یہ ایک یورپی دشمن کی مزاحمت نہیں کر سکتا۔ قلعہ بندیوں کی شکل بالکل بے قاعدہ ہے کیونکہ یہ پہاڑی کے پیچ و خم اور زاویوں کے مطابق بنائی گئی ہیں۔ دیواریں اینٹوں کی ہیں، پندرہ سے تیس فٹ اونچی اور ان کی بنیادیں پہاڑوں کی چوٹی کے کناروں پر ہیں، جہاں یہ خوب موٹی اور ٹھوس ہیں لیکن اوپر کی طرف اتنی پتلی ہوتی جاتی ہیں اور روزنوں اور سوراخوں سے اتنی کمزور ہو گئی ہیں کہ نشانے پر گولی ان کے کسی حصّہ کو گرا سکتی ہے اور فصیل دار گولہ باری کی زد میں آ سکتے ہیں۔ گول مینار تین چار سو قدموں کے وقفے پر اور گرد بنے ہوئے ہیں اور صحیح مقامات پر ایستادہ ہیں اور ڈھلوان پہاڑی کے ہمراہ ایک پرشکوہ منظر پیش کرتے ہیں لیکن پہاڑی بہت نرم اور پھسپھسے پتھروں کی ہے جو آسانی سے ٹوٹ سکتے ہیں اور ایسی ڈھلوان ہے کہ دیوار کے کسی شگاف کا کوڑا کرکٹ اس پر ٹھہر سکتا ہے اور حملہ آور فوج کو آرام سے کھڑے ہونے میں مدد دے سکتا ہے۔

شمال کی طرف ایک خشک خندق ہے جس پر ایک پُل بنا ہوا ہے جو دروازے تک آتا ہے اور اس پر ایک بہت بڑا بُرج بنا ہوا ہے۔ حیدرآباد کی قلعہ بندیوں پر کوئی ستر توپیں نصب ہیں لیکن دروازے کے بُرج کی آٹھ دس بھاری بھرکم توپوں کے سوا باقی سب

چھوٹی چھوٹی اور بیکار ہیں۔ پیٹھ یا مضافات قلعہ کے شمال میں ایک بلند قطعۂ زمین پر ہے اور ڈھائی ہزار مکانات پر مشتمل ہے۔ آبادی دس ہزار ہے۔ قلعہ کے اندر بھی قریباً اتنے ہی مکان ہیں لیکن آبادی آدھی بھی نہیں اور وہ سب سپاہیوں کی ہے۔ حیدر آباد کی اہم مصنوعات میں مختلف قسم کا اسلحہ شامل ہے جیسے توڑے دار بندوق، نیزے، تلواریں وغیرہ اور کشیدہ کردہ پارچات۔ مضافات کی آبادی کا پانچواں حصہ اسلحہ گری پر گذر اوقات کرتا ہے اور ان کی صناعی بعض اوقات تو اتنی عمدہ ہے جتنی یورپی صناعی۔

دربار میں ہمارے استقبال سے اگلی صبح امیروں کے لئے ہندوستان سے آوردہ تحائف چوبداروں کی نگرانی میں ان کے محلات میں بھیج دیئے گئے۔ یہ تینوں سونے کی گھڑیوں، کلاکوں، شکار کے طمنچوں، پستولوں، مخمل اور چھینٹ پر مشتمل تھے جو کافی بیش قیمت تھے۔ انہوں نے سب تحائف بخوشی قبول کئے سوائے چھینٹ کے جسے اپنی شان کے شایان نہ سمجھ کر لوٹا دینے کی دھمکی دی۔ وہ اسے زیادہ قیمتی نہ سمجھتے تھے اور گیدڑ بھبکی سے کوئی زیادہ قیمتی چیز ہتیانا چاہتے تھے لیکن چونکہ ان کا لوٹانا معطی کے عدم احترام کے مترادف تھا لہٰذا سفیر نے سرکاری معترمن کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ چھینٹیں بھی دیگر تحائف کی طرح اس کی حکومت کی طرف سے دوستی کی علامات اور مختلف انگلستانی مصنوعات کے نمونے تھے نہ کہ تحائف لہٰذا ان کی قیمت امیرانِ سندھ کے لئے کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔ لیکن اگر ایسا تھا تو وہ سارے تحائف واپس لینے پر تیار تھا اور پھر امیرانِ سندھ کو خود ہی عزت مآب گورنر جنرل کے حضور اس اقدام کی جواز دہی کرنا ہوگی۔ تیر نشانے پر بیٹھا، اُن کی حرص پر اوس پڑ گئی اور حکومتِ برطانیہ کی خفگی کے احساس سے امیروں کو سانپ سونگھ گیا اور حسبِ رواج ہمارے پڑاؤ میں فوراً تحائف بھیجے گئے۔ حکومتِ عالیہ کے لئے صرف آٹھ گھوڑے آئے اور سفیر کو ایک خوبصورت تلوار اور تینوں بھائیوں کی طرف سے ایک ایک گھوڑا ملا اور ہم باقی ماندگان کو معمولی قیمت کی سندھی مصنوعات ملیں۔

تعارفی باریابی کے چند روز بعد ہمیں دوبارہ شرفِ باریابی ملا جس میں ساری کارروائی بے حد احتیاط اور باقاعدگی سے ہوئی۔ وہ ہمیں اسی چبوترے پر اسی التفات سے ملے لیکن اس دفعہ محافظوں اور خدمتگاروں کے ہڑبونگ کی بجائے صرف چند خدمتگار آئے اور وہ بھی کافی فاصلے پر دیواروں کے پاس صف بستہ و دست بستہ مؤدبانہ کھڑے رہے۔

اس موقعہ پر تینوں نے خوب کھُل کر باتیں کیں۔ میرے خیال میں وہ پہلی ملاقات میں جان کی امان کے خطرے پر اب قابو پا چکے تھے اور نہ صرف ہماری تلواروں سے گھبرائے نہیں بلکہ بار بار انہیں بے نیام کرواتے رہے تاکہ اُن کی دھات اور صناعی کا معیار دیکھ سکیں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی تلواریں اور خنجر دکھائے جو بہترین فولاد کے تھے اور جنہیں خریدنے کے لئے بقول ان کے وہ ہر سال اپنے مختار کار ایران اور ایشیائے کوچک بھیجتے تھے کہ وہ قیمت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بہترین قسم کی چیزیں خریدیں۔ اُن کی گفتگو سے جلد ہی ثابت ہو گیا کہ صرف تلواروں اور دیگر اسلحہ جات کا جنون ہی ان کی ہوسِ زرپرستی پر فائق تھا اور اس میں تو وہ تینوں ایک دوسرے کے مقابلے پر قیمتی سے قیمتی اشیا خریدنے پر فخر کرتے تھے۔ اس جنون کے کچھ مخصوص فوائدِ عامہ بھی ہیں کیونکہ جب امرا و زرار اپنے حکمرانوں کا ذوقِ سبقت دیکھتے ہیں تو وہ بھی انہی کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ جذبہ آبادی کے نچلے طبقوں میں بھی سرایت کر گیا ہے اسی لئے حیدر آباد بے شمار اسلحہ سازوں کا مامن و مسکن بنا ہوا ہے اور اسی لئے اُن کی کاریگری اتنی عمدہ و افضل ہے!

اس دربار میں امیر پہلے سے بھی زیادہ شاندار طریقے سے ملبوس تھے۔ گو کوئی خاص قابلِ ذکر بات بھی نہ تھی۔ بڑا بھائی اپنے گلے میں خوبصورت موتیوں کے لمبے لمبے ہار پہنے ہوئے تھا اور ایک ہار بطور تسبیح اپنے ہاتھ میں بھی لئے ہوئے تھا۔ میں نے اس سے پہلے اتنی بڑی تسبیح کا کبھی یقین نہ کیا ہوتا۔ چھوٹوں میں سے ایک کے کمربند میں ایک خنجر تھا جس کے دستے سے ایک کامل زمرد معلق تھا جو کبوتر کے انڈے سے کافی بڑا تھا۔

اِس دربار کے خاتمے پر سفیر بھی امیروں کے ساتھ چلا گیا اور خلوت میں گفتگو ہوئی جس میں اُس نے انہیں گورنر جنرل کی طرف سے مفوضہ مذاکرات کی نوعیت کی تفصیل بتائی اور اِس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اپنی حکومت کے ایسے افسر نامزد کریں جو اُن کے خیال میں مشن کے مختلف موضوعات پر غور و خوض کے اہل ہوں۔ وہ فوراً اِس تجویز کو مان گئے اور وعدہ کیا کہ اُن کے وزراء ہر روز بلاناغہ برطانوی پڑاؤ میں آیا کریں گے تاکہ تمام امور بطرزِ احسن رُوبہ ترتیب ہو جائیں۔

امیروں کے وزراء ولی محمد خان، اخوند لقا خان اور ایک ہندو مُنشی رام تھے جو مسلّمہ قابلیت کے لوگ تھے اور اپنے آقاؤں کے معتمد علیہ لیکن مذاکرات کی رفتار کا بیان طولانی ہوگا، غیر دلچسپ اور بے سُود بھی۔ باقیماندہ قیام حیدر آباد میں سفیر تو انہی کا ہو کر رہ گیا۔ ان کی نوعیت انتہائی نازک اور پیچیدہ تھی اور ان میں دلچسپی کا کوئی پہلو نہ تھا اور چونکہ اب امیرانِ سندھ اپنے ابتدائی احساسِ برتری سے باز آ گئے تھے لہٰذا مذاکرات محض سیاسی نوعیت کے رہ گئے تھے اور میرے لئے یہی کہہ دینا کافی ہے کہ ان کے نتائج حکومت عالیہ ہند کو بے حد مطبوع و مرغوب معلوم ہوئے اور سفیر کو اپنے افسرانِ بالا کی طرف سے اپنی مضبوطی، وقار اور صحیح قوّتِ فیصلہ کے لئے خوب داد ملی جن کا اظہار و مظاہرہ اِس نے احکامات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کیا تھا۔ ایک سندھی سفیر بھی مشن کے ساتھ آیا تاکہ معاہدے کی مصدقہ نقل حاصل کر سکے۔

---

[1] حکومتِ عالیہ نے مشن کے ذمّے لگایا تھا کہ اِس جارحانہ و مدافعانہ معاہدے کو منسوخ کرا دے جو پچھلے سال حکومتِ بمبئی کے سفیر نے غلط فہمی کی بناء پر کر لیا تھا۔ فرانسیسی گماشتوں کو سندھ میں آنے سے روکنا اور برطانوی اور سندھی حکومتوں کے درمیان دوبارہ معمول کے تعلقات قائم کرنا گو بے حد اہم مقاصد تھے تاہم ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ پہلا مذاکرات سے حاصل ہو گیا اور دوسرا ان سے بھی پہلے کیونکہ یہی کافی عرصے موضوعِ بحث رہا تھا اور اِس کے بغیر مزید پیش رفت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

الوداعی باریابی کے بعد ہم ۲۵ اگست کی صبح کو تین جمپٹیوں پر سوار ہو گئے جو امیروں نے مہیا کی تھیں۔ سامان کرائے کی کشتیوں میں رکھ دیا گیا اور ہم حیدر آباد سے پھلیلی میں جنوب جنوب مشرق کی سمت میں روانہ ہوئے حتیٰ کہ گنی (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) کا دہانہ آگیا اور وہاں سے تیسری شام ہم گاؤں کدین پہنچ گئے جو گنی کی ایک شاخ کے انتہائی سرے پر واقع ہے[1] اور چونکہ یہاں پانی پایاب تھا جس پر کشتیاں نہ چل سکتی تھیں لہٰذا ہم نے اپنا سامان اتارا اور کچھ دن سیر و شکار میں گزار کر ہم سندھ کو کچھ سے جدا کرنے والی شور دلدلی زمین سے قلعہ لکھپت بندر کو چل دیئے جو کچھ کی مغربی حد پر واقع ہے اور یہاں ۷ ستمبر کو پہنچے۔ سامان اور مقامی ملازموں والی کشتیاں گنی سے سیدھی علی بندر پہنچ گئیں جہاں سے وہ دوسری کشتیوں میں مع سامان لونی دریا پر روانہ ہوئے اور بالآخر کچھ میں ہم سے آملے۔

اس راستے پر ہمیں صرف ایک قابلِ ذکر مقام ملا، محمد خان کا ٹنڈو، جو ایک بڑا اور ترقی پذیر قلعہ بند قصبہ ہے اور موجودہ امیروں کے ایک رشتہ دار، میر سلطان علی کی رہائش گاہ ہے۔ اس کے پاس کئی عمدہ علاقے ہیں اور تمام شمالی سوداگر یہاں آکر ٹھہرتے ہیں جو سالانہ ہندوستان کے لئے گھوڑے لے جاتے ہیں۔ اس کی آمدنی امسال (۱۸۱۲ء) چار سے

---

[1] اس کے ذکر نے مجھے بعض باتیں یاد دلا دی ہیں جو میں پہلے بھول گیا۔ سندھ کی بعض چھوٹی شاخیں ملک کے اندر پھیلی ہوتی ہیں اور اسی کی طرح یک لخت ختم ہو جاتی ہیں لیکن بعض دوسری اصل دھارے میں آملتی ہیں خواہ یہ پورے زور پر ہو۔ یہ مبصّر کو حیران کرنے والی بات ہے لیکن اس کی وجہ زمین کی ڈھال ہے جس میں یہ بل کھاتے ہوئے بہتی ہیں۔ اگر اوّل الذکر سمندر یا کسی بڑی گذرگاہ میں گرتیں تو وہ بھی مری نہ ہوتیں۔ لیکن ایک ندی کو کئی علاقوں سے گذرتے ہوئے دیکھنا اور پھر اس کے ... ہو کر چند انچ گہرے نالے میں بہنا اور وہ بھی اس تخفیف آب کے کسی واضح سبب کے بغیر واقعی بہت غیر معمولی چیز ہے۔ ان کا کچھ حصہ آبپاشی میں صرف ہوتا ہے لیکن مجھے اغلب ترین وجہ ریت کی قوتِ جاذبہ میں نظر آتی ہے۔

پانچ لاکھ روپے ہے اور اس کا علاقہ اس تیزی سے ترقی کر رہا ہے کہ اگر دیگر امیروں کی سازشوں نے اُسے تنگ نہ کیا اور وہ خود تعصّب سے بچا رہا تو اس کی آمدنی جلد ہی ان سے دگنی ہو جائے گی۔ حیدر آباد اور کدین کے درمیان دریائی کناروں کے آس پاس کا علاقہ عموماً بہت عمدہ اور زرخیز ہے لیکن امیروں کا علاقہ عموماً بیکار اور بے فصل پڑا رہتا ہے اور کاشت کاروں کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔

کدین سے لکھپت بندر تک راستہ ایک چٹیل، شور اور دلدلی میدان سے گزرتا ہے جو ٹنڈہ محمد خان سے چار میل دریے تک پھیلا ہوا ہے۔ لکھپت بندر سے ہم ... بندری تک آٹھ آسان منزلیں طے کیں جو خلیج کچھ کی مغربی طرف کا ایک ساحلی قصبہ و بندر ہے۔ یہاں آنریبل کمپنی کے جنگی جہازوں بنارس اور تین ماؤتھ کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ سفیر اور اس کے عملہ کو بمبئی پہنچا دے جہاں ہم اکتوبر کے آخر میں پہنچے۔ لمحقہ باب میں سندھ کی تاریخ اور وسعت کے علاوہ جغرافیائی اور شماریاتی کوائف بھی دیئے گئے ہیں جو میں پہلے نہ دے سکا تھا۔ اب سندھ کی آبادی ہندوؤں، جاٹوں اور بلوچوں سے مرکب ہے بلکہ آخری دو سے ایک تیسری نسل برآمد ہوئی ہے۔ ہندو ملک کے اصلی قابض تھے اور جاٹ ان ہندوؤں کی اولاد ہیں جنہوں نے اسلام قبول کر لیا (دیکھیئے جاٹوں کا بیان کچ گندا وا، باب ہشتم)۔ وہ خالصتاً زرعی یا میکانکی ذہنیت کے لوگ تھے لہٰذا انہوں نے تحفظ جائداد کے لئے بلوچوں کو اپنا لیا اور باہمی شادیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مقامیوں کی اکثریت ان شادیوں کا ثمرہ ہے۔ لفظ جاٹ ... ہو گیا اور اب ایک پست درجے کے ... نسان کے لئے مستعمل ہے جو بیچارہ اپنے حقوق کی حفاظت بھی نہ کر سکے۔ یہ سندھی محمود خان ... کی رعایا کے دشمن ہونے کے باوجود اپنا ماخذ انہی کو قرار دینے کے شائق ہیں اور اپنے سرداروں کی انتہائی تعریف کرتے وقت اکثر کہتے ہیں کہ وہ اصل بلوچ ہے مجھے احساس ہے کہ کسی قوم کی کردار نگاری سیاح کے فرض کا ایسا حصّہ ہے جس میں وہ اکثر غلطی کر سکتا ہے بالخصوص جب قوم کے محاسن ... بالکل انتہا تک ... پہنچے ہوئے ... ں

لہٰذا میں پوری احتیاط کے ساتھ رائے زنی کرتا ہوں کہ موجودہ سندھیوں میں معائب ایک افسوسناک حدتک غالب ہیں۔ وہ لالچی ہیں، پُرفریب، ظالم، احسان فراموش اور حق وصداقت سے بیگانہ لیکن ان کی صفائی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی موجودہ نسل ایسی حکومت کے تحت پروان چڑھی ہے جو اپنے استحصال، جہالت اور ظلم کی بنا پر دُنیا میں اپنی نظیر آپ ہے اور یہ تمام ممالک میں ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ذہنِ عامہ کی فرومائگی اس کے حکمرانوں کی روسیاہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں سندھی کردار کے ان نقائص کو صرف اسی وجہ واحد سے منسوب کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اکثر معائب اس اخلاقی خباثت کا نتیجہ ہیں جو کم وبیش ایشیا کی ہر اس قوم کی آبادی اور سماج میں مروّج ہے جس کا ہمیں معمولی سا بھی علم ہے[1]۔ سندھیوں کے مبیّنہ محاسن سراسر جسمانی ہیں اور اگر ہم انہیں کلّی طور پر بھی تسلیم کرلیں تو بھی وہ ان کے معائب کے مقابلہ پر ہیچ ہیں۔ یہ زیادہ تر ذاتی بہادری، اجتناب، جفاکوشی اور اطاعت شعاری بتائے جاتے ہیں جو انہیں اکثر ہندوستانی فوجوں کی طرح کرائے کے بہترین سپاہی بننے کا اعزاز بخشتے ہیں۔ ان میں سے اکثر انہیں اپنے ہمسایوں اور آباواجداد یعنی بلوچوں سے وراثتاً ملے ہیں، لیکن خواہ آب وہوا کا اثر ہو، خواہ ظالمانہ حکومت کا قہر ہو، خواہ دوسری قوموں سے اکثر اختلاط کا ثمر ہو سندھی اکثروبیشتر ان احساساتِ عالیہ سے عاری ہو چکے ہیں جو بلوچوں میں اب بھی موجود و محفوظ ہیں۔ عادات واطوار میں وہ عموماً بڑبولے اور ناتراشیدہ ہیں، ذہن میں کُند اور نااہل ہیں اور

---

[1] سندھ کے ہمسایہ ممالک میں اصطلاح "ایک سندھی کتا" "ایک دغاباز کاذب" کے مترادف ہے۔ یہ احساس موجودہ حکومت کی نفرت انگیزی سے بہت بڑھ گیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ میرے تمام ایشیائیوں کے متعلق نظریات کی وجہ سے مجھے انسان بیزار نہ سمجھا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم مشرق سے زیادہ واقف اور قریب ہوں گے اور ہماری تحقیقات آگے بڑھیں گی ووں ووں میرے اخذ کردہ نتیجہ کے عام اطلاق کے زیادہ واضح اور زیادہ مضبوط ثبوت ملتے جائیں گے۔ مخالف شواہد پر مجھے مسرت ہوگی لیکن اس کی اُمید بہت کم ہے۔

مہمان نوازی اور وفاکیشی میں بے لحاظ اور کو رے ہیں۔ ان کی اکثریت سُنّی مسلمان ہے لیکن امیر اور کبائرِ دربار شیعہ ہیں۔

سندھی مرد سانولے رنگ کے ہیں لیکن مجموعی طور پر بعید خوبصورت ہیں۔ وہ اہلِ ایشیا کے درمیانی قدوقامت سے بلند ہیں اور اچھے خدوخال اور قوی اعضا و جوارح کے مالک ہیں۔

سندھی عورتوں کا حُسن مشہور ہے اور صحیح طور پر مشہور ہے۔ جب ہم ٹھٹھہ اور حیدرآباد میں سوار ہو کر باہر نکلتے تھے تو ہمیں اونچے طبقے کی عورتیں کبھی کبھار نظر آتی تھیں جو ہمیں دیکھنے کی مشتاق ہوتی تھیں لیکن رقاصاؤں کے طائفے جو اکثر ہمارے پاس مظاہرۂ فن کے لئے آتے تھے میں نے اُن میں ایک بھی ایسی نہیں دیکھی جس کا چہرہ دلرُبا نہ ہو یا اس کا جسم متوازن و متناسب نہ ہو بلکہ اکثر یہ دیکھا کہ یہ دو نو صفات ان میں رچی بسی تھیں۔

مردوں کا لباس ایک کھُلی قمیص، ایک شلوار جو ٹخنوں پر چنٹ دار ہو اور ایک روئی دار سُوتی یا کپڑے کی ٹوپی ہے جس کے ارد گرد ریشم یا سونے کے پھُول کاڑھے ہوئے ہوں۔ عورتوں کا لباس بھی ایسا ہی ہے لیکن ٹوپی نہیں اور وہ قمیص کے نیچے ایک ریشمی جیکٹ پہنتی ہیں جو جسم کے مطابق ہو اور جس کے تسمے پیچھے بندھے ہوں۔ باہر نکلتے وقت وہ ساڑھی یا چادر پہنتی ہیں جس کا ایک پلّو سر پر ہوتا ہے اور جس سے وہ اجنبیوں کے سامنے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیتی ہیں۔

باب پانزدہم

صوبہ سندھ ـــ حدود اربعہ ـــ مصر سے مشابہت ـــ برطانوی حکومت
کے لئے عظیم سیاسی اہمیت کا حامل ـــ وجوہات ـــ اتنا گمنام کیوں ـــ
مصنف نے کیوں اس کی تاریخ شامل کی ـــ سندھ کا یونانی بیان ـــ
سگدی ـــ بھکر ـــ منصورہ ـــ محمود غزنوی ـــ یونانی مورخین کی ثقاہت
کا اہم ثبوت ـــ من نگر ـــ موسیو ڈی امینول ـــ لاڑکانہ ضلع چنڈوکی کا
صدر مقام ـــ یونانی بیان کا تسلسل ـــ سامبوس کا علاقہ ـــ ان کے محلِ وقوع
کا ثبوت ـــ قلعہ سیہوان ـــ قیاس آرائی ـــ پٹالہ ـــ ڈیلٹا ـــ مصنف کے
شکوک پٹالہ کے بارے میں ـــ ایرین کا بیان دریائے سندھ پر ـــ نیارکس
بحری بیڑے کا انتظام سنبھالتا ہے ـــ یونانی مورخین کی صداقت وصحت کے ناقابلِ انکار
نمونے ـــ کروکلہ یا کراکل ـــ یونانی حملہ کے بعد تاریخ بہت مبہم ـــ نوشیروان یا
خسرو شاہِ ایران ـــ سسی راجگان ـــ سہیر سنگھ ـــ سندھ میں انقلاب ـــ
سسی خاندان کا زوال ـــ چچ خاندان کا عروج ـــ اس کی تاریخ اور خاتمہ ـــ
خلفائے بغداد ـــ فتح سندھ ـــ اس کا بیان ـــ خلفائے امیہ وعباسیہ کی
حکومت ـــ ان کا سندھ کو خیرباد کہنا ـــ محمود غزنوی کی آمد ـــ فتح ـــ
قبیلہ سمرو ـــ غوری شہنشاہ ـــ قبیلہ سمہ ـــ حکومت پر قبضہ ـــ سندھ
سلطنتِ ہند کا ایک صوبہ ـــ وائسرائے کا تقرر ـــ اختیارات ـــ مغل حملہ بابر

سندھ پر اثرات — ارغونی قبیلہ — ترخانی قبیلہ — اس کی بغاوت — سندھ ان کے سپرد — آزاد ہو کر نواب کہلاتا ہے — ہمایوں قابو نہ کر سکا — چند سالوں کی صورتِ حال — شہنشاہ اکبر کی تسخیرِ سندھ — نوابین میں تبدیلی — خاندانِ کلورا — نادر شاہ کا حملۂ ہند — سندھ اور دیگر مغربی اضلاع اس کے سپرد — نادر کا قتل — احمد شاہ ابدالی سلطنت کابل کا بانی — نوابین سندھ کا رویہ — پنجاب اور سندھ شہزادہ تیمور کے سپرد — مرہٹہ اقتدار — کلوروں کو اس کا فائدہ — ان کی پالیسی کے آخری نتائج — تالپور — باغی — سندھ پر قبضہ اور کلوروں کا اخراج — بحالی — دوبارہ اخراج — میر فتح علی تالپور کی حکومت کی تصدیق — بغاوت — زمان شاہ کا غیر دانشمندانہ سمجھوتہ — اس کے اثرات — تالپوروں کی آمد پر سندھ کی تقسیم — میر سہراب — میر تھارا — ان کے علاقے — آمدنی — فوج — میر فتح علی کی وفات — آمدنی کی تقسیم — تینوں امیروں کے مابین غیر معمولی اتحاد — اس پر تبصرہ — آمدنی میں مبینہ اضافہ — امیروں کی ہوس اور بدتمیزی — ان کے نظریات کیع بج پر — برطانوی حکومت کی مداخلت — سندھ کی موجودہ حالت — مصنف کی رائے امیروں پر — برطانوی حکومت کی غیر عاقلانہ بُردباری — اس کے اثرات۔

صوبہ سندھ کے شمال میں صوبہ کچھ گنداوا، ضلع شکارپور اور بہاول خان الملقب بہ داؤد پوترا کے علاقے ہیں۔ جنوب میں بحرِ ہند اور رن کچھ کا کچھ حصہ ہے۔ مشرق میں ایک صحرائے بسیط ہے جو اسے اجمیر، مارواڑ، اودے پور، جودھپور اور بیکانیر وغیرہ کی ریاستوں اور صوبوں سے علیحدہ کرتا ہے اور مغرب میں صوبجات لاس و جھالاوان ہیں۔ سندھ کی مصر سے مشابہت اتنی گہری ہے کہ مبصر حیران رہ جاتا ہے۔ ایک ہموار میدان جس کے بیچوں بیچ

ایک عظیم الشان دریا بہتا ہے جو اپنے دونوں کناروں کے ملحقہ علاقوں کو زرخیز و زرخیز بناتا ہے اور پھر ایک طرف سطحِ زمین ایک ریگستان کا روپ دھار لیتی ہے اور دوسری خشک، چٹیل پہاڑوں کا جو زمین اور آب و ہوا دونوں کے لحاظ سے بے فیض ہیں۔

صوبے کی قدرتی حیثیت ایسی ہے کہ یہ ہندوستان میں انگریزی مقبوضات کی مغربی سرحد پر ہے۔ اس کا دریا اس طرف سے حملے کے خلاف ایک عظیم رکاوٹ ہے اور یہی رکاوٹ ہماری ملکہ بحر حکومت کے لئے کچھ آسانیوں کی آئینہ دار بھی ہے۔ اگر کبھی اسے ہندوستان کی طرف بڑھتی ہوئی مخالفانہ قوت کے خلاف فوجی کارروائی کی ضرورت پڑے۔ لہٰذا یہ بے حد سیاسی اہمیت کا علاقہ ہے۔ گجرات اور برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر انتظام و انصرام دیگر علاقوں سے اس کا اتصال ہی دعوتِ تجسس دیتا ہے اور اس کے تاریخ و جغرافیہ کے عمیق مطالعہ کا متقاضی ہے۔ اس کے موجودہ حکمرانوں کی تیس سالہ حکومت اور اس کی بے نظیر تنگ ظرفی اور مشکوک پالیسی نے اس مطالعہ کو تازیانہ لگا دیا ہے۔ میرے بلوچستان کے حالیہ مشاہدے نے مجھے سندھ کے متعلق بھی معمولی سی تاریخی تحقیق کا موقعہ دیا کیونکہ یہ اس کا متصلہ علاقہ ہے اور پھر دونوں علاقوں کے مقامی باشندے ہم نسل ہیں لہٰذا میں اپنے مطالعات کا خلاصہ یہاں اس اُمید پر پیش کر رہا ہوں کہ یہ حرفِ آخر نہیں بلکہ آئندہ محققوں کے لئے نقطۂ آغاز ہو سکتا ہے جب میں نے ابتداء میں اپنے لمحاتِ فرصت مطالعۂ سندھ پر صرف کرنے شروع کئے تاکہ انہیں شائع کرایا جا سکے تو مقصد یہ تھا کہ سندھ کی مفصل تاریخ لکھوں گا، لیکن مجھے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ یہ تو ایک ضخیم کتاب ہو گی اور میرے پاس صرف پچھلے دو سو سال کے حقیر مسودات تھے جو ادھورے تھے اور پھر اس کتاب کے دیگر موضوعات میرے ذہن پر اتنے مستولی تھے کہ میں نے اپنی یہ کوشش ترک کر دی اور اسی لئے اپنے محدود مبلغ علم پر ایسا شرمسار ہوں کہ اگر میں نے مختلف سابقہ ابواب میں ان مندرجات کا ذکر نہ کیا ہوتا تو شاید میں اس باب کو ہی حذف کر جاتا:

سنِ عیسوی سے چوتھی صدی پیشتر صوبہ سندھ کا یونانیوں کو پہلی دفعہ اس وقت معلوم

ہُوا جب فوج نے سکندر کے حکم پر بھارت میں داخل ہونے سے انکار کر دیا لہٰذا اُس نے بر چہ بادا باد کہتے ہُوئے اپنی کشتیاں دریائے سندھ میں ڈال دیں حتیٰ کہ وہ سمندر تک پہنچ گیا اُس وقت پنجاب سے سمندر تک جن علاقوں سے وہ گذرا اُن میں کئی حکومتیں برسرِ اقتدار تھیں۔ ان میں شمالی ترین سگدی تھی جسے بھکّر کا موجودہ قلعہ یا شہر بتایا جاتا ہے جو دریائے سندھ کے وسط میں ایک جزیرے پر بنا ہُوا ہے اور منقسم دھارے کے دونوں کناروں پر سکھر اور روہڑی اس کے مضافات ہیں۔ آئینِ اکبری سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جگہ بعد میں منصورہ کہلائی لیکن غالباً یہ محض ایک عارضی نام تھا جو ہندوؤں پر حاصل کی گئی ایک فتح کی یاد میں اُس علاقے کے عرب فاتحین نے اِسے دیا تھا۱۔ اب بھی یہ ایک اہم جگہ ہے گو قلعہ بندیاں ٹوٹ پھوٹ چکی ہیں لیکن کوئی ایسی دستاویز میسّر نہیں جس سے یہ پتہ چل سکے کہ اِسے موجودہ نام بھکّر کب دیا گیا؟ ۱۴۱۶ھ (۱۰۰۱ء) میں مجھے یہ ذکر ملا ہے کہ مشہور شہنشاہ محمود غزنوی نے اُس پر قبضہ کیا اور چند سال پہلے اِسے پچیسویں خلیفہ عباسی، القادر باللہ نے مقامی سرداروں کے سپُرد کر دیا تھا وہ آخری خلیفہ تھا جو موجودہ سلطنتِ ایران کے مغرب کی طرف کے بعض علاقوں پر بھی قابض تھا۔

سکندر نے سگدی کا مقام دوبارہ تعمیر کروایا اور ایک دستہ فوج چھوڑ کر ایک حکمران موسومہ بہ مُوسیکانوس کے علاقوں کی طرف چل پڑا، جنہیں صاف اور ناقابلِ تردید طور پر

---

۱ منصور کا عربی میں مطلب فاتح ہے یا زیرِ حفاظت۔ شاید بھکّر کے محلِ وقوع اور استحکام کی بدولت دوسرا معنی قرینِ قیاس ہے۔ لیکن یہ بھی متن کی طرح قیاس آرائی ہے موسیو ڈی اینول کا خیال ہے کہ منصورہ اِس سے بہت نیچے تھا لیکن میرا قیاس اس کے دیئے ہوئے مقام پر بھی نہیں ٹھہرتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خلیفہ المنصور کی وجہ سے موسوم ہُوا ہو جس کے دور میں یہ سلطنتِ بغداد میں شامل کیا گیا جیسا کہ موسیو نے لکھا ہے۔

موجودہ ضلع چند دکی سے شناخت کیا گیا ہے اور جو اُن دنوں کے مورخین کی صحت و صداقت کا واضح ثبوت ہے۔ مَیں نے پہلے ہی اس کی غیر معمولی زرخیزی اور اس کو سیراب کرنے والے دریا کا ذکر کیا ہے اور ان قدمائے نے یہاں ایک وسیع جزیرہ کی تصویر کشی کی جو ایک ندی سے وجود پذیر ہوتا تھا جو خود دریائے سندھ میں دوبارہ جا ملتی تھی اور اسے انہوں نے پراسیانے یعنی سرسبز کا نام دیا[1]۔ اس کے صدر مقام کا نام واضح نہیں ہے لیکن ڈاکٹر ابنول کا خیال ہے کہ یہ من نگر تھا جو بلا شک و شبہ میان نگر یا وسطی شہر کا نام تھا[2] لیکن مجھے اس کے بیان کردہ محل وقوع کی کوئی جگہ نہ مل سکی۔

ان دنوں صدر مقام لاڑکانہ[3] ہے جو اپنے ہمنام دریا پر واقع ہے اور سندھی امیروں کے لئے نہایت اہم چوکی ہے، کیونکہ وہ اپنی سلطنت میں داخل ہونے والے سوداگروں سے پہلی دفعہ یہیں چونگی وصول کرتے ہیں اور اس کے علاوہ کچ گنداوا کے بلوچوں کی دستبرد سے بچنے کے لئے یہیں ایک بڑی فوج متعین رکھتے ہیں۔

---

[1] مجھے نہایت مسرت ہے کہ میرے چند دکی کے سابقہ بیان سے پہلے مجھے اس بات کا پتہ نہ تھا اور اس نے نہ صرف میری معلومات کی تصدیق کر دی بلکہ قدیم جغرافیہ کے ساتھ ایک زبردست تطابق پیدا کر دیا۔ موجودہ سندھی میں لفظ چند دکی کا معنی ہے نقرئی یا روپہلا یعنی یہ دولتمندی یا دیدہ افروزی کے لئے استعارہ ہے۔ اگر مَیں نے پنجاب کے دریاؤں کا بھی ذکر کیا ہوتا تو مَیں ثبوت دے سکتا تھا کہ جہاں کہیں ہمارے جغرافیہ دانوں نے ہمارے قدمائے سے اختلاف کیا وہ گمراہ ہو گئے۔

[2] من نگر یا میان نگر (میان = وسط اور نگر = شہر) کو ڈی ابنول موجودہ صدر مقام بتاتا ہے۔

[3] مَیں نے لاڑکانہ کو کسی پرانی جگہ میں ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کی۔ لاڑ کا معنی سنسکرت میں لعاب ہے اور کانہ = خانہ یا گھر۔ اگر ہم لعاب کا مفہوم دریا کی گاد لیں تو ایک مقامی حقیقت کا مظہر ہے کیونکہ مقامی لوگ اس پاس کے علاقہ میں اسی کی کھاد ڈالتے ہیں۔

جب سکندر موسیکانوس کے پاس تھا تو اُس نے دو سرداروں کے خلاف فوج کشی کی۔ انہیں آکسیکانوس اور سامبوس کہتے ہیں۔ موخر الذکر اوّل الذکر کی ریاست سے ملحقہ پہاڑی علاقوں میں رہتا تھا لہٰذا یہ ظاہر ہُوا کہ وہ ان قبائل کا سردار تھا جو اُن دنوں جھالاوان کے مشرق کے سلسلۂ کوہ کے علاقوں میں رہتے تھے اور جو سہوان پر دریائے سندھ کو چھوتے ہیں۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ دریا کے مغرب کی طرف کوئی اور پہاڑ یا پہاڑیاں نہیں اور مشرق کی طرف ایک ہموار میدان ہے اور پھر کہیں صحرا پار کرنے کے بعد ہم ہندوستان کی راجپوت پہاڑیوں تک پہنچتے ہیں۔ ایک سردار کی شکست اور دوسرے کی موت کے بعد مقدونوی فاتح دریا کی طرف واپس آیا اور معلومات کے مطابق اُس نے ایک کشادہ اور وسیع المشاہدہ مقام تعمیر کیا جسے میں بلا پس وپیش موجودہ سہوان کی جگہ پر سمجھوں گا جہاں قلعہ ایک اونچی پہاڑی پر ہے جہاں سے دریائے سندھ اور دریائے لاڑکانہ کے گاؤں پر نظر رکھی جا سکتی ہے اور قرب وجوار کو مرعوب کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد برّی اور بحری مہم پٹیالہ پہنچی جو دریا کی شاخوں کے ساتھ ڈیلٹا کے دہانہ پر تھا، لیکن قدیم بیانات کے مطابق اُس کی پورے سندھ میں کوئی شبیہہ نہیں ملتی اور

---

[1] مجھے افسوس ہے کہ مَیں خود اس زبان سے ناواقف ہُوں جس میں موجودہ موضوعات کا مواد مرقوم ہے۔ ایک عالم فاضل دوست کی مہربانی سے میں نے مختلف جزئیات کی تعبیر کی ہے اور موسیو ڈی اینو ل اور ڈاکٹر وِنسنٹ سے بھی استفادہ کیا ہے۔ موسیکانوس اور مُو، سہوان میں زبردست مشابہت ہے۔ آخری دونو ملحقہ علاقے ہیں اور بالکل یونانی بیانات کے مطابق واقع ہیں اور آج بھی لوگ ان کا ایک ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ مَیں اشتقاقی تحقیقات کا قائل نہیں لیکن یہاں مشابہت بہت گہری ہے۔ ڈاکٹر ونسنٹ انہیں لقب سمجھتا ہے اور علاقوں کے نام نہیں اور سیوی کو سہوان بتاتا ہے لہٰذا ایرین اور آئین اکبری میں تضاد اور تخالف پاتا ہے۔

اسے ٹھٹھہ یا حیدرآباد سے منسوب کرنا کیساں طور پر مشکوک ہے[1]۔

ٹپالہ میں فوج کے قیام کے دوران سکندر اپنا کچھ بیڑہ لے کر دو دفعہ سمندر کو گیا اور ایرئین کے مطابق اُس نے دریا کے صرف دو دہانے دیکھے۔ یہ قابلِ ذکر ہے کہ صرف یہی دو دہانے یعنی مشرقی اور مغربی ان تیس سالوں میں قابلِ جہازرانی تھے اور اگر علی بندر پر پشتہ نہ بنتا، جیسا کہ میں نے پچھلے باب میں لکھا ہے تو آج بھی صرف یہی دو دہانے جہازرانی کے لائق ہوتے۔

جب صوبجات لاس و مکران سے فوج کے گذرنے کی ضروری تیاریاں ہو چکیں تو بحری بیڑہ نیارکس کی سرکردگی میں دے دیا گیا تاکہ وہ سمندر کے راستے بڑی فوجوں سے بابل میں آملے۔ اس بیڑے کا دریائی اور پھر ساحلی سفر (راس ایرس (آب راس مونز، سندھ کا آخری مغربی مقام) تک میرے مقصد سے غیر متعلق ہے اور میں یہاں صرف یونانی مؤرخین کی صداقت کے رو اور ناقابلِ انکار ثبوت دے کر اس موضوع کو ختم کر دوں گا۔ ایک تو سمندر کا خوفناک تموّج ہے جو تازہ اور شوریانی کے سنگم پر مذکور ہے اور جس کا میں نے حصۂ اول میں ۱۶ر جنوری کی ڈائری میں ذکر کیا ہے اور دوسرا یہ کہ کراچی کی

---

[1] میجر ریل نے ڈیلٹا کی لمبائی ۱۰۰ میل بتائی ہے۔ گویا سمندر دو درجے ساحل سے آگے بڑھ گیا ہے اور وہ بھی اُس وقت جب ہم ٹپالہ کو حیدرآباد سمجھیں۔ ٹھٹھہ سے اس شہر کا فاصلہ کیپٹن میکس فیلڈ کے سروے کے مطابق ۵۲ میل تھا اور مشن کا ایک ذہین ہندوستانی جو کراچی سے بھاری سامان کے ساتھ براستہ دریا ٹھٹھہ آیا تھا اُس نے دھراجے بندر پر بڑے دریا میں داخل ہونے کے بعد تیس یا چالیس سندھی کوس کا اندازہ لگایا جسے ہم زیادہ سے زیادہ ۵۰ میل سمجھ سکتے ہیں۔ زیریں سندھ کے دو سو سے زیادہ مقامیوں نے جو اندازے دیئے اُن کی اوسط ٹھٹھہ تا سمندر ۹۰ میل بنتی ہے۔ میرے خیال میں یہ قطعی ہے اور اگر پھر بھی کسی کو شک ہو تو کراچی اور ٹھٹھہ کے عرض بلد اس حقیقت کو ظاہر کر سکتے ہیں۔

بندرگاہ ہو بہو ایرئین کی موسومہ کروکلا ہے۔ مجھے ۱۸۰۹ء کے تحریر کردہ ایک مقامی مسودے میں اس علاقے کا نام کھراله ملا جس میں کراچی واقع ہے اور میرے خیال میں اس بندرگاہ خورعلی کا موجودہ نام اسی لفظ کا ایک متعصبانہ بگاڑ ہے[1]۔

میں اگر مقدونوی حملے کے بعد اور عرب حملے سے پیشتر کے زمانہ کے دوران سندھ کی تفصیلی تاریخ لکھنے کی کوشش کروں تو یہ بے سُود ہوگی۔ مقامی ہندو حکمرانوں کے نام بھی مذکور نہیں اور میں نے جتنے مسودات دیکھے ان میں مشہور خسرو (نوشیروان) شاہِ ایران[2] کا ذکر ہی ملتا ہے جس نے ایک لشکرِ جرار بھیجا تاکہ کسی راجہ کے مقبوضات کی مغربی سرحد پر لوٹ مار کرے۔ بیان کردہ مقبوضات بمعہ باجگزار ریاستیں شمال کی طرف کشمیر و کابل، جنوب کی طرف سورت اور دیو، مغرب کی طرف ساحل مکران اور مشرق کی طرف مارواڑ، بیکانیر وغیرہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ راجہ کا نام سہیر سنگھ بتایا گیا ہے اور اُس نے خود مکران میں اس حملے کے خلاف جم کر لڑائی کی اور مارا گیا اور اس کی فوج کو شکستِ فاش ہوگئی لیکن ایرانی آگے نہ بڑھے اور لوٹ مار کرکے واپس چلے گئے جس میں ہزاروں خوبصورت ترین قیدی عورتیں بھی شامل تھیں۔ اِس

---

[1] جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے خورعلی کا معنی ہے علی بندر گویا ایک مذہبی نام ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یونانی اور حالیہ بیانات سندھ کا تقابلی مطالعہ اوّل الذکر کو جزئیاتی صداقت میں بہتر ثابت کرتا ہے۔ سمندر کے پاس دریا کی غیر معمولی چوڑائی، جھاڑیوں کی وجہ سے کھاڑیوں کا ناقابلِ جہازرانی ہونا، ڈیلٹا کا دریاؤں سے منقطع نہ ہونا اور پانی کا شور ہونا لہٰذا اسے کھودتے ہی نکال لینا۔ چند مثالیں ہیں جو مجھے ملیں۔ میرے خیال میں نیارکس کے بحری سفر کا مورخ عموماً صحیح نتائج پر پہنچا۔ اور اگر وہ ایرئین کی پیروی کرتا تو اس کی صحت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔

[2] نوشیروان چھٹی صدی عیسوی کے قریباً وسط میں ہوا ہے۔ وہ رومی قیاصرہ جسٹینین اور جسٹن کا ہم عصر تھا۔

کے بعد اسی خاندان کے دو اور گمنام شہزادے گدی نشین ہوئے اور انہوں نے بہت عدل و انصاف سے حکومت کی۔ پہلے نے دفاعی اقدامات کئے اور لوگوں سے مالیہ لینے کی بجائے قلعے بنوائے اور ان قلعوں کی مرمت کروائی جو اس کے آباو اجداد کے دور میں رُوبہ انحطاط ہو گئے تھے۔[1]
دوسرا شروع میں اسی طرح فرض شناس رہا لیکن پھر خوشحالی نے اس کا دماغ خراب کر دیا۔ وہ نذرِ تعیش ہو گیا اور ہفتوں بجھے زنان خانے میں رہتا اور امورِ سلطنت وزیر پر چھوڑ دیئے۔ قریباً اسی وقت وزیر بیمار پڑا اور ایک کم مرتبہ نوجوان برہمن راجہ کا رازدار بن گیا اور براہِ راست احکام لینے لگا۔ اس کی وجہ سے اُس کی زنان خانے میں بھی رسائی ہو گئی اور وہ اور ملکہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی ایسے گرفتارِ عشق ہوئے کہ مایوسیوں کے باوجود دادِ عیش دینے میں کامیاب ہو گئے۔ برہمن کو وزیرِ اعظم بنا دیا گیا اور تھوڑے ہی عرصہ بعد راجہ کی موت پر دونوں نے شادی کر لی اور اُسے مسند نشین کر دیا گیا۔ مورخ لکھتا ہے: "یہ تھا راجہ سستی کی نسل کا انجام، جس نے سندھ پر دو ہزار سال سے زیادہ حکومت کی تھی، جس کے حکمران کسی وقت گیارہ باجگزار ریاستوں کے آقا تھے اور جنہوں نے دنیا کے عظیم ترین حکمرانوں کی دھمکیوں کو پائے اِستحقار سے ٹھکرا دیا تھا۔"[2]
مذکورہ برہمن چچ تھا اور اُس سے چچ راج شروع ہوا۔ اس کی توسیع پسندی نے سابقہ خاندان کے افراد کو متنفر کر دیا اور اُنہوں نے راجگانِ چتوڑ، جیسلمیر، جودھپور وغیرہ کے ساتھ اتحاد کر کے حملہ کا منصوبہ بنایا لیکن چچ نے بے حد دولت اور دل پسند اطوار کے

---

[1] ان میں سے بعض قلعوں کے نام سہوان، مؤ، اُچا، نرائن کوٹ وغیرہ تھے اور پہلے تین اب بھی انہی ناموں سے مشہور ہیں۔
[2] اس سے مُراد شاہانِ ایران ہیں جو قیامرۂ روم سے سیادتِ ایشیا کے لیے برسرِ پیکار تھے۔

زور پر ایک لشکر جمع کیا اور سرحد جیسلیر پر متحدہ افواج سے لڑا۔ آغاز پر ہی متحدہ افواج کے سالار نے اسے جنگ یکّی کے لئے للکارا اور وہ دونوں فوجوں کے رُو برو لڑے ۔ چچ غالب رہا، سالار مارا گیا، متحدہ فوج تتر بتر ہوگئی اور سندھی فوج نے اُس کا خوب صفایا کیا۔ اس کے بعد چچ کو اِس طرف سے کوئی مسئلہ دوبارہ پیش نہ ہُوا اور وہ بڑھاپے تک حکومت کرتا رہا۔ وہ ۸۶ھ (۶۷۱ء) میں فوت ہُوا اور اس کا بیٹا داہر آرام سے تخت پر بیٹھ گیا۔ کچھ عرصہ بعد خلیفۂ بغداد کے لشکر نے اس پر حملہ کیا، جس کی وجوہات مذہبی جوش و خروش اور بے حُرمتی بتائی گئی ہیں[1]۔ اصل میں پیغمبرِ اسلام کے جانشین ہر سال اپنے لوگوں کو سندھ خادمائیں خریدنے کے لئے سندھ بھیجا کرتے تھے جو اپنے رنگ روپ کی وجہ سے بہت مرغوب سمجھی جاتی تھیں۔ ایک دفعہ ایک جماعت برہمن آباد سے دیبل بندر (اب لاہوری بندر، یہ دیبل معلوم ہوتی ہے لیکن مجھے اس کا کوئی معنی نہ مِل سکا ۔ مجھے تمام مسودات میں دیبل ہی ملا) واپس ہُوئی تو راجہ کی فوج نے تعاقب کیا اور سب کو قیدی بنا لیا ۔ وہ سب لڑائی میں مارے گئے یہ تیسرے اموی خلیفہ عبدالملک کے دور میں ہُوا جس نے اس کا اور فتح سندھ کے سابقہ منصوبوں کی ناکامی کا انتقام لینے کا فیصلہ کیا جو حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے وقت سے بنتے اور بگڑتے رہے تھے اور بحری مُہمات بھی کامیاب نہ ہو سکی تھیں۔

اِس بالآخر کامیاب ہونے والی مُہم کی کمان والئی عراقین، حجاج بن یوسف کے سپرد کی گئی لیکن ایران میں مصروفیات کی وجہ سے اس نے اپنے داماد محمد بن قاسم کو اس کی سرکردگی کا حکم دیا ۔ سندھی راجہ کو وزراء نے دارالحکومت الور میں ہی مسلمانوں کا انتظار کرنے کا مشورہ دیا جس پر رعایا بددِل ہوگئی اور دشمن نے سلطنت کے طُول و عرض میں تباہی مچا دی اور فاتحانہ انداز میں سندھ پار کیا ۔ اب راجہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور وہ ۹۲ھ میں۔ ارماہ رمضان

---

[1] دیکھئے باب دوم، حصّہ دوم۔

کو اپنے جنگی ہاتھی اور بہترین فوج لے کر شہر سے نکلا تاکہ بازیابیٔ علاقہ کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دے لیکن پانی سر سے گذر چکا تھا اور اُس نے لڑائی میں اپنی سلطنت کے ساتھ اپنی جان بھی کھو دی[۱]۔ اس کے فوراً ہی بعد پورا سندھ مسخر کر لیا گیا اور بے شمار نوادرات بمعہ دو راجکماریاں[۲] بطورِ تحائف خلیفہ کو بغداد روانہ کر دیئے گئے۔ پانچواں حصہ تعمیرِ مساجد کے لئے

---

[۱] "مجمع الواردات" میں اس لڑائی کی تفصیل دی گئی ہے جو راجگان سندھ کی شان و شوکت کی مظہر ہے لہٰذا ایک اقتباس پیش کر رہا ہوں: "روایت ہے کہ راجہ ایک ہاتھی پر ہودہ میں نشستہ تھا جس کے اوپر مرصع چتر تھا۔ دو سُندر خادمائیں ساتھ تھیں۔ ایک شراب اور دوسری پان سپاری پیش کرتی تھی۔ یہ ہاتھی سود یگر کے وسط میں چل رہا تھا اور ایک ہزار شاہی محافظ چمکدار فولادی زرہ بکتر میں ملبوس ان کو گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ سندھی فوج تیس ہزار پیادہ اور سوار پر مشتمل تھی اور خلافت کی فوج بارہ اور تیرہ ہزار کے درمیان تھی۔ لڑائی طلوعِ آفتاب پر شروع ہوئی اور جھٹ پٹے تک جاری رہی۔ راجہ کے ہاتھی منجنیقوں کی سنگباری سے ڈر گئے اور سندھ میں کود گئے۔ راجہ کا ہاتھی کیچڑ میں پھنس گیا اور عین اس وقت راجہ کی گردن پر تیر لگا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ پھر سراسیمہ فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ برہمن اور امراء وزراء قیدی بنا لئے گئے۔ مسلمان نمازِ شکرانہ کے بعد میدانِ جنگ میں ہی سوئے اور صبح کو معمولی مذاکرات کے بعد الور پر خلیفہ ولید بن عبدالملک کے نام پر قبضہ کر لیا۔"

[۲] ان راجکماریوں کو ایشیا کی حسین ترین عورتیں بتایا گیا ہے۔ بغداد پہنچ کر انہوں نے محمد بن قاسم پر بہتان لگایا کہ بغداد بھیجنے سے پہلے اُس نے اُن کی بے حرمتی کی تھی۔ خلیفہ نے مشتعل ہو کر نائب سالار کو حکم بھیجا کہ اُسے ایک کھال میں سلوا کر بھیج دیا جائے اور بدستِ خود فرمان پر لکھا "محمد بن قاسم: جہاں بھی یہ تمہیں ملے، تم اپنے کو گائے کی کھال میں سلواؤ اور میرے سامنے پیش ہو جاؤ۔ اس میں کوئی عذر نہ سنا جائے گا۔" یہ خط اُسے اُودے پور ملا اور گو وہ بالکل بے گناہ تھا پھر بھی اُس نے اپنے آقا کی (باقی اگلے صفحہ پر)

رکھ کر باقی مالِ غنیمت سالاروں اور سپاہیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ راجہ کے دو بیٹے قلعہ سکندر[1] بھاگ گئے تھے اور مقابلہ کرتے رہے لیکن پھر اس پر حملہ کیا گیا اور سب کو چن چن کر مار دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سندھ کی مدافعت و مقاومت ختم ہو گئی۔

اکثر لوگ خلیفہ کے نام کا خطبہ[2] سن کر اور یہ دیکھ کر کہ فوری اطاعت باعثِ وقار ہے، جوق در جوق اور قبیلہ در قبیلہ محمد بن قاسم کے پاس آنے لگے اور مشرف بہ اسلام ہونے لگے۔ لیکن کچھ نے خوف یا اختلاف کی وجہ سے قبول اسلام گوارا نہ کیا اور اسے آقا تسلیم نہ کیا لہٰذا وہ بلوچستانی پہاڑوں میں دھکیل دیئے گئے جہاں انہوں نے اپنی بستیاں آباد کیں جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا۔ اس کے بعد محمد بن قاسم شمالی اور مشرقی فتوحات کے لئے نکلا اور حکومتِ سندھ کا امیر ایک انصاری کو بنایا جس کا خاندان موروثی طور پر امارت کرتا رہا حتیٰ کہ بنو عباس نے بنو امیہ کو بے دخل کر دیا اور یہ واقعہ ہند و حکومت کے خاتمہ کے کوئی چالیس سال بعد ہوا۔ اموی عمّال برطرف کر دیئے گئے اور عباسی خلفاء اپنی منشا سے والیوں میں رد و بدل کرتے رہے اور تاریخِ سندھ کوئی تین صدیوں تک حاکموں کے یکے بعد دیگرے تقرر و تنزل کی ایک خشک دستاویز بن کر رہ گئی۔ صوبے کا امن و امان کبھی کبھار قسمت آزماؤں کے حملوں سے بری طرح متاثر ہوتا رہا

(بقیہ حاشیہ)

یہ ظالمانہ اور غیر منصفانہ سزا اپنے پر عائد کر لی۔ وہ تیسرے دن فوت ہو گیا اور جب خلیفہ کو پتہ چلا کہ راجکماریوں نے محض بہتان تراشی کی تھی تاکہ وہ اپنے باپ کا انتقام لے سکیں تو وہ اتنا برافروختہ ہوا کہ انہیں ننگا کر کے سروں کے بال گھوڑوں کی دموں سے بندھوا کر بغداد کے بازاروں میں پھروایا، حتیٰ کہ وہ مر گئیں۔ ان کے جسموں کی دھجیاں دریا میں پھینک دی گئیں اور دمشق میں محمد بن قاسم کی یاد میں ایک شاندار مقبرہ بنایا جو کئی صدیوں تک ایستادہ رہا۔

[1] قلعہ سکندر بہت مضبوط جگہ بتائی جاتی ہے۔

[2] خطبہ تمام مسلمان ممالک میں حکمران اور اس کے اقتدار کے تحفظ کے لئے بطور دعا پڑھا جاتا ہے۔

کئی دفعہ وہ بیشتر حصّے پر قابض ہوتے رہے لیکن بغداد سے کمک آجاتی تو امن و امان ازسرِنو بحال کر دیا جاتا۔

پانچویں صدی ہجری میں خلیفہ القادر باللہ کو سندھ اور ملحقہ ممالک سے اپنی افواج واپس بُلانا پڑیں تاکہ وہ محمود غزنوی کے حملوں سے اپنے قریبی علاقوں کو بچا سکے اور یوں سندھ ملوک الطوائف کا بازیچہ بن گیا جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی سیادت کے علَم لہرا رہا تھا۔ اس انتشار و خلفشار کو بالآخر محمود نے ہی ختم کیا جس نے اِسے فتح کر کے اپنا باجگزار بنا لیا حاکم غزنی سے آنے لگے حتیٰ کہ مسعود بن محمود کے وقت سُمرا قبیلہ نے مسلح بغاوت کی اور غزنی کے طرفداروں کو پکڑنا شروع کیا لیکن سمرا سردار سنسنار نے معافی مانگ لی اور خراج کے بدلے اُسے ہی گورنر بنا دیا گیا۔

اس کے بعد ڈیڑھ سو سال تک باقاعدہ خراج ادا ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ غوریوں کی آمد پر موقتی سُمرا والی آزاد ہو گئے اور گو اُنہیں کئی معرکوں میں شکستیں ہوئیں تاہم وہ اپنی خود مختاری قائم رکھ سکے حتیٰ کہ دودا (جو لاولد تھا) کی موت (۶۹۴ھ) پر یہ خاندان تین سو بتیس سال کے اقتدار کے بعد ختم ہو گیا[1]۔

دودا کے بعد سندھ ایک دفعہ پھر قریباً ایک صدی کے لئے طوائف الملوکی کی نذر ہو گیا۔

---

[1] آئینِ اکبری نے سُمرا حکومت کا دورانیہ پانچ سو سال بتایا ہے اور لکھا ہے کہ کم از کم ان کے چھتیس حکمران ہوئے ہیں لیکن نہ اُن کے نام دیئے ہیں نہ سنہ۔ میں نے بہت تجسّس و تفحّص کے بعد بارہ یا چودہ نام معلوم کئے ہیں لیکن اس مجمل خاکے میں اُنہیں گنوانا غیر ضروری ہے۔ میرے خیال میں شاید دس اور حکمران ہوں گے گویا کُل چوبیس ہوں گے اور دورانیہ حکومت کے متعلق تو مجھے کوئی شبہ ہی نہیں۔ سنوں میں تضاد اور اختلاف اِس لئے ہے کہ سُمرا محمود غزنوی کے حملہ سے پہلے فتنہ و فساد کراتے رہتے تھے اور حکومت اکثر و بیشتر ان کے قبضہ یا اثر میں رہتی تھی۔ اس کی طرف آئینِ اکبری نے بھی اشارہ کیا ہے۔

دو بھائی خیرا مل اور ارک مل کچھ عرصہ قابض رہے لیکن موخر الذکر کے ظلم و ستم کے خلاف سمّہ قبیلہ کا سردار وزیروں کے ساتھ محل میں داخل ہوا اور اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ لوگوں نے اسے نجات دہندہ سمجھ کر بادشاہ بنا لیا اور وہ جام (= سردار) کے لقب سے تخت نشین ہوا کیونکہ وہ اپنے خاندان کو مشہور شاہِ ایران جمشید کی اولاد سمجھتا تھا۔

اُس نے تخت نشین ہوتے ہی سہوان اور بہرام پور کے قلعوں پر حملے کیے جو ابھی تک غوری جرنیلوں کے قبضے میں تھے۔ سہوان پر وہ قبضہ کر گیا لیکن دوسرے پر حملہ میں وہ ساڑھے تین سال کی حکومت کے بعد ہی مارا گیا۔ اُس کا بڑا بیٹا جام جونا تخت نشین ہوا اور اُس نے نہ صرف اپنے باپ کی شروع کردہ فتوحات کو پورا کیا بلکہ بھکر اور اُچ پر بھی قبضہ کر لیا۔ اُس کی صحت اتنی کمزور تھی کہ وہ ہمیشہ میدانِ جنگ میں نہ رہ سکتا تھا۔ لہٰذا اُس کی فوج اُس کی غیر حاضری کو محسوس کرتی تھی اور سولہ سال کے دورِ حکومت میں اُس کے مقبوضات آہستہ آہستہ اس کی گرفت سے نکلتے گئے تھے کہ موت پر وہ اتنے ہی علاقے کا مالک تھا جتنا اُسے اپنے باپ سے ملا تھا۔

اُس کی موت پر ایک خلاء پیدا ہو گیا کیونکہ اُس کا جائز وارث اس کے دور میں ہی ایک لڑائی میں قیدی بن کر دلّی چلا گیا تھا جہاں اُس نے سلطانِ ہند کو حاکمِ بالا تسلیم کر لیا لیکن جب قبیلہ کے دیگر سرداروں کو معلوم ہُوا تو انہوں نے اُس باجگزار حیثیت کو قبول نہ کیا اور اسے تخت سے اُتار کر اُس کے چھوٹے بھائی کو مسند پر بٹھا دیا۔ لیکن یہ حکمران، جام بابینہ زیادہ عرصہ خود مختار نہ رہ سکا کیونکہ فیروز شاہ سوم کے دو حملوں کی تاب لانے کے بعد وہ تیسرے حملہ میں ۷۶۹ھ (۱۳۶۷ء) ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ اُسے دلّی لے گئے لیکن اُس کے عمدہ اور شاہانہ خصائل کی وجہ سے اُسے خلعت اور چترِ شاہی[1] دے کر دوبارہ سندھ کا وائسرائے بنا دیا گیا اور اُس نے باجگزار

---

[1] خلعت اعزازی لباس ہے اور چترِ شاہی صرف شہزادوں کے لئے مخصوص ہوتا ہے اور اُس کی اپنی مخصوص شکل اور قیمت ہوتی ہے۔

طور کر لیا۔ وہ چار سال تک خود مختار رہا تھا اور اس کے بعد پندرہ تک وہ وائسرائے رہا۔
اس کے بعد تاریخ سندھ تاریخ ہند سے اتنی ملفوف ہے کہ اسے اس اجمال میں علیحدہ
قریباً ناممکن ہے اور اگر میں ایسا کر بھی لوں تو بھی یہ اتنی سپاٹ ہے کہ مجھے اور میرے قارئین
ناگوار ہوگی۔ بس یہ کہہ دینا کافی ہے کہ سمہ خاندان کے جوام سلاطینِ ہند کی طرف سے یہاں
دمت کرتے رہے اور بارہ شہزادے یکے بعد دیگرے اس منصب پر فائز رہے حتیٰ کہ
۹۲۶ھ (۱۵۱۱ء) میں وہ بھی سلاطینِ ہند کی طرح (جو بابر کی آمد اور تخت نشینی پر ختم ہو گئے)[۲]
زوال پذیر ہو گئے۔ اس عرصے میں سندھ کی حکومت نیابت ہونے کے باوجود لامحدود اختیارات
کی حامل تھی۔ جام اپنے ہمسایہ سرداروں کے علاقے پر حملے کر کے اپنی عملداری بھی وسیع کرتے
رہے جو حاکمِ بالا کی گرفت سے باہر تھے۔ ان میں سے ایک دو کو دلی جانے کا بھی موقعہ ملا
اور انہیں تمام نشاناتِ شاہی کے ساتھ ہی دارالحکومت میں جانے کی اجازت دی گئی اور اگر
فرماں روایانِ دہلی ہر نئے حکمران کو رسمی طور پر تصدیقی خلعت نہ دیتے ہوئے اور یہ حکمران
بھی وقفے وقفے سے بڑی پیشکش[۱] دربار کو نہ بھیجتے ہوتے تو سندھ کو ایک باجگزار صوبہ کہنا لفظ
باجگزاری کا غلط اطلاق ہوتا۔

---

[۱] پیشکش وہ نذرانہ ہے جو ادنیٰ اعلیٰ کو پیش کرتا ہے اور بعض اوقات یہ اپنی رقم کی وجہ سے محض خراج کی ہی ایک دوسری اصطلاح ہوتی تھی۔

[۲] جام بابینہ کے بعد سمہ خاندان کے مندرجہ ذیل جوام ہوئے:

جام جماجی	۱۳ سال
جام صلاح الدین	۷ سال
جام نظام الدین	۲ سال
جام شیر علی	۴ سال

(باقی اگلے صفحہ پر)

۹۲۳ھ (۱۵۰۸ء) میں بابر قندھار آیا اور شاہ بیگ[1] ارغون (جو یہاں کا حاکم تھا) نے اپنی آبائی وراثت سے محروم ہو کر ایک بڑی فوج منظم کی اور سیوستان، کچ گنداوا اور سندھ فتح کر لئے۔ پہلے پہل اُس نے جام فیروز کو ہی سندھ کا منتظم بنادیا اور خود سیوی میں اقامت گزیں ہو گیا لیکن وہ اُس کا تختہ اُلٹنے کے لئے گٹھ جوڑ کرنے لگا تو ارغون نے عبدالعلی خان ترخان کو گورنر بنادیا اور جام فیروز گجرات فرار ہو گیا جہاں وہ شکستہ وخستہ فوت ہو گیا۔ بابر کی ناقابلِ مزاحمت طاقت نے جلد ہی شاہ بیگ کو نو یافتہ سلطنت کے جنوبی ترین حصّہ میں ٹھکانہ بنانے پر مجبور کر دیا لیکن وہ اُس تھپیڑے کو برداشت نہ کر سکا اور بھکر اور ٹھٹھہ کے قلعوں کے درمیان جاتے ہوئے کشتی میں ہی خودکشی کر لی۔ بھکر کا قلعہ اُس نے حال ہی میں مغل فوج سے بچنے کے لئے خالی کیا تھا۔ اُس کا اکلوتا بیٹا، شاہ حسن بیگ بھی اُس کے اوصاف کا مالک تھا اور اُس نے

(بقیہ حاشیہ)

جام کرن	۱ سال
جام فتح خان	۱۰ سال
جام تغلق	۲۱ سال
جام سکندر	۲ سال
جام رادینو	۵ سال
جام سنجر	۱ سال
جام نظام الدین	۶۰ سال
جام فیروز	۴ سال

[1] شاہ بیگ دریائے ہلمند کے کناروں پر واقع گرم سیر کے حکمران میر ذوالنون بیگ کا بیٹا تھا۔ وہ سلطان سمرقند کا باجگزار تھا لیکن بابر اور ازبک آویزش کے دوران میر خود مختار ہو گیا تھا لیکن اُس کا بیٹا مغلوں کی بے پناہ طاقت کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔

نہ صرف بھکر واپس لیا بلکہ ملتان کا دولت مند شہر بھی لوٹا اور یوں اپنی ساکھ بحال کر دی۔ لیکن عبدالعلی خان ترخان کے بڑے بیٹے، میرزا عیسیٰ نے ٹھٹھہ اور اس کے متعلقات پر قبضہ کر کے اُس کے اِن پُر اُمنگ منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ نوجوان شہزادہ باغی کی سرکوبی کے لئے آیا، لیکن طویل مذاکرات کے بعد اُسے قلعہ سہوان کا تمام جنوبی علاقہ ترخان سرداروں کو بعوض خراج دیتے ہی بنی۔ وہ اس بٹوارے کے تھوڑا ہی عرصہ بعد اسی سال قلعہ بھکر میں فوت ہو گیا اور باقی علاقہ پر اس کے جرنیل قابض ہو گئے اور گو یہ موجودہ سندھ کی حدود کے اندر تھے تاہم ان کی تفصیلات میں جانا بے سُود ہو گا۔

جب سندھ میں یہ واقعات ہو رہے تھے تب سلطنت ہند ایک پٹھان خاندان سے موجودہ مغل خاندان میں منتقل ہو گئی۔ میرزا عیسیٰ نے سرکار ٹھٹھہ کے نواب کا لقب اختیار کیا اور اپنے پیشروؤں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مغل شہنشاہ کی غلامی کا جُوا اتار پھینکا۔[۱] اُس وقت بابر کا جانشین، ہمایوں ایران سے واپسی کے بعد دوبارہ تخت نشین ہو چکا تھا۔ حالات ایسے تھے کہ شہنشاہ دُور اُفتادہ سندھ کی طرف توجہ نہ دے سکا۔ میرزا عیسیٰ کے مقبوضات اُس کے بیٹوں کو ملے۔ بڑا تو ایک خبطی تھا لہٰذا لوگوں نے متفقہ طور پر اُسے نکال باہر کیا اور دوسرے بیٹے میرزا محمد باقی کو نواب بنا دیا۔ اُس پر بھی جنون طاری ہوا اور اُس نے ۹۹۳ھ (۸۵-۱۵۸۴ء) میں ٹھٹھہ کی جامع مسجد میں خنجر سے خودکشی کر لی۔ اس کا بیٹا، میرزا جانی بیگ تخت نشین ہوا لیکن تین سال بعد شہنشاہ اکبر کی فوجوں نے سندھ پر قبضہ کر لیا۔ اُس وقت سے اِن حاکموں نے خود مختاری کے اعلان کی جرأت نہیں کی، گو وہ اکثر خراج سے

---

[۱] ڈو کی کتاب ہندوستان میں شہنشاہ ہمایوں کے فرار کا بہت دلچسپ بیان موجود ہے۔ عمر کوٹ میں اکبر کی پیدائش اور ملکہ اور اس نوزائیدہ کی تکالیف نہایت درد انگیز انداز میں تاریخ سندھ میں مذکور رہیں۔ لیکن کہانی اتنی طویل ہے کہ یہاں درج نہیں ہو سکتی۔

سے پہلوتہی کرتے رہے ہیں اور مغلوں کے خلاف کئی ناکام بغاوتیں بھی کر چکے ہیں۔

۱۰۱۴ھ (۱۵۹۹ء) میں اکبر کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا اور اس کے اور بعد کے شاہ جہان اور عالمگیر (المعروف بہ اورنگ زیب) کے ادوار میں صوبہ سندھ کے حاکم شکنجہ میں رکھے گئے۔ لیکن عالمگیر کی موت کے بعد جو افراتفری پیدا ہوئی اس میں انہوں نے خراج دینا بند کر دیا۔ اس زمانے میں آبادی میں بھی ہمہ گیر اور دُور رس تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ بہت سے بلوچ قبائل کرائے کے سپاہی بن کر آ گئے تھے اور ترخان خاندان کی جگہ کلہوڑہ خاندان نے لے لی تھی جو ایران سے آیا تھا، لیکن اس تبدیلیٔ خاندان کا سبب میں کوشش کے باوجود دریافت نہ کر سکا۔

اسی عرصے میں ایرانی، قندھار پر قابض ہو چکے تھے اور ممکن ہے کہ انہی کی فوج سے کلہوڑہ قسمت آزماؤں کا گروہ نکلا ہو جس نے سندھ غصب کر لیا اور مغلوں کی اطاعت بھی کر لی جو یہاں کے حاکموں کے حق دانصاف کی بجائے صرف اپنے خراج کی باقاعدہ ادائیگی سے سروکار رکھتے تھے۔[1]

نادر شاہ کے حملۂ ہند کی تفصیل میں جانا میرے مقصد سے خارج ہے اور اس کے اہم نکات میں پہلے بیان کر چکا ہوں (دیکھیے باب سوم حصّہ دوم اور باب نہم حصّہ دوم)۔ یہ عظیم واقعہ ۱۷۳۹ء میں ہوا اور اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ سندھ اور دریا کے مغرب کے تمام صوبے ایران کے حوالے کر دیئے گئے۔ نادر واپسی پر ٹھٹھہ آیا اور زبانی بیانات کے مطابق

---

[1] میں یہ لکھ چکا تو معلوم ہوا کہ کلہوڑے ایک مذہبی فرقہ تھے اور عباسی الاصل ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ ۱۵۳۰ء کے بعد انہوں نے سندھ میں مذہب کے نام پر محصول لگانے شروع کر دیئے، حتیٰ کہ لوگ استحصال سے تنگ آ کر سینہ سپر ہو گئے اور تقدس کے باوجود ان کے سردار کو مار دیا اور اس کے پیروؤں کو قلات بھگا دیا۔ بعد میں وہ شہنشاہِ ہند کی اجازت سے واپس آ گئے اور اس دفعہ بتدریج زور پکڑتے پکڑتے ٹھٹھہ پر قابض ہو گئے۔

اُس کا نہایت تزک و احتشام سے استقبال کیا گیا[1] اور اُس نے گورنر کو برطرف نہیں کیا۔ وہ ۱۷۴۷ء میں قتل ہُوا اور اُس کی بنا کردہ وسیع سلطنت کی شکست و ریخت سے امارتِ کابل نمودار ہوئی اور سندھ اب اسی کا ایک باجگزار صُوبہ ہے۔ لیکن یہاں کے نوابین نے فوراً ہی نئے سورج کی پرستش شروع نہیں کی بلکہ شاہانِ دہلی کی دوبارہ اطاعت اختیار کر لی کیونکہ ۱۷۵۶ء میں عالمگیر ثانی نے احمد شاہ درانی کے بڑے بیٹے، تیمور کو پنجاب اور سندھ مغل شہزادی سے شادی پر بطورِ جہیز عطا کئے۔ عین اُس وقت مرہٹے ہندوستان پر قابض ہو گئے تھے اور ۱۷۵۸ء میں اُنہوں نے تیمور کو اٹک پار دھکیل دیا۔ افغان اُس مخمصے میں اتنا اُلجھے کہ سندھیوں پر توجہ نہ دے سکے اور اُنہوں نے ان آلفزی میں خراج بند کر دیا۔ یہ صورتِ حال زیادہ دیر جاری نہ رہی کیونکہ جنگ پانی پت (جو ۱۷۶۱ء میں لڑی گئی۔ دیکھیے باب سوم حصّہ دوم نوٹ) کے بعد انہوں نے بقایاجات بھی ادا کرکے اور دو سال کا خراج پیشگی ادا کرکے اپنی گلو خلاصی کرا لی تاکہ احمد شاہ خراسان پر ایرانی حملے کی مدافعت کر سکے۔

احمد شاہ ۱۷۷۳ء میں فوت ہُوا اور تیمور امیر کابل بنا۔ جون ۱۷۷۹ء میں ایک بلوچ قبیلہ تالپور نے اپنے موجودہ حکمرانوں اور اُن کے بڑے بھائی کے تحت کلہوڑہ نواب سندھ کے خلاف بغاوت کر دی اور اُس کے بہت سے پیروؤں کو نذرِ شمشیر کرکے اُسے قندھار بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ تیمور شاہ نے فوراً ایک فوج مدد خان کے تحت روانہ کی تاکہ اُسے بحال کر سکے۔ تالپور صحراؤں کو بھاگ گئے اور بحالی بلا مزاحمت عمل میں آ گئی، لیکن وہ جس تیزی سے بھاگے تھے اُسی تیزی سے واپس آ گئے اور کلہوڑہ کو دوبارہ تخت سے محروم

---

[1] سر ولیم جونز کے فرانسیسی ترجمہ تاریخ نادر شاہ' میں نواب ٹھٹھہ، میاں نور محمد کو خدا یار خان کہا گیا ہے یہ لقب اُسے شہنشاہِ ہند محمد شاہ نے دیا تھا۔ وہ ایرانی فوج کی آمد پر عمر کوٹ بھاگ گیا لیکن پکڑ کر لایا گیا اور پھر فاتح کو متاثر کیا اور وہ واقعات ہُوئے جن کا میں پہلے ذکر کر چکا ہُوں۔

کر دیا۔ لوگوں نے بھی تالپوروں کا ستارہ عروج پر دیکھا تو اس کا ساتھ نہ دیا۔ ۱۷۸۶ء میں ایک اور کابلی فوج تصفیہ کے لئے آئی لیکن اس وقت تک تالپور جم چکے تھے اور خزانہ بھی بھرپور تھا لہٰذا وہ افغانوں کے مقابلہ پر بہتر فوج لا سکے اور انہوں نے شکارپور سے بیس کوس جنوب مغرب میں جینیہ گاؤں میں بہت بُری شکست دی۔ مذاکرات کے تحت تالپوروں نے سابقہ خراج دینے اور آئندہ اس کی باقاعدہ ادائیگی کا ذمہ لیا۔ چنانچہ امیر کابل نے ایک فرمان کے ذریعے میر فتح علی کو حاکم سندھ مقرر کر دیا اور یوں کلہوڑا اقتدار ختم ہوا۔ اب اُن کا صرف ایک سردار زندہ ہے جو گجرات بھاگ گیا تھا۔ وہ قسمت آزمائی کرتا ہوا ان سالوں میں کسی مقامی راجہ کا مقرب ہے۔

اس معاہدہ کے کوئی تین سال بعد تالپور امیروں نے خراج بند کر دیا اور تیمور شاہ ان کے خلاف کارروائی نہ کر سکا۔ اس کا بیٹا زمان شاہ ۱۷۹۲ء میں امیر کابل بنا تو اگلے سال سندھ آیا لیکن طویل جنگ کی بجائے چوبیس لاکھ روپیہ لے کر مطمئن ہو گیا جو اصل خراج کا ایک چوتھائی بھی نہ تھا۔ اس غیر مدبرانہ سمجھوتے نے سندھیوں کو شہ دی اور اُس وقت سے اُنہوں نے خراج کو برائے نام سی اہمیت دینا شروع کر دی۔ ۱۸۰۵ء میں شاہ شجاع الملک اسے عائد کرنے کے لئے آیا تو انہوں نے ولی محمد خان کو بھیج دیا تاکہ سرحد پر امیر سے ملے اور اس نے اُسے بلطائف الحیل واپس کر دیا گو اس کا وزیر اکہتر لاکھ کی بجائے صرف ستائیس لاکھ روپے لینے پر احتجاج کرتا رہا۔

تیمور شاہ نے میر فتح علی کو مستقل کر دیا تو اس نے اپنے علاقے قبضۂ حکومت میں مدد کے بدلے اپنے عزیز و اقارب میں بانٹ دیئے۔ میر سہراب اور میر تھارا کو کافی بڑے بڑے علاقے ملے اور چونکہ ان پر خراج کی کوئی پابندی نہیں اور اختیارات بھی لامحدود ہیں لہٰذا اب وہ عملاً اور اصلاً خود مختار ہیں۔ میر سہراب کا علاقہ شمال مشرقی سندھ ہے جو بہاول خان کے مفتوحات کی جنوبی سرحد سے شروع ہوتا ہے اور خیرپور تک پھیلا ہوا ہے جو اس کا صدر مقام ہے۔

اُس کی آمدنی سات لاکھ روپے ہے اور وہ چار پانچ ہزار فوج میدان میں لا سکتا ہے
میر تھارا کا علاقہ اُس کے جنوب میں ہے۔ اُس کی سالانہ آمدنی چار لاکھ روپے سے زیادہ ہے
اور اُس کے پاس چار ہزار کی مُستقل فوج ہے۔

میر فتح علی کے انتقال کے بعد اُس کے تینوں بھائیوں نے آمدنی چار حصّوں میں تقسیم کر لی۔ دو حصّے میر غلام علی کو ملے اور ایک ایک دونوں چھوٹے بھائیوں کو۔ کل آمدنی چونتیس لاکھ تیرہ ہزار روپے تھی لیکن اب یہ کافی بڑھ چکی ہے۔ میر غلام علی کو زیادہ حصّہ ملنے کی وجہ سے لشکری و کشوری اخراجات بھی ادا کرنے ہوتے ہیں (جو بہت معمولی ہیں) اور امیر کابل کو بھی خراج کا نصف حصّہ دینا ہوتا ہے بشرطیکہ یہ دینا پڑے۔

انہی انتظامات کے ساتھ ساتھ تینوں بھائیوں نے صوبے پر مشترکہ حکومت کا معاہدہ کر لیا اور میر غلام علی کی وفات پر[1] (جو کرمشن کے وقت امیر اکبر تھا) اُس کا بڑا بیٹا اس مجلس ثلاثہ میں ممبر تین پر شامل کر لیا گیا اور اُس کے دونوں بھائی بھی درجے میں ایک ایک قدم آگے بڑھ گئے۔ یہ کہنا ناممکن ہے کہ یہ عجیب و غریب نظام کب تک جاری رہے گا تاہم فی الحال یہ مستحکم ہے لیکن یہ اساسی طور پر ایشیائی حکومتوں کے مزاج کے منافی ہے لہٰذا دیرپا نہیں ہو سکتا اور غالباً ان میں سے کوئی پُرامنگ فرد کسی دن شریکِ اقتدار رفقاء کی غفلت یا مخبوط الحواسی سے فائدہ اٹھا کر اقتدار پر کُلّی قبضہ کر لے گا۔

سندھ کی مجموعی آمدنی مشمولہ بہ علاقائی آمدنی اکسٹھ لاکھ روپے سالانہ بتائی جاتی ہے جو ۱۸۰۹ء کے مقابلہ پر اٹھارہ لاکھ زیادہ ہے کیونکہ اُس وقت یہ صرف بیالیس لاکھ اٹھتر ہزار تھی۔ کابل کو سالانہ خراج تیرہ لاکھ روپے ہے لیکن یہ معاہدہ سے

---

[1] میر غلام علی ۱۸۱۲ء میں ہرنوں کا شکار کھیلتا ہوا ایک ہرنی کے غضبناک حملے میں مارا گیا۔

لے کر اب تک شاید اوسطاً ۲/۱ بھی نہ دیا ہوگا۔ بھرے ہوئے خزانے اور سندھ کے طویل اور اندرونی امن نے امیروں کو اس قابل بنا دیا ہے کہ انہوں نے میر سہراب کے مرنے پر اس کے وسیع علاقے بھی ہتھیا لئے ہیں اور یوں اس کے بچوں کو بے دست و پا کر دیا ہے جو محمود شاہ امیرِ کابل کے پاس پناہ گزین ہیں[1]۔ ۱۸۱۲ء کے اواخر میں انہوں نے قلعہ عمر کوٹ پر قبضہ کے[2] لئے بھی فوج روانہ کی جو چند قرنوں سے راجہ جودھپور کے قبضہ میں تھا۔ یہ مہم کامیاب رہی اور اب تو غاصبوں کے حوصلے اور وسائل اتنے بڑھ گئے ہیں کہ وہ کچھ بھج (جنوب مشرقی سرحد کے ساتھ) کے علاقے پر دندان آز تیز کئے ہوئے ہیں اور اگر برطانوی حکومت نے انہیں تنبیہہ نہ کر دی ہوتی تو وہ اب تک اسے ہڑپ کر چکے ہوتے۔ ۱۸۰۹ء میں مشن کی روانگی پر ایک مقامی ایجنٹ کو حیدرآباد میں چھوڑ دیا گیا۔ اب سندھ صوبہ گجرات کی سرحد پر اولیں ریاست ہے اور صرف ہمارا خوف ہی اُن کو اُن کی قدرتی حدود میں رکھے ہوئے ہے اور ہم اس خوف کو طاری و جاری رکھتے ہیں۔ اگر امیروں کے کمپنی کے تجارتی ریذیڈنٹ کو سندھ سے نکالنے اور کافی سرکاری املاک پر قبضہ کرنے پر[3] ان کو انہی کے علاقے میں سبق سکھا دیتے تو دونو حالیہ وفود (مشن) کے ساتھ ان کا رویہ مختلف ہوتا!

---

[1] (نومبر ۱۸۱۲) مجھے ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ امیرِ کابل ان پر حملے کا سوچ رہا ہے تاکہ میر سہراب کا علاقہ اس کے بچوں کو بحال کرا سکے اور اپنا جمع شدہ خراج بھی وصول کر سکے جو ڈیڑھ کروڑ روپے سے بھی زیادہ بنتا ہے۔ اگر ایسی کوشش کی گئی تو میرے خیال میں کامیاب ہو جائے گی کیونکہ حق و انصاف کا تقاضا یہی ہے اور سندھیوں کی روز افزوں طاقت کو لگام دینا ضروری ہے۔

[2] قلعہ عمر کوٹ شہنشاہ اکبر کی پیدائش گاہ ہونے کی وجہ سے مشرق میں بہت مشہور ہے۔ یہ کافی مضبوط ہے اور اس کے ارد گرد کے صحرا کی وجہ سے اتنا ناقابلِ مزاحمت سمجھا جاتا ہے کہ امیرانِ سندھ نے اپنا کچھ خزانہ یہیں منتقل کر رکھا ہے۔

[3] یہ ۲-۲-۱۸۰۱ء میں ہوا۔ آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی ایک لاکھ روپے کی املاک جاتی رہیں اور سندھیوں نے ریذیڈنٹ کو مارنے کی بھی کوشش کی۔

ضمیمہ

کیپٹن کرسٹی کے جرنل کا ملخص

نوشکی میں لیفٹننٹ پوٹنگر سے علیحدگی کے بعد

۲۲ مارچ

میں ۲۲ مارچ کو نوشکی سے روانہ ہوا اور چھوٹی چھوٹی ریتلی پہاڑیاں پار کرنے کے بعد بارش کے پانی کے ایک مختصر سے گڑھے کے پاس رُکا جو گدلا ہونے کے باوجود تازہ تھا۔ میں نے جمعہ خان کا انتظار کیا اور کوئی ایک گھنٹہ بعد وہ (اس کا اونٹ جلد ہی مل گیا تھا) آملا اور ہم آگے چل پڑے۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ان کے ساتھ خوب گھل جاؤں کیونکہ ہم سب بھائی بھائی تھے۔ ایک مسطح شور علاقہ پار کرنے کے بعد (جو نمک کی چوٹی سے چادرِ آب معلوم دیتا تھا) ہم چودہ میل پر پہاڑیوں کے پاس کھانے کے لئے رُکے۔ پانی کھاری تھا لیکن اونٹوں کے چرنے کا خوب سماں اور سامان تھا۔ روٹی اور کھجور کا کھانا جلدی جلدی کھا کر ہم صحرائے شور سے مغرب کی طرف بڑھنے لگے۔ ہمارے رہنما نے تیز چلنے کے لئے کہا مبادا دشمن ہمیں آلیں جو ہمارے تمن سے چلتے ہی کسی دوسرے راستے سے چل پڑے ہوں گے۔ رات کے کوئی دس بجے ہمیں ایک روشنی نظر آئی اور جلد ہی ہم ایک چرواہے کی جھونپڑی میں پہنچ گئے جس کے گرد اس نے اپنی بھیڑوں کے لئے جھاڑیوں کی باڑ لگا رکھی تھی۔ وہ ایک دری لے آیا اور رسمی سلام کے بعد کہنے لگا کہ تیس افغان ہمارا پوچھ رہے تھے اور اب پہاڑیوں کا ایک درّہ روکنے کے لئے چلے گئے تھے۔ پھر اس نے لسی

دی اور ہم نے ایک بکری خریدی جسے میرے آدمیوں نے فوراً ذبح کیا اور ہڑپ کر گئے۔ اس کے بعد ہم چند میل اور آگے بڑھے اور راستہ چھوڑ کر باجرے کے ایک کھیت میں لیٹ رہے۔

۲۳ر مارچ

طلوعِ آفتاب سے پہلے ہم اُٹھے اور مغرب کی طرف چل دیئے اور ایک ایسا علاقہ پار کیا جو کسی وقت مزروعہ تھا لیکن اب ویران ہو چکا تھا۔ ہم غلام شاہ کے کھنڈرات میں ناشتہ کے لئے رُکے۔ قصبہ کا کچھ حصہ اب بھی سلامت ہے۔ یہاں ہمیں آبِ باراں کا ایک تالاب ملا اور دو گھنٹے کے آرام کے بعد ہم نے پھر سفر شروع کر دیا۔ ریتلی پہاڑیاں ہمارے دائیں طرف تھیں اور علاقہ بالکل چٹیل تھا جسے دک کہتے ہیں۔ ہم ایک بلوچ تمن اور ریوڑوں کے پاس سے گذرے لیکن تعاقب کنندگان کی وجہ سے ان کے پاس نہ جا سکے۔ بجلی اور گرج کے ساتھ بارش شروع ہو گئی اور جھکڑ چلنے لگا جو ریت اُڑا اُڑا کر ہمارے مُنہ میں ٹھونسنے لگا لہٰذا چند گھنٹوں کے لئے ایک ساحل کی کھوہ میں ہوا کی طرف پشت کر کے رُکے رہے اور جب مطلع صاف ہوا تو کچھ اور چل کر رات کے لئے ٹھہر گئے۔

۲۴ر مارچ

رات کے کھانے اور چند گھنٹے آرام کے بعد ہم پھر سوار ہوئے۔ ہوا ہلکی بارش اور کہر کی وجہ سے ٹھنڈی تھی۔ ہم سات بجے صبح ناشتہ کے لئے رُکے۔ سامنے ایک سلسلۂ کوہ تھا اور بائیں طرف کوئی دس میل کے فاصلے پر مخروطی شکل کی ایک عجیب وغریب پہاڑی تھی جسے میخ رُستم کہتے ہیں۔ اب ہم سخت مسطح ریت پر آ گئے تھے جہاں روئیدگی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ ناشتے کے بعد پھر روانہ ہوئے۔ سامنے کا سلسلہ قریب آ رہا تھا اور اس کے دامن میں ایک ہرا بھرا جنگل تھا لہٰذا اونٹوں کو تیز چلایا اور وہاں پہنچ کر جھاڑیوں اور پیڑوں میں آرام کے لئے ٹھہرے۔ دو تین بلوچوں کو پانی کی تلاش میں بھیجا۔ وہ بھی دُھن کے پکے تھے اور تھوڑی دیر بعد آ کر بتانے لگے کہ دو میل کے فاصلے پہ ایک تمن تھا جہاں بارش کا کافی پانی تھا۔

وہ جمعہ خان کے لئے ایک بکری بھی بطورِ تحفہ لائے جو اُن کے بقول حج پر جا رہا تھا - یہ جنگل چیگنی کہلاتا ہے، بہت اچھی چراگاہ ہے اور ایک دن کے سفر پر اس کے جنوب میں کھاری پانی کے تنگ لیکن گہرے تالاب ہیں۔

۲۵ مارچ

ہم جانوروں کی چرائی کے لئے دوپہر تک ٹھہرے۔ نیند نے ہم سب کو تازہ دم کر دیا تھا اور ہم دفاع کے لئے بلوس و مسلح تھے۔ کوئی ایک بجے ہم سوار ہوئے اور سلسلۂ کوہ تک پہنچ گئے۔ یہ ایک دائرے کی شکل میں خاران سے آتا ہے اور میرے گذرنے کی جگہ کے شمال کے پاس ختم ہو جاتا ہے۔ سارا علاقہ دہنی طرف قندھار تک صحرا ہے اور سلسلۂ کوہ پر دو درّے ہیں۔ شمالی درّہ پر افغان براجمان تھے لہٰذا ہم نے بائیں طرف کا چکر دار راستہ لیا اور پہاڑیوں میں تیز تیز چکر کاٹتے ہوئے تیسرے دن یعنی ۲۷ مارچ کو کوچن پہنچے۔ یہاں عمدہ پانی فراواں ہے۔ ہر روز اس علاقے میں مجھے ایسی بھیڑوں کے ریوڑ دکھائی دیتے رہے جسے پشت کوہ کہتے ہیں۔ ۲۷ کو ہم ایک بلوچ گروہ سے ملے جو شمال سے عورتوں، بچوں، خیموں اور ریوڑوں کے ساتھ مکرانی پہاڑوں کی طرف جا رہا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ امیر کابل کے وزیر، فتح خان کے ڈر سے گرم سیل سے بھاگے تھے جو قندھار سے اُدھر روانہ تھا۔

۲۸ مارچ

ہم طلوعِ آفتاب سے پہلے روانہ ہوئے اور مغرب کے کچھ شمال کی طرف ریگہائے رواں کے اُوپر چلتے ہوئے ممّو ناشتہ کے لئے ٹھہرے جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہاں پر ملک ممّو مدفون تھا اور بلوچوں نے خوش بختی کے لئے خیرات مانگی۔ انہوں نے مجھ سے اور جمعہ خان سے اونٹوں کی تعداد کی نسبت سے آٹا اور کھجوریں لیں اور پھر روٹی پکا کر اسی نسبت سے تقسیم کر دی۔ وہ زیارت پر باقاعدہ نماز پڑھتے رہے اور صرف جمعہ خان اور ایک اور نابالغ لڑکا مستثنیٰ قرار دیئے گئے۔ ممّو کا پانی اچھا نہ تھا لیکن بعد از دوپہر سات میل مغرب کی طرف

چل کر ہم کلمی پہنچے جو ایک پیر کی زیارت ہے جس نے اپنا نیزہ چٹان میں مار کر بہترین پانی کا ایک چھوٹا سا کنواں پیدا کر دیا۔ رات کے کھانے کے بعد ہم آگے چل دیئے اور چار میل شمال مغرب کی طرف چل کر ہم جھٹ پٹے میں سونے کے لئے ٹھہرے

۲۹ مارچ

اب ہم پھر ریت کی پہاڑیوں میں تھے اور بارہ میل چل کر انہی پہاڑیوں اور گز جھاڑیوں میں ناشتے کے لئے رکے۔ یہاں ہمیں گرم سیل کو واپس جاتے ہوئے خالی اونٹ ملے۔ ناشتہ کے بعد ہمیں ناہموار زمین پر سفر کرنا پڑا جس میں ریت اور کنکر ملے ہوئے تھے۔ پندرہ میل کے بعد ہم کچھ ریتلی پہاڑیوں کے نیچے اترے۔ یہ سخت تکلیف دہ سفر تھا اس لئے کہ پینتالیس میل تک پانی کا نام و نشان نہ تھا لیکن ہلمند قریب تھا اور مجھے اس کا بہت حوصلہ تھا۔

۳۰ مارچ

آج ہم صبح سویرے روانہ ہوئے اور ریتلی پہاڑیوں سے اتر کر شمال مغربی سمت میں ہم ایک سخت کنکریلے صحرا میں روانہ ہوئے اور گیارہ میل کے بعد کنار ہلمند پر پہنچ گئے۔ ہم گھاٹیوں سے ہوتے ہوئے ایک وادی میں داخل ہوئے جو ڈیڑھ یا دو میل تھی اور ہلمند تمرس کے جنگل میں بہہ رہا تھا۔ یہاں آکر سب کلفتیں بھول گئیں اور ہم ناشتہ کے لئے روٹی پکانے بیٹھ گئے۔

نوشکی سے دریائے ہلمند کا فاصلہ میرے اندازے کے مطابق ایک سو اکانوے میل ہے جو ہم نے نو منزلوں میں طے کیا۔ پہلی تین زیادہ لمبی ہیں (ہر ایک پچیس میل ہے)۔ تازہ بارانی پانی دوسرے دن مل سکتا ہے اور راستہ سخت ریت پر سے گذرتا ہے۔ چوتھی منزل مختصر ہے پانچویں اور چھٹی طویل ہیں اور پانی کافی مل جاتا ہے۔ راستہ پتھریلا ہونے کے باوجود نہ مشکل ہے نہ تکلیف دہ۔ ساتویں منزل کلمی تک بے حد طویل، تکلیف دہ اور مشکل ہے جس کی وجہ ریت کی پہاڑیاں ہیں اور پانی بھی خراب ہے۔ آٹھویں منزل بھی محروم آب اور زحمت آگیں ہے۔ آخری منزل گیارہ میل کی ہے اور ہم آخری تینوں کو ایک ہی منزل بنا لیتے تو بہتر ہوتا کیونکہ ہر ایک بتیس

میل ہوتی۔ سارے راستے پر جانوروں کے لئے چارہ ہے اور رُگ، جگنی اور بوٹو پر بھیڑیں پل سکتی ہیں۔

ہلمند قندھار سے جنوب مغرب اور مغرب سے سیستان میں پہنچتا ہے جہاں پہاڑیوں کا ایک چکر کاٹ کر (دوشک سے چار دن کا سفر) ایک جھیل بن جاتا ہے۔ پلالک پر یہ کوئی چار سو گز چوڑا ہے، بہت گہرا اور اس کا پانی بے حد عمدہ ہے۔ دونو طرف آدھ آدھ میل کے علاقے میں آب پاشی ہوتی ہے اور پھر ریگ زار عمودی چٹانوں کی صورت میں بلند ہوتے ہیں۔ کناروں پر تمرسک کی کثرت ہے لیکن جانوروں کا کھاجا بھی بہت ہے۔ ہمارے آج کے پڑاؤ سے قندھار سات منزل تھا اور دریائی علاقہ بنجر ہے اور ڈاکوؤں کا مامن و مسکن ہے۔ دن کے وقت ہم دریائی کناروں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دیہات اور قلعوں کے کھنڈرات دیکھتے رہے۔ رات کو ہم ایک افغان گاؤں کے پاس جنگل میں ٹھہر گئے جس کے لوگ ہماری آگ دیکھ کر شب خون کے لئے آگئے۔ ہم سو چکے تھے، لیکن ایک آدمی نے چور دیکھ کر شور مچادیا اور کچھ حیص بیص کے بعد ہماری ان سے صلح ہوگئی۔

۳۱ مارچ

آج ہم رودبار پہنچے اور طوقی بلوچوں کے سردار نیاز خان کے تمن میں ٹھہرے۔ وہ ایک وجیہہ نوجوان ہے اور اس کے لوگ نوشکوی بلوچوں سے بہتر ہیں گو انہی کا حصہ ہیں۔ میں یہاں ایک حاجی بن گیا گو سردار مجھے بھیس بدلے ہوئے ایک ایرانی سمجھتا رہا۔

یکم اپریل

آج ہم دو ناکام کوششوں کے بعد تیسری دفعہ رودبار کے قریب دریا کو پار کر کے سیستان پہنچے۔ رات ایک تباہ شدہ شہر پلکی کے کھنڈرات میں گذاری، جہاں کچھ لوگ رہتے ہیں جنہوں نے میرے اونٹ چرانے کی کوشش کی، لیکن حسن اتفاق کہ وہ جمعہ خان کا ایک اونٹ بھگا کر لے گئے۔

۲ر اپریل

مَیں بہت صبح صبح روانہ ہُوا تا کہ شام تک اِلمُدار پہنچ سکیں لیکن پانچ بجے کے قریب خان جہان خان کے سرداروں کے ایک تمن میں پہنچے تو میرے ساتھی دھرنا مار کر بیٹھ گئے، لیکن مَیں نے نوشکی واپس چلے جانے کی دھمکی دی تو وہ چند گھنٹے سرگشت کر کے پھر چلنے پر رضامند ہو گئے اور طلوعِ آفتاب تک اِلمُدار صرف آدھ میل رہ گیا۔ رہنما کے مشورے پر مَیں یہاں ٹھہرا اور ہندو تھل داس کو بُلایا جس کے نام میرے پاس سفارشی خط تھا۔ وہ ایک خچر پر آیا تو مَیں نے اُسے ایک طرف کر کے بتایا کہ مَیں سُندرجی کا ملازم تھا اور دو سو روپے کی ہُنڈی اور سفارشی خط لایا تھا۔ خط مَیں نے اُسے دے دیا۔ اُس نے خط پڑھ کر کہا کہ روپیہ حاضر ہے" اور دیگر خدمات کی پیشکش کی اور کہا۔ "یہاں سب ڈاکو ہیں، اِن بلوچوں سے جان چھڑاؤ اور حاجی بن جاؤ۔ مَیں تمہیں خود ایک رہنما لے دُوں گا۔" مَیں فوراً واپس آیا اور اپنے لوگوں کو چھوٹے چھوٹے تحائف دیئے اور پھر جمعہ خان سے رخصت ہو کر اپنے اونٹ پر سوار ہُوا اور تھل داس کے ساتھ اِلمُدار قصبہ میں آ گیا جہاں اُس نے رات کو اپنے گھر میں ٹھہرایا۔

۳ر اپریل

آج صبح مَیں یہاں کے سردار خان جہان سے ملنے گیا تو اُس نے حاجی سمجھ کر بہت پُرتپاک اِستقبال کیا۔ اُس کا لباس بہت عمدہ تھا اور پانچ چھ نوکر اُس کے جلو میں تھے۔ یہ سردار چاروں کھونٹ میں ہوا بنا ہُوا ہے اور صرف لُوٹ مار پر گذارہ کرتا ہے۔ اِس کا علاقہ بہت کم ہے۔

۴ر اپریل

آج دِن میں تھل داس کے ساتھ حساب کتاب کیا اور اُس نے مجھے خوش قسمتی سے ایک رہنما مہیا کر دیا۔ مَیں نے اُس کی تکلیف فرمائی کے لئے اُسے ایک تحفہ دیا اور جلد از جلد روانگی کے لئے تیاریاں کر لیں۔

سیستان ہلمند کے کناروں پر ایک چھوٹا سا صوبہ ہے جو پانچ سو مربع میل سے زیادہ نہیں ہے اِس کے شمال اور شمال مشرق میں خراسان، مغرب میں ایران اور جنوب اور جنوب مشرق میں ایک دشتِ بے آباد ہے جو اِسے مکران سے جُدا کرتا ہے۔ سیستان کے آباد حِصّے صرف دریائی کنارے ہیں۔ دریا کا پاٹ ہر سال بیٹھ جاتا ہے اور صحرا بھی اسی رفتار سے اس پر دست درازی کرتا رہتا ہے۔

ہم رودبار پر سیستان میں داخل ہوئے تھے۔ وہاں دریائی کنارے سیراب و شاداب اور مزروعہ و ثمر بار ہیں لیکن یہ علاقہ زیادہ سے زیادہ دو میل چوڑا ہے اور پھر صحرائی چٹانیں ہیں جو سراسر بے آب و گیاہ ہیں اور ایک طرف ہرات قندھار سڑک تک اور دوسری طرف نوشکی۔ زک۔ بمپور سڑک تک (لیفٹننٹ پوٹنگر کا راستہ) پھیلی ہوئی ہیں۔ یہاں اب صرف افغانوں اور بلوچوں کے نمدے کے خیمے نظر آتے ہیں لیکن سابقہ تہذیب و خوشحالی کے آثار بھی ہیں جو دیہات، قلعوں اور ہوا چکیوں کی صورت میں موجود ہیں اور رودبار سے دُوشک (عدہ مقام، اب سردار کے بڑے بیٹے کے نام پر جلال آباد) تک پھیلے ہوئے ہیں۔

رودبار سے پہلی توجہ طلب جگہ کیقباد ہے پانچ میل دور۔ یہ شاہ کیخسرو کی اقامت گاہ تھی۔ لیکن اب صرف ایک چھوٹے سے مربع قلعے کے میناروں اور مورچوں اور متصل عمارت کی کچی دیواروں کے سوا کچھ باقی نہیں۔ یہ عمارت کیخسرو کی والدہ کی تھی۔ دریا عبور کر کے اس کے شمال مغربی کنارے پر ہم حسین آباد آئے جو دورِ حالیہ میں تعمیر ہوا ہے اور جہاں عرب رہتے ہیں۔ اس کے بعد رہنما کی غلطی سے میں صحرا پار کر کے پچیس میل کے فاصلے پر چکنی آیا اور یوں گلیاپت کا شہر نہ دیکھ سکا۔ کہتے ہیں کہ وہاں محل اب بھی اچھی حالت میں ہے لیکن شہر کے طول و عرض یا اس کی بنیاد کے سلسلہ میں مجھے کوئی معلومات نہ مل سکیں۔ چکنی بھی کسی بڑے اور خوشحال شہر کا اثر باقیہ ہے۔ اس کی دیواروں، مکانوں اور باغوں کے کھنڈرات سولہ مربع میل پر پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں ہلمند کے کناروں پر خوب ہریاول اور بھیڑوں کے بے شمار

ریوڑ یہاں چر رہے تھے۔ دریا کوئی دو سو گز چوڑا ہے اور پار نہیں ہو سکتا اور انتہائی منظر خیز ہے۔ یہاں ہم نوشیروانی بلوچوں کے ایک مہمان نواز تمن میں ٹھہرے، جنہوں نے ڈاکوؤں کی وجہ سے ہمارے اونٹوں کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا ہمیں اپنے ہی قافلے کے ایک حصّہ کو ہر وقت چاق و چوبند رکھنا پڑا۔

المیدار کو خان جہان خان نے بسایا اور وہ اس علاقے کا مشہور ترین ڈاکو تھا اور ہرات و قندھار کے درمیان سفر کرنے والے کاروانوں کے لئے ہوا بنا ہوا تھا۔ یہاں سطح زمین ایک نیا روپ دھارتی ہے اور کاشت دریائی کناروں تک ہی محدود نہیں بلکہ دریا سے نالیاں نکالی گئی ہیں اور پانی بہت دُور دُور تک پہنچایا گیا ہے۔ یہ خان جہان خان کا کارنامہ ہے کہ اپنے ہمسایوں سے بڑا ڈاکو ہونے کے باوجود اس نے اپنا علاقہ آباد و شاداب کیا۔

میں چھ کو المیدار ٹھہرا اور سات کو تھل داس کے ساتھ چار میل سے زیادہ دُور شہر جلال آباد (دُوشک) گیا۔ قدیم شہر کے کھنڈرات ہی شہر اصفہان کے رقبہ کے برابر ہوں گے۔ یہ بھی دیگر سیستانی شہروں کی طرح نیم سوختہ اینٹوں، محراب سوا چھتوں اور دو منزلہ مکانوں کا شہر ہے۔ موجودہ شہر جلال آباد صاف ستھرا ہے، ترقی پذیر ہے اور اس میں کوئی دو ہزار مکانات ہیں۔ بازار بھی معقول ہے۔ یہ قدیم النسب بہرام خان کیانی کی عملداری میں ہے لیکن اس کی آمدنی تیس ہزار روپے سے زیادہ نہیں اور وہ خان جہان خان کی لوٹ مار کو نہیں روک سکتا۔ دوشک سے کرمان (ایران) تک ایک گھوڑ سوار بیس دن میں پہنچ سکتا ہے اور یزد تک بھی اتنا ہی فاصلہ ہے جو صحرائے بے آب سے گذرتا ہے۔ یہ سڑک خاش (دوریوں کے لئے مشہور) اور خبیص کے پاس سے گذرتی ہے جن کے متعلق مجھے کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔

۸؍اپریل

اپنے مہربان دوست، تھل داس سے رخصت ہو کر میں آج صبح آٹھ بجے دُوشک

سے روانہ ہوا۔ میرا رہنما ملا غنی جوین کے غلزئی قبیلہ کا افغان تھا اور بہت باخبر، خوش مزاج اور زندہ دل تھا اور زبردست شاہسوار تھا۔ وہ بلوچوں کی سست رفتاری کے برعکس خوب تیز رفتار تھا اور میں بہت خوش تھا۔ اکبر اور دولت آباد کے دیہات سے گذر کر دوشک سے کوئی پچیس میل شمال میں ہم سیستان سے خراسان میں داخل ہو گئے اور ایک چٹیل سخت صحرا میں چلنے لگے جو تدریج بلند ہو رہا تھا۔ ہم نے ایک درمیانی رفتار پر کوئی پچیس میل طے کئے اور پھر پشیا دران کے شہر کے کھنڈرات میں آ گئے جو وسیع و بسیط ہیں۔ ہم انہی میں سے پانچ میل سے زیادہ چلے اور سید اقبال کے مزار پر آ گئے جہاں گندھک کے پانی کا کنواں ہے۔ یہ ایک بڑے قافلے کا پڑاؤ ہے لیکن ہم تھوڑے تھے لہٰذا رہنما نے چلتے رہنا بہتر سمجھا اور چونتیس میل پر ہم جوین (ضلع اوک) کے پرانے شہر میں ٹھہرے۔ ہمارے جانور کھنڈرات میں چرنے لگے اور ہم بغیر کھانا کھائے سو گئے تاکہ ہماری آگ سے ڈاکو متوجہ نہ ہو جائیں جو یہاں بہت زیادہ ہیں۔

۹ر اپریل

آج صبح ہم قلعہ اور آباد گاؤں میں گئے اور اپنے رہنما کے مکان پر اترے۔ افغان ملنے آئے تو رہنما نے انہیں بتایا کہ میں سید تھا اور زیارتوں کے لئے جا رہا تھا۔ وہ مجھے مل کر خوش ہو گئے اور پوچھنے لگے کہ میں کونسا سید تھا۔ میں نے جواباً قریشی بتایا۔ اب میرے رہنما نے ایک بھیڑ ذبح کر لی تھی اور میں اپنے شتر بانوں اور ایک ملاقاتی کے لئے کھانے پر بیٹھ گیا۔ ناشتہ کے بعد میں لیٹ گیا، گویا میں بہت تھکا ماندہ تھا اور یوں ان ملاقاتیوں سے فراغت ہوئی۔ اگلا دن بھی ایسے ہی گذرا تاکہ میرا رہنما محمد خان غلزئی کی طرف سے ایک جعلی خط فرح کے کسی افغان کے نام لے سکے۔

جوین ضلع اوک میں ایک چھوٹا سا زرخیز مقام ہے، پہاڑیوں میں محصور جن میں سے ایک ندی نکلتی ہے جو اس پوری وادی کو سیراب کرتی ہے۔ یہاں غلہ پیسنے اور پانی اوپر اٹھانے کے لئے افقی پن چکیاں ہیں۔ قلعہ دیگر ایران ساختہ قلعوں کی طرح اونچا ہے، پتلی اور کمزور دیواروں

والا، اردگرد ایک چھوٹی سی خندق اور پہلوؤں میں مدوّر مینار ہیں۔ یہاں کے لوگ محمد خان غلزئی کی رعایا ہیں۔ وہ دو میل دُور ایک قلعہ دُرگ میں رہتا ہے۔ اُس کے پاس چار سو گھوڑ سوار ہیں، اور سارا علاقہ اُس سے خائف رہتا ہے۔ خطے کر اور اس پر محمد خان کی مُہر لگوا کر ہم رات کو باہر سوئے اور صبح شمال سے مشرق کی طرف چلے۔ پندرہ میل پر ہمیں عمدہ پانی کا ایک چشمہ ملا جہاں دو تین گھنٹے ٹھہرے اور دس میل مزید چل کر غروب آفتاب پر ایک پانی کی نالی پر ٹھہرے۔ یہ جگہ الیاس آباد گاؤں کے قریب ہے لیکن چارہ نہ مل سکا۔

۱۰ اپریل

آج ہم فرح پہنچے اور سیدھے ابراہیم خان کے مکان پر گئے جس کے نام میں جعلی خط لایا تھا۔ اُس نے خط پڑھ کر دریاں بچھوائیں اور گرمجوشی سے استقبال کیا۔ میں نے دن کی گرمی اس کے باغ میں گذاری اور خوب مزہ رہا۔ شام کو وہ اور اُس کا بھائی کھانے میں شریک ہوئے جو دُنیے کے افغان شوربے اور سالن پر مشتمل تھا۔

شام کو ایک مُلّا ملنے آیا اور اینڈی بینڈی باتیں کرنے لگا تو میں نے نیند کا بہانہ کیا لیکن وہ نہ ٹلا۔ اُسے پتہ چلا تھا کہ میں سیّد کی دُعا و برکت کے طور پر گلے کے ہاروں اور بچوں کے مُونہوں میں دَم کرتا تھا لہٰذا وہ مجھ سے تبادلۂ خیال کرنے آگیا تھا۔ اُس کی بغل میں ایک کتاب تھی اور میرے رہنما نے اُس سے کسی جائداد کے متعلق پوچھا کہ وہ جائز تھی یا نہیں۔ ملّا شرعی قانون بتانے لگا اور پھر کہنے لگا کہ ایک سیّد کے سامنے اُس کی کیا مجال تھی اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ جائز تھی یا نہیں۔ میں نے بے خیالی میں سر ہلا دیا تو وہ فوراً پوچھنے لگا کہ میں شیعہ تھا یا سُنّی؟ میں نے جواباً کہا کہ سُنّی تو اُس نے میرے الفاظ دُہرا کر کہا کہ سُنّی کے لئے تو یہ موزوں جواب نہ تھا۔ میں گھبرا گیا تو دوسرے لوگوں سے بات چیت کرنے لگا جو مجھ سے مخاطب تھے، لیکن ملّا کہاں باز آتا۔ اُس نے چند لمحے بعد نہایت اطمینان سے کہا۔ "تم نے شاید میرا سوال نہیں سُنا میں دُہراتا ہوں۔" اور اُس نے سوال دُہرایا۔ میں نے ہندوستانی میں جواب دیا کہ میں اُس کا

مفہوم نہ سمجھ رہا تھا کہ شافی جواب دے سکوں۔ اس پر اُس نے میرے رہنما غنی کو ترجمانی کے لئے بلایا۔ غنی نے مجھے بہت خوبصورتی سے اس مخمصے سے نکالا۔ جب مُلاّ چلا گیا تو غنی نے کہا کہ جب آپ بحث میں ملوّث نہ ہونا چاہیں تو سو نفیاں ایک اثبات سے بہتر ہوتی ہیں کیونکہ پھر کوئی آپ کے الفاظ و تراکیب پر مُوشگافی نہیں کر سکتا۔ مَیں بعد میں اسی مشورے پر کاربند رہا اور حدیث[1] و قرآن کے علم سے بے خبر ہونے کی معذرت کرتا رہا اور یوں بہت سے مسائل اور جھگڑوں سے بچ گیا اور چار دنوں میں اپنی اصلیت بھی چھپی رہی۔

فرح ایک زرخیز وادی میں بڑا اور فصیل بند شہر ہے اور قندھار سے ہرات کے راستے پر قریباً وسط میں[2] ہے۔ اس کا بازار اچھا بنایا جاتا ہے لیکن چونکہ ایک شہر میں داخل ہونا آسان ہے اور اس سے باہر نکلنا بہت مشکل ہوتا ہے لہٰذا مَیں اس کے اندر نہیں گیا اور کوئی ایک میل دُور باغات میں ٹھہرا رہا۔ وادی کو ایک پہاڑی ندی سیراب کرتی ہے۔ اور باغات لمبے چوڑے ہیں۔ افغان کوئی مالیہ نہیں دیتے اور بازار کے محصول بھی برائے نام ہیں۔

دوشک سے فرح بنیسٹھ میل ہے گویا ساری تین آسان منزلیں ہیں۔ پہلی منزل بے آب و گیاہ ہے اور پچیس میل ہے۔ دوسری دونوں میں پانی اور چارہ ہے اور یہ مختصر ہیں لیکن عام علاقہ بنجر اور کشادہ صحرا ہے۔

۱۴ر اپریل

آج ایک کاروان ہرات جا رہا تھا اور مجھے اسی کے ہمراہ جانا تھا لیکن چھ روپے کی چھینٹ کے بدلے میرے رہنما نے آدھے راستہ تک چلنے کی پیشکش کی۔ مَیں مان گیا اور اس کے سالے کو بھی مزید حفاظت کے لئے ایک اونٹ پر بٹھا لیا۔ ہم شمال مغرب کی طرف چلے۔

---

[1] قانون یا خدا کا حکم

[2] دوسرا راستہ سبزوار کے پاس کی پہاڑیوں سے گذرتا ہے۔

سڑک اچھی اور سخت تھی اور میدان کے اِرد گرد چٹیل پہاڑیاں تھیں جن پر کوئی ہریاول نہ تھی۔ ہم غروب آفتاب کے قریب کاروان کے پاس سے گذرے اور اُس کے بغیر آگے چلتے گئے۔ اکیس میل کے فاصلہ پر ہم ایک سلسلۂ کوہ میں آئے اور رود خانہ (پاٹ) میں داخل ہوئے اور پھر انار دَرّہ آئے جو انتہائی نظر فریب اور رومانوی مقام ہے۔ انار درّہ ایک نالے پر چھوٹا سا قصبہ ہے جو ایک آدھ میل چوڑی وادی میں واقع ہے جس کے اِردگرد اُونچی خشک چٹانیں ہیں۔ ان کے دامن میں ایک طرف مکانات ہیں اور دوسری طرف باغات ہیں جن میں خرمانی، شہتوت، ناشپاتی، سیب، آڑو وغیرہ کے درخت ہیں۔

۱۵ر اپریل

آج ہم صبح طلوعِ آفتاب پر باغات کے درمیان چلتے رہے اور دو میل کے بعد وادی کی انتہا تک پہنچے۔ یہاں ایک مسجد میں ٹھہرے اور شام کو پھر روانہ ہوئے۔ شمال کی طرف اور پھر شمال مشرق کی طرف پہاڑیوں کے درمیان۔ کاشت ندارد۔ سترہ میل پر ہم نے سڑک چھوڑی اور اس کے داہنی طرف چلتے رہے اور پھر انار درّہ سے کوئی بتیس میل دُور گاؤں اوکل کے پاس ایک خشک گذرگاہ میں اُترے۔ آج شام میرے رہنما نے کہا کہ یہاں کے لوگ ہائے توبہ پکار اٹھیں گے اگر میں نے نماز نہ پڑھی۔ میں نے کہا کہ پانی تو ہے نہیں۔ اس پر اُس نے کہا 'ریت جو ہے' اور وہ شام کے وقت نماز کے لئے رُکا۔ میں بھی انکار نہ کر سکا اور اس کی حرکات و سکنات کی پیروی کرتا رہا۔ لیکن میں نے دوبارہ ایسا نہیں کیا کیونکہ میرے خیال میں تائیدِ ایزدی کو ایسی ناسمجھی کی عبادت سے کھویا جا سکتا تھا جس کی برکت سے میں یہاں تک صحیح سلامت پہنچ چکا تھا۔

۱۶ر اپریل

ہم چھ میل چل کر صحرا کی ایک غیر مانوس زیارت گاہ میں پہنچے۔ یہاں اپنے نُودشکی رہنما کو خدا حافظ کہا اور وہ گاؤں اوکل واپس چلا گیا۔ میں تین بجے شام خدا تعالیٰ کے توکل پر ہرات کے لئے روانہ ہُوا۔ اوکل ایک وسیع و کشادہ وادی کے جنوب مشرقی کونے میں ایک چھوٹا سا

گاؤں ہے جو شرقاً غرباً واقع دو گھاٹیوں کے درمیان واقع ہے۔ وادی کا وسطی حصہ مزروعہ ہے اور گاؤں میں پانی کافی ہے۔

زیارت گاہ سے نکل کر ہم شمال مشرق کی طرف چلے اور وادی کے کونے میں پہاڑوں کے سرے پر آ گئے۔ اس کے بعد ایک عمدہ سڑک مل گئی جس کے بائیں طرف پہاڑیاں تھیں اور دائیں طرف مشرق اور شمال مشرق کی جانب پہاڑ ہی پہاڑ تھے۔ یہ کاروانوں کی باقاعدہ منزل ہے لیکن ہم مغرب اور شمال مغرب کو چلتے رہے جس کے دو رویہ پہاڑیاں تھیں۔ تیس میل کے فاصلے پر ہم سڑک سے مشرق کی طرف سونے کے لئے ٹھہر گئے۔

۱۷ اپریل

طلوع آفتاب پر ہم پھر پہاڑیوں میں بل کھاتے ہوئے شمال، شمال مغرب کی طرف چلے۔ ابھی چھ میل ہی بمشکل گئے تھے کہ ہم نے چھ مسلح افغان شاہسواروں کو تعاقب میں آتے ہوئے دیکھا۔ میرے رہنما نے اپنی توڑے دار بندوق چلائی، میں نے پستول بھر لئے اور اپنے قافلہ کو سڑک کے بائیں طرف کر کے ذرا بلند مقام پر مورچہ سنبھال لیا۔ یہاں قافلہ اترا اور رہنما جھکا۔ افغان ہمارے مقابل آئے اور پوچھا کہ ہم کون ہیں۔ رہنما نے کہا کہ میں ایک پیرزادہ تھا۔ محمد خان غلزئی کا پیرو تھا اور مشہد (خراسان) کو زیارت کے لئے جا رہا تھا۔ آخری سوار نے اپنا گھوڑا ہماری طرف موڑا جس پر میرے رہنما نے ہاتھ ہلا کر کہا کہ اگر وہ ایک قدم بھی اور آگے بڑھا تو وہ اس پر گولی چلا دے گا۔ اس پر افغان نے اس سے پوچھا۔ "تم ایک بندوق سے چھ مسلح آدمیوں کا مقابلہ کیسے کرو گے؟" رہنما نے جواب دیا۔ "بجا۔ تم اپنا بیکار بوڑھا سردار نکال دو تو تم بھی پانچ اور ہم بھی پانچ اور مقابلے کی چوٹ۔" بوڑھے نے کہا "اپنے ہتھیار سنبھالو اور پیرزادہ کو یہ تاثر نہ دو کہ ہم لٹیرے یا ڈاکو ہیں۔" اس پر انہوں نے گھوڑے موڑے اور واپس چل دیئے۔

ہم نے دوبارہ سفر شروع کیا۔ ہمیں اطمینان تھا کہ افغانوں سے بہ آسانی خلاصی ہو گئی۔ آٹھ میل پر ہم ایک کنوئیں پر پہنچے جسے پلیسی کہتے ہیں۔ یہ کاروانوں کا پڑاؤ بھی ہے۔ پانی اور

چارہ خوب ہیں۔ یہاں سے ہم شرقاً غرباً دو گھاٹیوں کے درمیان چلتے رہے جن کو گہری کھائیاں کاٹتی رہیں۔ ہم راستہ چھوڑ کر دائیں طرف کو چلتے رہے تاکہ مزید افغانوں کا سامنا ہو دوپہر کو ہم شمالی سلسلۂ کوہ کے دامن میں ٹھہرے جہاں کھاری پانی کا کنواں تھا۔ ناشتے کے بعد ہم دامنِ کوہ کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور یکے بعد دیگرے کئی کھائیاں پار کر کے اکیس میل بعد ایک درّے کی مختصر لیکن سہل چوٹی پر آ گئے۔ رات کو ہم دشتِ حام میں ٹھہرے جو وادئ ہرات کے گرد و پیش کے پہاڑوں کی چوٹی پر ہے۔

۱۸ / اپریل

ہم صبح صبح روانہ ہو گئے اور ناشتے تک پچیس میل طے کر کے ایک چھوٹی سی زیارتگاہ پر پہنچ گئے۔ اس کے آٹھ میل بعد ہم ہرات پہنچ گئے۔ درمیانی علاقہ دیہات کے قرب و جوار کے سوا بنجر پڑا تھا۔

فرح سے انار درّہ تک سڑک اچھی ہے اور پتھریلی نہیں۔ یہ اکیس میل کی آسان منزل ہے گو راستے میں پانی نہیں ملتا۔ انار درّہ سے ادکل تک ایک طویل اور تکلیف دہ منزل ہے جسے کارواں عموماً دو حصوں میں طے کرتے ہیں۔ سڑک خراب ہے اور پہاڑوں کے درمیان اور گرادکل راستے سے ہٹا ہوا ہے تاہم اس راستے سے گذرنے سے ڈاکوؤں کا خطرہ کم تھا۔ ادکل سے سڑک درمیانے درجے کی ہے۔ لیکن پہلی منزل تک پانی کھاری ہے اور پھر پلیسی تک ہے ہی نہیں۔ اس کے بعد ہرات تک پانی نہیں اور صرف چھ میل درے ایک کھاری کنواں ہے۔ یہ آخری منزل ہے اور لمبی ہے اور زیارت گاہ تک تیس میل اور وہاں سے ہرات تک آٹھ میل ہے۔

شہر ہرات پہاڑوں میں محصور ایک وادی میں واقع ہے اور شمالی پہاڑ سے ملحق ہے جو اسے سنجارلے علیحدہ کرتا ہے۔ وادی شرقاً غرباً تیس میل لمبی اور پندرہ میل چوڑی ہے اور ایک دریا اسے سیراب کرتا ہے اور وسط میں بہتا ہے۔ یہ مزروعہ ہے اور دیہات و باغات بہت ہیں۔ زیارتگاہ سے ہرات تک چار میل کا فاصلہ باغیچوں کے درمیان سے گذرتا ہے اور شاہراہ ہے۔

اِس شاہراہ کے خاتمے پر ہم دریا تک پہنچ جاتے ہیں جس پر ایک قدیم پُل ہے چار سو گز لمبا، پختہ اینٹوں کا بنا ہُوا اور مشہور ہے کہ اِسے ایک عطارہ نے اپنے ہی خرچ پر بنوایا تھا۔ اِس وقت یہ بہت شکستہ ہے اور اگر حکومت نے فوراً مرمّت نہ کی تو یہ چکنا چُور ہو جائے گا۔ اِس پُل سے شہر اور دیہات کے درمیان رابطہ سالانہ کٹ جایا کرتا تھا جب پہاڑوں پر برف پگھلتی تھی اور دریا پھیل جاتا تھا۔ پُل پر سے گذرنے کے بعد ہم چار میل تک مضافاتی علاقے اور سڑک سے گذر کر شہر کے دروازے تک آئے۔

شہر کا رقبہ چار مربع میل ہے اور اِس کے گرد ایک بُرجدار اُونچی کچی فصیل ہے اور ایک پُرآب خندق۔ شمالی پہلو میں دیوار کے اوپر ایک ڈھیری پر قلعہ ایستادہ ہے جو چھوٹا سا مربع قلعہ ہے، پکی اینٹوں کا بنا ہُوا اور اِس کے زاویوں پر مینار ہیں۔ یہ سارا دیوار کے ساتھ ساتھ ہے اور اِس کے گرد بھی ایک تو خندق ہے جس کے اوپر اٹھاؤ پل ہے۔ اِس سے پرے ایک اور بیرونی دیوار اور خشک خندق حال ہی میں تعمیر کی گئی ہیں۔ شہر کا ہر رُخ پر ایک دروازہ ہے اور شمالی رُخ پر البتہ دو دروازے ہیں لیکن قلعہ بندیاں ڈھکو سلے ہی ہیں۔

ہر دروازے سے بازار چار سُو کو جاتے ہیں جو وسط شہر میں منڈی ہے۔ یہ خوب کشادہ اور دکانوں سے بھرپور ہیں۔ ان میں سے بڑا جنوبی دروازے سے گنج بازار یا مویشی منڈی تک جاتا ہے، قلعہ کے عین سامنے اور اِس کی پوری لمبائی پر محراب دار چھت ہے۔ یہ گلیاں اور چار سُو جمعرات کے دن اتنی پُر ہجوم ہوتی ہیں کہ گذرنا محال ہوتا ہے۔ جمعرات خرید و فروخت کا دن ہے۔ دونو طرف بڑی بڑی کشادہ سرائیں ہیں جہاں سوداگروں کی کوٹھیاں یا فیکٹریاں ہیں۔ شہر میں پانی فراواں ہے، ہر سرائے میں اپنا اپنا حوض آب ہے اور بازار میں دونو طرف لوگوں کے لئے حوض بنے ہیں۔ بدنما ترین عمارت حکمران کی رہائش گاہ ہے جس کا دروازہ معمولی سا ہے اور اِس کے اوپر ایک ٹیڑھی میڑھی عمارت ہے اور عین سامنے ایک کھُلا میدان ہے جس کے وسط میں نقارخانے کے لئے گیلریاں یا برآمدے ہیں۔

جامع مسجد کسی وقت ایک عظیم الشان عمارت تھی جس کا رقبہ آٹھ سو گز مربع ہے لیکن اب یہ شکست و ریخت کی زد میں ہے۔ ہرات کی بھی عمارتیں ایسی نہیں ہیں اور شاید ہی کوئی اور شہر ایسا ہوگا جو اتنی محدود جگہ پر اتنی زیادہ آبادی سے مملو ہو۔ ہرات اور اس کے مضافات کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے جس میں سے دس ہزار افغان ہیں، چھ سو ہندو اور باقی مغل ہیں۔ چند یہودی بھی ہیں۔ ہندوؤں کی یہاں بہت عزت ہے کیونکہ وہی سرمایہ دار ہیں۔ حکومت ان کی قدر و قیمت پہچانتی ہے لہٰذا وہ بہت با اثر ہیں۔ وہ بہتر ان سراؤں میں رہتے ہیں جن کے باہر باغات ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنے بچوں کو شہر لانے کی جرأت نہیں کرتے۔

ہرات غالباً ایشیا کا عظیم ترین تجارتی شہر ہے۔ اسے بندر کہتے ہیں اور یہ کابل، قندھار، ہندوستان، کشمیر، ایران اور بغداد وغیرہ کا تجارتی مرکز ہے۔ پہلے چاروں سے یہ شال، نیل، چینی، چھینٹ، ململ، بافتہ، کمخواب، کھالیں اور چمڑا درآمد کرتا ہے اور انہیں مشہد، یزد، تہران، بغداد اور کرمان کو برآمد کرتا ہے اور بدلے میں ڈالر، چائے، مصری، چینی ظروف، بانات، چھینٹ، ریشم، تانبا، فلفل اور دیگر مصالحہ جات، کھجور، شال، نمدے اور دریاں لیتا ہے۔ ہندوستان سے آنیوالی کھالیں سو فیصدی منافع دیتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ساری تجارت میں مایہ داروں کی پانچوں گھی میں ہیں۔ یہاں کا سکہ محمود شاہی روپیہ ہے لیکن حساب کتاب کریم خانی روپے میں رکھا جاتا ہے جن کی شرح ایک سو پچیس فی صد محمود شاہی ہے۔

ہرات کی برآمدات ریشم، زعفران اور رال ہیں جو ہندوستان کو جاتے ہیں۔ ملکی پارچات ایرانی پارچات کا لگا نہیں کھا سکتے۔ باغات درختان شہتوت سے بھرے پڑے ہیں جو ریشم کے کیڑوں کے لئے وقف ہیں اور ہرات کے ارد گرد کے پہاڑ اور میدان سب رال پیدا کرتے ہیں خصوصاً مغربی طرف کے۔ یہ دو تین فٹ اونچا ہوتا ہے، اس کا تنا قطر میں دو انچ ہوتا ہے اور چوٹی پک جائے تو زرد ہوتی ہے اور پھول گوبھی سے مشابہ۔ ہندو اور بلوچ اس کے بہت شوقین ہیں، تنا راکھ میں بھون کر کھاتے ہیں اور سرے دیگر سبزیوں کی طرح پکاتے ہیں پھر

بھی اس کا ناخوشگوار ذائقہ اور بُو باقی رہتے ہیں۔

ہرات کے باغات بہت وسیع ہیں۔ ان دو باغ حکمران کا ہے اور باغ شاہی تیمور شاہ کا لگوایا ہوا ہے جو اُس کی محبوب نشست گاہ تھا) یہ عوامی باغات ہیں اور صرف ان کی سالانہ پیداوار کی حفاظت کی جاتی ہے جو بازار میں بکتی ہے۔ باغ شاہی کو جانے والا راستہ ایک میل لمبا ہے اور اس کے دو رویہ سرو ایستادہ ہیں اور اس کے ساتھ ہی ایک مسجد کے چار مینار ہیں جو امام موسیٰ علی رضا کے مقبرہ کے لئے تھے جو ہرات کو دیکھ کر اتنا مایوس ہوئے کہ مشہد میں فوت ہو گئے۔

ہرات کے آس پاس بے شمار دیہات ہیں اور یہ وادی گویا سونے کی کان ہے۔ گندم اور جوار افراط سے پیدا ہوتے ہیں اور ہر قسم کا پھل بے حد ارزاں ہے۔ جب میں ہرات میں تھا تو سب گھوڑے ایک منزل دُور پہاڑوں میں باغ میں تھے کیونکہ وہاں عمدہ گھاس کی بہتات تھی یہ عموماً نیم سدھائے ہوئے ہوتے ہیں لیکن بخارا کے سوداگر ترکمانی گھوڑے لاتے ہیں جو اپنی اونچائی کی نسبت سے قیمت پاتے ہیں۔ یہاں کا سب سے بڑا گھوڑیال علیاد بیگ ہزارہ ہے جو مشہد کی طرف پہاڑوں میں رہتا ہے اور گھوڑوں گھوڑیوں کے ریوڑ رکھتا ہے۔ اس کے بچھیرے بہت قیمت پاتے ہیں اور عموماً ایک تا چار ہزار روپے پر بکتے ہیں۔ ہرات کے محصول دو روپے باہر جانے والے لدے ہوئے اونٹ پر ہوتے ہیں اور بیس روپے کے سامان کے بدلے ایک آنہ ٹیکس لیا جاتا ہے۔ یہ سرائے دار خریدار سے وصول کرتا ہے جس کے پاس اجارہ ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ ٹیکس معمولی ہے پھر بھی لوگ اس سے ہر طرح بچنے کے جتن کرتے ہیں اور دو تین مثالیں میرے مشاہدہ میں بھی آئیں۔ آمدنی ساڑھے چار لاکھ روپے بتائی جاتی ہے اور سرائے، دکان اور باغ سے وصول ہوتی ہے۔ کچھ جنس یا غلہ اور مویشی کی صورت میں لی جاتی ہے۔ حکمران اس میں سے پچاس ہزار روپے سالانہ شاہِ ایران کو دیتا ہے۔

ہرات کا حاکم شاہزادہ حاجی فیروز الدین خان ہے جو تیمور شاہ مرحوم کا تیسرا بیٹا اور موجودہ

محمود شاہ کا سگا بھائی ہے ۔ وہ قریباً پچاس سال کا ہے اور امورِ عامہ میں بہت کم حصّہ لیتا ہے اور ہر کام حاجی آغا خان کے سپرد کئے ہوئے ہے جو وزیر ہے ۔ وہ خراسان کی موجودہ پیچیدہ صورتِ حال میں غیر جانب دار رہنے کی کوشش کرتا ہے اور طرفین اس سے ناراض نہیں ہوتے ۔ اس کی دو بیویاں ہیں ، ایک مُغل اور دوسری شکور خان دُرانی کی بیٹی ۔ ان سے دو دو بیٹے ہیں ۔ بڑا قاسم خان خوبصورت جوان ہے اور کوئی بائیس سال کا ہے ۔ معاملات کی باگ ڈور مغل کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے افغان حسد کرتے ہیں لیکن وہ اسے اپنے لوگوں پر اس لئے ترجیح دیتا ہے کہ وہ اُسی کا خزانہ بھرنے کے لئے رعایا پر جبر کرتا ہے اور یہ اُس کے ہم قوم نہ کر سکتے تھے کیونکہ وہ تو مفت اور آزاد زمینی ملکیت کے عادی ہیں اور وہ اس لوٹ مار کو انجام نہیں دے سکتے جو مُغلوں کا خاصہ ہے ۔

ہراتی پولیس اخلاقی لحاظ سے تو نہیں البتہ جُرمانے وصُول کرنے میں بہت سخت ہے اور کوئی شخص اندھیرے کے بعد باہر نہیں رہ سکتا ۔ یہ شہر تمام خراسان میں ٹھگوں کی وجہ سے مشہور ہے جو سادہ لوح اجنبی کو خاطر مدارات کے لئے گھروں میں لے جاتے ہیں اور پھر اپنی مستورات کو بہلانے پھسلانے اور مہمان نوازی کی خلاف ورزی کے بدلے اُسے پکڑ لیتے ہیں اور اگر وہ پانچ سو روپے پر بھی گلو خلاصی کرالے تو بہت خوش قسمت ہوگا ۔ ایسے مواقع پر وہ عموماً اس کے کوائف پہلے سے معلوم کر لیتے ہیں اور پھر انہی کے مطابق اس سے رقم اینٹھتے ہیں اس کا نصف مخبر کو چلا جاتا ہے اور دیگر نصف وزیر اور حکومت کو ۔

مَیں ہرات میں قریباً ایک ماہ گھوڑوں کے سوداگر کی حیثیت سے رہا اور پھر اعلان کیا کہ مشہد زیارت کے لئے جاؤں گا جو عموماً ان سوداگروں کا وطیرہ ہے ۔ مَیں نے اپنے اس ارادے کا برملا اظہار اس لئے کیا کہ مَیں ہرات سے کسی وقت بھی جا سکوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گھوڑوں کے بغیر جا سکوں اور کہہ دیا کہ واپسی پر خرید وں گا ۔ اس بناء پر مَیں نے اپنے دورانِ قیام صرف دو گھوڑے خریدے ۔

۱۸ر اور ۱۹ر مئی

اپنے ہندو گماشتے سے ایک رہنما لے کر میں ۱۸ر مئی کو پانچ بجے شام ہرات سے روانہ ہُوا۔ ہم پانچ میل مغرب کی طرف باغوں میں چلتے رہے۔ پھر کھیت آگئے جو پہاڑوں تک بالکل ختم ہوگئے۔ بارہ میل پر جاکر ہم نے اپنے گھوڑے باندھے اور سو گئے۔ طلوعِ آفتاب سے پہلے ہم پھر مغرب کی طرف روانہ ہو گئے اور بائیس میل پر سیخوان کے بڑے گاؤں کے پاس سے گذرے اور ایک میل چل کر درویشوں کے پنڈورے میں ٹھہرے۔ سڑک عمدہ تھی، لیکن تیز ہوا چل رہی تھی اور ریت کے بادل بہت تکلیف دہ تھے۔ اب میں خوش تھا کہ ہم افغان سرحد پار کر آئے تھے اور مملکتِ ایران میں آگئے تھے جس میں میں کئی دفعہ بال بال بچنے کے بعد نسبتاً محفوظ محسوس کر رہا تھا۔ ہم دو گھنٹے ٹھہرے اور بعد از دوپہر بارہ میل چل کر غوریان پہنچے جو ہرات سے پینتیس میل کے فاصلے پر ایک بڑا قصبہ ہے اور جہاں پانی، غلّہ اور چارہ فراواں ہے۔

۲۰ر مئی

آج ہم طلوعِ آفتاب سے پہلے مغرب کی طرف روانہ ہوئے۔ دس میل کے مزروعہ رقبے کے بعد ہم ایسے علاقے میں داخل ہوئے جہاں رال کی جھاڑیاں تھیں۔ ایک سلسلۂ کوہ شمالاً جنوباً سامنے تھا اور اس سلسلہ سے ملحق ہو رہا تھا جو ہرات سے ہی ہمارے دائیں طرف ایستادہ تھا۔ ان پہاڑیوں کو بہ آسانی اور عمدہ سڑک سے عبور کر کے ہم بیس میل پر ایک خوش آب کنوئیں پر پہنچے اور ٹھہر گئے۔ ایک بجے ہم پھر ایک عمدہ میدان پر سفر کرنے لگے جہاں بہت سے دیہات کے کھنڈرات ہیں جنہیں اوزبکوں نے تباہ کر دیا تھا۔ ہم انہی میں سے ایک میں شب بسری کے لئے ٹھہرے۔ یہاں نہ پانی تھا نہ چارہ۔

۲۱ر، ۲۲ر اور ۲۳ر مئی

اکیس کو ہم قلات نادر پہنچے جہاں کافی پانی اور چارہ ہے۔ اس کے بعد ایک سنگلاخ علاقے کا سفر کیا اور تیسرے دن چٹیل میدان سے گذرتے ہوئے خف پہنچے۔

خف، پہاڑیوں کے ایک سلسلے کے عین دامن میں چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں غلہ اور پانی کی بہتات ہے اور اس کے مضافات مزروعہ ہیں اور بہت سے باغات ہیں موسم گرما کے چاروں مہینوں میں یہاں جھکڑ چلتا رہتا ہے جس سے ہوا چکیاں چلتی ہیں۔ گورنر علزئی خان ہے اور یہیں مستقلاً رہتا ہے۔ ہم قصبے کے پاس ہی ٹھنٹھوں کے ایک کھیت میں ٹھہرے اور صبح کو آگے روانہ ہو گئے۔

۲۴ر مئی

آج ہم شمال مغرب کو چلے اور سڑک کے دائیں طرف کی پہاڑیوں سے بچتے ہوئے ایک سرسبز مزروعہ میدان سے گذرے۔ بہت سے دیہات آئے اور ہم چونتیس میل پر شیروان میں رکے۔ اس راستے پر پانی اور چارہ بکثرت ہے اور بھیڑوں کے بڑے بڑے ریوڑ ہیں۔ شیروان میں ہوا کم ہو گئی جو خف پر اتنی پریشان کن تھی۔

۲۵ر ۲۶ر اور ۲۷ر مئی

پچیس کو ہم شمال مغرب کی طرف صرف بارہ میل چلے اور مجھے کئی روزہ بخار کی وجہ سے گاؤں سکار میں رکنا پڑا جہاں بادام بہت ہوتے ہیں۔ ویسے میرا ارادہ آٹھ میل آگے چل کر سنگون ٹھہرنے کا تھا جہاں میں چھبیس کو پہنچا۔ یہاں پانی کھاری اور علاقہ پتھریلا ہے۔ ستائیس کو ہم شمال مغرب اور مغرب کی طرف چلے اور سولہ میل پر تجرد گاؤں میں پہنچے جو پہاڑیوں میں واقع ہے۔ شیروان سے تجرد تک تینوں منزلیں ایک گھوڑ سوار آسانی سے ایک دن میں طے کر سکتا ہے تجرد سے ہم نے دو تین پہاڑیاں عبور کیں اور جنوب مغرب کی طرف بارہ میل چل کر چلسر بیڈوے میں رات کے لئے ٹھہرے۔

۲۸ر مئی

ہم صبح چلے اور پہاڑیوں کو چھوڑ کر جو ہمارے داہنی طرف شمال مغرب کو جاتا ہوا سلسلہ ہے ایک نفیس لیکن محروم آب میدان سے گذرے۔ سولہ میل پر ایک بڑے گاؤں نفرے

آئے جہاں پانی کھاری تھا۔ یہاں رُکے اور کچھ کھا پی کر بارہ میل طے کر کے شام تک اُنشی پہنچ گئے۔ آٹھویں میل پر مشہد سے ہرات جانے والی سڑک آملتی ہے۔ یہ ایک بڑا گاؤں ہے کاشت کم ہے لیکن پانی اور ریوڑ خوب ہیں۔ یہاں ایک کاروان سرائے نے ہمیں تہذیب کی آمد آمد کا پتہ دیا۔

۲۹ مئی

آج صبح اُنشی سے پانچ میل سے زیادہ طے کر کے ہم صحرا کے سرے پر ایک پُرانی خستہ سرائے میں پہنچے جہاں پانی بہت ہے لیکن رسد ندارد۔ تین بجے ہم پہاڑوں کے ساتھ ساتھ (جو بائیں طرف تھے) پھر روانہ ہو گئے۔ پہلے مغرب کو اور پھر جنوب کو چلتے رہے۔ طبس کی سڑک بائیں طرف کی پہاڑیوں کے اُوپر سے گذرتی ہے لیکن صرف آٹھ فرسخ تک آباد ہے اور پتھریلی ہونے کی وجہ سے اونٹوں کے لئے ساز گار نہیں۔ لہٰذا میں نے صحرائی راستہ اختیار کیا۔ تین میل، سات میل اور گیارہ میل پر ہمیں کنوئیں ملے۔ آخری پر ہم چند گھنٹے ٹھہرے اور پھر جنوب مغرب کی طرف سینتیس میل چلے۔ ہر فرسخ پر خشک کنوئیں ملتے رہے اور پچیسویں میل پر آبدار کنواں ملا۔

۳۰ مئی

طلوعِ آفتاب سے پہلے ہم مزید مغرب کی طرف چلے۔ بارہ میل پر ایک کنوئیں سے پانی لیا جہاں کارواں ٹھہرتے ہیں۔ سات میل چل کر گاؤں ایک میں پہنچے جہاں غلہ، پھل، پانی، چارہ اور بھیڑیں افراط سے ہیں۔ اُنشی سے لدے ہوئے جانور چار منزلوں میں بہ آسانی یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ ہم نے سفر پھر پہاڑیوں کے درمیان شروع کر لیا اور پندرہ میل پر دیہہ محمد آ گئے جہاں ایک بڑی سرائے، ایک ہندو دکاندار اور عمدہ پانی، غلّہ اور چارہ موجود ہیں۔

۳۱ مئی

دیہہ محمد سے چار دیہہ۔ پہلے بارہ میل میں کنکر، پھر ایک چوٹی کے گرد بائیں طرف گھومے۔

سڑک اچھی، زیادہ تر صحرا اور ایک سلسلۂ کوہ کے دامن میں۔ چوبیس میل پر چاردیہہ پہنچے۔ آٹھ میل جنوب مشرق میں شہر طبس ہے۔

چاردیہہ چار گاؤں کا مجموعہ ہے۔ یہاں پانی، غلّہ اور چارہ بکثرت ہے۔ ایک ٹوٹی پھوٹی سرائے بھی ہے۔ یہاں سے کاروان تیرہ منزلوں میں خف پہنچتے ہیں لیکن گھوڑ سوار آٹھ منزلوں میں بہ آسانی جا سکتا ہے۔ صرف سینتیس میل تکلیف دہ ثابت ہوئے۔ سڑک عموماً اچھی ہے۔

یکم اور ۲ر جون

چاردیہہ سے گیارہ میل مغرب کی طرف یکم کو چلے اور ایک خشک گذرگاہ میں سوئے۔ اگلے دن پہاڑیوں پر چڑھ کر دس میل پر کلبت آئے۔ یہاں کاشت نہیں اور ایک ہندو دکاندار ہے جو ایک سرائے کو روٹی اور جوار مہیا کرتا ہے۔ پانی کھاری ہے۔

۳ر جون

ہم ایک پہاڑی ناہموار سڑک پر جنوب کی طرف چلے جس میں گھاٹیاں تھیں اور اٹھارہ میل پر شتران ٹھہرے، روٹی بھی حاصل کی اور گھوڑوں کے لئے غلّہ بھی، لیکن پانی خراب ہے۔

۴ر جون

ہم پانچ بجے صبح روانہ ہوئے، ریگزاروں پر چڑھتے اور اترتے ہوئے، جنوب مغربی سمت میں۔ پہلے سڑک گہری ریت سے گذری اور پھر ایک سخت میدان سے، پانی ندارد، چوبیس میل پر ایک بڑا گاؤں پشت بادام آیا جس میں ہر قسم کی رسد فراواں تھی۔

۵ر جون

آج ہم جنوب کی طرف چلے۔ ہلکی سی چڑھائی تھی۔ پانچ میل پر پانی کی ایک ندی تھی۔ شام ہم الہ آباد ٹھہرے جو پشت بادام سے چودہ میل ہے، صحرا میں واقع ہے، ایک نئی سرائے ہے اور رسد آسانی سے میسر ہے۔

۶ ؍جون

الہ آباد سے سہ گنا، دس میل کی ایک چھوٹی سی منزل، یہاں سرائے تو کوئی نہیں، بلکہ غلّہ اور اچھا پانی بافراط ہیں۔

۷ ؍جون

سہ گنا سے ریزاب، ایک تنگ بل کھاتی ہوئی سڑک کے ذریعے، پہاڑ قریب ہی دائیں طرف اور پانچ میل دور بائیں طرف، آٹھ میل پر ریزاب آ گئے، ایک اچھی سرائے، غلّہ اور چارہ میسّر، پانی خراب۔

۸ ؍جون

جنوب مغرب کی طرف سفر، چودہ میل پر ایک خشک دریائی گذرگاہ میں داخل ہوئے، ایک مجمع الجبال کی پہاڑیوں میں بل کھاتی ہوئی سڑک تا غرباً، چودہ میل پر پانی ملا، اس کے بعد چٹانوں کے درمیان اور اوپر ایک ڈھلوان پیچیدہ راستے پر چڑھنا پڑا اور خارانی آئے جو سہ گنا سے بیس میل ہے۔ یہاں کی سرائے اچھی ہے اور روٹی، غلّہ اور چارہ بہتات سے ہیں۔ پانی بہت لیکن کھاری۔

۹ ؍جون

ہم خارانی سے جنوب کی طرف چٹانی پہاڑوں کے درمیان چلتے رہے جو دو رویہ ایک میل کے قریب تھے۔ چھ میل پر راستہ جنوب مشرق کی طرف ایک میدان میں مڑتا ہے۔ بارہ میل پر اچھے پانی کا حوض ہے۔ یہاں سے پہاڑ دائیں طرف کو مڑتے ہیں۔ سترہ میل پر سڑک پتھریلی اور خراب ہے۔ بیس میل پر ریگستان ہے اور بائیں طرف کا سلسلۂ کوہ اس ریگزار کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ چھبیس میل پر یزد کا شہر ہے۔

چار دیہہ سے کلبت کاروان دو منزلوں میں جاتے ہیں۔ دوسری تکلیف رساں اور بے آب ہے۔ وہاں سے اٹھارہ میل سشطران تک پانی خوب ملتا ہے۔ چوتھی منزل لشتت بادام تک

بہت لمبی ہے جہاں سے یزد پانچ آسان منزلوں پر ہے اور پانی اور چارہ میسّر ہیں۔ ہرات سے یزد تک ہر ترکی کو اوزبک حملوں نے کافی نقصان پہنچایا ہے جنہوں نے لوٹ مار کی اور آبِ باراں کے حوض تباہ کر دیئے۔

فاصلے مندرجہ ذیل ہیں:

خَف	۱۱۷ میل
چار دیہہ	۲۱۰ میل
یزد	۱۵۱ میل
	۴۷۸ میل

یزد ایک بہت بڑا اور گنجان آباد شہر ہے اور ریگستان کے سرے پر واقع ہے جو شرقاً غرباً پھیلے ہوئے سلسلۂ کوہ سے ملحق ہے۔ اسے دار العبادت کہا جاتا ہے لیکن زیادہ صحیح طور پر اسے دار الامانت کہہ سکتے ہیں جو کرمان کے لئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ تمام سوداگر اس کے امن و امان اور جان و مال کی سلامتی کی تعریف کرتے ہیں۔ یہ ہندوستان، خراسان، بغداد اور ایران کے درمیان ایک بڑی منڈی ہے اور غالباً ایران کی سب سے بڑی منڈی۔ بازار خوب کھلا اور مملو ہے۔ شہر میں بیس ہزار مکانات ہیں۔ گبروں کے چار ہزار مکانات اس کے علاوہ ہیں۔ یہ محنتی لوگ ہیں لیکن آزردہ خاطر کیونکہ ایرانی حکومت دیگر محصولات کے علاوہ پچیس روپے فی کس وصول کرتی ہے۔ یزد سے شاہ کو تین لاکھ روپے سالانہ آمدنی ہوتی ہے

یزد ریگستان میں واقع ہونے کی وجہ سے خود کچھ پیدا نہیں کرتا یا بے حد محنت سے بہت کم پیدا کرتا ہے۔ پہاڑیوں کے دامن میں باغوں اور باغیچوں کا ایک خطہ آباد کیا گیا ہے جہاں اعلیٰ ترین خوبانیاں اور خربوزے وغیرہ ہوتے ہیں۔ کسب اور الوہی (ریشمی کپڑے کی دو قسمیں) مصنوعاتِ ایران میں بہترین سمجھی جاتی ہیں۔ گبر عمدہ ترین مصری کی ڈلیاں بناتے ہیں۔ تفت (آٹھ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں) کے نمدے کرمانی نمدوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ بھیڑیں یہاں شیراز سے آتی ہیں اور

غلّہ اصفہان سے ۔ شہر میں کم از کم پچاس ہزار اونٹ ہیں۔ گدھا یہاں پندرہ تومان یا پندرہ پاؤنڈ پر بکتا ہے۔ شہر بے ڈھب ہے اور یہاں ایک عمدہ فصیل ہوتی تھی جس کا کچھ حصّہ باقی ہے ۔

۲۴ ر جون

آج یزد سے نکل کر پہاڑیوں کے دامن میں ایک گہری ریتلی سڑک پر سفر کرتا رہا - چھ میل تک دو رویہ باغات ہیں ۔ چودہ میل پر ایک بڑے گاؤں اشک ذُر کے پاس سے گذرا اور پھر ریگزاروں میں بل کھاتا ہوا شمال کی طرف مڑا - چوبیس میل پر ایک چھوٹے قصبہ یزدواہ میں پہنچا۔ علاقہ مزروعہ ہے اور آبدار ۔

۲۵ ر جون

بارہ میل کے فاصلے پر چھوٹا سا گاؤں میبت آیا جو بائیں طرف کے سلسلۂ کوہ سے ملحق ہے ۔ دائیں طرف علاقہ مزروعہ ہے ۔ آٹھ میل آگے ایک بڑا گاؤں ارداکو ہے ۔ دس میل آگے تافتہ کا گاؤں ہے ۔ تیس میل پر اگدا پہنچا۔

اُگدا کوئی ایک سو ساٹھ گھروں کا چھوٹا سا گاؤں ہے جس میں ایک اچھی سرائے ہے۔ یہ ایک شمال مغربی اور جنوب مشرقی سلسلہ ہائے کوہ کے درمیان ایک صحرا کے سرے پر واقع ہے ۔ یہاں یزد کے گورنر کا علاقہ ختم ہوتا ہے۔

۲۶ ر جون

مغرب اور پھر مغرب کو جنوب کی طرف سے صحرا پر چلا ۔ ستائیس میل پر جمار باشی گاؤں آیا ۔ یہاں ایک چھوٹی سی سرائے ہے ۔ پانی خراب لیکن چارہ سستا ہے ۔

۲۷ ر جون

چھ میل پر سڑک کے بائیں طرف کی پہاڑیوں کو عبور کیا اور ہمیں اچھا پانی اور چراگاہ ملے جہاں دو گھنٹے ٹھہرے ۔ اس کے بعد کا علاقہ پہاڑی ہے لیکن درمیانی کاشت ہوتی ہے ۔ ستائیس میل پر ایک بڑے گاؤں گچکو ٹھہرے ۔ یہاں سرائے ہے اور ہر چیز وافر ہے ۔

۲۸ر جون

گھگھو سے تین میل تک پہاڑیوں کے بیچ میں چلے، پھر ایک میدان آگیا۔ سامنے ایک سلسلۂ کوہ تھا۔ پچیس میل چلے۔ سڑک اچھی ہے۔ راستہ میں مغرب کا تھا۔ چھ میل پر گاؤں مشک نون آیا اور تین میل کے فاصلے پر اچھے پانی کا حوض ملا۔ نو میل آگے گز پر ہے جہاں ٹھہرے۔ یہاں شاہ عباس اعظم کی تعمیر کردہ ایک اچھی سرائے ہے۔

۲۹ر جون

میدان پر چلے۔ ہر فرسخ پر ایک کنواں ہے۔ راستہ مغرب اور جنوب مغرب کو ہے۔ پندرہ میل پر گاؤں نادر شول آیا اور تیس میل پر لنک نون ٹھہرے جہاں ایک اچھی سرائے ہے۔ یہ ایک سلسلۂ کوہ کے پاس چھوٹا سا گاؤں ہے اور یہیں یہاں غلّہ اور چارہ بکثرت ملا۔

۳۰ر جون

لنک نون سے تیس میل مغرب کی طرف چلا۔ پہاڑ مغرب، جنوب مغرب کی طرف ہیں اور دس پندرہ فرسخ دور ہیں۔ یہاں راستہ باغوں میں داخل ہوتا ہے اور نو میل آگے میں امین الدولہ کے محل (اصفہان) میں پہنچا۔ یزد سے اصفہان تک کا مجموعی فاصلہ اندازاً ایک سو ستّر میل ہے۔ راستہ مغرب کی جانب ہے اور سڑک اچھی ہے۔ یہاں میں خوش قسمتی سے لیفٹیننٹ پوٹنگر سے دوبارہ آملا جو مراغہ کو جنرل میلکم سے ملنے جا رہا تھا۔ وہاں ہم یکم اگست کو پہنچے، بمبئی سے ہماری روانگی کے پورے سات ماہ بعد!!

تمت بالخیر

بلوچستان، سندھ، صوبہ سرحد و ملحقہ علاقوں میں اٹھارھویں صدی اور اس سے بھی پہلے ادوار کے تاریخی، جغرافیائی، سماجی، ثقافتی اور قبائلی حالات اور واقعات سے متعلق ہم نے انگریزی زبان میں متعدد کتب شائع کی ہیں۔ ان کتب کے اُردو تراجم کا کام بھی ہم نے شروع کر دیا ہے۔ اس پروگرام کے تحت ہماری مندرجہ ذیل کتب شائع ہو گئی ہیں :

- بلوچستان تاریخ کے آئینے میں ... مصنف ... جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری ... ترجمہ ... پروفیسر سعید احمد رفیق
- بلوچی قبائل ... مصنف ... ایم۔ لونگ ورتھ ڈیمز ... ترجمہ ... کامل القادری
- شمال مغربی پاکستان کے رسم و رواج ... مصنف ... لفٹیننٹ جنرل سر جارج میکمن ... ترجمہ ... پروفیسر ایم۔ انور رومان
- بلوچ قوم اور اس کی تاریخ ... مصنف ... محمد سردار خان بلوچ ... ترجمہ ... پروفیسر ایم۔ انور رومان
- سیستان ... مصنف ... جی۔ پی۔ ٹیٹ ... ترجمہ ... پروفیسر ایم انور رومان
- [illegible] ... مصنف ... تھامس ہنری تھارنٹن ... ترجمہ ... کامل القادری
- مری بلوچ ... مصنف ... رابرٹ پیرسن ... ترجمہ ... ریاض صدیقی
- وسط ایشیا میں روس کے عزائم ... مصنف ... جوزف پوپوسکی ... ترجمہ ... نذیر حق
- سفرنامہ سندھ و بلوچستان ... مصنف ... ہنری پوٹنجر ... ترجمہ ... پروفیسر ایم انور رومان
- مشرقی افغانستان کے خانہ بدوش ... مصنف ... کیپٹن جے اے رابنسن ... ترجمہ ... پروفیسر سعید احمد رفیق
- [illegible] بلوچستان ... مصنف ... کامل القادری (نئی تصنیف)

سول و ملٹری ہورڈز بنام میسرز گوشہ ادب، سرکلر روڈ، کوئٹہ
(پاکستان) فون ۷۵۰۰۲